فتاویٰ حقانیہ



از افادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

و دیگر مفتیانِ کرام دارالعلوم حقانیہ

نگرانی و اہتمام

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ حقانیہ

ترتیب

مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰىٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ (الآیہ)

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے نصف صدی کے فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ حقانیہ

جلد پنجم

افادات

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق و دیگر مفتیانِ کرام

جامعہ دارالعلوم حقانیہ

نگرانی و اہتمام

مولانا سمیع الحق مہتمم و استاذ حدیث

جامعہ دارالعلوم حقانیہ

ترتیب مفتی مختار اللہ حقانی

شائع کردہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ پاکستان

نام کتاب .... فتاویٰ حقانیہ (جلد پنجم)

افادات .... شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
بانی جامعہ دارالعلوم حقانیہ ودیگر مفتیان کرام جامعہ ہذا

نگرانی واہتمام .... شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب، مہتمم جامعہ ہذا

ترتیب .... مولانا مفتی مختار اللہ حقانی استاذ شعبہ التخصص فی الفقہ والافتاء

ضخامت .... ۵۵۰ صفحات

تاریخ طبع ہفتم ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء

طابع .... مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
Mob:0300-4572899

ناشر .... جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

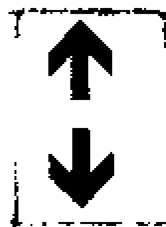
فہرست مضامین جلد پنجم


كتاب
النفقات
والأيمان
والنذر

لينفق ذو سعة من سعته

ومن قدر عليه رزقه

فلينفق مما آتاه الله



من حلف كاذباً

أدخله الله النار.

کتاب النفقات

(خرچہ کے احکام و مسائل)

بیوی کا علاج کرانا خاوند پر لازم نہیں

سوال:۔ زید کی بیوی کافی عرصہ سے بیمار تھی اُس کے والدین بخوشی علاج کی غرض سے اپنے گھر لے گئے اور وہاں اس کا علاج معالجہ کرایا گیا، کچھ عرصہ بعد عورت کے والدین نے زید سے علاج معالجہ پر خرچ ہونے والی رقم کا مطالبہ کیا، تو کیا ان کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیوی کا علاج معالجہ کرانا بہر حال خاوند پر واجب نہیں البتہ مروت کے باب میں علاج کرانا مناسب ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: ولقائل ان يقول عليها كأجرة الطبيب الخ

(فتح القدير ج ۴ ص۲۰۰ باب النفقة۔ كتاب النكاح)[1]

والدین کے نان و نفقہ کا حکم

سوال:۔ والدین کا نان و نفقہ اولاد پر واجب ہے یا نہیں؟ نیز اگر اولاد تنگدست ہو تو پھر بھی اسے والدین کے نفقہ کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اگر خود غنی ہوں تو اولاد کو ان کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا چاہے اولاد خوشحال ہی کیوں نہ ہو، لیکن جب والدین کا متبادل بندوبست نہ ہو تو ان کے اخراجات کی ذمہ داری بالغ اولاد پر عائد ہوتی ہے تاہم اگر اولاد خود تنگدست ہو تو اُسے اس کے لیے مجبور کرنا بھی مناسب نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجيمؒ: (ولابويه واجداده وجداته لو فقراء) اى تجب

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: وقيد بالنفقة لان المداواة لا تجب عليه اصلاً۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۸۲ باب النفقة)

ومثله في الهندية ج۱ ص۵۴۹ كتاب النكاح۔ الباب النفقة۔

النفقة لهُ وكا ء....... واطلق فی الابن ولم یقید فی الغنی مع انهٗ مقید بهٖ لما فی شرح الطحاوی ولا یجبر الابن علی نفقة للابوین المعسرین اذا کا معسرًا۔
(البحر الرائق ج ۴ ص۳۵ باب النفقة۔ کتاب النکاح) لـه

بالغ اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ بالغ اولاد کے اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے یا وہ اپنے اخراجات کی خود ذمہ دار ہوتی ہے؟

الجواب:۔ اولاد جب تک نابالغ ہو تو اس کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر والد فقیر ہو تو پھر بھی اس کو اپنی ذمہ داری نبھانا ضروری ہے، البتہ جب بچے بالغ ہو جائیں تو ان کی ذمہ داری والد سے اٹھ جاتی ہے لیکن بچیوں کا خرچہ ان کی شادی ہونے تک والد ہی برداشت کرے گا۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: وقید بالعجز عن الکسب وھو بالانوثة مطلقاً۔۔۔ فلا یعتبر فی الانثیٰ الا الفقر۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۱ باب النفقة .....) لـه ۲

عدّت کے دوران بیوہ کے اخراجات کا حکم

سوال:۔ خاوند کی وفات کے بعد اس کی بیوہ کے عدت کے دوران اخراجات کون برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ کسی شخص کی وفات سے اس کے ترکہ میں جملہ شرعی ورثاء کے حقوق ثابت ہو جاتے ہیں، اسی طرح خاوند کی وفات کے بعد اس کے ترکہ میں ثمن (آٹھواں حصہ) یا ربع

لـه لما قال شیخ الاسلام برھان الدین المرغینانیؒ: وعلی الرجل الموسران ینفق علی ابویه واجداده وجداته اذا کانوا فقراء وان خالفوه فی الدین۔
(الھدایة ج۲ ص۴۲۴ باب النفقة۔ کتاب النکاح)
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج ۱ ص۵۸۳ کتاب النکاح۔ الباب فی النفقة۔

لـه ۲ لما قال العلامة ابن ھمامؒ: والاولاد کبارًا ماناث ..... فللاناث علیه نفقتھن الیٰ ان یتزوجن اذا لم یکن لھن مالٌ۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۱۶ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۱ ص۵۸۳ کتاب النکاح۔ الباب فی النفقة۔

چوتھا حصہ ہے کے علاوہ اخراجات کے نام سے کچھ زائد لینے کی عورت مجاز نہیں اور نہ ہی دیگر ورثاء پر اس کے اخراجات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، عورت خاوند کے ترکہ سے اپنا حصہ لے کر عدت کے دوران گذارہ کرے گی، اگر اس سے اس کے اخراجات پورے نہ ہو سکتے ہوں اور محارم میں سے کوئی بھی اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر وہ ہاتھ کی کمائی سے گذارہ کرے گی۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (قوله لا للموت .....) ای لا تجب النفقة لمعتدة الموت۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۰۳ کتاب النکاح۔ باب النفقة) [1]

چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ پر واجب ہے

سوال:۔ ایک شخص کی بیوی کے بطن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان بچوں کا خرچہ باپ کے ذمہ ہوگا یا ماں کے؟

الجواب:۔ بچوں کا جب اپنا مال نہ ہو تو ان کا نفقہ باپ پر واجب ہے خواہ یہ بچے باپ کے گھر میں رہ رہے ہوں یا میاں بیوی میں جدائی کی صورت میں والدہ کے ساتھ رہائش پذیر ہوں۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: نفقة البنت البالغة یجب کالصغیرة وکل علیه اذا لم یکن للصغیر مال۔
(خلاصة الفتاوی ج۲ ص۶۳ کتاب النکاح۔ فصل فی النفقة) [2]

والدین کے گھر رہنے کی صورت میں نفقہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کی بیوی اس کی رضامندی سے اپنے والدین کے گھر رہتی ہو تو کیا شوہر کو اس کے

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولا نفقة للمتوفی عنها زوجها۔
(فتح القدیر ج۴ ص۲۱۴ باب النفقة)

[2] قال العلامة قاضیخانؒ: نفقة الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لا یشارکه فیها احد ولا یسقط بفقره۔ (الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۴۵ فصل فی النفقة)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۵۶۰ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے یا اس کے والدین کو؟

الجواب:۔ خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر جانا عورت کے لیے مرخص ہے اس لیے اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر رہے تو اس کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہوں گے، گویا عورت کے محض والدین کے گھر رہنے سے خاوند اخراجات کی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہوسکتا جب تک یہ عورت ناشزہ (نافرمان) نہ ہو۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: فتجب للزوجة علی زوجها (ولو هی فی بیت ابیها) اذا لم یطالبها الزوج بالنقلة به یفتی۔

(الدر المختار شرح تنویر الابصار ج۳ ص۵۷۵ باب النفقة)[1]

معذور اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ بچہ جب بالغ ہوجائے لیکن معذور یعنی نابینا ہو اور اپنے اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہو تو اس کا خرچہ باپ پر واجب ہے یا اس کے بالغ ہونے کے ساتھ ہی باپ کی ذمہ داری ساقط ہوجاتی ہے۔

الجواب:۔ اگر کسی کا بچہ معذور ہو تو بالغ ہوجانے کے باوجود اس کا نفقہ باپ سے ساقط نہیں ہوتا، جب تک والد زندہ ہو تو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ معذور بچے کے اخراجات پورے کرے ورنہ بصورتِ دیگر دوسرے ورثاء پر بقدر الارث یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمامؒ: والذکور اما عاجزون عن الکسب لزمانة وعمی اوشلل او ذهاب عقل فعلیه نفقتهم۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۱۷ باب النفقة)[2]

---

[1] قال العلامة قاضی خانؒ: الناشزة لا نفقة لها وهی التی خرجت عن منزل الزوج بغیر حق۔ (الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۲۶ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۴۴ باب النفقة۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: وحکم ولد الکبیر الزمن اوالانثی مطلقاً کالصغیر لما سیأتی۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۹۶ باب النفقة۔ کتاب النکاح)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۶۳ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

ناراضگی کے ایام کا نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں

سوال:۔ اگر کوئی عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال تک والدین کے ہاں رہے اور بعد میں عدالت میں ناراضگی کے ایام کے نفقہ کی دعویداری کردے تو کیا یہ عورت گذشتہ ایام کے نفقہ کی حقدار ہے یا نہیں جبکہ زیادتی شوہر کی طرف سے ہو؟

الجواب:۔ غلطی شوہر کی ہو یا بیوی کی اگر عورت ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی جائے تو ناراضگی کے زمانہ کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں تاہم اگر قاضی بیوی کے حق میں فیصلہ کرے کہ شوہر بیوی کو اتنا نفقہ سالانہ یا ماہانہ ادا کرے گا لیکن بعد القضاء بھی اگر خاوند نفقہ نہ دے تو اس صورت میں یعنی قضاء کے بعد والے ایام کا نفقہ خاوند کے ذمے واجب الاداء ہے جو قرض شمار ہوگا۔

لما قال العلامة قاضیخانؒ: لا تطالب بنفقة ما مضیٰ من الزمان قبل الفرض لانا عندنا لا تصیر النفقة دیناً الّا بالقضاء۔ (فتاویٰ الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۴۳۰ باب النفقة) [1]

نافرمان عورت کا خرچہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ اگر ایک عورت بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلی جائے اور بار بار بلانے کے باوجود خاوند کے گھر نہ آئے تو اس کا نفقہ خاوند کے ذمہ رہے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ عورت کا بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلے جانا اور بلانے کے باوجود نہ آنا نشوز کے حکم میں ہے، ایسی ناشزہ (نافرمان) عورت کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں، جب تک عورت نافرمانی ترک کر کے خاوند کے گھر نہ آجائے اس وقت تک وہ خاوند سے خرچہ کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

قال المرغینانیؒ: وان نشزت فلا نفقة لها حتیٰ تعود الیٰ منزله۔ (الهدایة ج۲ ص۴۱۶ باب النفقة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن همامؒ: واذا مضت مدة لم ینفق الزوج علیها وطالبه بذلك فلا شیء لها الا ان یکون القاضی فرضه لها النفقة۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۰۱ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۵۹۳ باب النفقة۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: لا نفقة لاحد عشر (وعدّ منها) وخارجة من بیته بغیر حق وهی الناشزة۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۶۴۲ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۴۵ الباب السابع عشر فی النفقات الفصل الاول فی نفقة الزوج۔

ناچاقی کے باوجود شوہر پر اہل وعیال کا خرچہ لازم ہے

سوال:۔ گھریلو ناچاقی کی وجہ سے زید نے اپنے اہل وعیال پر نفقہ بند کر دیا اب اس کی بیوی کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ شوہر کے ذمے اہل وعیال کا خرچہ شرعاً لازم ہے اگر وہ کسی وجہ سے خرچہ دینے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو اس کو بذریعہ جرگہ وغیرہ خرچہ دینے پر مجبور کیا جائے یا پھر وہ طلاق دے کر بیوی کو فارغ کر دے۔ بلا عذر شرعی اہل وعیال کا خرچہ بند کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة الحصکفی رحمة الله علیه: و یجب لو فات الامساك بالمعروف۔
(الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار جلد ۲ ص۵۷۲ کتاب الطلاق) [1]

نامرد شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے

سوال:۔ اگر شوہر عنین (نامرد) ہو اور وظیفہ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کی بیوی کا نفقہ کس کے ذمے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ یہ عورت اس شخص کے لیے محبوس ہے اس لیے کہ دونوں کا نکاح ہو چکا ہے تو بیوی کا خرچہ اس کے ذمے لازم ہے اگرچہ وہ وطی کرنے پر قادر نہ ہو۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: فتجب للزوجة بنکاح صحیح۔ الخ علیٰ زوجها لانها جزاء الاحتباس۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص۶۹۹ باب النفقه) [2]

---

[1] قال الامام ابوزهرةؒ: لقوله تعالیٰ: (ولا تمسکوهن ضراراً لتعتدوا) وقوله تعالیٰ: (فامساك بمعروف او تسریحٌ باحسانٍ) وان البقاء مع عدم الانفاق ضرارٌ۔ وامساك بغیر معروف، وکان حقاً علیه ان یطلق زوجته۔ ولما لم یقم بذلك وقد تعین علیه قام القاضی مقامه فیه۔ (الاحوال الشخصیة ص۳۴۹ باب اللعان۔ التفریق لعدم الانفاق)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج۱۱ ص۱۱۳ باب النفقة۔

[2] قال العلامة ابوبکر المرغینانی رحمه الله: النفقة واجبةٌ للزوجة علیٰ زوجها مسلمة کانت او کافرةً اذا اسلمت نفسها الیٰ منزله فعلیه نفقتها وکسوتها وسکناها الخ۔
(الهدایة ج۲ ص۴۱۳ کتاب الطلاق، باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۴ ص۱۵ کتاب النفقة۔

فاحشہ اور بدکردار بیوی کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کی بیوی بدچلن اور بدکردار ہو اور شوہر کے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی بدچلنی سے باز نہیں آتی ہو مگر رہتی شوہر کے ساتھ اسکے گھر میں ہو تو کیا ایسی عورت کا نفقہ بھی شوہر پر لازم ہوگا ؟

الجواب:۔ جو کوئی جس کی وجہ سے محبوس ہو اُس کا خرچہ بھی اُسی کے ذمے لازم ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں یہ عورت باوجود اپنی بدکرداری اور بدچلنی کے شوہر کے لیے محبوس ہے اس لیے شوہر پر اس کا نفقہ لازم ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: فتجب للزوجۃ بنکاح صحیح ...... علیٰ زوجھا لانھا جزاءُ الاحتباس ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج۲ ص۶۹۹ باب النفقۃ) [1]

خاوند سے ناراض ہو کر باپ کے گھر گذارے ہوئے سالوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ ایک عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال اپنے والدین کے گھر رہی، اب جرگہ (پنچایت) والے میاں بیوی کے درمیان فیصلہ (راضی نامہ) کرانا چاہتے ہیں لیکن عورت والدین کے گھر گذارے ہوئے سالوں کے خرچے کا مطالبہ کرتی ہے، کیا شرعاً شوہر کے ذمے ان گذشتہ سالوں کا خرچہ لازم ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ فقہی ذخائر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں ان سالوں کا خرچہ شوہر کے ذمے واجب نہیں اس لیے عورت مذکورہ کا یہ مطالبہ ناقابلِ قبول ہے تاہم اگر شوہر بخوشی یہ خرچہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ:۔ والنفقۃ لا تصیر دینا

---

[1] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: واما نفقۃ المرأۃ فمقابلۃ بالاحتباس وقد احتسبت بحق الزوج فکان لھا النفقۃ علی الزوج۔ (الخانیۃ علیٰ ہامش الھندیۃ ج۱ ص۴۲۵ باب النفقۃ)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۴۱۵ باب النفقۃ۔ ھکذا فی مجمع الانھر ج۲ ص۴۹۲ باب النفقۃ)

الا بالقضاء او الرضاء ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص۷۱۵ باب النفقۃ) لہ

چھوٹے بچے کا نفقہ باپ کے ذمے ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے جبکہ اس کا ایک چھوٹا بچہ ماں کے پاس ہے، تو کیا اُس بچے کا خرچہ باپ کے ذمے ہے یا نہیں؟ جبکہ بچے کا باپ خرچہ دینے سے انکار کرتا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے اگرچہ سات سال تک بچے کی پرورش کا حق عورت (ماں) کو دیا ہے، بصورتِ مسئولہ میں اس بچے کا خرچہ باپ کے ذمہ ہوگا، باپ حقِ حضانت کی وجہ سے بچے کے نفقہ سے بری نہیں ہوگا اور اس کا انکار درست نہیں ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ وتجب النفقۃ بانواعھا علی الحر لطفلہ یعم الانثیٰ والجمع ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص۷۲۸ باب النفقۃ) ۲ہ

زچہ بچہ کا خرچہ شوہر کے ذمے ہے

سوال:۔ بچے کی ولادت کے وقت زچہ خانے میں عورت پر جو خرچہ ہو تو اسکی دائیگی شوہر کے ذمے لازم ہے یا عورت کے والدین کے ذمے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً یہ بچہ شوہر کا ہے لہٰذا اس کی پیدائش پر جو خرچہ ہوگا وہ بھی اسی کے ذمے لازم ہوگا۔

قال المرغینانیؒ: ونفقۃ الاولاد الصغار علی الاب لایشارکہ فیھا احد کما لایشارکہ فی نفقۃ الزوجۃ ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص۴۴۰ باب النفقۃ) ۳ہ

لہ قال المرغینانیؒ: واذا مضت مدۃ لم ینفق الزوج علیھا وطالبتہ بذلک فلاشئ لھا الا ان یکون القاضی فرض لھا النفقۃ او صالحت الزوج علی مقدار نفقتھا فیقضی لھا بنفقۃ ما مضیٰ ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص۴۳۲ باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی مجمع الانھر باب النفقۃ ج ۲ ص۴۹۹ باب النفقۃ ۔

۲ہ قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ: نفقۂ صغیرہ بذمہ پدر است حسب عرف نفقہ از پدر گرفتہ شود و تا ہفت سال نزد حاضنہ اُمّ یا اُمّ الاُمّ یا غیر او شاں بماند ۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۱۱ ص۱۱۸ باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج ۲ ص۱۵۸ باب النفقۃ ۔

۳ہ قال العلامۃ قاضیخانؒ: نفقۃ الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لایشارکہ فی ذلک احد ۔

(فتاویٰ الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۴۴۵ فصل فی نفقۃ الاولاد)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۵۶۰ الفصل الرابع فی نفقۃ الاولاد ۔

نادار والدین کا نفقہ اولاد پر لازمی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں بوڑھا اور نادار شخص ہوں جبکہ میرے دو بیٹے صاحب ثروت (مالدار) ہیں، کیا میرا نان ونفقہ ان کے ذمّے ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ماں باپ جب محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گذارنے کے لیے کوئی ذریعہ آمدن نہ ہو تو ان کا نان ونفقہ اولاد پر لازم ہے، اگر اولاد ادا نہ کرتی ہو تو گنہگار ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وتجب علی موسرٍ الخ النفقة لاصوله الفقراء۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ۲ ص۷۳۶ باب النفقة) ؎۱

باپ کی وفات کے بعد بچّے کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی بچے کا باپ فوت ہو جائے اور وہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس بچے کا خرچہ ماں کے ذمّے ہے یا کسی اور کے؟

الجواب: جس بچے کی حالتِ صغر میں اس کا باپ فوت ہو جائے اور وہ بچہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کا جملہ خرچہ اس کی ماں کے ذمّے لازم ہوگا۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: وھی اولیٰ بالتحمل من سائر الاقارب۔

(رد المحتار ج۲ ص۹۲۲ باب النفقة) ؎۲

؎۱ قال العلامة برھان الدین المرغینانی رحمه الله: وعلی الرجل ان ینفق علی ابویه واجداده وجداته اذا کانوا فقراء وان خالفوه فی دینه۔

(الھدایة ج ۲ ص۴۲۴ باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی معین القضاة والمفتین ص۸۵ مادة ۴۹۵ الفصل الثالث عشر فی احکام النفقة۔

؎۲ وفی الھندیة: الامّ اولیٰ بالتحمل من سائر الاقارب حتیٰ لو کان الاب معسرًا والامّ موسرة وللصغیر جد موسر تؤمر الاُمّ بالانفاق من مال نفسها۔ (الفتاوی الھندیة ج ۱ ص۵۶۲ باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ الخانیة علی ہامش الھندیة ج ۱ ص۴۲۷ باب النفقة۔ کتاب الطلاق۔

کتاب الأیمان والنذر

(قسم اور نذر کے احکام ومسائل)

یمینِ منعقدہ کا حکم

سوال:۔ ایک لڑکی کے والد نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا۔ اب فریقین کی آپس میں صلح ہوگئی ہے البتہ قسم کا معاملہ باقی ہے، اب اگر یہ آدمی (لڑکی کا والد) اُس شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی دیدے تو اُس پر کیا لازم آئے گا؟

الجواب:۔ اگر لڑکی کے والد نے یوں قسم کھائی ہو کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا تو عقدِ نکاح کر دینے سے حانث ہو گا جس کے بدلے میں کفارہ لازم آئے گا، تاہم اگر لڑکی بالغ ہو تو وہ والد کے کسی دخل کے بغیر اس شخص سے نکاح کر سکتی ہے اور اس سے اُس کا والد حانث نہیں ہو گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (و) ثالثها (منعقدة وهي حلفه علىٰ مستقبل (آت) الخ...(و) هذا القسم (فی الکفارة) الخ... فقط الخ..... ان حنث ۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۵۲ کتاب الایمان)[1]

حلال اشیاء کو اپنے اوپر حرام کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں کام نہ کیا تو تمام حلال چیزیں مجھ پر حرام ہوں گی، تو اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا اس سے قسم منعقد ہو گی یا نہیں؟ اگر منعقد ہو گی تو اس کا کفارہ کس وقت ادا کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں یہ شخص موت سے قبل وہ جائز کام کرے تو حنث سے بچ جائے گا، تاہم اگر پوری زندگی معہودہ جائز کام کرنے سے یہ شخص قاصر رہے تو زندگی کی آخری گھڑیوں میں حانث متصور ہو گا جس کی وجہ سے اس کے ورثاء پر کفارہ ادا کرنا ہو گا۔ تمام

---

[1] قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: وعلیٰ آت منعقد وفيه الکفارة فقط ۔ (کنز الدقائق ص۱۶۲ کتاب الایمان) ومثلهُ فی الهندية ج ۲ ص۵۲ کتاب الایمان ۔ الباب الاول ۔

حلال چیزوں کے عموم کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی بھی اس وقت طلاقِ بائن سے جدا ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (کل حل) او حلال اللہ او حلال المسلمین (علیّ حرام) زاد الکمال او الحرام یلزمنی ونحوہ (فھو علی الطعام والشراب) ولکن (الفتوٰی فی زماننا (علیٰ انہ تبین امرأتہ الخ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۳ ص۶۵ کتاب الایمان)[1]

اگر فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں یمین ہے یا نہیں؟

سوال:۔ایک شخص نے یوں قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو کافر ہوں گا۔اب اگر وہ اس کام کو کرے تو اس کے عقیدے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔اگر یہ شخص بے علم ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ایسی قسم سے حانث کافر ہو جاتا ہے تو یہ حنث کی صورت میں کافر ہو جائے گا، بصورتِ دیگر کافر تو نہ ہوگا بلکہ حانث ہو کر کفارہ لازم آئے گا۔

لما فی الھندیۃ: ولو قال ان فعل کذا فھو یھودی او نصرانی او مجوسی او بریٔ من الاسلام او کافر او یعبد من دون اللہ او یعبد الصلیب او نحو ذٰلک مما یکون اعتقاد کفر فھو یمین استحسانًا کذا فی البدائع فی لو فعل ذٰلک الفعل یلزمہ الکفارۃ وھل یصیر کافرًا اختلف المشائخ فیہ قال شمس الائمۃ السرخسیؒ والمختار للفتوٰی انہ کان عندہ انہ یکفر متی اتی بھٰذا الشرط ومع ھٰذا اتی یصیر کافرًا لرضاء بالکفر وکفارتہ أن یقول لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وان عندہ انہ اذا اتی بھٰذا الشرط لا یصیر کافرًا لا یکفر وھٰذا اذا حلف بھٰذا الالفاظ علیٰ أمرٍ فی المستقبل وأما اذا حلف بھٰذا الفاظ علی أمر فی الماضی بان قال ھو یھودی أو نصرانی أو مجوسی ان فعل کذا أمس وھو یعلم انہ قد کان فعل أنہ

---

[1] قال العلامۃ ابوالبرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود النسفیؒ: کل حل علیّ حرام علی الطعام والشراب والفتوٰی علیٰ انہ تبین امرأتہ بلا نیۃ۔ (کنز الدقائق ص۱۶۶ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۵۵،۵۶ کتاب الایمان۔ الباب الثانی۔ الفصل الاول۔

لا یلزمہ الکفارۃ عندنا لانہ یمین غموس وھل یصیر کافراً اختلف المشائخ فیہ قال شمس الائمۃ السرخسیؒ والمختار للفتوٰی انہٗ کان عندہٗ اَنَّ ھٰذا یمین ولا یکفر متی حلف بہٖ لا یکفر وان عندہٗ انہ یکفر متی حلف بہ یکفر رضاءہ بالکفر۔ (الفتاوٰی الہندیۃ ج ۲ ص۵۴ کتاب الایمان، الباب الثانی) لہ

قرآن مجید کی قسم کھانے کا حکم

سوال:- قرآن پاک کی قسم کھانا کیسا ہے؟ کیا اس سے قسم ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ قسم کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اس لیے متأخرین اربابِ فتوٰی نے عرف کی بناء پر قرآنِ کریم کی قسم کھانے کو الفاظِ یمین سے شمار کیا ہے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللّٰہ: قال الکمالؒ ولا یخفٰی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینًا واما الحلف بکلام اللّٰہ فیدور مع العرف۔ وقال العینیؒ وعندی أن المصحف یمین لا سیما فی زماننا وعند الثلاثۃ المصحف والقرآن وکلام اللّٰہ یمین۔ (الدر المختار علٰی ہامش رد المحتار ج ۲ ص۵۱، ۵۲ کتاب الایمان) ؎۲

لہ قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللّٰہ: (و) القسم بقولہ (ان فعل کذا فھو) یہودی اونصرانی (او فاشھدوا علیّ بالنصرانیۃ اوشریک الکفار) او (کافر) فیکفر بحنثہ لوفی المستقبل اَمَّا الماضی عالمًا بخلافہ فغموس واختلف فی کفرہ (و) الاصح ان الحالف (لم یکفر) سواء (علقہ بماضٍ اَو اٰتٍ ان کان عندہٗ) فی اعتقادہٖ انہٗ (یمین وان) جاھلا و عندہٗ انہ یکفر فی الحلف بالغموس وبمباشرۃ الشرط فی المستقبل (یکفر فیھا لرضاءہٖ بالکفر)۔ (الدر المختار علٰی ہامش ردالمحتار ج ۳ ص۵۹ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج ۳ ص۱۲ کتاب الایمان۔ الفصل الثانی۔

؎۲ قال العلامۃ زین الدین ابن نجیم المصریؒ: وفی فتح القدیر ثم لا یخفٰی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینًا کما ھو قول الائمۃ الثلاثۃ

(البحر الرائق ج ۴ ص۲۸۶ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص۵۳ کتاب الایمان، الباب الثانی، الفصل الاول۔

ہزار روزے رکھنے کی قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ایک شخص نے کہا کہ میں کسی کی غیبت نہیں کروں گا اور اگر کی تو قسم ہے میں ایک ہزار روزے رکھوں گا، بعد ازاں اس شخص نے کسی کی غیبت کی تو اب اس پر پورے ہزار روزے رکھنا لازم ہیں یا کفارۂ قسم؟

الجواب:۔یہ شخص کفارۂ یمین (یعنی تین روزے رکھنے) سے فارغ الذمہ ہوسکتا ہے۔

لما فی الهندیة: وان علق بشرط لا یرید کدخول الدار ونحوه یتخیر بین الکفارة وبین عین ما التزمه۔وروی ان اباحنیفةؒ الی التخییر ایضاً وبهذا یفتی اسماعیل الزاهد قال رضی الله عنه هو اختیاری ایضاً کذا فی المبسوط۔
(الفتاوی الهندیہ ج۲ ص۶۵ کتاب الایمان، الفصل الثانی فی الکفارہ)[1]

فلاں مسجد میں نماز پڑھاؤں تو کافر ہوں گا

سوال:۔ایک شخص نے کہا کہ اگر میں فلاں مسجد میں نماز پڑھا دوں تو کافر ہوں گا، پھر اُس نے اس مسجد میں نماز پڑھا دی، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔یہ شخص اس مسجد میں نماز پڑھانے کے بعد حانث ہوکر کفارہ ادا کرے گا لیکن کافر نہ ہوگا۔

لما فی الهندیة: ولو قال ان فعل کذا فهو یهودی أو نصرانی أو مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون الله او یعبد الصلیب أو نحو ذلك مما یکون اعتقاده کفر فهو یمین استحساناً کذا فی البدائع حتی لو

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ان فعلت کذا فعلیّ حجة أو صوم سنة او صدقة ما أملکه أجزاه من ذلك کفارة یمین وهو قول محمدؒ و یخرج عن العهدة بالوفاء بما سمی ایضاً اذا کان شرطاً لا یرید کونه لان فیه معنی الیمین وهو المنع وهو بظاهره نذر فیتخیر ویمیل الی ای الجهتین شاء۔ (البحرالرائق ج۴ ص۲۹۵ کتاب الایمان)
ومثلهٗ فی الهدایة ج۲ ص۵۲ کتاب الایمان، الفصل الثانی۔

فعل ذٰلك الفعل يلزمه الكفارة وهل يصير كافرًا اختلف المشائخ فيه - قال شمس الائمة السرخسيؒ والمختار للفتوٰی انه ان كان عندهٗ انهٗ يكفر متی اَتی بهٰذا الشرط ومع هٰذا اتی يصير كافرالرضاءه بالكفر وكفارته اَن يقول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وان كان عندهٗ انهٗ اذا اَتی بهٰذا الشرط لايصير كافرًا لا يكفر الخ - (الفتاوٰی الهندية ج ۲ ص۵۴ الباب الثانی فيما يكون يمينًا وَمَا لَا يكون يمينًا) ـــــلہ

اگر عمر سے بات کروں تو ماں سے زنا کروں، قسم نہیں

سوال:- زید نے کہا اگر میں نے عمر سے بات کی تو یہ ایسا ہے کہ میں نے اپنی ماں سے زنا کیا، اب زید کو عُمر سے باتیں کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تو باتیں کرنے کی صورت میں زید پر کچھ لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مذکورہ میں زید عمر سے باتیں کرسکتا ہے اور اس میں کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ یہ قسم نہیں، مزید برآں یہ الفاظ موجبِ ظہار بھی نہیں لعدم التشبیہ اور نہ موجبِ ایلاء ہے لعدم ارادة زوجته۔

لما فی الهندية :لوقال ان فعلت كذا فان زانٍ اَو سارقٌ اَو شارب خمرٍ اَو اكل ربٰو فليس بحالف كذا فی الكافی - (الفتاوٰی الهندية ج۲ ص۵۵ الباب الثانی فيما يكون يمينًا وما لا يكون يمينًا. الفصل الاول) ـــــ۲ـــہ

ـــــلہ قال العلامة الحصكفیؒ :(و) القسم بقوله (ان فعل كذا فهو يهودی او نصرانی اَو فاشهدوا علیّ بالنصرانية او شريك الكفار او (كافر) فيكفر بحنثه لو فی المستقبل اَمّا الماضی عالمًا بخلافه فغموس واختلف فی كفره (و) الاصح اَنَّ الحالف (لم يكفر) سواء (علقه بماضٍ اَو آتٍ ان كان عندهٗ) فی اعتقاده انهٗ (يمين وان) جاهلاً و (عنده انهٗ يكفر فی الحلف) بالغموس وبمباشرة الشرط فی المستقبل (يكفر فيهما الرضاه بالكفر) - (الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج ۳ ص۵۵ كتاب الايمان)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج ۲ ص۱۲۷ كتاب الايمان الجنس الاوّل)

ـــــ۲ـــہ قال العلامة الحصكفی رحمه اللّٰه :(والا ان) فعله غضبه الخ اُو هو زانٍ اَو سارقٌ اَو شارب خمرٍ او اكل ربا لا) يكون قسمًا لعدم التعارف فلو تعورف هل يكون يمينا ظاهر كلامهم نعم وظاهر كلام الكمال لا وتمام فی

(الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج ۳ ص۶۲ كتاب الايمان)
وَمِثْلُهٗ فی كنز الدقائق ص۱۵۵ كتاب الايمان۔

بھائی کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی قسم کھانا

سوال:- ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں آج کے بعد اپنے حقیقی بھائی کے ساتھ تعلقات نہیں رکھوں گا، اب وہ والدہ کے ناراض ہونے کی صورت میں بھائی سے تعلقات بحال کرنا چاہتا ہے، اور اگر وہ قسم توڑ دے تو شرعاً اس کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:- ایسی قسم کا توڑ دینا واجب ہے، یہ شخص بھی قسم توڑ کر کفارہ دیدے ورنہ گنہگار ہوگا۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: ومن حلف على معصية كعدم الكلام مع ابويه اوقتل فلان اليوم وجب الحنث والتكفير۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۶۲ مطلب كفارة اليمين)[1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی نہ ہونے کی قسم کھانا

سوال:- ایک شخص نے یوں کہا کہ اگر میں نے فلاں کپڑے پہن لیے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی نہیں ہوں گا، بعد میں اُس شخص نے وہ کپڑے پہن لیے، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- یہ الفاظ یمین میں سے ہیں لہٰذا حنث کی صورت میں یہ شخص کفارہ ادا کرے گا تاہم حانث ہونے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصكفيؒ: تعليق الكفر بالشرط يمين وسيجيئ بانه ان اعتقد الكفر به يكفر والا يكفر (اى تلزمه الكفارة)۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۵۲ مطلب فى القرآن انما الخلق بكلام الله)[2]

---

[1] قال العلامة عبيد الله بن مسعود بن تاج الشريعةؒ: ومن حلف على معصية كعدم الكلام مع ابويه حنث وكفر۔ (شرح الوقاية ج ۲ ص ۱۳۹ كتاب الايمان)
وَمثلهٗ فى مختصر القدورى ص ۲۰۲ كتاب الايمان۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وفى قوله هو يهودى ان فعل كذا وحنث لزمته الكفارة وهل اختلف المشائخ فيه قال الشيخ الامام شمس الائمة ان اعتقد يمينا يكون يمينا واعتقده كفرا يكون كفرا على ما ياتى فى الفاظ الكفر۔ (خلاصة الفتاوى ج ۲ ص ۱۴۰ كتاب الايمان)
وَمثلهٗ فى الهندية ج ۲ ص ۵۴ الباب الاول، الفصل الثانى۔

کلمۂ توحید پڑھنے سے قسم کے انعقاد کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ کسی بات کا یقین دلانے اور مخاطب کو مطمئن کرنے کے لیے کلمہ توحید پڑھ کر بات کرتے ہیں، عرف میں اس فعل کو قسم سمجھا جاتا ہے، کیا صرف کلمہ پڑھنے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ قسم کے انعقاد کا حکم نیت اور ارادہ پر ہے جس کے انعقاد میں عرف کا کافی عمل دخل پایا جاتا ہے۔ کلمہ پڑھنا اگرچہ بذاتِ خود قسم نہیں لیکن جہاں عرف کی موجودگی میں کلمہ پڑھنا قسم کی نیت سے ہو تو اس سے قسم واقع ہو جائے گی۔

لما فی الهندية: ولو قال لا اله الا الله لا فعلن كذا لا يكون فليس بيمين الا أن ينوی يمينًا وكذالك سبحان الله والله اكبر لا فعلن كذا فی سراج الوهاج۔ (الفتاوی الهندية ج۲ ص۵۵ الباب الثانی الفصل الاول)[1]

آسمانی کتابوں سے بری ہونے کی قسم کھانا

سوال:۔ زید نے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں چار آسمانی کتابوں سے بری ہوں گا، اس کے بعد اس نے وہ کام کر لیا، تو اب اس صورت میں وہ حانث ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ الفاظ قسم کے ہیں اس لیے حنث کی صورت میں اس شخص پر قسم کا کفارہ واجب ہے۔

قال العلامة ابو الليث السمرقندیؒ: ولو قال ان افعل كذا فانا بریٔ من الكتب الاربعة فان حنث فعليه كفارة واحدة۔ (الفتاوی النوازل ص۱۶۳)[2]

---

[1] قال الشيخ طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: وفی التجريد عن محمد لو قال لا اله الا الله افعل كذا او سبحان الله ليس بيمين الا ان ينوی۔

(خلاصة الفتاوی ج۲ ص۱۲۶ كتاب الايمان۔ الجنس الاول)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۳ ص۵۲ كتاب الايمان۔

[2] وفی الهندية: ولو قال ان فعلت كذا فانا بریٔ من الكتب الاربعة فهو يمين واحدة

(الفتاوی الهندية ج۲ ص۵۴ الباب الثانی۔ الفصل الاول)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۲۸۵ كتاب الايمان۔

کسی دینی مصلحت کے لیے قسم توڑنا

سوال:۔ اگر قسم کھانے کے بعد انسان کو یہ احساس ہو کہ قسم کھاتے وقت میں نے بے احتیاطی سے کام لیا ہے، تو کیا ایسی حالت میں قسم کا پورا کرنا ضروری ہے یا حانث ہوکر کفارہ دینا مناسب ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائے اور بعد ازاں اس کام کی مخالفت میں کوئی دینی مصلحت سامنے آئے تو اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کی مخالفت کرکے کفارہ ادا کرے۔

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما علی الارض یمین احلف علیہا فاریٰ غیرہا خیرًا منہا الا اتیتہ۔ (سنن النسائی ج۲ ص۱۴۳ باب من حلف علی یمین فرأی غیرہا خیرًا۔) لہ

کفاراتِ یمین میں تداخل کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے متعدد بار قسمیں کھاکر ہر دفعہ قسم پوری نہ کرسکنے کی وجہ سے حانث ہوتا رہا، اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے تو کیا اس شخص کے لیے تمام قسموں کا ایک ہی کفارہ کافی ہوگا یا متعدد کفارہ جات کی ادائیگی ضروری ہوگی؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق احتیاط اسی میں ہے کہ متعدد کفارات ادا کئے جائیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: تتعدد الکفارۃ لتعدد الیمین۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۳ ص۵۲)

ہاں اگر پہلے کفارہ ادا نہیں کیا تو امام محمدؒ کے نزدیک ایک کفارہ بھی کافی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ، وفی البغیۃ کفارات الأیمان اذا کثرت تداخلت ویخرج بالکفارۃ الواحدۃ عن عہدۃ الجمیع۔ وقال شہاب الائمۃ

لہ قال الامام الحافظ المجتہد ابوعبداللہ محمد بن الحسن الشیبانیؒ: وقد بلغنا عن النبیؐ انہٗ قال من حلف علی یمین فرأی غیرہا خیرًا منہا فلیأت الذی ہو خیر ولیکفر عن یمینہ۔ (کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج۳ ص۱۹ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی الہدایۃ ج۲ ص۴۸۳ کتاب الایمان۔

هٰذا قول محمّد قال صاحب الاصل هوالمختار عندی ام مقدسی۔ ومثلہ فی القهستانی عن المنیۃ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۵۲ کتاب الایمان) [1]

کفارۂ قسم ادا کرنے کا طریقہ

سوال:۔ اگر کوئی شخص قسم توڑ دے تو اس پر کتنا کفارہ لازم ہوگا؟

الجواب:۔ قسم کا کفّارہ ایک غلام کو آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو پوشاک دینا جو بدن کے اکثر حصہ کو ڈھانپ لے، البتہ اگر کوئی مالی کفّارہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو پھر تین روزے رکھنے سے وہ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو سکے گا۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ: فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۸۹) [2]

کھانا کھلانے میں تسلسل کا حکم

سوال:۔ جس طرح روزہ کے کفارہ میں مساکین کو کھانا کھلانے میں تسلسل کا ضروری ہے اسی طرح قسم کے کفارہ میں بھی تسلسل کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ کبھی ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلایا اور پھر ناغہ کر دیا پھر کبھی ایک دو مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلا دیا، اسی طرح مختلف اوقات میں

---

[1] وفی الهندیۃ: اذا حلف الرجل علی امر لا یفعله ابدًا ثم حلف فی ذٰلك المجلس او مجلس اٰخر لا افعله ابدا ثم فعله کانت علیه کفارۃ یمینین وهٰذا اذا نوی یمینًا اخریٰ او نوی التغلیظ او لم یکن له نیۃ، واذا نوی بالکلام الثانی الیمین الاولیٰ علیه کفارۃ واحدۃ۔

(الفتاویٰ الهندیۃ ج ۲ ص ۵۲ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج ۳ ص ۲۲۸،۲۳۰ کتاب الایمان۔

[2] قال ابوالبرکات النسفیؒ: وکفارته تحریر رقبة او اطعام عشرۃ مساکین کهما فی الظهار او کسوتهم بما یستر عامة البدن فان عجز عن احدها صام ثلٰثة ایام متتابعات

(کنز الدقائق ص ۱۶۵،۱۶۶ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۷۱ کتاب الایمان۔

حساب پورا کر دینے سے کفارہ ادا ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: قسم کے کفارہ میں اگر دس دن مسلسل کھانا نہیں کھلایا جا سکا بلکہ بیچ میں کچھ ناغے ہو گئے تو کچھ حرج نہیں صرف شمار اور تعداد پوری کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة قاضیخانؒ: وفی کفارة یمین یعتبر العدد۔ (فتاویٰ قاضیخان ج۲ ص۲۸۶) [1]

کفارہ کے روزوں میں تسلسل ضروری ہے

سوال: حانث ہونے کی صورت میں کفارہ کے روزے رکھنے میں تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب: قسم کے کفارہ میں رکھے جانے والے روزوں میں تسلسل ضروری ہے اگر کسی وجہ سے درمیان میں ناغہ ہو جائے تو از سر نو روزے رکھنے ہوں گے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: فان لم یقدر علی احد الاشیاء الثلاثة صیام ثلاثة ایام متتابعات۔ وقال الشافعیؒ: یخیر لاطلاق النص ولنا قراءة ابن مسعود رضی اللہ عنہما فصیام ثلاثة ایام متتابعات وھی کالخبر المشھور۔ (الہدایہ ج۲ ص۴۶۰ فصل فی کفارة الیمین) [2]

کفارۂ یمین ایک شخص کو دینے کا حکم

سوال: کفارۂ یمین (قسم) کی ادائیگی میں اگر دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کی صورت پیش ہو تو کیا یہ تمام فدیہ کسی ایک مسکین کو بطور ملکیت دیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟ یا دس مسکینوں کو ہی دینا ضروری ہے ؟

الجواب: کفارۂ یمین کا فدیہ کسی ایک مسکین کو ایک ہی دن میں یکمشت دینا اگرچہ بعض

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ولو عشاھم فی رمضان عشرین لیلة اجزاہ الخ۔ (رد المحتار ج ۳ ص۵۳ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج۲ ص۱۲۵ جنس اٰخر فی کفارة الیمین۔

[2] قال الشیخ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفیہ ایضاً کفارة المعسر صیام ثلاثة ایام متتابعات ولو حاضت المرأة فی الثلاث استقبلت بخلاف کفارة صیام رمضان۔

(خلاصة الفتاویٰ ج۲ ص۱۲۵ کتاب الایمان، کفارة الیمین)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج۲ ص۶۱ کتاب الایمان، الفصل الثانی۔

اقوال کی رُو سے فراغتِ ذمہ کے لیے کافی ہے لیکن صحیح رائے کے مطابق ایسا کرنا درست نہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس میں تعدد کی رعایت ہو اور فدیہ دس مسکینوں کو علیحدہ علیحدہ دیا جائے۔

وفی الھندیۃ: ولو اعطی مسکیناً واحداً عشرۃ اثواب فی مرۃ واحدۃ لم یجزہ کما فی الطعام وان اعطاہ فی کل یوم ثوبا حتی استکمل عشرۃ اثواب فی عشرۃ ایام اجزاہ کما فی الطعام۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۶۲ کتاب الایمان، الفصل الثانی)[۱]

ناذر کا نذر سے کچھ کھانے کا حکم

سوال:۔ اگر نذر ماننے والا شخص بہت زیادہ غریب ہو تو وہ اپنی نذر میں سے کچھ کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نذر شدہ چیز واجب التصدق ہوتی ہے اس کا مصرف صرف فقراء اور مساکین ہیں اس لیے نذر سے نہ تو اغنیاء کو کچھ کھلایا جا سکتا ہے اور نہ ناذر خود کھا سکتا ہے اگرچہ نذر ماننے والا فقیر ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ نذر غربت سے متاثر نہیں ہوتی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو ترک التضحیۃ ومضت ایامھا تصدق بھا حیۃ ناذر فاعل تصدق (لمعینۃ) ولو فقیرا ولو ذبحھا تصدق بلحمھا ولو نقصھا تصدق بقیمۃ النقصان ایضا ولا یاکل الناذر منھا فان اکل تصدق بقیمۃ ما اکل۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۲۰۳،۲۰۴ کتاب الاضحیۃ)[۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ای تحقیقاً او تقدیراً حتی لو اعطی مسکینا واحداً فی عشرۃ ایام کل یوم نصف صاع یجوز ولو اعطاہ فی یوم واحد بدفعات فی عشر ساعات قیل یجزی وقیل لا هو الصحیح۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۷۶ کتاب الایمان، مطلب کفارۃ الیمین)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی قاضیخان ج۲ ص۲۸ کتاب الایمان۔

[۲] قال الشیخ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: لا یاکل الناذر منھا ولو اکل منھا فعلیہ قیمتھا۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۲ کتاب الاضحیۃ، الفصل الرابع فیما یجوز من الاضحیۃ وفیما لا یجوز)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۶۸ کتاب التضحیۃ، فصل واما کیفیۃ الوجوب فانواع۔

نذر مانی ہوئی چیز کی قیمت ادا کرنے کا حکم

سوال :- ایک شخص نے یوں نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں گائے یا بھینس ذبح کر کے اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کروں گا، کام ہو جانے پر اب نذر ماننے والا گائے یا بھینس کا گوشت فقراء میں تقسیم کرنے کی بجائے اس کی قیمت دینا چاہتا ہے تو کیا ایسا کرنے سے نذر ادا ہو جائے گی یا عینِ منذور چیز ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب :- صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی میں بنیادی فلسفہ فقراء اور غرباء کی ضروریات کی تکمیل اور انکی حاجت برآری ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا سے کیا ہے، اس لیے ناذر کو اختیار ہے کہ عینِ منذور ادا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔

قال العلامة الحصکفیؒ : نذر ان یتصدق بعشرة دراھم من الخبز فتصدق بغیرہ جاز ان ساوی العشرة کتصدقه بثمنه - (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۷۱ مطلب فی احکام النذر - النذر غیر المعلق لایختص بزمان ومکان ودرھم وفقیر)[1]

نذر کی پیشگی ادائیگی کرنا

سوال :- ایک شخص نے کہا کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فلاں چیز اللہ کے نام پر دوں گا، اب اگر وہ کام ہو جانے سے پہلے ہی نذر دے دے تو کیا اس سے نذر ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ یا کام ہو جانے کے بعد نذر پوری کرنا ضروری ہے؟

الجواب :- نذر کا وجوب جب کسی کام کے ساتھ مشروط ہو جائے تو شرط کی موجودگی سے پہلے مشروط واجب نہیں ہوتا اور نہ اس کی ادائیگی درست ہے اس لیے کام ہونے سے پہلے نذر دینے سے فارغ الذمہ نہیں ہوسکتا بلکہ کام ہو جانے کے بعد دوبارہ نذر پوری کرنا ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : بخلاف النذر المعلق فانه لایجوز

---

[1] وفی الھندیة : ویجوز دفع القیم فی الزکوٰة عندنا وکذا فی الکفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر کذا فی الھدایة - (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۸۱ الباب الثالث فی زکوٰة الذھب والفضة والعروض ، الفصل الثانی فی العروض)

ومثلهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۴۳ کتاب الزکوٰة - الفصل الثامن فی اداء الزکوٰة۔

تعجیلہ قبل وجود الشرط۔ (الرد المحتار ج۳ صـ مطلب فی احکام النذر ، النذر غیر المعلق لا یختص بزمان ومکان ودرھم)[1]

نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص چند روزے رکھنے کی نذر مانے تو کیا ان میں تسلسل ضروری ہے یا جب چاہے مختلف اوقات میں رکھ کر پورے کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر پے در پے روزوں کی نیت نہیں کی ہو تو نذر کے روزے رکھنے میں تسلسل ضروری نہیں ورنہ تسلسل کا خیال رکھنا لازمی ہے ۔

وفی الھندیۃ : ولو قال للہ علیّ ان اصوم شھراً متتابعاً لزمہ التتابع وان اطلق لیخیر۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ صـ۲۱۱ کتاب الصوم ،الباب السادس فی النذر)[2]

نذر کی ہوئی گائے کے منافع کا حکم

سوال:۔ ایک گائے جو کہ اللہ کیلئے نذر کی گئی ہو اگر اس گائے کے بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ بچہ ناذر کا ہوگا یا اس کو بھی صدقہ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ جب کسی جانور کو نذر کیا جائے تو یہ حکم اس کے جملہ اجزاء کو شامل

---

[1] قال العلامۃ علاؤالدین الکاسانیؒ : وان کان معلقاً بشرط نحو ان یقول ان شفی اللہ مریض او ان قدم فلان الغائب فللہ علیّ ان اصوم شھراً او اصلی رکعتین اوتصدق بدرھم ونحو ذٰلک فوقتہ وقت الشرط فما لم یوجد الشرط لا یجب بالاجماع ولو فعل ذٰلک قبل وجود الشرط یکون نفلاً لأن المعلق بالشرط عدم قبل وجود الشرط ۔

(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ صـ۹۳ کتاب النذر ، فصل واما حکم النذر الخ

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۴ صـ۲۹۱ کتاب الایمان ۔

[2] قال العلامۃ فخرالدین حسن بن منصور بن محمود المعروف بقاضیخانؒ : لو قال للہ علیّ صوم مثل شھر رمضان قال ان اراد ومثلہٗ فی الوجوب فلہٗ ان یفرق وان اراد فی التتابع فعلیہ ان یتتابع وان لم یکن لہٗ نیۃ فلہ ان لصوم متفرقاً ۔

(الفتاوی قاضیخان ج ۱ صـ۲۰۵ کتاب الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۱ صـ۲۰۹ کتاب الصوم ۔ الباب السادس فی النذر ۔

ہوتا ہے بچہ بھی اس کا ایک جزو ہے اس لیے گائے کی طرح بچہ بھی واجب التصدق ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: و ت الاضحیۃ ولد قبل الذبح یذبح الولد معھا و عند بعضھم یتصدق بہ بلا ذبح۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۰۵ کتاب الضحیۃ) ؎۱

نذر کا دارومدار الفاظ پر ہے

سوال:- ایک شخص نے کہا کہ اگر مجھے فلاں چیز مل گئی تو اتنی رقم خیرات کروں گا جبکہ دل میں ارادہ یہ تھا کہ اگر وہ چیز صحیح ہو لیکن زبان پر یہ تعین نہیں ہوا، اب متعلقہ چیز ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو خراب ہے، تو کیا اس شخص پر اتنی ہی رقم خیرات کرنا واجب ہے یا مطلوبہ چیز میں نقص کی وجہ سے خیرات کی رقم میں کمی بیشی ہو سکتی ہے؟

الجواب:- نذر کی تکمیل کا تمام تر دارومدار الفاظ پر ہوتا ہے، نیت کا زیادہ دخل نہیں رہتا اس لیے جب الفاظ مطلق ہوں تو اس چیز کے ملنے پر مقررہ رقم خیرات کرنا واجب ہے اگر وہ چیز درست حالت میں نہ ہوں۔

قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ومن نذر نذراً مطلقاً او معلقاً بشرط وکان من جنسہ (واجب) فرض وھو عبادۃ مقصودۃ ووجد الشرط المعلق بہ لزم الناذر (کصوم وصلوٰۃ وصدقۃ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۶۶، ۶۷ کتاب الایمان) ؎۲

؎۱ قال الامام فخر الدین حسن بن منصور المعروف بقاضی خانؒ: ولو ولدت ولدا یکون ولدھا للاضحیۃ۔ (فتاوی قاضی خان علی ہامش الھندیۃ جلد ۳ ص ۳۴۷ کتاب الاضحیۃ۔ فصل فی صفۃ الاضحیۃ ووقت وجوبھا ومن تجب علیہ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص ۷۸، ۷۹ کتاب التضحیۃ فصل واما بیان مایستحب قبل التضحیۃ۔

؎۲ قال العلامۃ برھان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: وان علق النذر بشرط فوجد الشرط فعلیہ الوفاء بنفس النذر۔

(الھدایۃ ج ۲ ص ۴۶۳ کتاب الایمان۔ فصل فی الکفارۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج ۲ ص ۲۴ کتاب الایمان۔

معذور روزوں میں عدم تسلسل کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! مجھے کینسر کا مرض لاحق تھا، بیماری کے دنوں میں میں نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت عطا فرمائی تو میں دو ماہ روزے رکھوں گا۔ اب الحمد للہ میں صحتیاب ہوں اور روزے رکھنے کے قابل ہوں تو کیا میں دو ماہ مسلسل روزے رکھوں یا غیر مسلسل بھی رکھ سکتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ بیماری کی وجہ سے جسم میں کمزوری بھی بہت ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے جواب میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر تو آپ نے نذر مانتے وقت تتابع یعنی دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کی نیت کی ہو تو پھر دو ماہ مسلسل روزے رکھنے ہوں گے اور اگر یہ نیت نہ کی ہو تو شرعاً آپ کو اجازت ہے کہ غیر مسلسل روزے رکھیں یا مسلسل، غیر مسلسل کی صورت میں ساٹھ روزے پورے کرنے ہوں گے۔ باقی اگر کمزوری بہت زیادہ ہے تو مکمل صحتیابی تک انتظار بھی کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله : وكذا الحكم لو نكر السنة او شرط التتابع فيفطرها لكنه يقضيها هنا متتابعة ويعيد لو افطر يوماً بخلاف المعينة ولو لم يشترط التتابع يقضي خمسة وثلاثين۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار جلد ۲ ص ۴۳۴ كتاب الصوم، مطلب في الكلام على النذر)[1]

نابالغ بچے کی نذر کی شرعی حیثیت

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! میرے ایک بچے کی عمر دس سال ہے اور وہ پانچویں جماعت کا طالبعلم ہے جب اس کا سالانہ امتحان قریب آیا تو اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر میں امتحان میں

---

[1] لما قال العلامة مولانا اشرف علی التھانویؒ : فی الدر المختار قبیل بالاعتکاف، وکذا الحکم لو نکر السنة او شرط التتابع الیٰ قوله ولو لم یشترط التتابع یقضی خمسة وثلاثین اھ
اس روایت سے ثابت ہوا کہ اگر تتابع کی شرط نہیں تو تتابع واجب نہیں البتہ ایام منہیہ کے عوض روزے رکھنے پڑیں گے تاکہ ایک ماہ کی تکمیل ہو جاوے۔

(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۵۷، ص ۵۵۸ کتاب النذر)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۶۱ الفصل الرابع فی النذر۔

کامیاب ہوگیا تو چار روزے اور سو روپے اللہ کے نام نذر دوں گا۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ امتحان میں پاس ہونے کے بعد اس بچے کے لیے چار روزے اور سو روپے اللہ کے نام نذر دینا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نابالغ بچہ چونکہ غیر مکلف ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کی مانی ہوئی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر آپ کا بچہ پانچویں جماعت کے امتحان میں کامیاب بھی ہوجائے تو بھی اس کے ذمے چار روزے رکھنا اور سو روپے کی نذر دینا واجب نہیں۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: **سوال (۶۷۶)** طفل نابالغ جو عقل رکھتا ہے اس نے نذر معین یا غیر معین مانی، بعد حصول مقصود اس پر ادا کرنا اس نذر کا واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: واجب نہ ہوگا، اگر وہ نذر مالی ہے تو ادا کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔

(امداد الفتاوی ج۲ ص۵۵۷ کتاب النذر)

منذور چیز نہ ملنے پر اس کے قائم مقام کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی لیکن اس کے علاقہ میں اونٹ ملنا مشکل ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو اتنا مہنگا کہ اس کی قوتِ خرید سے باہر ہے، اب اس شخص کے لیے اونٹ ہی ذبح کرنا ضروری ہے یا کوئی اور جانور اس کے بدلہ میں ذبح کرسکتا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرماکر مشکور فرمائیں۔

الجواب:۔ اگر یہ شخص واقعی کسی ایسے علاقہ میں رہتا ہے جہاں اونٹ ملنا مشکل ہے تو اب اس کو اختیار ہے کہ یا تو سات بکریاں ذبح کرکے اپنی نذر پوری کرے یا پھر درمیانی قسم کے اونٹ کی قیمت صدقہ کردے، اس سے اس کی نذر پوری ہوجائے گی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو قال للہ علی ان اذبح جزورًا واتصدق بلحمہ فذبح مکانہ سبع شاۃ جاز۔ (الدر المختار بحوالہ امداد الفتاوی ج۲ ص۵۵۲ کتاب النذر)[1]

---

[1] لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: اس صورت میں اختیار ہے خواہ سات بکریاں ذبح کرکے مساکین کو خیرات کردیجیے یا متوسط درجہ کے اونٹ کی قیمت مساکین کو تقسیم کردیجیے۔ (امداد الفتاوی ج۲ ص۵۵۲ کتاب النذر)

نذر مطلق واجب علی التراخی ہے

سوال: ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں تین روزے رکھوں گا، لیکن اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ اب الحمد للہ اس شخص کا کام ہو گیا ہے، جبکہ موسم بہت گرم ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے روزے رکھنا بہت مشکل ہے۔ تو کیا یہ شخص سردی کے موسم میں یہ روزے رکھ سکتا ہے یا کام ہو جانے کے فوراً بعد گرم موسم میں ہی رکھنے ضروری ہیں؟

الجواب:۔ نذر مطلق جس کے لیے کوئی وقت مقرر نہ ہو اس کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے۔ اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق اس شخص کے لیے نذر روزوں کا رکھنا مرخص ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ کام ہو جانے کے فوراً بعد نذر کے روزے ادا کیے جائیں۔

لما فی الھندیة: لو قال للہ علی ان اصوم یوماً فانہ یلزمہ صوم یوم و تعیین الاداء الیہ وھو علی التراخی بالاجماع۔ (الفتاویٰ الھندیة ج ۱ ص۲۰۹ الباب السادس فی النذر)

درود شریف پڑھنے کی نذر ماننے کا حکم

سوال:۔ میں نے ایک کارخانے میں نوکری کے لیے درخواست دی تھی، اس کی منظوری کے لیے میں نے نذر مانی کہ نوکری ملنے کے بعد چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھوں گا، اب جبکہ میری درخواست منظور ہو گئی ہے اور اسی جگہ مجھے نوکری مل گئی ہے تو کیا مجھ پر چالیس دن تک روزانہ درود شریف پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل کسی مقام پر فرض یا واجب ہو، درود شریف پڑھنا بھی بعض مواقع میں واجب ہے، اس لیے درود شریف پڑھنے کی نذر ماننا صحیح ہے اگرچہ بعض علماء کرام کا اس میں کلام ہے مگر صحیح اور راجح قول صحت کا ہے۔ لہٰذا اب آپ پر چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھنا واجب ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو نذر ان یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کل یوم کذا لزمة وقیل لا۔ قال ابن عابدینؒ: تحتہ قولہ لزمہ لان من جنسہ فرضاً .... منہ یعلم انہ لا یشترط کون الفرض قطعیاً وقولہ قیل لا لعل وجھہ اشتراط کون الفرض قطعیاً ...... قلت والاحوط الاول۔
(رد المحتار ج ۳ ص۱۰۵ بحوالہ امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۵۹۲ کتاب النذور)

"میں اپنے باپ سے نہیں ہوں گا" کہنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ پختون معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بات پر کسی کو پختہ یقین دلانا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ اگر میں نے یہ کام اس طرح نہ کیا تو میں اپنے باپ کے نطفے سے نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے الفاظ سے یمین (قسم) منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اپنی اس قسم کو پورا نہ کرسکے تو کیا اس کے ذمہ کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر اٹھائی جائے بدون اس کے یمین منعقد نہیں ہوگی۔ صورتِ مسئولہ کے الفاظ سے قسم منعقد نہیں ہوتی اور نہ مخالفت کرنے پر کفارہ لازم آتا ہے۔

لما قال العلامۃ المفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ: (سوال) اگر یہ کہہ دے کہ اگر میں آپ کے گھر جاؤں تو اپنے باپ سے نہیں بلکہ کسی خاکروب سے ہوں، پھر اگر چلا جاوے تو کفارہ لازم ہے یا نہ؟

(الجواب) اس میں کچھ کفارہ نہیں جانا درست ہے۔ (عزیز الفتاویٰ ج۱ ص۵۷۲ کتاب الایمان)

کسی گناہ سے توبہ کرنا قسم نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے بھرے مجمع میں کہا میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ چوری نہیں کروں گا، کچھ عرصہ تو وہ اس توبہ پر قائم رہا لیکن پھر اس سے چوری کا جرم سرزد ہوگیا، اب اس شخص پر شرعاً کیا حکم لاگو ہوگا؟ یعنی توبہ کے مذکورہ الفاظ قسم شمار ہوکر اس شخص پر کفارۂ قسم لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کے الفاظ اگرچہ کسی بات کی توثیق کے لیے مفید ہوتے ہیں مگر یہ یمین کے لیے مثبت نہیں اس لیے اس شخص پر کوئی کفارہ نہیں، البتہ چوری جیسے قبیح فعل کے دوبارہ ارتکاب پر مال اصل مالک کو واپس کرے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو انشاء اللہ گناہ معاف ہو جائے گا۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: (سوال) اگر کسی نے یہ کہا کہ میں فلاں گناہ سے توبہ کرتا ہوں اب کبھی نہ کروں گا، تو یہ قسم ہوگی یا نہیں؟

(الجواب) یہ قسم نہیں ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج۳ ص۵۴۹ کتاب الایمان)

کفارۂ یمین میں بیس مساکین کو ایک وقت کھانا کھلانا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کفارۂ یمین کی ادائیگی اس طرح کرے کہ بیس مساکین کو ایک ہی وقت کھانا کھلادے تو کیا اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کفارۂ یمین میں دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا ضروری ہے، اگر کوئی شخص ایک وقت میں بیس مسکینوں کو کھانا کھلادے تو اس سے دو وقتوں کی تلافی نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک وقت کا کھانا متصور ہوگا اس کے ذمے دوسرے وقت کا کھانا کھلانا لازم ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: واذا غدی مسکیناً وعشی غیرہ عشرۃ ایام لم یجزہ لانہ فرق طعام العشرۃ علیٰ عشرین کما اذا فرق حصۃ المسکین علیٰ مسکینین۔

(ردّ المحتار ج ۳ ص۷۲۶ کتاب الیمین۔ مطلب کفارۃ الیمین) [1]

غیر اللہ پر قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں کے لوگ جب کسی بات کی توثیق کرتے ہیں تو دوسرے سے کہتے ہیں کہ تیرے سر کی قسم میں یہ کام کروں گا۔ تو کیا اس سے شرعاً قسم منعقد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم اٹھانے کی صورت میں دو مقصد پیشِ نظر ہوتے ہیں (۱) مقسم بہ کی تعظیم (۲) بات کی پختگی۔ اگر صورتِ مسئولہ میں اس قسم کی یمین سے بات کی پختگی مراد ہو اور مقسم بہ کی تعظیم کا کوئی شائبہ نہ ہو تو یہ شرعی قسم نہیں صرف بات کو پختہ کرنے کی وجہ سے اس کو یمین کہا گیا ہے، اس لیے فقہاء کرام نے اس کو جائز کہا ہے اور اگر مقسم بہ کی تعظیم مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں مشارکت کی بناء پر جائز نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وهل یکرہ الحلف بغیر اللّٰه تعالیٰ قیل نعم للنهی وعامتهم لا وبه افتوا لا سیما فی زماننا وحملوا النهی علی الحلف بغیر اللّٰه لا علیٰ وجه الوثیقة کقولهم بابیك ولعمرك ونحو ذلك۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۳ ص۷۰۵ کتاب الیمین۔ مطلب فی حکم الحلف بغیرہ تعالیٰ)

---

[1] ولما قال العلامة ابوبکر بن علی الحداد الیمنیؒ: وان غدا عشرۃ وعشا عشرۃ غیرهم لم یجزیه وکذا اذا غدا مسکیناً وعشا غیرہ عشرۃ ایام لم یجزیه لانه فرق طعام العشرۃ علیٰ عشرین یحصل لکل واحد منهم المقدار المقدر کما اذا فرق حصة المسکین علیٰ مسکینین۔

(الجوهرة النیرة ج ۲ ص۲۹۲ کتاب الایمان)

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ سے کیا مراد ہے؟

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی جنگل میں سفر کر رہا ہے اور اس کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کی موت واقع ہونے کا بھی خدشہ ہے، جبکہ اس کے پاس کھانے کی صرف دو چیزیں موجود ہیں، ایک نذر غیر اللہ کی اور دوسرے خنزیر کا گوشت۔ اس صورت حال میں ان دونوں چیزوں میں سے کون سی کھانا اس کے لیے رخص ہے کہ اس سے اس کی جان بچ جائے؟ جبکہ قرآن کریم کی اس آیت اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ( ) میں مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور نذر لغیر اللہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا آیتِ کریمہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب :- مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، دوسری یہ کہ اس سے غیر اللہ کے نام کی نذر مراد ہے، یعنی کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جو غیر اللہ کے لیے نامزد کی گئی ہوں اور اس سے غرض یہ ہو کہ غیر اللہ کا تقرب حاصل ہو جائے۔ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ کی پہلی قسم اور خنزیر حرمت میں دونوں برابر ہیں، مضطر کو اختیار ہے کہ حالتِ اضطرار میں ان دونوں میں سے جو چاہے بقدرِ ضرورت اتنا کھا لے کہ مرنے سے بچ جائے۔ اور دوسری قسم جو کہ نذر لغیر اللہ ہے وہ اگرچہ حرام ہے مگر حرمت میں خنزیر سے کمتر ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خنزیر کی حرمت لعینہٖ ہے اور غیر اللہ کے نام کی نذر کی حرمت لغیرہٖ ہے، اور حرمت لغیرہٖ بہ نسبت حرمت لعینہٖ کے کمتر درجے کی حرمت ہے۔ اس لیے مضطر پر لازم ہے کہ خنزیر کو چھوڑ کر نذر لغیر اللہ سے بقدرِ ضرورت اتنا کھا لے کہ مرنے سے بچ جائے۔ فقط واللہ اعلم

ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر کی شرعی حیثیت

سوال :- ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ میں اپنے مرحوم والد کے ایصالِ ثواب کے لیے ہر روز چار رکعت نفل نماز پڑھوں گا اور ہر ماہ ایک بکرا اللہ کے نام پر ذبح کروں گا۔ کئی ماہ تک تو اس شخص نے اس پر عمل کیا مگر کچھ حادثات کی وجہ سے اب وہ مالی مشکلات سے دوچار ہے اور نفل نماز تو پڑھ لیتا ہے مگر ہر ماہ بکرا ذبح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، اس شخص کے لیے شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟ اگر یہ شخص ہر ماہ بکرا ذبح نہ کرے تو کیا وہ عنداللہ مجرم ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جنس سے کوئی واجب یا فرض عمل موجود ہو۔ چونکہ ایصالِ ثواب ایک ایسا عمل ہے کہ جس کی جنس میں کوئی واجب عمل موجود نہیں اسلئے صورتِ مسئولہ میں بھی ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر منعقد نہیں ہوئی ہے، اور اب یہ شخص چونکہ نادار اور غریب ہے اور ہر ماہ بکرا ذبح نہیں کرسکتا تو اس عمل کے ترک کرنے سے وہ عنداللہ مجرم نہ ہوگا۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) ایصالِ ثواب کی نذر منعقد نہیں ہوتی کیونکہ اس کی جنس سے کوئی واجب نہیں اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ مالیس من جنسہ واجب لاینعقد النذر بہ اور گو تصدق کی جنس سے واجب ہے مگر یہاں اصل مقصود ایصالِ ثواب بروحِ میت ہے تصدق کی نذر تبعاً ہے اور نذرِ صحیح میں بھی صحت نذر کی تعیین مکان و زمان و تعیین فقیر نہیں بلکہ اس میں تغیّر کا اختیار رہتا ہے۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۳۰ کتاب الأیمان والنذر)[۱]

---

[۱] قال العلامة ابن العربیؒ: حقیقة النذر التزام الفعل بالقول مما یکون طاعة للّٰه عزوجل ومن الاعمال قربة ولایلزم نذر المباح، بدلیل ماروی فی الصحیح ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم رأی ابا اسرائیل قائماً فسأل عنه فقالوا نذر أن یقوم ولایقعد ولایستظل ویصوم فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم مروه فلیصم ولیقعد ولیستظل فاخبره باتمام العبادة ونهاه عن فعل المباح۔

(احکام القرآن ج۱ ص۳۵۲ سورة آل عمران)

ومثله فی احکام القرآن للشیخ ظفر احمد العثمانی رحمه اللّٰه ج۲ ص۱۸ سورة آل عمران۔


كتاب
الوقف

کتاب الوقف
(وقف کے مسائل واحکام)

مسجد کے لیے وقف مکان میں دعویٰ ارث نہیں چلتا

سوال:۔ مسجد کیلئے وقف مکان میں امام مسجد رہائش پذیر تھے ان کی وفات کے بعد ورثاء ارث کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ ورثاء مسجد کی امامت و خطابت جیسی ذمہ داریوں سے وابستہ نہیں ہیں، توکیا ایسی حالت میں ورثاء اس مکان میں ارث کا دعویٰ کرسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ مسجد کی موقوفہ جائیداد پر کسی کو ارث کے دعویٰ کا حق حاصل نہیں، مذکورہ مکان اگر مسجد کے لیے باقاعدہ وقف ہو تو امام کی موت کے بعد اس کے ورثاء کا اس میں کسی قسم کا کوئی حق نہیں، صرف مسجد کے منافع کے لیے اس کا استعمال ہوگا۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من احب ولو غنيا فيلزم فلا يجوز ابطاله ولا يورث عنه وعليه الفتوى۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۶ كتاب الوقف)[1]

موقوفہ زمین کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد یا قبرستان کے لیے باقاعدہ طور پر وقف کی، اب واقف موقوفہ زمین کو فروخت کرنا چاہتا ہے، توکیا موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف کو موقوفہ جائیداد میں کسی قسم کے

---

[1] وقال العلامة المرغيناني رحمه الله: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم يكن له ان يرجع فيه ولا يبيعه ولا يورث عنه لانه يحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالى۔

(الهداية ج۲ ص۶۲۵ كتاب الوقف، فصل في المسجد۔

ومثله في الهندية ج۲ ص۴۶۶ كتاب الوقف، الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر

ردّو بدل کا اختیار حاصل نہیں اور نہ اس کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني: واذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۴۰ کتاب الوقف)[1]

باغ کے میوہ کو وقف کرنے کا حکم

سوال: ایک آدمی نے اپنا باغ وقف کرتے وقت زمین یا آمدن کا تعین نہیں کیا، اس کی وفات کے بعد جب باغ کے درخت فائدہ کے قابل نہ رہے تو ورثا نے زمین کا دعویٰ کر دیا، ان کا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے مورث نے باغ کے درخت اور اس کی آمدنی وقف کی تھی زمین نہیں، چونکہ اب نہ تو باغ کے درخت رہے ہیں اور نہ اس کی آمدنی، اس لیے یہ زمین ہم آپس میں تقسیم کرتے ہیں، تو اس معاملہ میں ان کو کہاں تک حق بجانب سمجھنا چاہیئے؟

الجواب: شرعاً باغ کی زمین کی طرح اس کے درخت اور میوہ کا وقف کرنا بھی جائز ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں واقف کے الفاظ اور عرف کو مدِ نظر رکھ کر فیصلہ کرنا زیادہ مناسب ہے، اگر علاقہ میں وقف صرف درخت اور میوہ کیا جاتا ہو تو پھر اس کا اعتبار ہوگا ورنہ زمین بھی وقف متصور ہوگی۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: لان هذا صدقة بالمنفعة او بالغلة وذلك قد يكون مؤبداً فمطلقه لا ينصرف الى التابيد فلا بد من التنصيص۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۳۹ کتاب الوقف)[2]

وقف سے رجوع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی اور وقف تام بھی ہوگیا، اب وہ اس

---

[1] قال العلامة التمرتاشي: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملك ولا یعار ولا یرهن ای لا یملك لتملیك لغیره بالبیع۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۲ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۲۱ فصل حکم الواقف الجائز۔

[2] وقال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري: واذا وقف مالاً لاجل المساجد فانه جائز لجريان العرف به۔ (خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۴۱۵ کتاب الوقف الفصل الثالث)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیة ج ۵ ص ۸۲۷ کتاب الوقف۔

وقف سے رجوع کرنا چاہتا ہے، تو کیا واقف اپنے وقف سے رجوع کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جو کوئی اپنی مملوکہ زمین ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کرے اور وقف بھی تام ہوجائے تو اس کے بعد واقف اپنے وقف سے رجوع کرنے کا شرعاً مجاز نہیں۔

لما قال العلامة فخرالدین الرازی الشهیر بقاضی خانؒ: وعن محمدؒ وعن ابی حنیفةؒ اذا جعل ارضه وقفاً علی المسجد جاز ولا یکون له ان یرجع۔

(فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۱ باب الرجل یجعل داره مسجداً الخ)[1]

موقوفہ زمین میں امام مسجد کے لیے مکان بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے مصالح کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اب مسجد کی انتظامیہ امام مسجد کے لیے اس موقوفہ زمین میں رہائشی مکان تعمیر کرنا چاہتی ہے، تو کیا انتظامیہ کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے مصالح کے لیے وقف ہو اس میں انتظامیہ کو امام مسجد کے لیے مکان تعمیر کرنا شرعاً درست ہے، کیونکہ امام مسجد کی ضرورت بھی مسجد کے مصالح میں شامل ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: وبما ذکرناه علم انه لو بنی بیتاً علی سطح المسجد لسکنی الامام فانه لا یضر فی کونه مسجداً لانه من المصالح۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد)[2]

عیدگاہ میں کھیلنا جائز نہیں

سوال:۔ عیدگاہ میں کھیلنا اور ورزش کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں نہیں، اسی لیے بعض فقہاء اس میں

---

[1] وقال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: واذا صح الوقف لم تجز بیعه ولا تملیکه۔ (الهدایة ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ فصل الذی یرجع الی الموقوف۔

[2] وقال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: ویبدأ من غلته بعمارته ثم ما هو اقرب لعمارته کامام مسجد و مدرس مدرسة یعطون بقدر کفایتهم۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۶۶ مطلب یبدأ من غلة الوقف بعمارته)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۲۱۱ کتاب الوقف۔

ادب واحترام کے اس درجہ کے قائل نہیں جو مساجد کے لیے ہوتا ہے تاہم ہمارے معاشرہ میں عیدگاہ کو مسجد کی طرح سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کا احترام زیادہ مناسب ہے اور اس میں ہر قسم کے کھیل کود سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اما مصلی العید لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی له حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف وفیما سوی ذٰلک فلیس له حکم المسجد وقال بعضهم یکون مسجداً حال اداء الصلوٰة لا غیر وهو الجبانة سواءٌ ویجنب هٰذا المکان عما یجنب عنه المساجد احتیاطاً والظاهر ترجیح الاول لانه فی الخانیة یقدم الاشهر۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۶ الوقف فی احکام المسجد)[1]

موقوفہ زمین میں عشر ادا کرنا ضروری ہے

سوال:۔ ایک شخص نے مدرسہ کیلئے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف تام بھی ہوگیا ہے تو کیا اس موقوفہ زمین میں عشر دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مدرسہ وغیرہ کے لیے وقف ہو جائے اور اس کے بعد اس میں کاشت وغیرہ کی جائے تو اس کی آمدنی میں عشر دینا ضروری ہے۔

لما قال فی الهندیة: قال ارض الوقف اذا کانت عشریة دفعها القیم مزارعة او معاملة فعشر جمیع الخارج فی نصیب الدافع وهٰذا علیٰ قول ابی حنیفةؒ فان عنده فی الاجارة بالدراهم العشر علی الآجر کالخراج وعندهما یجب فی الخارج

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وما تخذ لصلوٰة العید فانه لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی له حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف اما فیما سوی ذٰلک لیس له حکم المسجد قال بعضهم له حکم المسجد حال اداء الصلوٰة لا غیر هو والجبانة سواء ویجنب هٰذا المکان عما یجنب المسجد احتیاطاً وفی الواقعات المسجد الذی اتخذ لصلوٰة العید۔ فالمختار للفتوٰی انه مسجد فی حق جواز الاقتداء وان انفصلت الصفوف واما فیما عدا ذٰلک فلا رفقاً بالناس۔
(فتاوٰی تاتارخانیة ج۵ ص۸۴۵ کتاب الوقف مسائل وقف المساجد)
ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف۔

فکذٰلک المزارعۃ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۲ ص۴۲۴ کتاب الوقف۔ الباب الخامس) [۱]

موقوفہ زمین پر ملکیت کا دعوٰی کرنے کا حکم

سوال:۔ کافی مدت سے ایک زمین مسجد کے لیے وقف کی ہوئی ہے لیکن اب وہ آدمی اسی زمین کی دوبارہ ملکیت کا دعوٰی کر رہا ہے، تو کیا شرعاً اس شخص کا یہ دعوٰی درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر اس زمین کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ مسجد ہی رہے گی اور کسی کی ملکیت متصور نہ ہوگی اور نہ رجوع صحیح ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجدًا لم یکن لہٗ ان یرجع فیہ ولا یبیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصًا للّٰہ تعالٰی۔

(الھدایۃ ج ۲ ص۶۲۵ کتاب الوقف) [۲]

موقوفہ قبرستان میں مردے دفنانے سے منع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے قبرستان کے لیے اپنی زمین وقف کی جس میں سینکڑوں کی تعداد میں مُردوں کو دفنایا جا چکا ہے، اب محلہ کی تنظیم والے اس قبرستان میں لوگوں کو اموات کے دفنانے سے روکتے ہیں، تو کیا اس تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر اس قبرستان کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ قبرستان ہی رہے گی، اور محلہ کی تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعاً درست نہیں ہے، اس قبرستان میں مُردوں کو دفنایا جائے گا منع کرنا ناجائز ہے۔

---

[۱] قال العلامۃ المرغینانیؒ: قال ابو حنیفۃؒ فی قلیل ما اخرجتہ وکثیرہ العشر سواسقی سیحًا او سقتہ السماء۔ (الھدایۃ ج ۱ ص۲۰۱ باب العشر)

ومثلہٗ فی تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص۹ کتاب الصلوٰۃ۔

[۲] وقال فی الھندیۃ: اما حکمہ عندھما زوال العین عن ملکہ ...... فانہ یصح حتّٰی لا یملک بیعہ ولا یورث۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۲ ص۳۵۲ الوقف الباب الاول فی تعریفہ)

ومثلہٗ فی الدر المختار علٰی صدر ردالمحتار ج ۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف، مطلب فی شرط واقف الکتب۔

لما قال فی الهندیة : واذا کان یزول الملك عندهما یزول ملکه بالقول عند ابی یوسفؒ وهو قول الائمة الثلاثة وهو قول اکثر اهل العلم وعلیٰ هٰذا مشائخ بلخ وعلیه الفتویٰ ..... امّا حکمه عندهما زوال العین عن ملکه الیٰ ..... فانه یصح حتیٰ لایملك بیعه ولا یورث.
(الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص۳۵۲ الوقف، الباب الاول فی تعریفه الخ) [۱]

وقف میں واقف کی شرائط کے معتبر ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے حالتِ حیات میں محلہ والوں کو مدرسہ کی تعمیر کے لیے جگہ دے دی اور کہا کہ جب تک اس مدرسہ میں طلباء تعلیم حاصل کرتے رہیں گے تو مجھے اور میرے ورثاء کو اس زمین میں مداخلت کا حق نہیں ہوگا لیکن اگر کسی وجہ سے مدرسہ میں سلسلہ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف میرا یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگا۔ تو کچھ عرصہ کے بعد سلسلہ تعلیم بند ہوگیا ہے تو اس شخص نے کہا کہ اب میں اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہوں، اس پر لوگوں نے اسے منع کیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ تو کیا اس آدمی کو حق استرداد شرعاً حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورۃ مذکورہ میں چونکہ واقف نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر سلسلۂ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف کردہ زمین میری یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگی، تو یہ وقف عدم تابید کی وجہ نامنظور رہے اور وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ واقف کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے اس لیے واقف مذکورہ زمین کو واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان یجعل مالہ حیث شاء مالم یکن معصیة وله ان یخص صنفا من الفقراء.
(ردالمحتار ج ۴ ص۳۶۱ کتاب الوقف) [۲]

---

[۱] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ : ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع ولا بیعه ولا یورث عنه۔ (الهدایة ج ۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج ۳ ص۳۶۷ کتاب الوقف۔

[۲] قال العلامة ابن نجیمؒ : شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل به وفی المفهوم والدلالة۔ (الاشباه والنظائر ج ۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۱ ص۱۲۶ کتاب الوقف۔

طلباء کے لیے مخصوص وقف کا حکم | سوال:۔ دینی مدارس کے لیے جو بکرے یا گوشت آتا ہے کیا طلباء کے علاوہ اساتذہ اور دیگر عملہ بھی اس میں سے کھا سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر گوشت اور بکرے واقف نے صرف مدرسہ کے طلبہ کے لیے وقف کیے ہوں تو اس گوشت وغیرہ کو طلباء کے علاوہ کوئی اور استعمال نہیں کرسکتا کیونکہ اس میں واقف کی شرط سے مخالفت لازم آتی ہے جوکہ ناجائز ہے کیونکہ شرطِ واقف شارع کی نص کی طرح ہے، تاہم صرف مدرسہ کو دے کر مدرسہ کے ذمہ دار حضرات کو اختیار دینے کی صورت میں مدرسہ کے لیے دیئے گئے دیگر عطایا کے حکم میں ہو کر طلباء کے علاوہ مدرسہ کے اساتذہ اور ملازمین بھی استعمال کرسکتے ہیں ۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : قال فی الاسعاف یجب صرف الغلۃ علی ما شرط الواقف وفی غیرہ شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفھوم والدلالۃ۔
(تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص۱۲۶ کتاب الوقف) [1]

شاملاتِ دیہہ زمین کے وقف کا حکم | سوال:۔ ایک قطعہ اراضی تمام گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور سرکاری کاغذات میں وہ شاملاتِ دیہہ ہے، گاؤں کے چند آدمیوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر وقف کردیا اور وقف کی تحریری دستاویز پر انگوٹھے اور دستخط وغیرہ ثبت کیے، جبکہ گاؤں کے تمام لوگ اس وقف پر راضی نہیں، تو کیا ایسا وقف شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب: اگر مذکورہ زمین واقعی پورے گاؤں والوں کی مشترکہ ہے اور اس کو تمام مالکان نے نہیں بلکہ بعض نے وقف کیا ہو تو یہ وقف شرعاً صحیح نہیں کیونکہ یہ وقف مشاع ہے لہٰذا شاملاتِ دیہہ زمین کا وقف بدون تمام شرکاء کی رضا کے درست نہیں۔

لما قال العلامۃ فخرالدین حسن بن منصور الشھیر بقاضی خانؒ، وقف المشاع

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ : قولھم شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفھوم والدلالۃ۔
(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۴ ص۴۳۳ کتاب الوقف)
ومثلہ فی الفتاوی الخیریۃ علی ھامش تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص۱۳۴ کتاب الوقف۔

عند محمدؒ لا یجوز والفتویٰ علیٰ قول محمدؒ ۔ (فتاویٰ قاضیخان علیٰ ہامش الہندیۃ ج۳ ص۳۰۲ فصل وقف المشاع)[۱]

قاضی کے لیے استبدالِ وقف جائز ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دینی مدرسہ کے لیے کچھ زمین وقف کرے اور بعد میں کسی مصلحت کی بناء پر اس کو بدلنا چاہے تو شریعت کی رو سے اس طرح کی استبدال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر قاضی استبدالِ وقف میں مصلحت سمجھے تو اسے شرعاً اختیار حاصل ہے کہ وہ وقف میں استبدال کرے البتہ قاضی کے علاوہ کسی اور کو شرعاً یہ اختیارات حاصل نہیں۔

لما قال العلامۃ فخرالدین حسن بن منصور الشہیر بقاضی خانؒ: امایدون الشرط اشار فی السیر انہ لایملک الاستبدال الا القاضی اذا رأی المصلحۃ فی ذٰلک۔
(فتاویٰ قاضیخان علیٰ ہامش الہندیۃ ج۳ ص۳۰۶ فصل فی مسائل الشرط فی الوقف)[۲]

مشترکہ جائیداد بلاتقسیم مسجد کے لیے وقف کرنا

سوال:۔ کئی مالکوں میں ایک زمین مشترکہ تھی ان میں سے چند ساتھیوں نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی جبکہ ان میں بعض ساتھی اس پر راضی نہیں ہیں، تو کیا شریعت کی رو سے یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مشترکہ جائیداد بغیر تقسیم کیے وقف مشاع کے مترادف ہے، اس لیے وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے ناراض مالکوں کی طرف وقف کنندگان بھی اپنے اپنے حصص سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

لما قال فی الہندیۃ: واتفقا علیٰ عدم جعل المشاع مسجداً اومقبرۃ

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً اومقبرۃ غیر جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحرالرائق ج۵ ص۱۹۶ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

[۲] قال العلامۃ زین الدین بن ابراہیم الشہیر ابن نجیمؒ: شرط الوقف عدم الاستبدال فللقاضی الاستبدال اذا کان اصلح۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی مجموعۃ الفتاویٰ ج۲ ص۱۱۲ کتاب الوقف۔

مطلقاً سواءکان مما لایحتمل القسمۃ او یحتملہا۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع)[1]

قبرستان کے درختوں کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:- ایک قبرستان میں بڑے بڑے درخت ہیں جن کو فروخت کرکے ان کی قیمت اگر قبرستان میں ہی لگادی جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہاں کہیں درخت زمین کے قبرستان بن جانے سے قبل اُگے ہوں تو مملوکہ زمین ہونے کی صورت میں درخت مالکِ زمین کے ہوں گے، خواہ مالک کوئی ایک شخص ہو یا قوم، البتہ زمین کے قبرستان بن جانے کے بعد درخت اُگے ہوں اور یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے لیے وقف ہو تو اس کے درخت فروخت کرکے ان کی قیمت قبرستان یا دوسرے اجتماعی مفاد میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

لما فی الہندیۃ: مقبرۃ علیہا اشجار عظیمۃ فہذا علی وجہین اما ان کانت الاشجار قبل اتخاذ الارض مقبرۃ او نبت بعد اتخاذ الارض مقبرۃ ففی الوجہ الاول المسألۃ علی قسمین اما ان کانت الارض مملوکۃ لہا مالک او کانت مواتاً لا مالک لہا واتخذہا اہل القریۃ مقبرۃ۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۲ ص۴۷۳ الباب الثانی عشر الخ)[2]

[1] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرۃ غیر جائز مطلقاً اتفاقاً وفی غیرہما ان کان مما لایحتمل القسمۃ جاز اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۹۶ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: مقبرۃ علیہا اشجار ان کانت نابتۃ قبل اتخاذ الارض مقبرۃ والارض مملوکۃ لہا مالک جعلہا مقبرۃ فالاشجار باصلہا علی ملک رب الارض یصنع الورثۃ بالاشجار ما شاؤا لان الشجرۃ لاتدخل تحت الوقف... وان کانت الارض مواتا لا مالک لہا باصلہا علی حالہا القدیمۃ ہذا کلہ اذا کانت الاشجار نابتۃ قبل اتخاذہا مقبرۃ ولم ینبت بعد ذلک لایخلوا اما ان علم غارسہا اولایعلم ان علم کانت للغارس وان لم یعلم بہا غارس فالحکم للقاضی۔

(خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف الفصل الثالث نوع آخر)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف۔

وقف مشاع کی خرید و فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر چند آدمی کچھ رقم اکٹھی کر کے مسجد کے لیے زمین خریدیں جس کے مالکانہ حقوق بھی ان کو منتقل ہوئے ہوں لیکن اب اس جگہ کو تبدیل کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے، تو کیا یہ اشخاص اس جگہ کو فروخت کر کے کسی دوسری جگہ مسجد کے لیے زمین خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ چند اشخاص کا مشترکہ طور پر مسجد کے لیے زمین خریدنا وقف مشاع کے حکم میں ہے، جو صحیح نہیں، اس لیے صورتِ مذکورہ میں ان اشخاص کی خریدی ہوئی جگہ مسجد کے لیے وقف نہ ہونے کی وجہ سے اس کو فروخت کرنے میں کوئی امر مانع نہیں، ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ زمین خریدنے سے قبل یہ اشخاص کسی ایک کو رقم ہبہ کر دیں اور موہوب لہٗ اپنی رقم اور موہوبہ رقم ملا کر اس سے زمین خریدے اور بعد ازاں اس کو مسجد کے لیے وقف کر دے، اس طرح کرنے سے اس جگہ کی تبدیلی جائز نہیں ہوگی۔

لما قال فی الهندیة: وقف المشاع المحتمل للقسمة لایجوز عند محمدؒ وبه اخذ مشائخ بخاری وعلیه الفتوی۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع۔)[1]

مغصوبہ جائیداد کی آمدنی مساجد کی تعمیر کیلئے وقف کرنا

سوال:۔ ایک شخص تقریباً ۶۰ سال سے ایک وسیع جائیداد پر غاصب ہے اور اس جائیداد کی کافی آمدنی ہے، اب اگر یہ شخص اس جائیداد کی آمدنی کا کچھ حصہ مساجد کی تعمیر یا دیگر رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کرے تو کیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ مغصوبہ جائیداد واجب الرد ہے اور ایسی جائیداد کی آمدنی غاصب کیلئے ذاتی طور پر استعمال کرنا حلال نہیں اور نہ ثواب کی نیت سے کسی مسجد یا مفاد عامہ کے لیے وقف کر سکتا ہے، کیونکہ وقف کی صحت کے لیے اس چیز کا مالک ہونا ضروری ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرة غیر جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۹۷ کتاب الوقف)

ومثلهٗ فی الهدایة ج۲ ص۶۰۱ کتاب الوقف۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: هو حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة ۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص۳۹۱ کتاب الوقف) ؎۱

پرانے قبرستان پر مدرسہ تعمیر کرنے کا حکم

سوال:۔ یہاں ایک ایسا قبرستان ہے جس کی تاریخ معلوم نہیں، قبریں بالکل ہموار ہو چکی ہیں، ان کے آثار پر حیوانات چرتے ہیں اور لوگوں کے واسطے بول و براز کا مرکز بن چکا ہے، کیا ایسے قبرستان پر دینی مدرسہ قائم کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر واقعی قبرستان کی موقوفہ زمین پر قبروں کے نشانات نہ ہوں اور پرانا قبرستان ہو اور اس کی زمین بھی ہموار ہو چکی ہو تو چراگاہ بنانے اور بول و براز پھینکنے کے بجائے یہ بہتر اور ضروری ہے کہ اس پر کوئی دینی مدرسہ تعمیر کر لیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۵۹ کتاب الجنائز) ؎۲

جنازہ گاہ میں کنواں کھودنا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین جنازہ گاہ کے لیے وقف کی جبکہ ایک دوسرے شخص نے اس میں ایک کنواں اس غرض سے کھودا کہ لوگ اس کے پانی سے وضو وغیرہ کریں گے، تو کیا اس شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مرقومہ کے مطابق چونکہ کنواں کھودنے والے کا عمل اور ارادہ زمین وقف کرنے والے کے عمل اور ارادے کے منافی نہیں بلکہ کنواں کھودنے والا واقف

؎۱ وقال العلامة ابن نجیم المصریؒ: هو حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۶ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف ۔ الباب الاول فی تعریفه ۔

؎۲ وقال فی الهندیة: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۶۷ باب الجنائز)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۵ باب الجنائز ۔

کے عمل وارادے کے لیے مکمل اور معاون ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لما قال فی الهندیة: الذی یبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف ام لا ثم إلی ماهو اقرب إلی العمارة واعم للمصلحة کالامام للمسجد والمدرس للمدرسة ثم السراج والبسط کذلك الی آخر المصالح۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۶۸ ـ الوقف ـ الباب الثانی)[1]

ہبہ کے لفظ سے وقف کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص زمین وقف کرتے وقت "ہبہ" کا لفظ استعمال کرے یا یوں کہے کہ میں نے یہ زمین مسجد کو دے دی ہے، کیا اس سے وقف جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ زمین وقف متصور ہو گی یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ "ہبہ" اور "اعطاء" کے لفظ سے بھی دائمی حقوق دیئے جاتے ہیں اس لیے فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں "ہبہ" اور "اعطاء" سے بھی وقف صحیح ہے، لہٰذا یہ زمین موقوفہ (وقف شدہ) زمین ہو گی۔

لما قال فی الهندیة: ولو قال وهبت داری للمسجد او اعطیتها له صح ویکون تملیکاً فیشترط التسلیم کما لو قال وقفت هذه المائة للمسجد یصح بطریق التملیك اذا سلمه للقیم۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۰ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد)[2]

عیدگاہ میں ہسپتال بنانے کا حکم

سوال:۔ شہر سے باہر لوگوں نے نمازِ عیدین کے لیے ایک میدان مقرر کیا ہے تقریباً نو سال تک

---

[1] وقال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: الشعائر التی تقدم شرط ام لم یشرط بعد العمارة هی امام .... وقنادیل وحصر وماء وضوء۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۷۱ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۸۸ قبل کتاب اللقطة۔

[2] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: ولو قال وهبت داری للمسجد او اعطیتها له صح ویکون تملیکاً فیشترط التسلیم کما لو قال وقفت هذه المائة للمسجد۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۸۵۳ کتاب الوقف ـ مسائل وقف المساجد)

اس میدان میں نماز عیدین ادا کی گئی ہے، اب حکومت اس جگہ پر ہسپتال بنانے کا ارادہ رکھتی ہے اور عیدگاہ کے لیے اس کے بدلے میں ایک دوسری جگہ بھی دینے کو تیار ہے، کیا حکومت کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مذکورہ عیدگاہ موقوفہ ہو تو حکومت کا اس پر ہسپتال وغیرہ بنانا شرعاً جائز نہیں کیونکہ یہ جہت وقف کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ واقف کی شرط شارع کی نص کی طرح ہوتی ہے، البتہ اگر یہ جگہ وقف نہ ہو بلکہ ویسے ہی اس جگہ پر کئی سالوں سے نماز عیدین پڑھی جا رہی ہو تو اس صورت میں اس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع و هو مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية۔[1]

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۹۵ کتاب الوقف۔ مطلب ما خالف شرط الواقف)

واقف کی شرط کے اعتبار کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص مسجد سے ملحق اپنی دو مرلہ زمین اس شرط پر مسجد کے لیے وقف کرے کہ مسجد سے ملحق ایک دوسرا پلاٹ خرید کر اس پر جنازہ گاہ بنایا جائے گا، اور اگر کسی وجہ سے ملحقہ پلاٹ نہ مل سکے تو کیا یہ شخص اپنی دو مرلہ زمین کی واپسی کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین واقف نے کسی شرط کے ساتھ وقف کی ہو اور وہ شرط پوری نہ ہو سکتی ہو تو واقف اپنی زمین کو واپس لینے کا شرعاً مجاز ہے، لہٰذا موصوف اپنی دو مرلہ زمین واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: و ما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حكم لا دليل عليه سواء كان نصه فى الوقف نصاً

---

[1] ولما قال العلامة ابن البزاز رحمه الله: شرط الواقف كنص الشارع مالم تخالف الشرع۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۲۵۱ الباب الثانى فى نصب المتولى و ما يملكه اولا ـــ كتاب الوقف) و مثله فى الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۵۶ کتاب الوقف۔

او ظاهراً وهٰذا موافق لقول مشائخنا كغيرهم شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۹۵ کتاب الوقف، مطلب ما خالف شرط الواقف)[1]

قبرستان کے لیے موقوفہ زمین میں تصرّف کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین قبرستان کے لیے وقف کر دی، واقف کے فوت ہونے کے ۳۵/۳۶ سال بعد اس کے بیٹے نے موقوفہ زمین میں کچھ یوں تصرّف کیا کہ جسے چاہتا ہے میت دفن کرنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے روک دیتا ہے، اس کے علاوہ وقف شدہ زمین کے کچھ حصہ میں فصل بھی کاشت کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ والد کی موقوفہ زمین میں بیٹے کا کسی قسم کا تصرّف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں واقف کا بیٹا باپ کی وفات کے بعد اس موقوفہ زمین میں کسی قسم کے تصرّف کرنے کا حق دار نہیں رہتا، اس لیے کہ ایک دفعہ وقف تام ہونے کے بعد زمین مالک کی مِلک سے نکل جاتی ہے جس کے بعد واقف اور اس کے ورثاء کو تصرّف کا کوئی حق نہیں رہتا۔

لما قال العلامة فخر الدين الزيلعي رحمه الله: وعند ابي يوسفؒ يزول مِلكه بالقول و عند محمدؒ اذا ستسقى الناس عن السقاية وسكنوا الخان والرباط ودفنوا في المقبرة زال المِلك الخ۔ (تبيين الحقائق ج۳ ص۳۳۱ کتاب الوقف)[2]

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: شرط الواقف يجب اتباعه لقولهم شرط الواقف كنص الشارع۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف)

وَمِثلُهٗ فی مجموعة الفتاوی ج۲ ص۱۰۱ کتاب الوقف۔

[2] وقال في الهندية: من جعل ارضه مقبرة لم يزل مِلكه عن ذلك حتى يحكم به الحاكم عند ابي حنيفةؒ وعند ابي يوسفؒ يزول ملكه بالقول كما هو اصله..... ودفنوا في المقبرة زال المِلك ويكتفي بواحد ذكر في المبسوط ان الفتوى على قولهما في هٰذه المسائل وعليه الاجماع۔

(الفتاوی الهندية ج۲ ص۴۶۴ الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر)

وَمِثلُهٗ في البحر الرائق ج۵ ص۲۵۳ کتاب الوقف۔

جنازہ گاہ سے راستہ جدا کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے جنازہ گاہ کے لیے تین کنال زمین وقف کردی اور وقف تام بھی ہوگیا ہے، لیکن اب اس وقف شدہ زمین میں راستہ کی اشد ضرورت ہے، تو کیا شریعت کی رُو سے اس سے راستہ جدا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ زمین کو وقف کرنے کے بعد نماز جنازہ کے لیے استعمال کیا گیا اگرچہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو تو اس سے وقف اب وقف تام ہو گیا ہے اب اس کا استعمال راستہ وغیرہ کے لیے شرعاً جائز نہیں۔

لما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: فاذا تم ولزم (اى الوقف) لا يملك ولا يعار ولا يرهن (اى لا يقبل التمليك لغيره بالبيع)۔[1]

(تنویر الابصار على صدر ردّ المحتار ج۴ ص۳۶۲ کتاب الوقف)

وقف غیر تام کے استبدال کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے جبکہ اس کے قریب ہی ایک اور مسجد موجود ہے لیکن پھر بھی اس جگہ پر مسجد بنانے میں فائدہ ہے، لہذا اگر یہ شخص اس زمین کے بدلے جس پر ابھی تک مسجد نہیں بنائی گئی ہے کسی دوسری جگہ مسجد بنالے تو شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی زمین کے وقف تام ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا راستہ الگ کرکے عام لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے کر اذان اور اقامت سے کم از کم ایک دفعہ نماز باجماعت ادا ہو جائے چونکہ صورتِ مذکورہ میں یہ اقدامات نہیں ہوئے ہیں، لہذا یہاں وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے مالکِ زمین اس میں ہر قسم کا تصرف کرسکتا ہے۔ اور جب کسی زمین پر ایک دفعہ باقاعدہ شرعی مسجد بن جائے تو ایسی جگہ کو مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے استعمال میں نہیں لائی جاسکتی۔

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: اذا صح الوقف لم تجز بيعه ولا تمليكه۔ (الهداية ج۲ ص۶۴۰ كتاب الوقف)

ومثله فى بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱ كتاب الوقف۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ : ومن بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ واذا صلی فیہ واحد زال ملکہ۔
(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ الوقف فصل فی احکام المسجد) لہ

وقف کے مملوکہ ہونے کا حکم

سوال :- کسی نے مسجد کے واسطے زمین وقف کردی اور اس پر مسجد بناکر اس میں نماز باجماعت بھی ادا کی گئی، کیا یہ موقوفہ زمین مسجد کے بانی کی ملکیت متصور ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- مساجد اللہ تعالیٰ کی بندگی کے واسطے بنائی جاتی ہیں، اسکی زمین پر باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت بن جاتی ہے، اس لیے مذکورہ موقوفہ زمین کسی کی ملکیت میں نہیں آسکتی۔

لما قال فی الھندیۃ : وعندھما حبس العین علیٰ مِلکِ اللہِ تعالیٰ علیٰ وجہ تعودُ منفعۃ الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوھب ولا یورث۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۰ کتاب الوقف) ٢ہ

موقوفہ زمین میں فلش بنانے کا حکم

سوال :- مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہوتی ہو بلکہ چپلوں (جوتوں) اور

لہ لما قال العلامۃ المرغیناني رحمہ اللہ : واذا بُنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصّلوٰۃ فیہ واذا صلّی فیہ واحد زال عن ملکہ۔ الخ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۴۴ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۴۵۴ الوقف، الباب الحادی عشر فی المسجد۔

٢ہ وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : وعندھما حبسھا علیٰ حکم مِلکِ اللہ تعالیٰ وصرف منفعتھا علیٰ من احب وعلیہ الفتویٰ قولہ علیٰ حکم مِلکِ اللہ تعالیٰ قدرہ لفظ الحکم لیفید ان المراد لم یبق علیٰ مِلکِ الواقف ولو انتقل اِلیٰ ملک غیرہ وقولہ وعلیہ الفتویٰ ای علیٰ قولھما یلزمہ۔
(ردالمحتار ج ۴ ص ۳۳۸ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج ۵ ص ۱۸۷ کتاب الوقف۔

استنجا خانوں وغیرہ کے لیے متعین نہ ہو اُس میں فلش (لیٹرین) بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہو بلکہ جوتوں، استنجا خانوں اور غسلخانوں وغیرہ کے لیے مختص ہو تو اس میں فلش (لیٹرین) بنانا جائز ہے۔

لما قال العلامة شهاب الدین احمد رحمه الله: لو جعل تحته حانوتا وجعله وقفاً علی المسجد قیل لا یستحب ذٰلك ولكنه لو جعل فی الابتداء هٰكذا صار مسجداً وقفاً علیه ویجوز المسجد والوقف الذی تحته۔

(شلبی علی هامش تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۰ کتاب الوقف) [1]

موقوفہ زمین میں وراثت جاری نہ ہونے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین کا کچھ حصہ اہل محلہ کی ضروریات کے لیے وقف کر کے ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا، کیا واقف کی وفات کے بعد اس کے ورثاء یہ زمین واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ اہالیانِ محلہ کو اب بھی اس کی ضرورت ہے اور متعلقہ متولی بھی فوت ہو گیا ہے؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف یا متولی کی وفات سے وقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا جب تک اہلِ محلہ کو اس کی ضرورت ہو تو واقف کے فیصلہ کی رعایت ہوگی، واضح ہو کہ موقوفہ زمین میں ارث جاری نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة علاؤالدین الحصكفی رحمه الله: فلا یجوز له ابطاله

---

[1] لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وبما ذكرناه علم انه لو بنی بیتاً علی سطح المسجد لسكنی الامام فانه لا یضر فی كونه مسجداً لانه من مصالح المسجد ...... اذا بنی مسجداً وبنی غرفة وهو فی یده فله ذٰلك وان كان حین بناه خلی بینه وبین الناس ثم جاء بعد ذٰلك یبنی لا یتركه وفی جامع الفتاوی اذا قال عنیت ذٰلك فانه لا یصدق۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ الوقف، فصل فی احكام المسجد)

ومثله فی تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۰ کتاب الوقف۔

ولا یورث عنه وعلیه الفتوی ابن الکمال وابن الشحنة۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۲ کتاب الوقف)[1]

متروکہ جائیداد میں وقف پر اقرار کا حکم

سوال:۔ ایک شخص فوت ہوگیا اور کچھ جائیداد ترکہ میں رہ گئی، اس کے ورثاء میں ایک بیٹا یہ اقرار کرتا ہے کہ والد صاحب نے یہ زمین باقاعدہ وقف کی تھی جبکہ باقی ورثاء اس سے انکار کر رہے ہیں، اندریں حالات کیا تمام جائیداد وقف منصور ہوگی یا یہ مقر کے حصہ تک محدود رہے گی؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں اقرار حجت قاصرہ بھی ہے اور دوسرے پر اقرار بھی جوکہ صحیح نہیں اس لیے مقر کا اقرارِ وقف صرف اس کے حصہ تک محدود رہے گا اور دوسرے ورثاء پر اس کا اقرار حجت نہیں بن سکتا، وہی حصہ موقوف رہے گا جو مقر کے حصہ میں آئے۔

لما قال فی الهندیة: ولو اقرّ بالوقف الی...... وان کان مع المقر وارث اٰخر یجحدُ ذٰلک کان نصیب الجاحد من هٰذه الارض للجاحد یفعل ما یشآء ونصیب المقرّ یکون وقفاً علی ما اقرّ به۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۴۲ الوقف، الباب الثامن فی الاقرار)[2]

---

[1] وقال فی الهندیة: وکذٰلک اذا جعل داره فی ثغر مسکنا للغزاة اوالمرابطین ودافعها الی وال یقوم علیها فلیس له ان یرجع فیها وان مات لم تکن میراثاً عنه وان لم یسکنها احد۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۶ الباب الثانی عشر فی الرباطات)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۰۶ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله، واما اذا کان ثمة وارث آخر فان اقر الاخر بجمیع ما اقر به هٰذا الوارث کان الجواب کما قلنا وان انکر الوقف کان نصیب المنکر ملکاً له یتصرف فیه بما شآء ونصیب المقر وقفٌ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۷۳۳ کتاب الوقف الاقرار بالوقف)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف، قبل الفصل الرابع فی المسجد۔

باب المساجد

(مساجد میں وقف کے احکام ومسائل)

وقف کی یادداشت (تحریر) لکھنے کا حکم

سوال :- ایک شخص مسجد کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا وقف کرنا چاہتا ہے، اگر وہ بطور یادداشت یہ لکھے کہ میں نے زمین کا یہ ٹکڑا مسجد کے واسطے وقف کیا، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- کسی واقعہ کا تحریر میں لانا دوام اور استحکام کی دلیل ہے، عرف میں بھی جس واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے یا سرکاری کاغذات میں اندراج کیا جائے تو وہ زیادہ قوی سمجھا جاتا ہے، اس لیے وقف کو یادداشت کے لیے لکھنا یا سرکاری کاغذات میں انتقال کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے تاکہ بعد میں کسی وارث کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ : إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ فَاكْتُبُوهُ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)

ولما قال العلامۃ حافظ عماد الدین رحمہ اللہ : ھٰذا ارشاد منہ تعالیٰ لعبادہ المؤمنین اذا تعاملوا بمعاملات مؤجلۃ ان یکتبوھا لیکون ذٰلک احفظ لمقدارھا ومیقاتھا واضبط للشاھد فیھا وقد نبہ علیٰ ھٰذا فی آخر الآیۃ۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۵۸ سورۃ البقرۃ پ ۳)

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر دوکانیں تعمیر کرنے کا حکم

سوال :- گاؤں کے چند معززین نے ایک پلاٹ تقریباً ۶ کنال برائے جامع مسجد وقف کیا، جس میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی

---

[1] وقال العلامۃ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ :- معاملہ کا لکھنا جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ (بیان القرآن ج ۱ ص ۱۶۸ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)

وَمِثْلُہٗ فی تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰ سورۃ البقرۃ۔

مسجد کی تعمیر سے بچ جانے والی زمین بنجر ہے جسے لوگ عیدین کی نماز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب ان معززین نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بنجر زمین پر دوکانیں یا کچھ مکانات بنا دیئے جائیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مسجد پر صرف کیا جائے۔ تو کیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مذکورہ پلاٹ کے جس حصہ پر باقاعدہ مسجد بن گئی ہے خواہ اس میں مستقل چھت ڈالی گئی ہے یا عارضی چبوترہ بنا کر اس میں نماز پڑھی جا رہی ہو یا ویسے ہی کھلی جگہ ہو ایسی جگہ میں دوکانیں بنانا یا مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے اسے استعمال کرنا جائز نہیں، البتہ مسجد کے نام سے جو زمین وقف کی گئی ہے اور اس میں کچھ حصہ ویسے ہی غیر آباد چھوڑا گیا ہے اور تا حال اس پر آبادی نہیں ہوئی ہے تو وہ جگہ مسجد کے علاوہ مذکورہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما قال فی الهندیة: قیم المسجد لا یجوز له ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتاً و مسکناً تسقط حرمته وهذا لا یجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف۔ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم وغیرہ فی مال الوقف علیه)[1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانے کا حکم

سوال: قیام پاکستان کے بعد یہاں پر ہندوؤں کی کچھ جائیدادیں رہ گئی ہیں جن پر کچھ لوگ قابض ہیں، بعض لوگوں کا تو قانونی قبضہ ہے اور بعض لوگ غیر قانونی طور پر محض قوت کے بل بوتے پر قابض ہیں، کیا ایسی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں حکومت نے قانونی طور پر جن قابضین کا حق تسلیم کر کے انہیں مالکانہ حقوق دیئے ہوں تو وہ جائز مالک متصور ہو کر ان کا وقف صحیح ہے

---

[1] وقال العلامة ابن الهمامؒ: قیم المسجد اذا اراد ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فنائه لا یجوز له ان یفعل لانه اذا جعل المسجد سکناً تسقط حرمة المسجد واما الفناء فلانه تبع للمسجد۔ (فتح القدیر ج۵ ص۴۴۶ کتاب الوقف۔ الفصل الاول فی المتولی۔ ومثله فی التاتارخانیة ج۵ ص۸۶۲ کتاب الوقف الفصل الحادی والعشرون فی المساجد۔

لیکن جس جائیداد پر کسی کا غاصبانہ قبضہ ہو تو مغصوبہ جائیداد کے وقف کی عدم صحت کی وجہ سے اس پر بنائی ہوئی مسجد شرعی مسجد نہیں رہے گی الّا یہ کہ حکومت باقاعدہ اجازت دے دے۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللہ: من شرائطہ الملک وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفھا......... لا تکون وقفاً۔

(البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف) [1]

مسجد کی زمین سے ملک کے زائل ہونے کا حکم

سوال:- مسجد کی زمین سے مالک کی مِلک کا ازالہ کب ہو جاتا ہے؟

الجواب:- مسجد کی زمین سے مالک کی ملک صرف نماز کی اجازت پر اسی مسجد میں یا انہی الفاظ کے معنی پر ملک زائل ہو جاتی ہے، اور یہی امام ابو یوسفؒ کا قول ہے اور قضاءً کے باب اور وقف میں اس کا قول راجح ہو جاتا ہے۔

وقال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: وقال ابو یوسفؒ یزول ملکہ بقولہ جعلتہ مسجداً لان التسلیم عندہ لیس بشرط لانہ اسقاط لملک العبد فیصیر خالصاً للہ تعالیٰ بسقوط حق العبد وصار کالاعتاق۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف۔ فصل فی احکام المسجد) [2]

منہدم مسجد کی تبدیلی کا حکم

سوال:- ایک مسجد کسی وجہ سے شہید ہو گئی ہے، اب گاؤں والے یہ چاہتے ہیں کہ اسکے

---

[1] وقال فی الہندیۃ: (ومنھا) الملک وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفھا .... لا تکون وقفاً۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف مطلب فی وقف الذی)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۴ ص۳۸۱ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وعند ابی یوسفؒ یزول بمجرد قول الواقف ولا یجوز بیعہ ولو ما لا یورث۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۲۰ کتاب الوقف الاول)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف والصدقۃ۔

بدلے میں کسی دوسری جگہ مسجد تعمیر کرلی جائے اور اس مسجد کا ملبہ اور زمین وغیرہ فروخت کر دیا جائے، تو کیا شریعت کی رُو سے منہدم مسجد کا سامان اور جگہ وغیرہ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے وقف ہو اور اس پر مسجد بن گئی ہو تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کی تبدیلی کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذ صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف) [۱]

ارضِ مغصوبہ پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے غیر مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی، لوگوں نے اس میں تقریباً ۹/۸ سال تک نمازیں بھی پڑھیں، ۸/۹ سال بعد زمین کے اصل مالک نے دعوٰی کیا کہ یہ زمین میری ہے اور میں نے اس کو مسجد کے لیے وقف نہیں کیا ہے، لوگوں نے کہا کہ آپ اس کے بدلہ میں دوسری جگہ لے لیں اور مسجد کو اپنی جگہ پر رہنے دیں لیکن وہ نہیں مانتا، تو اب شریعت کی رُو سے اس مسجد کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ وقف کے لیے باقاعدہ ملک تام ہونا شرط ہے، جہاں کہیں کسی غیر کی زمین کو بغیر اس کی اجازت کے مسجد کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں نہیں، اس لیے مالک اگر چاہے تو وقف کر سکتا ہے ورنہ مغصوبہ زمین سے مسجد گرا کر زمین فارغ کرانا مالک کا حق ہے۔

لما فی الھندیۃ: (ومنہا) الملک وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضا فوقفہا ثم اشتراھا من مالکہا ودفع الثمن الیہ او صالح علی مال دفعہ الیہ لا تکون وقفا۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف، مطلب فی وقف المرتد) [۲]

---

[۱] وقال العلامۃ التمرتاشیؒ: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملک ولا یعار ولا یرھن) ای لا یقبل التملیک لغیرہ بالبیع۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف۔

[۲] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: من شرائطہ الملک وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضا فوقفہا......لا تکون وقفاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۴ ص۳۸۱ کتاب الوقف۔

موقوفہ زمین کو مسجد کے مصالح میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی جس پر ابھی تک نماز نہیں پڑھی گئی ہے، کیا یہ زمین مسجد کے مصالح مثلاً دوکان وغیرہ کے لیے استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- جو زمین مسجد کیلئے وقف کی گئی ہو اور اس پر نماز بھی نہیں پڑھی گئی ہو تو اس کو مسجد کے مصالح پر صرف کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے۔

لما قال فی الهندية: والاصح ما قال الامام ظهير الدينؒ ان الوقف علی عمارة المسجد وعلی مصالح المسجد سواءٌ۔ (الفتاویٰ الهندية ج۵ ص۴۶۵ كتاب الوقف، الفصل الاول فی المتولی) [1]

مسجد کی زمین پر گھر بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی، اور اس پر مسجد بھی بنادی گئی لیکن اب یہ مسجد گاؤں کے لیے ناکافی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسجد کے بدلے دوسری جگہ جس میں مسجد کے متعلقہ تمام انتظامات وسہولیات ہوں، وقف کی جائے اور پرانی مسجد کی جگہ مکان بنالیا جائے، تو کیا شریعت کی رُو سے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جس زمین پر ایک مرتبہ مسجد بن گئی اور اس میں نماز بھی پڑھی گئی تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں ہے اس کو کسی دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں بلکہ اس کو اپنی اصلی حالت پر مسجد کی حیثیت سے باقی رکھا جائے گا۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ: یبقیٰ مسجداً ابداً الی قیام الساعة وبه یفتی۔ وقال ابن عابدینؒ فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء كانوا یصلون فیه اولا وهو الفتویٰ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ كتاب الوقف، مطلب فیما لو خرب المسجد او غیره) [2]

---

[1] وقال العلامة ابن الهمامؒ: ان الوقف علی عمارة المسجد و مصالح المسجد سواء۔ فتح القدیر ج۵ ص۴۵۰ كتاب الوقف۔ ومثله فی رد المحتار ج۳ ص۴۱۲ كتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابوبكر الكاسانیؒ: واما الذی یرجع الی نفس الوقف فهو التابید وهو ان یكون مؤبداً حتیٰ لو وقت لم یجز لانه ازالة الملك لا الی حد۔ بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ كتاب الوقف والصدقة، فصل واما شرائط الجواز ـــــ ومثله فی الهداية ج۲ ص۶۳۹ كتاب الوقف۔

مسجد سے پرندوں کے گھونسلے اتارنے کا حکم

سوال:۔ بعض اوقات پرندے مساجد میں اپنے لیے گھونسلے بناتے ہیں اور ان میں انڈے اور بچے وغیرہ بھی دیتے ہیں جس کی وجہ سے مساجد میں کافی گندگی پھیل جاتی ہے، تو کیا شریعت کی رُو سے ان کے گھونسلے اُتار کر باہر پھینکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ پرندوں کے گھونسلوں سے مساجد میں عموماً گندگی پھیلتی رہتی ہے نیز نمازیوں کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس لیے مساجد سے ایسے گھونسلوں کا اکھاڑنا مرخص ہے۔

لما قال فی الهندیة : ولو کان فی المسجد عش خطاف او خفاش یقذر المسجد لاباس برمیه بما فیه من الفراخ ۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة ۔ الباب الخامس) [له]

مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ جمعرات کی شب اکٹھے ہو کر مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کے ساتھ ساتھ اچھلتے اور کودتے ہیں جس کی وجہ سے نمازیوں کو کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو کیا ان لوگوں کا یہ عمل (ذکر بالجہر) شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد مسلمانوں کی مشترکہ عبادت گاہ ہے، اس لیے اس میں ذکر کے نام پر مذکورہ طرز اور طریقہ پر اچھلنا کودنا اور ایک ہنگامہ کی سی صورت اختیار کرنا شریعت کی رُو سے ناجائز اور ممنوع ہے، البتہ اگر ذاکرین ایسا طریقہ اختیار کریں کہ جس سے نمازیوں وغیرہ کو تکلیف نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : وفی الملتقیٰ وعن النبی صلی الله علیه وسلم انه کره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة فما ظنك به عند الغناء الذی یسمونه وجدا ومحبة فانه مکروه لا اصل له فی الدین

له وقال العلامة الحصکفیؒ : ولا بأس برمی عش خفاش وحمام لتنقیته۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۶۳ کتاب الصلوٰة ۔ مطلب فیمن سبقت ... الخ
وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۴۷ کتاب الکراهیة ۔ الفصل التاسع فی المتفرقات۔

وزادفی الجوهرة ومایفعله متصوفة فی زماننا حرام لایجوز القصد والجلوس الیه۔ (ردالمحتار ج ۶ ص۳۴۹ کتاب الحظروالاباحت۔قبل فصل فی اللبس) [۱]

مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے میں بانیٔ مسجد کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے

سوال:۔ایک شخص نے موقوفہ زمین پر اپنے پیسوں سے مسجد بنائی، بعد میں کچھ لوگ باہر سے آکراس مسجد کے قریب آباد ہوگئے، اب بانیٔ مسجداوراہلِ محلہ میں اختلافات پیدا ہوگئے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے کا زیادہ مستحق کون ہے؟ بانیٔ مسجد یا اہلِ محلہ؟

الجواب:۔مسجد بنانے والا اہلِ محلہ کی نسبت مسجد کے تمام امور میں تصرف کرنے پر مقدم ہے کیونکہ بانی کو مسجد کی مرمت، بجلی، پانی کے اخراجات اور امام ومؤذن کے مقرر کرنے میں اہلِ محلہ پر سبقت حاصل ہے۔

لما قال العلامة ابراهیم الحلبی رحمه الله : رجلٌ بنیٰ مسجدا وجعله لله فهواحق بمرمته وعمارته وبسط البواری والحصیر والقنادیل والاذان والاقامة والامامة فیه ان کان اهلاً لذالك وان لم یکن فالرأی فی ذالك الیه وکذا ولد البانی وعشیرته من بعده اولیٰ من غیرهم۔ (حلبی کبیری ص۶۱۵ فصل فی احکام المسجد) [۲]

---

[۱] وقال العلامة حموی رحمه الله : واجمع العلماء سلفاً وخلفاً علیٰ استحباب ذکرالله تعالیٰ جماعة فی المساجد وغیرها من غیرنکیرالا ان یشوش جهرهم بالذکر علیٰ نائم اومصلی اوقاری کماهومقرر فی کتب الفقه۔

(عیون البصائرحاشیة الاشباه والنظائر ج۴ ص۱۶ الفول فی احکام المسجد)

وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج۵ ص۲۲۴ کتاب السیر۔الفصل الاول فی بیان صفة الجهاد۔

[۲] وقال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : فیکون اولیٰ بولایة لمن اتخذ مسجداً یکون اولیٰ بعمارته ونصب المؤذن فیه۔

(البحرالرائق ج۵ ص۲۲۶ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۳۳ کتاب الوقف۔

غیر آباد مسجد کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں

سوال:۔ خدانخواستہ اگر کوئی مسجد ویران ہو جائے اور لوگ اس میں نمازیں پڑھنا چھوڑ دیں تو اس کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا ازروئے شریعت درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس زمین پر ایک دفعہ شرعی مسجد بن جائے تو قیامت تک کے لیے وہ مسجد ہی رہتی ہے اس میں کسی قسم کی فصل کاشت کرنا یا کسی دوسرے دنیاوی کام کے لئے استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے اگرچہ ویران ہی ہو جائے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: يبقى مسجداً ابداً الى يوم القيامة وبه يفتى۔
(الدر المختار على هامش رد المختار ج۴ ص۳۵۸ الوقف۔ مطلب فيما لو خرب المسجد)

مسجد کے لیے موقوفہ مکانات میں سے تبلیغی حضرات کے لیے مکان وقف کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک جامع مسجد بناتے وقت ابتداءً مسجد کے نیچے کچھ مکانات تعمیر کرکے کرائے پر دے دیئے گئے اور ان کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر صرف ہو رہی ہے، اب مسجد کی موجودہ انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان مکانات میں سے ایک مکان تبلیغی حضرات کے لیے وقف کیا جائے تو کیا عند الشرع یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اگر ان واقفین نے مکانات کے متعلق کوئی تصریح نہ کی ہو بلکہ مطلقاً وقف کیا ہو تو متولی اور انتظامیہ مسجد کے اہل حل وعقد کے لیے ایسا کرنا جائز ہے، وہ اس مکان کو تبلیغی حضرات کی سکونت کے لیے استعمال کرسکتے ہیں ورنہ واقفین کی شرائط کی پابندی ضروری ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: قال واذا اراد القيم ان يبنى

ے وقال العلامة الكاسانیؒ: واما الذى يرجع الى نفس الوقف فهو التابيد وهو ان يكون مؤبداً حتى لو وقت لم يجز لانه ازالة الملك لا الى حد۔
(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ كتاب الوقف والصدقة۔ الفصل واما شرائط الجواز)
ومثله فى الهداية ج۳ ص۶۳۹ كتاب الوقف۔

فيها قرية لاكرتها وحفاظها فيحرز فيها الغلة لحاجته إلى ذلك كان له ان يفعل ذلك۔ .الفتاوى التاتارخانية ج۵ ص۷۴۵ کتاب الوقف۔الفصل السابع في تصرف القيم۔الخ [1]

مسجد کے لیے وقف شدہ گھڑی کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی

سوال:۔کسی جگہ پر فوج کے دو یونٹ اکٹھے قیام پذیر تھے، وہاں پر ایک مسجد بھی تھی جس کے لیے ان فوجیوں نے مشترکہ طور پر چندہ کر کے ایک گھڑی خرید کر وقف کی، کچھ مدت گزرنے کے بعد ایک یونٹ والے وہاں سے جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ یہ وقف شدہ گھڑی ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے، اب سوال یہ ہے کہ اس یونٹ والوں کا مذکورہ گھڑی کو اپنے ساتھ لے جانا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب: صورت مذکورہ کے مطابق یہ گھڑی چونکہ مسجد کے لیے وقف کی گئی اور وقف تام ہونے کے بعد وہ کسی کی ملکیت نہیں رہی، لہٰذا اس موقوفہ گھڑی کو کسی بھی یونٹ والے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني: إذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔ (الهداية ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف) [2]

قبرستان کے لیے وقف شدہ زمین پر جنازہ گاہ بنانے کا حکم

سوال:۔ایک شخص نے قبرستان

---

[1] وقال العلامة فخر الدين الرازي الشهير بقاضي خان: وكذا لو كان الوقف خانا على الفقراء واحتاج الى خادم يكسح الخان ويقوم ويفتح بابه ويسده فسلم بعض البيوت الى رجل اجرة له ليقوم بذلك كان له ذلك - (فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج۳ ص۳۰۱ كتاب الوقف، باب الرجل يجعل داره مسجدا)

ومثله في الهندية ج۲ ص۴۶۱ كتاب الوقف۔الفصل الثاني في الوقف على المسجد.....في مال الوقف۔

[2] وقال العلامة التمرتاشي: فاذا تم ولزم (اى الوقف) لا يملك ولا يعار ولا يرهن اى لا يقبل التمليك لغيره بالبيع - (تنوير الابصار على صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ كتاب الوقف)

ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ كتاب الوقف۔فصل واما الذي يرجع الى الموقوف فانواع -

کے لیے زمین وقف کی، اب چونکہ قبرستان کے لیے جنازہ گاہ کی بھی اشد ضرورت ہے تو کیا واقف کی اجازت سے اس وقف شدہ زمین میں جنازہ گاہ بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ وقف میں واقف کی نیت معتبر ہوگی لہٰذا اس کے لیے سوائے معصیت کے ہر قسم کے تصرفات جائز ہیں، اور مذکورہ صورت میں جنازہ گاہ چونکہ ضروریاتِ مقبرہ میں سے ہے اور واقف کی اجازت بھی موجود ہے لہٰذا جنازہ گاہ بنانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان یجعل ماله حیث شاء مالم یکن معصیة وله ان یخص صنفاً من الفقراء۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۴۳ مطلب شرائط الوقف المعتبرة)[1]

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین کی آمدن مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا

سوال: کسی شخص نے اپنی زمین مسجد کیلئے وقف کرکے اُسے کرایہ پر دیدیا جس سے کافی آمدنی حاصل ہوئی، تو سوال یہ ہے کہ اس موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے وقف کی گئی ہو اور اس سے آمدنی بھی حاصل ہوتی ہو تو متولی کے لیے اس آمدنی کو مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا جائز ہے۔

لما فی الهندیة: مسجد له مستغلات واوقاف اراد المتولی ان یشتری من غلة الوقف للمسجد دهناً وحصیراً وحشیشاً....... تفعل ما تری من مصلحة المسجد کان له ان یشتری للمسجد ما شاء وان لم یوسع۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۱ کتاب الوقف الفصل الثانی.... فی مال الوقف)[2]

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: شرط الواقف کنص الشارع یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف۔ وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۱۲۶ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابن عابدینؒ: والذی یبدأ به ارتفاع الوقف ای من غلته عمارته شرط الواقف اولا ثم ما هو اقرب الی العمارة واعم للمصلحة کالامام للمسجد..... ثم السراج والبساط الی آخر المصالح۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۶۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۷ کتاب الوقف۔ باب الرجل یجعل داره مسجداً۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کے درختوں کا حکم | **سوال**:۔ ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کی ، مسجد کی دیوار سے ملحق ہی واقف کا گھر ہے، واقف نے وقف شدہ مسجد کے صحن میں اخروٹ کے درخت لگائے تھے، اب وہ کہہ رہا ہے کہ ان درختوں کے پھل پر صرف میرا ہی حق ہے جبکہ اہلِ محلہ اس کو اس سے منع کرتے ہیں اور اس کو پورے محلہ کا حق قرار دیتے ہیں، شرعاً اس پھل کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ وقف میں واقف کے قول کو اعتبار دیا جائے گا، مذکورہ صورت میں واقف نے اگر وقف کرتے وقت تصریح کی ہو کہ میں نے اس درخت کو بھی وقف کیا تھا یا کچھ بھی نہ کہا ہو تو دونوں صورتوں میں درخت وقف ہوگا، البتہ اگر وقف کرتے وقت واقف نے اس درخت کا استثناء کیا ہو تو اس صورت میں واقف کے قول کا اعتبار کرکے درخت وقف شمار نہ ہوگا بلکہ واقف کی علیحدہ ملکیت متصور ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الاسعاف ویدخل فی وقف الارض مافیها من الشجر والبناء دون الزرع۔ (ردالمحتار ج۳ ص۳۶۱ مطلب فی وقف المنقول تبعاً للعقار) [1]

پرانے قبرستان پر مسجد بنانے کا حکم | **سوال**:۔ ایک مسجد کے متصل بہت پرانا قبرستان ہے جس میں دو سو سال سے کسی بھی میت کو دفن نہیں کیا گیا، اب اہلِ محلہ مسجد میں توسیع کے خواہشمند ہیں اور قبرستان کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنا چاہتے ہیں، تو کیا محلہ والوں کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مذکورہ قبرستان اگر موقوفہ ہو اور اموات کے اجسام ظنِ غالب میں خاک ہو چکے ہوں اور گاؤں والوں نے اس میں اموات کو دفنانا چھوڑ دیا ہو تو پھر اس قبرستان کو مسجد میں شامل کرنا قابلِ اعتراض نہیں۔

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان الوقف کالبیع لا یدخل فیھا الزرع والثمر الا بالذکر۔ (البحرالرائق ج۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف۔)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف۔ الفصل الثالث۔

لما قال فی الهندیة : لو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ ۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۶۷ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز) ؎۱

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال :- کیا محلہ والے یا حاکم وقت متولئ مسجد کو معزول کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :- متولی مسجد اور اسی طرح امام مسجد کو بغیر خیانت کے کوئی بھی معزول نہیں کر سکتا البتہ اگر شرعی جرم ثابت ہو جائے تو متولی اور امام مسجد کو اہل محلہ یا قاضی معزول کرنے کے مجاز ہیں ۔

لما قال فی الهندیة : ولو ان الواقف شرط الولایة لنفسہ وکان الواقف غیر مأمون علی الوقف فللقاضی ان ینزعها من یدہ ۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۰۹ کتاب الوقف، الباب الخامس فی ولایة الوقف) ؎۲

طریق عام کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم

سوال :- ایک شخص نے مسجد کیلئے زمین وقف کی جو کہ طریق عام کے ساتھ متصل ہے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ مسجد نمازیوں کیلئے ناکافی ہوتی جا رہی ہے، اہل محلہ کا ارادہ ہے کہ اس عام راستہ سے زمین کا کچھ حصہ مسجد میں فراخی کے لیے شامل کر لیا جائے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر راستہ کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنے سے راستہ تنگ نہ ہوتا ہو

؎۱ وقال العلامة ابن عابدینؒ : ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ ۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۵۹ کتاب الجنائز ۔

ومثلہ فی الهندیة ج۲ ص۱۶۷ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز ۔ الفصل السادس ۔

؎۲ ولما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللّٰہ : لا یصح عزل صاحب وظیفة بلا جنحة او عدم اهلیة ـــــ قال فی البحر واستفید من عدم عزل الناظر بلا جنحة عدمها لصاحب وظیفة فی وقف بغیر جنحة وعدم اهلیة

(رد المحتار ج۴ ص۳۸۲ کتاب الوقف)

ومثلہ فی الهدایة ج۳ ص۶۴۳ کتاب الوقف ۔

اور لوگوں کو آمد و رفت میں تکلیف نہ ہوتی ہو تو ایسا کرنا شرعاً مرخص ہے ورنہ نہیں؟

لما قال العلامة فخر الدين عثمان الزيلعي رحمه الله: اذا بنى قوم مسجداً واحتاجوا الى مكان ليتسع فادخلوا شيئاً من الطريق فى المسجد وكان ذلك لا يضر باصحاب الطريق جاز ذلك۔ (تبيين الحقائق ج ۳ ص ۳۳۱ كتاب الوقف، فصل ومن بنى مسجداً الخ)[1]

مسجد کی زمین پر ڈاکخانہ بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف بھی تام ہوا ہے، اب حکومت اس مسجد کے ایک گوشہ میں ڈاک خانہ بنانا چاہتی ہے جس کی آمدنی مسجد کو ملے گی لیکن ملکیت حکومت کی رہے گی، اب سوال یہ ہے کہ مسجد کے لیے وقف شدہ زمین حکومت کے اغراض ومقاصد کے لیے دینا شریعتِ مقدسہ کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے ایک دفعہ وقف کی گئی ہو تو اس میں ماسوائے مسجد کے متعلقہ امور کے دیگر امور مثلاً دوکان یا ڈاکخانہ وغیرہ بنانا جائز نہیں کیونکہ واقف کی نیّت سے مخالفت لازم آتی ہے اور واقف کی نیّت کے خلاف کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: ماخالف شرط الواقف فهو مخالف للنص والحكم به حكم بلا دليل۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۴۹۵ كتاب الوقف)[2]

---

[1] لما قال العلامة شهاب الدين احمد شلبيؒ: طريق للعامة وهي واسعة فبنى فيه اهل المحلة مسجداً للعامة ولا يضر ذلك بالطريق قالوا لا بأس به. قوم بنوا مسجداً واحتاجوا الى مكان ليتسع المسجد فاخذوا من الطريق فادخلوه فى المسجد اذا كان ذلك يضر باصحاب الطريق لا يجوز والا فلا بأس به. (شلبي على هامش تبيين الحقائق ج ۳ ص ۳۳۱ كتاب الوقف) ـــ ومثله فى البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۶ كتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابن عابدينؒ: وما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حكم بلا دليل اى لا دليل عليه سواء كان نصه فى الوقف نصاً او ظاهراً وهذا موافق لقول مشائخنا كغيرهم شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه كما صرح به فى شرح المجمع۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۴۹۴ كتاب الوقف)

ومثله فى الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ كتاب الوقف۔

مسجد میں خیاطت کرنے کا حکم

سوال :۔ مسجد میں خیاطت کرنا (کپڑے سینا) شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ خیاطت کا تعلق چونکہ دنیاوی امور سے ہے اور مسجد میں دنیاوی امور سے اجتناب ضروری ہے، لہٰذا مسجد میں خیاطت (درزی کا کام) کرنا شرعاً مکروہ ہے البتہ اگر کوئی مسجد کی حفاظت کے واسطے مسجد میں کپڑوں کی سلائی کا کام کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال الشیخ ابراهیم الحلبی رحمه الله : والخیاطة فیه تکره الا اذا کان لضرورة حفظه عن الصبیان و نحوهم ۔

(حلبی کبیری ص۶۱۱ کتاب الصلوٰة. فصل فی احکام المسجد)[1]

متولی مسجد اور اہلِ محلہ کی اجازت کے بغیر مسجد کی تعمیرات میں تصرّف کرنا

سوال :۔ ایک شخص نے زمین خرید کر اس پر مسجد بنائی اور بعد میں وہ اس مسجد کا متولی مقرر ہوا ، اب دوسرے محلے کا ایک شخص اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جبکہ متولی اس کی اجازت نہیں دے رہا ، تو کیا از روئے شرع متولی کا انکار جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں متولی مسجد اور اہلِ محلہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے محلہ والے کو اس مسجد میں هدماً و بناءً تصرّف کرنا جائز نہیں ، ایسے معاملات کے اختیارات صرف اہلِ محلہ اور متولی ہی کو حاصل ہو سکتے ہیں نہ کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو ۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : ارادو نقض المسجد وبناءه واحکم من الاول ان لم یکن البانی من اهل المحلة لیس لهم ذلك وان کان

---

[1] وقال العلامة حافظ الدین محمد بن محمد البزاز رحمه الله : والخیاطة فیه تکره الا اذا کان لحفظ المسجد عن الصبیان وخاط وکذا الکاتب۔

(البزازیة علی هامش الهندیة ج۴ ص۸۲ کتاب الصلوٰة الفصل السادس والعشرون)

ومثله فی الاشباه والنظائر ج۴ ص۵۶ القول فی احکام المسجد ۔

من اهل المحلة لهم ذلك ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد)[1]

بانی مسجد کے لیے لوگوں کو مسجد سے منع کرنا ناجائز ہے

سوال:- ایک مسجد کے لیے کچھ زمین وقف تھی، کسی نے اس زمین پر اپنے خرچ سے مسجد بنائی اور مسجد کی آبادی میں کسی نے بھی اس سے تعاون نہیں کیا، اب اس بانی کے ساتھ اہلِ محلہ اور پیش امام کی ناراضگی پیدا ہوگئی ہے جبکہ بانی مسجد یہ چاہتا ہے کہ اہلِ محلہ اور پیش امام کو مسجد میں آنے جانے سے روک دے، تو کیا شریعت کی رُو سے یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- بشرط صدق وثبوت بانی مسجد کا پیش امام یا اہلِ محلہ کو مسجد سے منع کرنا شرعاً حرام ہے ۔

لما قال اللّٰہ تبارك وتعالیٰ: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۱۴)[2]

ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر خرچ کرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا اس وقت درست ہے جب اس مسجد کو اس کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر فی الحال اس چندہ کی مسجد کو ضرورت نہ ہو اور آئندہ ضرورت پیش آنے کا امکان ہو تو پھر بھی دوسری مسجد میں اس چندہ کا استعمال

---

[1] وقال فی الهندیة: وفی الکبریٰ مسجد مبنی اراد رجل ان ینقضه ویبنیه ثانیاً احکم من البناء الاول لیس له ذلك لانه لا ولایة له کذا فی المضمرات ۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۵۷ کتاب الوقف الباب الحادی عشر)
ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۲۶۸ کتاب الوقف باب فی الرابع المسجد

[2] وقال العلامة بیضاوی رحمه اللّٰہ: عام لکل من خرب مسجداً او سعی فی تعطیل مکان مرشح للصلوٰة ۔ (تفسیر بیضاوی ج۱ ص۱۰۲ ۔ سورة البقرة)
ومثله فی تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۱۵۶ سورة البقرة ۔

درست نہیں، تاہم اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو پھر کسی دوسری مسجد پر صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : وعن الثانی ینقل الی مسجد آخر باذن القاضی ...... حشیش المسجد وحصرہ مع الاستغناء عنهما وکذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف فی وقف المسجد والرباط والبئر والحوض الی اقرب مسجد او رباط او حوض ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف)[۱]

مسجد کی چھت کی پرانی چادروں کا حکم

سوال :- ایک مسجد جو کہ ۱۹۰۵ء میں تعمیر کی گئی تھی اور اس کی چھت چادروں کی تھی بعد میں اسے شہید کرکے اس میں توسیع کی گئی اور اس کے ساتھ ہی اہل محلہ پیش امام کیلئے ایک مکان بھی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اب اگر اس مسجد کی پرانی چادروں کو پیش امام کے گھر میں استعمال کیا جائے تو شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر یہ چادریں مسجد کے کسی کام میں استعمال نہ ہوسکتی ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کو فروخت کرنا یا امام صاحب کے گھر میں استعمال کرنا از روئے شریعت مرخص ہے بلکہ ان کو فروخت کرکے رقم مسجد کی تعمیر جدید میں خرچ کرنا بھی جائز ہے ۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : سئل ابوبکر عن حشیش المسجد یخرج من المسجد ایام الربیع ؟ قال ان لم یکن له قیمة فلا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس برفعه والانتفاع به ۔ (فتاوی تاتارخانیة ج۵ ص۸۵۵ کتاب الوقف، الفصل الحادی والعشرون فی المساجد)[۲]

---

[۱] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجد او حوض خرب ولا یحتاج الیه لتفرق الناس هل للقاضی ان یصرف اوقافه الی مسجد آخر او حوض آخر؟ قال نعم ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۸۷۸ کتاب الوقف) ــــ ومثله فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۳ ۔

[۲] وقال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : حشیش المسجد اذا اخرج من المسجد ایام الربیع ان لم یکن له قیمة لا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس بدفعه والانتفاع به ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۵ کتاب الوقف، الفصل الرابع)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۵۹ کتاب الوقف، الباب الحادی عشر ۔

متولیٔ مسجد کی وفات کے بعد مسجد کے اختیارات کا حکم

سوال :- ایک آدمی کسی مسجد کا بانی تھا اور مسجد کے تمام اختیارات اس کو حاصل تھے، تو اس کی وفات کے بعد اس کے اختیارات اُس کی اولاد کو منتقل ہو سکتے ہیں؟

الجواب :- مسجد کے بانی اور متولی کو تمام تر اختیارات شرعاً حاصل ہوتے ہیں اور مسجد کے لیے مؤذن، امام وخطیب وغیرہ مقرر کرنا اسی کا حق ہوتا ہے، لہٰذا اس کی وفات کے بعد تمامتر اختیارات اس کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوں گے، وہ اپنی خوشی سے مسجد کے امور میں جائز اور مناسب تصرفات کرنے کی شرعاً مجاز ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ رحمه الله : والباني احق بالامامة والاذان وولده من بعده وعشیرته اولیٰ بذٰلك من غیرهم وفي المجرد عن ابي حنیفةؒ ان الباني اولیٰ بجمیع مصالح المسجد ونصب الامام والمؤذن اذا تأهل للامامة۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۹ کتاب الوقف) لہ

مسجد کا پنکھا گھر میں استعمال کرنا جائز نہیں

سوال :- ایک شخص نے مسجد کے لیے پنکھا خریدا اور مسجد کے لیے وقف کیا، تو کیا مسجد کا پیش امام اس پنکھے کو اپنے گھر میں استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- صورت مسئولہ کے مطابق اگر یہ پنکھا واقعۃً مسجد کے لیے وقف شدہ ہو تو مسجد کے پیش امام کے لیے اس پنکھے کا اپنے گھر میں استعمال شرعاً جائز نہیں، اگرچہ پیش امام کا وجود مصالح مسجد میں سے ہے تاہم اگر واقف نے علی الاطلاق نیت کی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال في الهندية : متولي المسجد لیس له ان یحمل سراج المسجد

لہ وقال الشیخ ابراهیم الحلبي رحمه الله : وكل اولاد الباني وعشیرته من بعده اولیٰ من غیرهم۔ (حلبي كبیري ج ص ۶۱۵ فصل في احكام المسجد)
ومثله في خلاصة الفتاویٰ ج ۴ ص ۴۲۱ كتاب الفصل، الباب الرابع۔

الیٰ بیتہٖ ولہٗ ان یحملہ من البیت اِلیٰ المسجد ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف)[1]

مسجد میں نکاح پڑھانے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ مسجد میں نکاح پڑھانے کو سنت سمجھتے ہیں، کیا واقعی مسجد میں نکاح پڑھانا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح پڑھانا خود ایک مسنون عمل ہے جو عبادت کا ایک شعبہ ہے اسلئے مسجد میں نکاح کے ایجاب وقبول کرانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم ایسے مواقع پر کوئی ایسی حرکت کرنا جو مسجد کے آداب کے منافی ہو سے اجتناب کرنا اشد ضروری ہے ۔

لما ورد فی الحدیث : عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلنوا ھٰذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف۔

(مشکوٰۃ ج۲ ص۲۷۲ کتاب النکاح)[2]

ذکر واذکار اور نماز میں مشغول لوگوں کو سلام کرنے کا حکم

سوال:۔ مسجد میں لوگ عموماً ذکر واذکار اور نماز میں مشغول ہوتے ہیں، تو ایسی حالت میں مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے اُن پر سلام کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنے والا شخص بھی حکماً ذاکر ہے جیسا کہ روایت

---

[1] وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ : متولی المسجد لیس لہٗ ان یحمل سراج المسجد اِلیٰ بیتہ ولہٗ ان یحمل من البیت الی المسجد۔

(خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف۔ الفصل الرابع)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۵ ص۸۵۱ کتاب الوقف الفصل الحادی والعشرون ۔

[2] وقال فی الھندیۃ : مباشرۃ عقد النکاح فی المساجد مُسْتَحَبٌّ ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۲ ص۲۸۴ کتاب النکاح۔

سے ثابت ہے، اس لیے یہ بھی ذاکر کے حکم میں ہو کر اس کو سلام کرنا جائز نہیں، تاہم اگر کوئی نماز کے بعد ویسے ہی فارغ بیٹھا ہو تو اسے سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما ورد فی الحدیث : قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من جلس مجلس ینتظر الصلوٰۃ فھو فی الصلوٰۃ ۔ (ترمذی ج۱ ص۱۱۱ ابواب الجمعۃ) [1]

مسجد میں تھوکنے کا حکم

سوال:۔ سنا ہے کہ انسان کے منہ سے نکلنے والا تھوک پاک ہے، اس کے پاک ہونے کی صورت میں کیا مسجد میں تھوکنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کا گھر اور مسلمانوں کی عبادت گاہ ہیں اس لیے ان کی عظمت اور عزت برقرار رکھنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، ایسے کام جن میں حقارت کا معمولی سا شائبہ بھی ہو ان سے بھی مساجد کو پاک رکھا جائے۔ مسلمان کی تھوک اگرچہ بالاتفاق پاک ہے لیکن مسجد کی عظمتِ شان اور آداب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں تھوکنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الشیخ ابراھیم الحلبیؒ :۔ ولا یبزق علی حیطان المسجد ولا علی ارضہ ولا علی البواری وکذ المخاط لکن یأخذہ بطرف ثوبہ ویدلک بعضہ ببعض ۔ (کبیری ص۶۱۲ فصل فی احکام المسجد)

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر پیش امام کا تصرف کرنا

سوال: مسجد کے ساتھ متصل زمین مسجد کے

---

[1] وقال فی الھندیۃ : ویکرہ السلام عند قرأۃ القرآن جھراً وکذا عند مذاکرۃ العلم وعند الاذان والاقامۃ والصحیح انہ لا یرد فی ھٰذہ المواضع ایضاً ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراھیۃ ۔ الباب السابع)
ومثلہ فی رد المحتار ج۱ ص۴۵۶ باب ما یفسد الطلاق ۔ مطلب المواضع التی یکرہ فیھا السلام ۔

[2] لما ورد فی الحدیث : قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم البزاق فی المسجد خطیئۃ وکفارتھا دفنھا ۔ (ابوداؤد ج۱ ص۶۸ باب کراھیۃ البزاق فی المسجد)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ ۔ الباب الخامس ۔

مصارف کے لیے وقف کی گئی تھی، اس زمین میں مسجد کا پیش امام اپنے لیے کھیتی باڑی کرتا رہا، کچھ عرصہ بعد پیش امام نے چپکے سے مسجد کی انتظامیہ یا کسی اور کو بتائے بغیر اس زمین کا سرکاری کاغذات میں انتقال اپنے نام کرالیا ہے، تو پیش امام کے اس اقدام کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا یہ زمین پیش امام کی ملکیت ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مذکورہ زمین مسجد اور مسجد کے مصالح کے لیے وقف کی گئی ہے جس میں پیش امام کی شخصیت کا کوئی دخل نہیں، لہٰذا مسجد کے مصارف کے لیے جو چیز وقف ہو وہ مسجد ہی کا حق ہے اور پیش امام کا قبضہ اور اپنے نام انتقال کرانا شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے پیش امام کا یہ اقدام خلافِ شرع ہو کر اس زمین کا مالک متصور نہ ہوگا۔

لما قال فی الهندیة: ارض وقف علیٰ مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضاً للعامة لا یجوز للمسلمین انتفاع عاد ذٰلک الحوض۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف الفصل الثانی)

ایک مسجد کی موجودگی میں دوسری مسجد تعمیر کرنا

سوال:۔ ایک وسیع و عریض مسجد کے باوجود بعض لوگ امام سے اختلاف کا بہانہ بنا کر دوسری مسجد تعمیر کریں تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے قوم میں بے اتفاقی کا احتمال بھی ہو۔

الجواب:۔ ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے قوم میں بے اتفاقی اور اختلافات کا ذریعہ بننا بدقسمتی کی دلیل ہے۔ اگر امام سے اختلاف ذاتی وجوہات یا غیر شرعی امور کی وجہ سے ہو تو ایسے اختلافات کا شکار ہونا خود بھی گناہ ہے، پھر اس ایک گناہ کے ارتکاب کے بعد مسلمانوں میں بے اتفاقی کا موقع فراہم کرنا دوسرا بڑا جرم ہے۔ ایسی صورت میں دوسری مسجد بنانے کی ضرورت نہیں۔ تاہم اگر ان واقعات کی وجہ سے کوئی شخص زمین باقاعدہ وقف کرکے اس پر مسجد بنائے تو دوسری مسجد بھی مسجدِ شرعی رہے گی، اس کے ذاتی اغراض کا معاملہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔ البتہ بوقتِ ضرورت یا باہمی اختلافات سے بچنے کے لیے دوسری مسجد بنانا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم الحلّة المسجد وضربوا فیه حائطاً ولکل منهم امام علیٰ حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۵ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکره فیها)

مسجد کے بعض حصّہ کو سڑک میں شامل کرنا

سوال:- ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جو اپنے رقبہ کے لحاظ سے نمازیوں کی تعداد کے مقابلہ میں کافی وسیع ہے، اور مسجد کے متصل ایک سڑک بھی بن رہی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کا کچھ حصّہ اس سڑک میں شامل کر دیا جائے تاکہ سڑک وسیع ہو کر لوگوں کے مفاد میں بہتر ثابت ہو۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کا کچھ حصّہ افادۂ عام کے لیے سڑک میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:- جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اسے کسی اور کام میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں اگرچہ فوائد اس میں زائد ہوں، لہٰذا مسجد کا کوئی بھی حصّہ سڑک میں شامل کرنا جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ (جعل شی) ای جعل البانی شیئاً (من الطریق مسجداً) لضیقه ولم یضر بالمارین (جاز) لانهما للمسلمین (کعکسه) ای کجواز عکسه وهو ما اذا جعل فی المسجد ممر لتعارف اهل الامصار فی الجوامع وجاز لکل احد ان یمر فیه حتی الکافر الا الجنب والحائض والدواب زیلعی (کما جاز جعل) الامام (الطریق مسجداً لا عکسه) لجواز الصلوٰة فی الطریق لا المرور فی المسجد۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۷۷ احکام المساجد کتاب الوقف) [۱]

مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا

سوال:- مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا جیسا کہ آجکل جلسوں میں ہوتا ہے شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- مساجد میں بلند آواز سے تقریر کرنا اور ایسے ہی نعت خوانی کرنا اگر کسی نمازی کی نماز میں باعثِ تشویش نہ ہو تو جائز ہے، لیکن اگر کہیں نمازیوں کی نماز میں تشویش کا ذریعہ ہو تو مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ انشاد ضالة او شعر الا ما فیه ذکر ورفع صوت بذکر الا للمتفقهة۔

---

[۱] وفی الهندیة ان ارادوا ان یجعلوا شیئاً من المسجد طریقاً للمسلمین فقد قیل لیس لهم ذلك وانه صحیح کذا فی محیط۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۶ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فِی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۵ کتاب الوقف۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول وفی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانیؒ اجمع العلماء سلفاً وخلفاً علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الاان یشوش جهرهم علی نائم او مصل او قاری۔ الخ۔ (ردالمحتار ج ا ص۶۶۰ احکام المساجد کتاب الصلوٰة) ؎۱

سرکاری زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا

سوال:۔ ایک مقام پر بعض لوگوں نے گورنمنٹ کی زمین پر جبراً قبضہ کرکے مسجد تعمیر کرلی جبکہ حکومت نے انہیں مسجد بنانے کی اجازت نہیں دی۔ اب حکومت اپنے نقشہ کے مطابق شہر کی تعمیر چاہتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسی غصب شدہ زمین پر بنائی گئی مسجد مسجدِ شرعی کے حکم میں ہے؟ اور کیا حکومت اس کو منہدم کرکے اپنے مصرف میں لاسکتی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کے لیے واقف کا ملکِ تام ہونا شرط ہے، جبکہ یہ زمین حکومت کی ملکیت ہے، تو عوام کو حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا جائز نہیں۔ کسی کی زمین پر جبراً قبضہ کرکے وہاں مسجد بنالی جائے تو وہ شرعی مسجد نہیں، اسلئے اگر حکومت ایسی مسجد کو منہدم کرکے اس جگہ کو کسی اور مصرف میں استعمال کرے تو جائز ہے تاہم اگر ضرر نہ ہو تو اسی جگہ مسجد کو باقی رکھنا بہتر ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افاد ان الواقف لا بد ان یکون مالکا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب وان لا یکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالك وقف الفضولی جاز۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار ج ۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة) ؎۲

؎۱ فی الصحیح البخاری عن السائب بن یزید قال: کنتُ قائماً فی المسجد فحصبنی رجلٌ فنظرت الیه فاذا عمر بن الخطابؓ اذهب فأتنی بهذین فجئته بهما فقال ممن انتما او من این انتما قال من اهل الطائف قال لو کنتما من اهل البلد لاوجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (الصحیح البخاری ج ۱ ص۶۷ باب رفع الصوت فی المسجد)

ومثلُهٗ فی الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص۲۰۴ کتاب الصلوٰة۔

؎۲ قال ابن نجیمؒ: الخامس من شرائط الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفاً۔

(البحرالرائق ج ۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف) ومثلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف۔

مسجد کے مسبع ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد جو کہ عوام کے تعاون سے تعمیر کی گئی ہے لیکن ڈیزائن اور نقشہ کے لحاظ سے مسبع ہے جبکہ عام مساجد کی تعمیر مربع اور مستطیل شکل میں ہوتی ہے اور فقہاء اُمت کے اقوال سے بھی اس کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مروجہ طریقہ کو چھوڑ کر جدید طریقہ سے مسجد بنانا جائز ہے؟ جبکہ اس مسجد کا ڈیزائن بعض غیر مسلم عبادت گاہوں سے بھی متشابہ ہے؟

الجواب:۔ مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہ اور شعائر اللہ میں سے ہیں جن کا مقصد یادِ الٰہی اور صلوٰۃ واذکار ہیں، ان کی یہ حیثیت تب برقرار رہتی ہے جب یہ اسلامی مساجد کی ہیئت اور شکل وصورت کی طرح ہوں اور ان کو بعض غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں کا ہم شکل بنانا جائز نہیں، تاہم اگر تشبیہ کی نیت کے بغیر محض جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایسا نقشہ اختیار کیا گیا ہو تو پھر اس مسجد کی شرعی حیثیت پر یہ نقشہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۔ الآیۃ (سورۃ ھود، رکوع ۱۰)

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم۔ رواہ احمد وابوداؤد۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص۳۷۵ کتاب اللباس)[1]

مسجد میں گم شدہ چیزوں کے اعلان کا حکم

سوال:۔ لاؤڈ سپیکر سے استفادہ کی خاطر عموماً گم شدہ اور جلسوں کے اعلانات مساجد میں ہوتے رہتے ہیں، کیا ازروئے شرع یہ امور جائز ہیں؟

الجواب:۔ مسجد عبادت گاہ ہے اس لیے جو چیز مسجد سے باہر گم ہو گئی ہو تو اس کا اعلان مسجد میں کرنا جائز نہیں البتہ جو چیز مسجد میں گم ہوئی ہو تو اس کا اعلان مسجد کے اندر بھی مرخص ہے۔ اسی طرح مسجد میں گم شدہ بچے کا اعلان کرنا انسانی جان کی عظمت کی وجہ سے جائز ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: یکرہ انشاد الضالۃ) قال السید احمد الطحطاوی فی حاشیۃ علی الدر المختار تحت قولہ وانشاد الضالۃ لقولہ علیہ السلام اذا رأیتم من ینشد الضالۃ فی المسجد فقولوا لا ردھا اللہ علیک قولہ الا ما فیہ ذکر نحوہ الموعظۃ لانہ

---

[1] ومثلہ فی ابی داؤد ج ۲ ص۲۰۳ کتاب اللباس، باب القمیص

كان ينشد الشعر بين يديه صلى الله عليه وسلم وهو فى المسجد و يأمر حسانا بذلك۔
(الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص۲۷۸ مکروهات الصلوٰة۔ فصل فی احکام المساجد) لـه

مسجد کی جائداد موقوفہ پر دعویٰ ارث

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی اور مکان کسی شخص نے مسجد کی ضروریات کے لیے وقف کیا، امام کو مسجد کے مکان میں رہائش کی اجازت دی گئی، جب تک موصوف مسجد کے امام تھے تو ان سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا لیکن موصوف کی رحلت کے بعد اس کے پسماندہ ورثاء مکان پر قبضہ جما کر مالکانہ حقوق کا دعویٰ کر رہے ہیں۔۔۔ کیا مسجد کی موقوفہ جائداد پر کسی کے ارث کا دعویٰ درست ہے؟

الجواب:۔ اگر مکان اور زمین مسجد کی ضروریات کے لیے وقف ہوں تو امام صاحب کے پسماندہ ورثاء بطور وراثت اس پر قابض نہیں ہو سکتے، کیونکہ مسجد کے لیے وقف شدہ چیز کسی کی ملک نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ مسجد کی ضروریات کے لیے ہی استعمال ہوگی۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم يكن له ان يرجع فيه ولا يبيعه ولا يورث عنه لانه يحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالىٰ وهذا لان الاشياء كلها لله تعالىٰ۔ (الهداية ج ۲ ص۶۰۶ كتاب الوقف، فصل فى المسجد) ـه

لـه لما قال العلامة محمد يوسف البنوری: واما انشاد الضالة فلها صورتان احدهما وهي اقبح واشنع بأن يضل شئ خارج المسجد ثم ينشد فى المسجد لاجل اجتماع الناس فيه۔

والثانية ان يضل فى المسجد نفسه فينشده فيه وهذا يجوز اذا كان من غير لغط وشغب۔ (معارف السنن ج ۳ ص۳۱۳ باب ماجاء فى كراهية البيع والشراء۔۔۔ والشعر فى المسجد)

وَمِثْلُهٗ فى ردالمحتار ج ۱ ص۶۶۰ مطلب فى افضل المساجد، كتاب الصلوٰة۔

ـه و فى الهندية: اما حكمه عندهما زوال العين عن ملكه الى الله تعالىٰ وعند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ حكمه صيرورة العين محبوسة على ملكه بحيث لا تقبل النقل عن ملك الى ملك والتصدق بالغلة المعدومة متى صح الوقف بان قال جعلت ارضى هذه صدقة موقوفة مؤبدة او اوصيت بها بعد موتى فانه يصح حتى لا يملك بيعه ولا يورث عنه لكن ينظر ان خرج من الثلث يجوز۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص۳۵۲ الباب الاول فى تعريف الوقف، كتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فى ردالمحتار ج ۴ ص۳۵۱/۳۵۲ كتاب الوقف۔

مسجد میں کھانے پینے کا حکم

سوال:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں تو ان میں کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد میں کھانا پینا صرف معتکف کے لیے جائز ہے، البتہ غیر معتکف یا مقیم وغیرہ اگر کسی وجہ سے مسجد میں کھانا کھانا چاہتے ہیں تو بغیر نیت اعتکاف کے مکروہ ہے، لہٰذا مسجد میں کھانا کھاتے وقت اعتکاف کی نیت کر لی جائے۔ مسجد کے ساتھ متصل زمین یا کمرہ کو چھوڑ کر بعینہ مسجد میں ہی کھانا کھانا اچھا نہیں۔

وفی الهندیة: ویکره النوم والاکل لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلک ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیه ویذکر الله تعالیٰ بقدر ما نوی اویصلی ماشاء کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیه ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة۔ الباب الخامس فی آداب المسجد)[1]

مدرس کو مسجد کے فنڈ سے اُجرت دینا

سوال:۔ مسجد میں بچوں کو پڑھانے والے استاد کو مسجد کے فنڈ سے اُجرت دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مدرس کو مسجد کے لیے جمع شدہ فنڈ سے تنخواہ دینا جائز نہیں کیونکہ مدرس مسجد کے مصارف میں سے نہیں ہے، اس لیے مدرس کی تنخواہ کا کوئی اور انتظام کیا جائے۔ البتہ اگر جمع شدہ فنڈ مسجد کی ضروریات سے زائد ہو تو اس کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں صرف کیا جا سکتا ہے جو اقرب الاقرب ہو۔

قال الحصکفیؒ: حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما و(کذا) الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (الی اقرب مسجد او رباط او بئر) وحوض (الیه)۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف)

تاہم اگر واقف نے مال دیتے وقت یہ نیت کی ہو کہ اس مال سے مسجد اور اس کے متعلق امام و مؤذن اور مدرس کو تنخواہ دی جائے تو اس صورت میں جائز ہے۔[2]

---

[1] قال قاضی خانؒ: ویباح للمعتکف الاکل والشرب فی معتکفه (ج۱ ص۲۳۲ باب الاعتکاف، قاضیخان علی هامش فتاوی هندیه)۔ ومثلُهٗ فی رد المحتار ج۱ ص۶۶۱ احکام المساجد۔

[2] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئًا من ذٰلک الی امام المسجد والی مؤذن المسجد لیس له ذٰلک الا ان کان الواقف شرط ذٰلک فی الوقف۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف۔ الباب الحادی عشر فی المسجد۔ الفصل الثانی)

سوال:۔ مسجد میں رہائش پذیر طلباء جو کہ علم دین حاصل کر رہے | **مسجد میں رہائش پذیر طلباء کا مسجد کی چیزوں کو استعمال کرنا**

ہوں کیا وہ مسجد کی اشیاء مثلاً بجلی، لکڑی، دری وغیرہم استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی موقوفہ اشیاء کا طلباء کو استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ طلباء کرام مساجد کے مصالح سے متعلق نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو امام و مؤذن کی طرح ان کے لیے بھی استعمال جائز ہے۔

قال ابن عابدین (قوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفين على المسجد احدهما على العمارة والآخر الى امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لايستقرلقلة المرسوم للحاكم الدين ان يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب اهل الاصلاح من اهل المحلة۔ (ردالمحتار ج۳ ص۳۶ كتاب الوقف)[۱]

سوال:۔ ہم ایک سرکاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں جبکہ اس کالونی میں کوئی مسجد نہیں ہے اور حکومت نے | **عارضی مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں**

ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم نقشہ کے مطابق آپ کو مسجد کے لیے زمین دیں گے، کالونی میں دو دُکانیں اور ان کے سامنے برآمدہ بھی ہے۔ کیا فی الحال عارضی طور پر ہم ان دو کانوں کی ہیئت کو بدل کر مسجد بنا سکتے ہیں؟ مثلاً ان کے درمیان میں محراب بنا لیا جائے جبکہ یہ دکانیں حکومت کی ملک ہیں۔ اور بعد میں جب حکومت کی طرف سے مسجد کے نام پر زمین الاٹ ہوگی تو اس الاٹ شدہ زمین پر مستقل طور پر مسجد بنائی جائے گی۔ کیا یہ دو کانیں جن میں عارضی طور پر مسجد بنائی گئی تھی بعد میں اس کو دوبارہ دُکانوں کے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ جس زمین پر عارضی طور پر مسجد بنائی جائے یا مغصوبہ زمین پر مسجد بنائی جائے تو یہ مسجد شرعی کے حکم میں نہیں، ضرورت ختم ہونے پر مالک اس زمین کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے استعمال کر سکتا ہے، چونکہ یہ دوکانیں بھی مالک کی اجازت کے بغیر مسجد کے لیے استعمال ہوئی ہیں

---

[۱] وفی الهندية: واذا اراد ان يصرف شيئاً من ذلك الى امام المسجد او الى مؤذن المسجد فليس له ذلك الا ان كان الواقف شرط ذلك في الوقف كذا في الذخيرة۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۳ كتاب الوقف)۔ ومثله في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۲۶

اس لیے یہ مسجدِ شرعی کے حکم میں نہیں بلکہ بعد مالک یعنی حکومت اس کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: ان شرائط الواقف لا بد ان یکون مالکا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب فاسد وان لا یکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالک وقف الفضولی جاز۔
رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة) [1]

معتکف کا مسجد میں ریح (ہوا) خارج کرنا

سوال:۔ رمضان المبارک میں اعتکاف کے دوران خروجِ ریح کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بدبو پھیلنے کے سبب مسجد میں ہوا خارج کرنا مکروہ تحریمی ہے جس سے مسجد کو پاک رکھا جائے، چونکہ معتکف کے لیے مسجد میں سونے کی اجازت ہے اس لیے سونے کے ساتھ جو اس کے لوازمات ہیں وہ سب جائز ہیں تاہم بہتر نہیں۔

وفی الہندیة: اختلف فی الذی یفسوا فی المسجد فلم یر بعضهم بأسا وبعضهم قالوا لا یفسوا ویخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح ولا بأس للمحدث ان یدخل المسجد فی اصح القولین ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف۔
(الفتاوی الہندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة) [2]
الباب الخامس

---

[1] قال ابن نجیمؒ: الخامس من شرائطه الملک وقت الوقف حتی لو غصب ارضا فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الہندیة ج۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف)

[2] قال ابن عابدینؒ: وکذا لا یخرج فیه الریح من الدبر کما فی الاشباه واختلف فیه السلف فقیل لا بأس وقیل یخرج اذا احتاج الیه هو الاصح حموی عن شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد ۱ ص۷۸۶ احکام المساجد)
وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۴ ص۶۲ کتاب الوقف۔

مسجد کا پانی گھر لے جانا

سوال:۔ بعض علاقوں میں مسجد کا پانی اکثر لوگ گھر لے جاتے ہیں، کیا مسجد کا پانی گھر لے جانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ یہ پانی اگر صرف مسجد کے لیے وقف ہو تو پھر مسجد کی ضروریات تک محدود رہے گا، مسجد سے گھروں کو پانی لے جانا جائز نہیں، البتہ اگر واقف نے پانی وقف کرتے وقت اس کی اجازت دی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں لیکن مسجد کی ضروریات کو مقدم رکھا جائے گا۔ اب اگر واقف نے کنواں مسجد اور دیگر ضروریات کے لیے تو وقف کیا ہے مگر پانی بجلی کی موٹر یا ڈیزل انجن وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہو تو اس میں بھی چندہ دہندگان کی نیت ضروری ہوگی۔

قال ابن نجیمؒ التوضی من السقایة اذا اتخذھا للشرب اختلف المشائخ ولو اتخذھا للتوضوء لا یجوز الشرب منه بالاجماع۔ (البحر الرائق جلد ۵ ص۲۵۵ کتاب الوقف) لہ

مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دینا

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی تھی جس میں اس نے یہ تعین کیا تھا کہ نصف زمین کو فروخت کرکے مسجد کی تعمیر پہ لگادی جائے اور نصف زمین مزارعت کے لیے ہے اور اس سے حاصل شدہ منافع امام کی تنخواہ میں صرف کیا جائے۔ اب جس مزارع کے پاس زمین ہے وہ نفع دینے سے انکاری ہے، ان حالات میں مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا فنڈ جو مسجد کی تعمیر کے لیے خاص ہو اس سے امام کو تنخواہ نہیں دی جاسکتی، اگر واقف اس کی نیت کرے تو اس صورت میں دینا جائز ہے، البتہ مسجد کی عام ضروریات کے لیے رکھے ہوئے چندہ سے امام کو تنخواہ دینا جائز ہے کیونکہ یہ بھی مسجد کی ضرورت ہے۔

قال ابن عابدینؒ (قوله اتخذ الواقف والجھة) ان وقف وقفین علی المسجد احدھما علی العمارة والاٰخر الی امامه ومؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر

لہ قال ابواللیث السمرقندیؒ: یبدأ بثمنه فی مسجد اٰخر فی موضع ماء لعمارة المسجد او فی الطرق للشرب لا یجوز التوضی به الا اذا کان کثیراً وکذا لا یجوز دفع الجر من السقایة۔ (الفتاوی النوازل ص۲۴۳ کتاب الوقف)
ومثلهٗ فی الھندیة ج۲ ص۴۶۵ کتاب الوقف)

لقلتة المرسوم الحاکم الدین وان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۶۰ کتاب الوقف مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوہ) [۱]

مسجد کے فنڈ سے امام کے لیے مکان بنانا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس کے ساتھ متصل رقبہ مسجد کے لیے وقف ہے اس میں بعض اہلِ محلہ کا ارادہ ہے کہ امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کرا لیا جائے لیکن مکان کی تعمیر کے لیے مستقل چندہ نہیں کیا گیا بلکہ مسجد کے فنڈ سے ہی مکان کو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ کیا عندالشرع مسجد کے فنڈ سے امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کیا جاسکتا ہے ؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مکان کی تعمیر مسجد کے فنڈ کے مصارف میں سے نہیں ہے البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے کہ اس فنڈ سے امام مسجد کے لیے مکان بھی تعمیر کرلیا جائے تو پھر شرعاً جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ (قوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والاخر الی امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر لقلة المرسوم للحاکم الدین ان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۶۰ کتاب الوقف) [۲]

---

[۱] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: ولو شرط الواقف فی الوقف الصرف الی امام المسجد وبیّن قدره یصرف الیه ان کان فقیراً وان کان غنیاً لا یحل له وکذا الوقف علی الفقهاء والمؤذنین۔
(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۶ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ الباب الحادی عشر فی المسجد والفصل الثانی فی الوقف علی المسجد۔

[۲] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئاً من ذلك الی امام المسجد او الی مؤذن المسجد فلیس له ذلك الا ان کان الواقف شرط ذلك فی الوقف کذا فی الذخیرة۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف۔ الباب الحادی عشر فی المسجد الفصل الثانی)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

دو مسجدوں کا قریب قریب ہونا

سوال:- ہماری مسجد کے قریب تقریباً ۵ گز کے فاصلہ پر ایک چبوترہ ہے، ہمارے محلہ میں عقائد کے لحاظ سے بہت اختلاف ہے، اسی اختلاف کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز کو جائز نہیں سمجھتے، ان حالات میں ہر فریق نے اپنے لیے الگ الگ مسجد بنائی ہے لیکن دونوں مساجد اتنی قریب ہیں کہ بسا اوقات ایک دوسرے کی تکبیرات اور قرأت سُنی جاتی ہے۔ ان حالات میں دوسری مسجد کا قیام جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر اہل محلہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو بہتر یہ ہے کہ آپس میں صلح کرلیں اور اختلاف کو رفع کر دیں، اور اگر اختلاف رفع نہ ہو سکے تو رفع فساد کے لیے ایک مسجد کو تقسیم کرنا شرعاً جائز ہے اس لیے قریب میں دوسری مسجد بنانا بطریق اولیٰ جائز ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم اهل المحلة المسجد وضربوا فيه حائطاً ولكل منهم امام علی حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۳۵ باب ما يفسد الصلوٰة وما يكره فيها) [1]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال:- کسی کو مسجد میں آنے سے منع کرنے کا شرع میں کیا حکم ہے؟

الجواب:- مسجد کسی کی مِلک نہیں، یہ ایک عبادت گاہ ہے جس میں ہر ایک کو آنے کا حق حاصل ہے کہ اس میں نماز و تلاوت و ذکر کرے۔ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (سورۃ الجن آیت ۱۸) اس لیے مساجد میں آنے سے کسی کو منع کرنا گناہِ عظیم ہے، قرآنِ کریم میں مساجد میں آنے سے منع کرنے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہے، ارشادِ ربانی ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا (البقرہ ۱۱۴) البتہ اگر مسجد تنگ ہو تو اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر دوسرے محلے والوں کو مسجد آنے سے روکا جا سکتا ہے۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی القنية ولكن لاهل المحلة ان يمنعوا من ليس منهم

---

[1] قال الحصكفیؒ: وجعل المسجدين واحدا وعكسه لصلوٰة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ا ص۶۶۳ احکام المساجد)۔ وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج ۵ ص۳۲۰ کتاب الکراهية۔

عن الصلوٰۃ فیہ اذا ضاق بہم مسجد۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۶۲ کتاب الصلوٰۃ)[۱]

مسجد میں گوبر کا استعمال

سوال:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال کیسا ہے ؟ جیسا کہ بعض مساجد میں آگ جلانے یا مٹی میں خلط کر کے گارا بنا کر استعمال کیا جاتا ہے ؟

الجواب:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال جائز نہیں، البتہ ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے تاہم اگر گوبر کے علاوہ کسی متبادل چیز سے ضرورت پوری ہوسکتی ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس متبادل چیز کو استعمال کیا جائے۔

قال ابن عابدینؒ: (ولا تطیینہ بنجس) فی الفتاوی الھندیۃ یکرہ ان یطین المسجد بطین قد بل بماء نجس بخلاف السرقین اذا جعل فیہ الطین لان فی ذلک ضرورۃ وھو تحصیل غرض لا یحصل الا بہ کذا فی السراجیۃ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المساجد)[۲]

ویران مسجد کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک پرانی مسجد ہے جو کسی وقت آباد تھی لیکن اب لوگ اس میں نماز نہیں پڑھتے، بعض لوگ اس میں مویشی بھی باندھتے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں کا ارادہ ہے کہ اس پرانی اور ویران مسجد کو جنازہ گاہ میں تبدیل کیا جائے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب:۔ جب کسی مقام پر ایک دفعہ مسجد بنادی جائے اور مستقلاً اس میں نماز بھی پڑھی گئی ہو تو اس کو ویران ہونے کے بعد کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، لہٰذا اس ویران مسجد کو جنازہ گاہ یا اصطبل میں بدلنے کی اجازت

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: وکذا لاھل المحلۃ ان یمنعوا من لیس منھم عن الصلوٰۃ فیہ اذا ضاق بھم المسجد۔ (البحرالرائق ج ۵ ص۲۵ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص۳۲۲ کتاب الکراھیۃ)

[۲] قال ابن نجیمؒ: اذا نزح الماء النجس من البئر کرہ لہ ان یبل بہ الطین فیطین بہ المسجد علیٰ قول من اعتبر نجاسۃ الطین۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۳۵ باب ما یفسد الصلوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۱۷ کتاب الکراھیۃ الباب الخامس فی اداب المسجد۔

نہیں بلکہ اگر ہوسکے تو از سرِ نو اس مسجد کو تعمیر کرکے آباد کیا جائے۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الامام والثانی) ابدا الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثا ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کان یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الاوجه۔

(رد المحتار ج۳ ص۳۵۸ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد وغیره)[۱]

مسجدِ شرعی کا تبادلہ

سوال:۔ زید نے مسجد کے لیے ایک جگہ دی تھی اور باقاعدہ طور پر اہلِ محلہ نے وہاں مسجد تعمیر کرکے نماز شروع کردی، اب یہ شخص کہتا ہے کہ یہ جگہ مجھے واپس کردی جائے میں اس کے بدلہ میں دوسری جگہ دیتا ہوں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ جو جگہ ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کردی گئی اور باقاعدہ طور پر وہاں مسجد بھی بنائی گئی اور نماز شروع ہوگئی تو ہمیشہ کے لیے مسجد ہی رہے گی، اب اس کو منہدم کرکے اس کے بدلے میں دوسری مسجد بنانا یا اس کی جگہ کو تبدیل کرنا شرعاً جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الامام والثانی) ابدا الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثا ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کان یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الاوجه۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۵۸ باب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد وغیره)[۲]

---

[۱] قال طاهر البخاریؒ: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد فلا یصلی فیه احد فلا بأس بان یأخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابدا۔ (خلاصة الفتاوی جلد ۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد واوقافه) ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[۲] وفی الخلاصة الفتاوی: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یأخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابدا۔ (ج۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد وغیره) ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

مسجد میں کسی کے لیے جگہ متعین کرنا

سوال:۔ بعض لوگ مسجد کے اندر اپنے رفقاء کے لیے بیٹھنے کی جگہ متعین کر دیتے ہیں اور اس جگہ پر چادر یا جائے نماز رکھ کر دوسروں کو وہاں بیٹھنے نہیں دیتے جبکہ ابھی تک وہ لوگ مسجد میں موجود ہی نہیں ہوتے۔ کیا اس طرح کسی کے لیے مسجد میں جگہ متعین کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں غیر موجود لوگوں کے لیے جگہ روکنا خصوصاً جمعہ کے دن ایسا کرنے کو غیر مستحسن اور ناجائز سمجھا گیا ہے کیونکہ مسجد کسی کی ملک نہیں، یہ حق پہلے آنے والوں کا بنتا ہے، علاوہ ازیں بعد میں آنے والا شخص بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنوں یا کندھوں کے اوپر سے گذر کر جائے گا اور دوسرے مسلمانوں کی ایذا رسانی کا سبب بنے گا جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

عن ابی سعیدؓ و ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اغتسل یوم الجمعۃ ولبس من احسن ثیابہ ومس من طیب ان کان عندہ ثم اتی الجمعۃ فلم یتخط اعناق الناس ثم صلی ما کتب اللہ لہ ثم انصت اذا خرج امامہ حتی یفرغ من صلوتہ کانت کفارۃ لما بینھا وبین جمعۃ التی قبلھا۔ رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲۲ باب التنظیف والتکبیر، الفصل الثانی) [1]

مسجد کے باغیچہ پر چھت ڈالنا

سوال:۔ مسجد کے ساتھ صحن میں ایک باغیچہ ہے بعض اہلِ محلہ کا ارادہ ہے کہ اس باغیچہ پر چھت ڈال دی جائے تاکہ طلباء کرام دینی علوم حاصل کر سکیں یا کسی اور مصالح میں اس کو استعمال کیا جا سکے، کیا عند الشرع ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر مسجد کا یہ صحن مسجد کی حدود میں داخل ہو اور اس میں مستقل طور پر کسی وقت نماز

---

[1] حدثنا ھارون بن معروف نا بشر بن السری نا معاویۃ بن صالح عن الزاھریۃ قال کنا مع عبد اللہ بن بسر صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعۃ فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبد اللہ بن بسر جاء رجلٌ یتخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجلس فقد اذیت۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۵۹ باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ)

ومثلہٗ فی الجامع الترمذی ج ۱ ص ۶۷ باب فی کراھیۃ التخطی یوم الجمعۃ۔

پڑھ لی گئی ہو تو اب یہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کو کسی اور مصرف میں لانا عند الشرع جائز نہیں۔ تاہم چونکہ دینی تعلیم کا حصول مساجد کے مقاصد میں شمار ہوتا ہے اس لیے مسجد یا اس کے کسی کونے کو مدرسے کے طور پر استعمال کرنا مرخص ہے، لیکن دیگر مصالح کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں۔

لما روی ابو هریرۃؓ عن النبی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من جاء مسجدی لم یأت الا لخیر یتعلمه او یعلمه فهو بمنزلة المجاهد فی سبیل اللہ۔ الخ قال الملا علی القاری فیه دلالة علی جواز التدریس فی المسجد۔ (المرقاۃ شرح مشکوۃ جلد ۲ ص۲۲۱ باب المساجد الفصل الثالث، کتاب الصلوٰۃ) [1]

متولی مسجد کا بغیر اذن چندہ دہندگان کے اُجرت لینا

سوال: اہلِ محلہ نے اپنی مسجد کے لیے ایک متولی مقرر کیا ہے لیکن اس کے لیے اہلِ محلہ نے کوئی مشاہرہ مقرر نہیں کیا، تو کیا متولی بغیر اذنِ اہلِ محلہ مسجد کے فنڈ میں سے اپنی اُجرت لے سکتا ہے؟

الجواب: چندہ کے اموال ایک امانت ہوتے ہیں اور یہ وقف عرفی ہے شرعی نہیں، لہٰذا ایسے امور کے لیے واقفین سے اس کی اجازت لینا ضروری ہے، بغیر اذن کے متولی کو مسجد کے فنڈ سے تنخواہ لینا جائز نہیں ہے۔

وفی الهندیة: لو وقف دراهم او مکیلاً او ثیاباً لم یجز وقیل فی موضع تعارفوا ذلك یعنی بالجواز قیل کیف الدراهم تقرض للفقراء ثم یقبضها او تدفع مضاربة و یتصدق بالربح والحنطة تقرض للفقراء یزرعون ثم تؤخذ منهم والثیاب الاکسیة تعطی للفقراء لیلبسوها عند حاجتهم ثم تؤخذ کذا فی الفتاوی العتابیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۶۲ کتاب الوقف، الباب الثانی فیما یجوز وقفه الخ)

فهو فی الشرع عند ابی حنیفة رحمه اللہ تعالیٰ حبس العین علی ملك الواقف والتصدق بالمنفعة علی الفقراء او علی وجه من وجوه الخیر بمنزلة العواری کذا فی الکافی فلا یکون

---

[1] وفی الهندیة: یجوز الدرس فی المسجد وان کان فیه استعمال اللبود والبواری المسبلة لاجل المسجد۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ الباب الخامس فی آداب المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی امداد المفتیین المعروف بفتاوی دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۸۱۲۔

لازمًا وله ان یرجع و یبیع کذا فی المضمرات ولا یلزم الا بطریقین احدھما قضاء القاضی بلزومه والثانی ان یخرج مخرج الوصیة..... وعندھما حبس العین علی حکم ملك الله تعالی علی وجه تعود منفعتہ الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوھب ولا یورث کذا فی الھدایة الی العیون الیتیمة ان الفتوی علی قولھما کذا فی شرح الشیخ ابی المکارم للنقایة۔

(فتاوی ھندیة ج۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف، الباب الاول فی تعریفه الخ) [۱]

مسجد میں ٹیپ ریکارڈر لانا

سوال:۔ بعض لوگ مساجد میں ٹیپ ریکارڈر لے آتے ہیں جس سے تقاریر اور تلاوت وغیرہ سنتے ہیں اور ریکارڈ کرتے ہیں، کیا ان کا یہ فعل شرعًا جائز ہے؟

الجواب:۔ ٹیپ ریکارڈ بذاتِ خود ایک آلہ ہے، اس کو اچھے اور بُرے دونوں کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اگر اسے اچھے کاموں میں استعمال کیا جائے مثلاً تلاوتِ قرآن یا کسی کی تقریر ٹیپ کرنا، اگر اس نیت سے مسجد میں لایا جائے تو شرعًا اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ اگر اس ٹیپ ریکارڈ سے گانے سنے جائیں یا کسی اور گناہ کے کام کے لیے لایا جائے تو مسجد و خارج مسجد دونوں میں مطلقًا جائز نہیں۔

قال طاھر بن عبدالرشیدؒ: وفی الفتاوی استماع صوت الملاھی کالضرب بالقصب وغیرہ حرام لانه من الملاھی وقال علیه الصلوة والسلام استماع الملاھی معصیة والجلوس علیھا فسوق والتلذذ بھا من الکفر ھذا علی وجه التحدید ولکن وجب علیه ان یجتھد حتی لا یسمع لما روی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه ادخل اصبعه فی اذنه منذ ذکر اشعار العرب ان کان فیھا ذکر الفسق کرہ ھم بالمعصیة

---

[۱] قال الحصکفی (حبس العین علی حکم (ملك الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو فی الجملة والاصح انه (عنده) جائز غیر لازم کالعاریة (وعندھما ھو حبسھا علی حکم (ملك الله تعالی وصرف منفعتھا علی من احب۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۵۷ کتاب الوقف)

قال المرغینانیؒ: لا یزول ملك الواقف الا ان یحکم به الحاکم او یعلقه بموته فیقول اذا مت فقد وقفت داری علی کذا وقال ابویوسفؒ یزول ملکه بمجرد القول وقال محمدؒ لا یزول حتی یجعل للوقف۔ (الھدایة ج۲ ص۶۳۷ کتاب الوقف)

ان عزم علیہ الاثم۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۳۴۵ کتاب الکراھیۃ الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی)[1]

بوقتِ ضرورت متولی کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا

سوال:۔ اگر مسجد کے گرجانے کا خوف ہو تو دوسرے محلہ میں سے کسی شخص کو بغیر اذنِ متولی یا اہلِ محلہ کے اس کو شہید کرکے نئی مسجد تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بسا اوقات ایسے بلا اجازت تصرفات سے بہت سی بے اعتدالیاں پیدا ہوجاتی ہیں جس سے مساجد کا انتظام بری طرح متاثر ہوتا ہے، ایسی مساجد میں جملہ تصرفات بانیٔ مسجد، متولی یا اہلِ محلہ کی اجازت پر موقوف رکھے جائیں، تاہم کسی متعنت اور اناڑی متولی کے جابرانہ رویہ کا اعتبار نہیں۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ: الباني اولی بنصب الامام والمؤذن وولد الباني وعشیرتہ اولی من غیرھم بنی مسجدا فی محلۃ تنازعہ بعض اھل المحلۃ فی العمارۃ فالباني اولی مطلقاً۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳۲ کتاب الوقف)[2]

مسجد کے لیے باقاعدہ وقف سے ملکیت کا زائل ہونا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے، اس زمین سے اس شخص کی ملکیت کب زائل ہوگی یا وقف کے بعد اس کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل رہتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین کا وقف باقاعدہ اجازت سے نماز باجماعت پڑھنے پر موقوف ہے لہٰذا ایک دفعہ نماز باجماعت پڑھنے سے اس کی ملکیت زائل ہوگئی، البتہ امام ابو یوسفؒ

---

[1] قال الحصکفیؒ: (و) کرہ (کل لھو) لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کل لھو المسلم حرام الا ثلاثۃ ملاعبتہ اھلہ وتادیبہ لفرسہ ومناضلتہ بقوسہ (در مختار جلد۵ ص۲۵۳ کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیہ ج۵ ص۳۵۱ کتاب الکراھیۃ۔

[2] اما طاہر بن عبدالرشیدؒ: رجل بنی مسجدا فی سکۃ فنازعہ بعض اھل السکۃ فی عمارتہ او نصب المؤذن والامام فالمختار ان الباني اولی وفی العمارۃ اولی بالاتفاق۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۲۱ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ باب احکام المساجد، کتاب الوقف۔

کے نزدیک اس میں نماز پڑھنا بھی ضروری نہیں بلکہ صرف اس کے قول سے ملکیت زائل ہوجاتی ہے، باقاعدہ وقف کے بعد واقف کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل نہیں۔

قال الحصکفیؒ (ویزول ملکہ عن المسجد والمصلی) بالفعل (بقولہ جعلتہ مسجداً) عند الثانی (وشرط محمد) والامام (الصلاۃ فیہ) بجماعۃ وقیل یکفی واحد وجعلہ فی الخانیۃ ظاہر الروایۃ۔ (الدرالمختار ہامش ردالمحتار ج۳ ص۳۶۹ کتاب الوقف)[1]

عورتوں کا مسجد میں جانا

سوال:۔ ہمارے شہر رما میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے وہاں کے لوگ اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ اگر شریعت میں عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے تو ایک جگہ متعین کرکے عورتوں کے لیے بھی مسجد بنا دی جائے جس میں عورتیں نماز پڑھیں اور وعظ و نصیحت کی مجالس میں شمولیت اختیار کرسکیں۔ ایسا کرنا اس دور میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرونِ اولیٰ میں اگرچہ عورتوں کو مساجد میں آنے کی اجازت تھی لیکن اس دور میں فتنہ و فساد کے عموم کی وجہ سے فقہاء نے انہیں مسجدوں میں جانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ عورتوں کی مساجد میں حاضری کے اتنے فوائد نہیں جتنے نقصانات یقینی ہوتے ہیں، لہٰذا فسادِ زمانہ کی وجہ سے عورتوں کا مسجد میں آنا مستحسن نہیں۔

قال الحصکفیؒ (ویکرہ حضورھن الجماعۃ) ولو لجمعۃ وعید ووعظ (مطلقاً) ولو عجوزاً لیلاً (علی المذہب) المفتی بہ لفساد الزمان۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج۱ ص۵۲۹ باب الامامۃ)[2]

---

[1] واذا بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال عن ابی حنیفۃؒ عن ملکہ وقال ابو یوسف یزول ملکہ بقولہ جعلتہ مسجداً۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف تصل فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۴۰۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

[2] قال طاھرؒ: اما اذا ام الرجل النساء فی مسجد بجماعۃ لیس معھن رجل لا باس بہ وفی غیر المسجد من البیوت ونحوھا یکرہ الا ان یکون معہ ذات رحم محرم وتخرج العجوز الی العید والجمعۃ وفی الفجر والعشاء دون الظھر والعصر والمغرب فلما فی الحال ان فی المغرب اختلاف الروایۃ وعندھما تخرج الی جمیع الصلوٰۃ ھذا جواب الاصل وقال فی الفتاوٰی لا تخرج العجائز فی زماننا الی الجماعات۔

(خلاصۃ الفتاوٰی ج۱ ص۱۵۵ کتاب الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۵۹ فصل فی الجماعۃ۔

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال: ایک مسجد کے متولی کو بعض لوگ معزول کرنا چاہتے ہیں لیکن اکثر لوگ اس کی معزولی کے اسباب نہ جاننے کی وجہ سے ایسی سرگرمیوں میں شرکت نہیں کرتے۔ کیا کسی متولی مسجد کو اہلِ محلہ یا حاکم معزول کر سکتا ہے اور وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے متولی کو معزول کیا جا سکتا ہے؟

الجواب: اہلِ محلہ یا حاکم نے جن امورِ شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی کو متولی بنایا تھا اگر یہ متولی اُن امورِ شرعیہ کا لحاظ نہیں رکھتا بلکہ کہیں خیانت کا ارتکاب کر کے وقف کے اموال کو غیر شرعی طور سے استعمال کر رہا ہو اور اسی طرح ایسے دوسرے امور کا ارتکاب کر رہا ہو جس سے اہلِ محلہ تنگ ہوں تو امورِ فسقیہ کی وجہ سے اسے معزول کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اگر ایسے امور کا خود واقف بھی مرتکب ہو تو اسے بھی معزول کیا جا سکتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: (جعل الواقف (الولایة لنفسه جاز) وکذا لو لم یشترط لاحد فالولایة له عند الثانی وهو ظاهر المذهب نهر خلافاً لما نقله المصنف ثم لوصیه ان کان والا فللحاکم فتاویٰ ابن نجیم، قاری الهدایة وسیجیئ (وینزع وجوباً بزازیة ولو) الواقف درر فغیره بالاولیٰ (غیر مامون) اوعاجز او ظهر به فسق کشرب خمر ونحوه فتح اوکان یصرف ماله فی الکیمیا نهر بحثاً (وان شرط عدم نزعه)

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۳۸۴ کتاب الوقف)

مصالحِ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کا حکم

سوال: اکبر اور ریحان کے آباؤ اجداد نے مسجد میں پانی کی نکاسی کے لیے ایک رہٹ لگایا تھا اور اس رہٹ کے اخراجات کے لیے ۵ کنال اور تین مرلہ زمین بخشی تھی جس کا اندراج کاغذات میں موجود ہے۔ اب جبکہ مسجد میں بجلی کا پمپ بھی ہے اور لکڑی کے رہٹ کے بجائے لوہے کا رہٹ لگا دیا گیا ہے، لہٰذا اس زمین سے جو اخراجات اس رہٹ کے پورے کیے جاتے تھے اب ان کی ضرورت نہیں رہی، اب اہلِ مسجد نے یہ ارادہ کیا ہے کہ یہ زمین جو پانی کی نکاسی

لہ وفی الهندیة: ولو ان الواقف شرط الولایة لنفسه وکان الواقف غیر مامون علی الوقف فللقاضی ان ینزعها من یده کذا فی الهدایة۔ (ج ۲ ص ۴۰۹ کتاب الوقف)

ومثلہٗ فی الهدایة ج ۲ ص ۶۴۳ کتاب الوقف)

کے لیے وقف کی گئی تھی اس کو مسجد کے کسی اور مصرف میں لایا جائے، مثلاً اجارہ پر دے دی جائے یا جن کے قبضہ میں ہے اُن سے آدھا نفع لے کر مسجد کے مصالح میں خرچ کر دیا جائے، لیکن ریحان اور اکبر مسجد کی اس اراضی کو اپنے قبضہ سے نکالنے کو تیار نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم صرف رہٹ کے ذمہ دار تھے جبکہ اب زمین اس سے مستغنی ہو گئی ہے لہٰذا یہ زمین اب ہماری ہے، اب ہم اسے اپنے مصرف میں خرچ کریں گے، کیا ان کا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ عرف کو دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاملہ وقف کا ہے لہٰذا جس نے اپنی زمین کی آمدنی مسجد کے لیے معین کر دی ہے تو یہ زمین بھی وقف سمجھی جائے گی اس لئے ریحان اور اکبر کو اس پر قبضہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں بلکہ اس کی آمدنی کو پمپ یا مصالح مسجد میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔

ونظیرہ قال ابن نجیمؒ اشتروا من غلۃ داری ھذہ کل شھر بعشرۃ دراھم خبزاً وفرقوہ علی المساکین صارت دار وقفاً۔ (البحرالرائق ج ۵ ص[1] کتاب الوقف)

مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا حکم

سوال:۔ مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کیا حکم ہے، خصوصاً جب مسجد میں کیا جائے؟ اس دور میں مساجد میں عام طور پر چندہ مانگا جاتا ہے۔ اگر کسی محلہ والوں کو ایک عام اور کچی مسجد بنانے کی استطاعت ہو لیکن وہ پکی مسجد بنانے کے لیے چندہ کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مساجد کو تعمیر کرنا اصل کے لحاظ سے سلطانِ وقت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانہ یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجداً من بیت المال ومن مالھم ان لم یکن لھم بیت مال کذا فی فتح القدیر۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۳۵۸ کتاب الوقف)

جبکہ اس دور میں عموماً سلاطین مساجد کی تعمیر کے لیے متوجہ نہیں ہوتے تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مساجد کی تعمیر کے لیے چندہ کریں، چاہے یہ چندہ مساجد میں کریں یا مساجد سے

---

[1] وفی الھندیۃ: رجل قال فی مرضہ اشتروا من غلۃ داری ھذہ کل شھر بعشرۃ دراھم خبزاً وفرقوا علی المساکین صارت الدار وقفاً۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۹ کتاب الوقف، فصل فی الالفاظ التی یتم بہا الوقف) ومثلہٗ فی ردالمحتار ج ۳ ص ۳۵۹ کتاب الوقف)

باہر، اور بعض روایات سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

عن جریرٍ قال کنا فی صدر النہار عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فجاء قوم عراۃ مجتابی النمار او العباء متقلدی السیوف عامتہم من مضر بل کلہم من مضر فتمعر وجہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لما رای بہم من الفاقۃ فدخل ثم خرج فامر بلالاً فاذن واقام فصلی ثم خطب فقال یٰاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ۔ (الیٰ اٰخر الاٰیۃ) اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا۔ الاٰیۃ۔ التی فی الحشر اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ـــ تصدق رجل من دینارہ من درہمہ من ثوبہ من صاع برہ من صاع تمرۃ حتی قال ولو بشق تمرۃ الیٰ آخر۔

(مشکوٰۃ ج ۱ ص۳۳ کتاب العلم) [1]

مسجد کے ہوتے ہوئے مندر میں نماز پڑھنا

سوال: ہمارے علاقے میں اکثر مہاجرین رہتے ہیں جب ہم ہندوستان سے ہجرت کرکے آئے تو اس علاقے میں کسی جگہ پر بھی کوئی مسجد نہیں تھی البتہ ہندوؤں کا ایک مندر تھا جس کو ہم لوگوں نے نماز کے لیے متعین کر دیا اور کچھ عرصہ باقاعدہ اس میں نماز پڑھتے رہے، بعد میں گورنمنٹ سے منظوری لے کر ایک جگہ مسجد کے لیے متعین کرکے اس پر مسجد تعمیر کر دی، لیکن بعض لوگ اب بھی اس مسجد کے ہوتے ہوئے مندر ہی میں نماز پڑھتے ہیں۔ تو کیا مسجد کے ہوتے ہوئے اس مندر میں نماز پڑھنی جائز ہے؟

الجواب: ۔ مذکورہ سوال میں مندر کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں، اگر اس کو مستقل طور پر مسجد کی ہیئت میں بنا دیا گیا ہو اور اس کی پہلی شکل میں تبدیلی کر دی گئی ہو تو اس کا حکم مسجد جیسا ہے لہٰذا یہ مندر بھی مسجد میں شمار ہوگا۔ البتہ اگر مندر کی صورت تبدیل نہیں کی گئی ہو اور اس کو اپنی اصلی حالت میں رکھا گیا ہو اور نہ ہی اس کو مستقل مسجد بنانے کی نیت کی گئی ہو تو یہ مسجد کے حکم میں نہیں اور اس میں نماز پڑھنا تشبہ بالکفار کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے، تشبہ بالکفار کی حرمت پر بے شمار دلائل ہیں ـــــ کما قال تعالیٰ: لَا تَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا

---

[1] وفی المسلم: عن جریر قال خطب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فحث علی الصدقۃ بمعنی حدیث جریر۔ (صحیح مسلم جلد ۲ ص۳۴۱ کتاب العلم باب من سن سنۃ حسنۃ الخ)

وَتَمَسَّکُمُ النَّارُ ۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تشبّہ بقوم فھو منھم ۔
(ابوداؤد ج ۲ ص ۵۵۹ کتاب اللباس، باب لبس الشھرۃ) [۱]

قدیم مسجد کی جگہ نئی مسجد میں نماز پڑھنا

سوال :۔ ہمارے شہر میں ایک مسجد تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے اور اس کی عمارت بھی بوسیدہ ہو چکی ہے جس کے گرنے کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے، اگر کوئی شخص اس مسجد کو ترک کرکے دوسری نئی مسجد میں جو کہ قریب ہی تھوڑے سے فاصلے پر بنائی گئی ہے، نماز پڑھے تو شرعاً کیسا ہے؟ بعد میں اگر کسی شخص نے اس بوسیدہ مسجد کی عمارت کو شہید کرکے نئے سرے سے اس کی تعمیر کرائی ہے، اس صورت میں اس قدیم مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا جدید مسجد میں؟

الجواب :۔ کسی جگہ جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے لہٰذا قدیم مسجد جب نئے سرے سے بنائی گئی ہو تو اس کے حقوق مسجد قریب ہونے کی بہ نسبت دوسری مسجد کے زیادہ ہیں لہٰذا اس قدیم مسجد کو ہی آباد کیا جائے، بہر حال جدید مسجد میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے لیکن بہتر نہیں ۔

قال ابن عابدینؒ : ومسجد حیہ وان قل جمعہ افضل من الجامع وان کثر جمعہ ۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۴۸۸ باب ما یفسد الصلوٰۃ) [۲]

مسجد میں حوض بنانا

سوال :۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں نمازیوں کی سہولت کے لیے ایک حوض بنانے کا ارادہ ہے، لیکن اگر حوض کو کامل طریقے سے بنایا جائے تو مسجد کا کچھ حصہ اس حوض میں شامل ہوگا، اور مسجد اپنی وسعت کے لحاظ سے اتنی

---

[۱] وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ من تشبہ بقوم فھو منھم قال الملا علی القاری ای من شبہ نفسہ بالکفار مثلاً فی اللباس وغیرہ ... فھو منھم ای فی الاثم ۔ (مرقاۃ جلد ۸ ص ۲۵۵ کتاب اللباس الفصل الثانی)
وَمِثْلُہٗ فی جواھر الفقہ ج ۱ ص ۲۲۱ مساجد کی نئی شکلیں اور ان کے مقاصد

[۲] وفی الخلاصۃ ان نسخۃ القاضی الامام رجل یصلی فی الجامع لکثرۃ الجمع ولا یصلی فی مسجد حیہ فانہ یصلی فی مسجد منزلہ وان کان قومہ اقل وان لم یکن لمسجد منزلہ مؤذن ویصلی وان کان ھناک واحد ۔ (ج ۱ ص ۲۲۸ الفصل السادس والعشرون فی المسجد ینقل بعض)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۸۳ باب الامامۃ ۔

بڑی ہے کہ اس کا کچھ حصہ حوض میں شامل کرنے کی وجہ سے مسجد کے صفوف میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ کیا ایسی صورت میں مسجد کے بعض حصے کو حوض میں شامل کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کو کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا، یہ تا قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس لیے مسجد کے کسی بھی حصے پر حوض بنانا جائز نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: لانہ مسجد الی عنان السماء وفی ردالمحتار وکذا الی تحت الثریٰ۔

(الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج ۱ ص۸۹۵ کتاب الصلوٰۃ فی الکعبۃ)

علاوہ ازیں فقہاء کرام نے مسجد میں مضمضہ واستنشاق مکروہ لکھا ہے، اسلئے مسجد کے کسی حصہ میں حوض بنانے سے اس کراہیت کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے۔

البتہ اگر مسجد بنانے کے ابتداء ہی میں کوئی جگہ حوض یا وضو کے لیے متعین کردی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وفی الخلاصۃ ویکرہ التوضی والمضمضۃ فی المسجد الّا ان یکون فیہ موضع اتخذ للوضوء ولا یصلی فیہ۔ (ج ۱ ص۲۲۹ الفصل السادس والعشرون ومایتصل بہ)[1]

دکانوں پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک مسجد ہے جو چند دکانوں کے اوپر واقع ہے اور باقاعدہ اس میں اذان وجماعت بھی ہوتی ہے جبکہ یہ دوکانیں مالک کی ملک میں ہیں۔ کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کو مسجد شرعی کا درجہ حاصل ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دوکانوں کے اوپر مالک کی اجازت سے مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں، اس میں نماز بلا کراہیت جائز ہے، اگر مالک کی اجازت کے بغیر یہ مسجد بنائی گئی ہو تو اس میں نماز مکروہ ہے، البتہ یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں بلکہ عرفی مسجد کے حکم میں ہے، شرعی مسجد کا حکم اس پر

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وفی الخلاصۃ وغیرھا ویکرہ الوضوء والمضمضۃ فی المسجد الّا ان یکون موضع فیہ اتخذ للوضوء ولا یصلی فیہ۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۳۴ فصل مما فرغ من بیان الکراھۃ فی الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۰ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ وما لا یکرہ۔

اُس وقت ہوگا جب دو کانوں سے مالک کی ملکیت کو ختم کر کے مسجد کی ملکیت میں دیدی جائیں۔

قال ابن عابدینؒ: وفی القہستانی ولابد من افرازہ ای تمیزہ عن ملکہ من جمیع الوجوہ فلو کان العلو مسجدا والسفل حوانیت او بالعکس لا یزول ملکہ لتعلق حق العبد بہ کما فی الکافی۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص۳۷۰ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے متولی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا تولیت مسجد میں ارث جاری ہو سکتا ہے اور متولی مسجد کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

الجواب:۔ متولی نسلاً بعد نسلٍ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ بعد میں آنے والے کے اندر صلاحیت ہو امام و مؤذن اور مسجد کی دوسری ضروریات کا اہتمام کرنا متولی کے فرائض منصبی ہیں۔

قال ابن نجیمؒ: البانی اولیٰ بنصب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرتہ اولیٰ من غیرھم بنی مسجدا فی محلۃ فنازعہ بعض اھل المحلۃ فی العمارۃ فالبانی اولیٰ مطلقاً۔

(الاشباہ والنظائر ج ۲ ص۳۳۲ کتاب الوقف) [2]

کعبۃ اللہ کی ایسی تصاویر جن میں انسانوں کی تصاویر بھی ہوں مسجد میں آویزاں کرنا

سوال:۔ مسجد میں خانہ کعبہ کی ایسی تصاویر آویزاں کرنا جن میں کعبۃ اللہ کی تصویر کے علاوہ انسانی شکلیں بھی طواف کی ہیئت کو

---

[1] من بنی مسجدا لم یزل ملکہ عنہ حتیٰ یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال ملکہ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف)

وایضاً قال ابن نجیمؒ: وحاصلہ ان شرط کونہ مسجدا ان یکون سفلہ وعلوہ مسجدا لینقطع حق العبد عنہ لقولہ تعالیٰ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف)

[2] وفی الھندیۃ: قال فی الجامع الفصولین لو شرط الواقف ان یکون المتولی من اولادہ واولاد اولادہ ھل للقاضی ان یولی غیرہ بلا خیانۃ لو ولاہ ھل یکون متولیا قال الشیخ الاسلام برھان الدین فی فوائدہ لا کذا فی النھر الفائق۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۴۱۲ کتاب الوقف)

(وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۴۱۱ کتاب الوقف)

ظاہر کرتی ہوں کیا ایسی تصاویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہیں؟

الجواب:- کعبۃ اللہ ایک قابلِ احترام جگہ ہے اور ایسے ہی غیر ذی روح ہونے کی بنیاد پر اس کی تصویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہے، البتہ کعبۃ اللہ کی ایسی تصویر آویزاں کرنا جس میں لوگوں کو طواف کرتے ہوئے دکھایا گیا ہو اور جس میں اشخاص کی معرفت ہوتی ہو شرعًا ناجائز ہے پھر جائز نہ ہونے کے علاوہ ایسی تصاویر کو مسجد میں آویزاں کرنا یہ زیادت علی الاثم ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے جیسا کہ مسجد میں تصویریں نکالنا مسجد کی عظمت کے منافی ہے۔

عن عائشةؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال اشد الناس عذابًا يوم القيامة الذين يضاهئون بخلق الله ۔ متفقٌ عليه (مشكوٰة ج ۲ ص ۳۸۵ باب التصاوير)

عن عبد الله بن مسعود قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اشد الناس عذابًا عند الله المصورون. متفقٌ عليه. (مشكوٰة ج ۲ ص ۳۸۵ باب التصاوير) [1]

مسجد پر قبضہ کی شرعی حیثیت

سوال:- دو قوموں کا ایک قطعۂ زمین پر جھگڑا تھا ایک قوم نے دوسری قوم کی املاک پر حملہ کر کے جبرًا قبضہ کر لیا اور تمام مکینوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا، ان املاک میں مکان اور زمین کے علاوہ مساجد بھی ہیں اور ان مساجد پر بھی غاصبانہ طریقہ سے قبضہ کر لیا گیا ہے۔ اندریں صورت ایسی مساجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- قریہ مذکورہ میں جو مساجد ہیں وہ غصب سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں جو کسی کی ملک نہیں اور غاصبین بھی مسلمان ہیں جن کے نزدیک بھی مساجد کا احترام ملحوظ ہے ایسی مساجد میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہیت نہیں اور ان مساجد پر اس قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ کسی کو

---

[1] عن عائشةؓ تقول دخل عَلَيَّ رسول الله ... يا عائشةؓ اشد الناس عذابًا عند الله يوم القيٰمة الذين يضاهئون بخلق الله ۔

عن عبد الله بن مسعودؓ يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اشد الناس عذابًا يوم القيٰمة المصورون ۔ (مسلم ج ۲ ص ۲۰۱ باب تحريم تصوير صورة الحيوان وتحريم الخ)

مسجد سے منع کرنا ظلم عظیم کے مترادف ہے۔

وفی الهندية: قال ابو یوسف رحمه الله تعالیٰ اذا غصب ارضاً فبنی فیها مسجداً او حماماً او حانوتاً فلا بأس بالصلوٰة فی المسجد۔ (ج ۵ ص ۳۲۲ کتاب الکراهية)[1]

مسجد کی تعمیر کے وقت قبر کے درمیان میں آنے کا حکم

سوال: ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جو کہ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے تنگ ہوگئی ہے، اس کے قریب ہی ایک خالی پلاٹ واقع ہے جبکہ مسجد اور پلاٹ کے درمیان ایک پختہ قبر ہے، اگر اس پلاٹ کو مسجد میں شامل کر دیا جائے تو قبر مسجد کے دروازہ پر آتی ہے جس سے مسجد کی زینت خراب ہوتی ہے، اگر اس دروازہ کو بند کیا جائے تو دوسری طرف دروازہ نکالنے پر حسن قائم نہیں رہتا، اندریں صورت قبر کے ساتھ کیا کیا جائے؟

الجواب: جب مسجد کی وسعت ناگزیر ہو تو قبر کے درمیان میں آنے کی صورت میں اگر قبر اتنی پرانی کہ اس میں انسانی اعضاء بوسیدہ ہوگئے ہوں تو اس صورت میں اس قبر کو بالکل منہدم کرکے مسجد کے ساتھ اس جگہ کو ملانے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر قبر جدید ہو تو پھر قبر کے اردگرد تعیین کے لیے دیوار بناکر دوسرے حصہ میں مسجد بنائی جائے تاہم اس بات کا خیال رہے کہ مسجد کی وضع ایسی ہو کہ قبر کی طرف کہیں توجہ نہ رہے تاکہ قبر پرستی کا شبہ نہ رہے، ایسی حالت پر زینت کا مسئلہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة فخر الدين الزيلعيؒ ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غيره وزراعته والبناء عليه (تبيين الحقائق ج ۱ ص ۲۴۶ باب الجنائز)

قال الطحطاویؒ وفی القهستانی عن جنائز المضمرات لا تکره الصلوٰة الخ

---

[1] قال فی الينابيع اذا غصب ارضاً فبناها مسجداً او حماماً فلا بأس بدخول المسجد للصلوٰة۔ (الجوهرة النيرة ج ۲ ص ۲۵ کتاب الوقف)

قال قاضیخانؒ: عن ابی یوسفؒ ذکره الناطفی رحمه الله تعالیٰ فی الواقعات اذا بنی فی ارض الغصب مسجداً او حماماً او حانوتاً لا بأس بالصلوٰة فی المسجد۔

(الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندية ج ۱ ص ۶۶ فصل فی المسجد)

جهۃ القبر الا اذا کان بین یدیہ بحیث لو صلی صلوٰۃ خاشعین دفع بصرہ علیہ۔
(طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۶۱ مکروھات الصلوٰۃ) [1]

مسجد کی دوکان پر مدرسہ تعمیر کرنا

سوال: مسجد کے غسلخانوں اور دوکانوں پر دینی علوم کا مدرسہ تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے غسل خانے اور دوکانیں اگرچہ مسجد کے لیے وقف ہیں لیکن احکام کے اعتبار سے من کل الوجوہ ایک ہیں، لہٰذا جب مسجد کو دینی علوم کے لیے استعمال کرنا جائز ہے تو ان مقامات پر مدرسہ تعمیر کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔

وفی الخلاصۃ: اما المعلم الذی یُعلّم الصبیان باجر اذا جلس فی المسجد یعلم الصبیان لضرورۃ الحر وغیرہ لا یکرہ۔ (ج ۱ ص۲۲۹ کتاب الصلوٰۃ) [2]

مسجد میں رقص وسرود

سوال: مسجد میں رقص وسرود کا کیا حکم ہے؟

الجواب: رقص وسرود از روئے شرع ناجائز اور حرام ہے مساجد تو درکنار کسی بھی مقام پر اس کا اہتمام اور اس میں شرکت عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

وفی الہندیۃ: قال رحمہ اللہ تعالیٰ السماع والقول والرقص الذی یفعلہ المتصوفۃ فی زماننا حرام لا یجوز القصد الیہ والجلوس علیہ۔
(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۵ ص۳۵۲ کتاب الکراھیۃ۔ الباب السابع عشر فی الغناء واللھو) [3]

---

[1] لما فی الہندیۃ: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔
(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۱ ص۱۶۷ کتاب الجنائز الفصل السادس فی القبر والدفن)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۵ کتاب الجنائز۔

[2] قال ابن نجیمؒ: لان المسجد ما بنی الا لہا من صلوٰۃ واعتکاف وذکر شرعی وتعلیم علم وتعلمہ وقراءۃ قرآن۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۴) وَمِثْلُہٗ فی الفتاویٰ الہندیۃ ج ۱ ص۱۱۰ کتاب الصلوٰۃ)

[3] قال المرغینانیؒ: ان الملاھی کلھا حرام حتی التغنی بضرب القضیب وکذا قول ابی حنیفۃ
(الہدایۃ ج ۴ ص۴۵۳ کتاب الکراہیۃ فصل الاکل والشرب)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۹۵ کتاب الکراھیۃ، فصل فی البیع۔

عیدگاہ پر مسجد بنانا

سوال:۔ ایک شخص نے عیدگاہ کے لیے زمین وقف کی، اب وہاں لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ کیا شرعاً اس عیدگاہ کے رقبہ پر مسجد تعمیر کی جاسکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی قطعہ زمین صرف عید کی نماز کے لیے وقف کیا گیا ہو تو بغیر اذن واقف کے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز نہیں، کیونکہ شریعت میں واقف کی شرائط کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جب تک شریعت کے موافق ہوں۔ جب واقف اجازت دے دے تو اس تعمیر میں کوئی حرج نہیں الخ اگر یہ قطعہ زمین قانونی وقف ہو شرعی وقف نہ ہو تو اس کی خرید وفروخت بھی جائز ہے۔

قال ابن نجیم المصریؒ۔ شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل به وفی المفهوم والدلالة کما بیناه فی شرح الکنز الا فی مسائل۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف)[۱]

مسجد میں سوال کرنے کا حکم

سوال:۔ عموماً سائلین مساجد میں عوام کی حاضری کو غنیمت سمجھ کر سوال کرتے ہیں، ان کا یہ اقدام کیسا ہے اور ایسے سائلین کے ساتھ مالی تعاون کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں سوال کرنا مکروہ تحریمی ہے اور ان کو دینے میں دو قول ہیں، بعض علماء تو مطلق کراہیت کے قائل ہیں، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر نمازیوں کی رعایت رکھ کر سائل سوال کر رہا ہے تو اس کو دینا جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول (ویحرم فیه السوال ویکره الاعطاء مطلقاً وقیل ان تخطی) ای هو الذی اقتصر علیه الشارح فی الحظر حیث قال فرع یکره اعطاء سائل المسجد الا اذا لم یتخط رقاب الناس فی المختار لان علیاً تصدق بخاتمه فی الصلوٰة فمدحه الله تعالیٰ

---

[۱] قال ابن عابدینؒ فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله ان یجعل ماله حیث شاء مالم یکن معصیة وله ان یخص صنفا من الفقراء ولو کان الوضع فی کلهم قربة۔ (ردالمحتار ج۴ ص۳۴۳ کتاب الوقف مطلب شرائط الواقف معتبرة۔۔۔ الخ)

بقولہ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ٥ (رد المحتار ج ۱ ص۶۵۹ فی افضل المساجد) ؎۱

مساجد میں نمازی کی توجہ متاثر کرنے والی زینت کا حکم

سوال:۔ مساجد میں بطور آرائش و زیبائش ایسا نقش و نگار کرنا، طغرے یا خطوط لکھنا جو نمازی کے لیے نماز میں باعثِ تشویش و خلل اندازی ہوں۔ کیا اس طرح مسجد کی زیبائش کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد ایک عبادت گاہ ہے اور اس کی تعمیر فقط عبادت اور یادِ الٰہی کے لیے ہوتی ہے، اور اگر اس میں ایسے نقوش جو آجکل کی مروجہ تعمیرات میں ہیں بنا دیئے جائیں تو اس سے مسجد کی تعمیر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ جدید عمارات کی طرح یہ بھی ایک سیر و تفریح کا مقام بن جائیں گی، پھر اس میں نماز پڑھنے والے کا دھیان مکمل طور پر نماز میں بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا مسجد کی اتنی زینت کر لی جائے جس سے مسجد خوبصورت اور صاف ستھری نظر آئے البتہ ضرورت سے زیادہ اموال خرچ کر کے مسجد کو مزین کرنا مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ: (ولا بأس بنقشہ خلا محرابہ) فانہ یکرہ لانہ یلھی المصلّی ویکرہ التکلف بدقائق النقوش ونحوھا خصوصاً فی جدار القبلۃ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۵۸ احکام المساجد) ؎۲

مسجد کے درخت اور پھلوں کا حکم

سوال:۔ ہماری مسجد کے صحن میں پھلدار درخت ہیں۔ کیا شرعاً ان پھلوں کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت ہے یا ان کی قیمت سے مسجد کے مصارف پورے کئے جائیں؟

الجواب:۔ مسجد میں پھلدار درخت اگر وقف برائے مسجد ہوں تو ان کا کھانا جائز نہیں،

؎۱ اعطأ سوال المسجد انہ اذا کانوا لا ینخطون رقاب الناس ولا یمرون بین یدی المصلین یسألون مالا بد لھم منہ ولا یلحون فی السؤال فلا بأس ولا بالمطانۃ۔ (فتاوٰی غیاثیۃ ص۲۱)

؎۲ وفی الھندیۃ: اما المتولی یفعل من مال الوقف ما یرجع الی أحکام البناء دون ما یرجع الی النقش حتی لو فعل یضمن کذا فی الھدایۃ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۰۹ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلٰوۃ وما لا یکرہ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۱ ص۱۴۴ باب ما یفسد الصلٰوۃ وما یکرہ فیھا۔

البتہ اگر واقف نے ابتداءً اس کی شرط رکھی ہو تو پھر جائز ہے، بہتر یہ ہے کہ مسجد کے پھل فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد کے مصارف میں خرچ کی جائے ۔

قال ابن نجیمؒ: وفی الحاوی وما غرس فی المساجد من الاشجار المثمرة ان غرس للسبیل وهو الوقف علی العامة کان لکل من دخل المسجد من المسلمین ان یأکل منها وان غرس للمسجد لا یجوز صرفها الا الی مصالح المسجد الاهم فالاهم کسائر الوقوف۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۰۵ کتاب الوقف) ؎۱

امام کا مسجد کو ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا

سوال:- مسجد کا صحن یا برآمدہ جس میں باقاعدہ نماز باجماعت پڑھائی جاتی ہو، کسی وقت حالات کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص یا امام مسجد اپنے ذاتی استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:- مسجد کے برآمدہ یا صحن کو جب باقاعدہ مسجد کا حصہ قرار دیا جا چکا ہو تو ایک دفعہ مسجد بن جانے کے بعد وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس کو اب کسی دوسرے امور میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر یہ برآمدہ کہیں مسجد کے لیے وقف ہو لیکن نماز اس میں نہیں پڑھی گئی ہو تو ایسی صورت میں مسجد پہ وقف ہو کر واقف کی اجازت یا متولی کی صوابدید پر امام کا اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام (والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی)۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی

؎۱ قال العلامة طاهر بن احمد بن عبد الرشید البخاریؒ: وسئل ابوبکر عن وقف شجرة اصلها والشجرة فیما ینتفع باوراقها وثمرها۔ قال فالوقف جائز وینتفع بثمرها ولا یقطع اصلها الا ان یفسد اغصانها فان لم ینتفع باوراقها وثمرها فانها تقطع وتصرف ثمنها علی سبیله فان نبت ثانیا والا غرس مکانها۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف۔ نوع منه)
ومثله فی الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۷۷ کتاب الوقف۔

واکثر المشائخ علیه مجتبیٰ وھو الاوجه فتح۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ مطلب فیما لو خرب المسجد)[1]

مسجد بنانے کے ارادہ سے وہ جگہ شرعی مسجد نہیں بنتی

سوال:۔ اہلِ محلہ نے ایک جگہ کا تعین کر کے مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور پتھر وغیرہ بھی جمع کر لیے، بعض وجوہات کی وجہ سے اس جگہ مسجد بنانا موزوں نہیں سمجھا گیا، اب ایک دوسری جگہ مسجد بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے، کیا یہ تبادلہ جائز ہے یا اُسی جگہ پر جہاں پہلے ارادہ کیا گیا تھا مسجد کے لیے کام شروع کیا جائے؟

الجواب:۔ صرف ارادہ کرنے سے یہ جگہ شرعی مسجد کا حکم نہیں رکھتی بلکہ مسجد کیلئے باقاعدہ وقف کے علاوہ نماز پڑھنی بھی ضروری ہے لہٰذا وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے اس کی جگہ دوسرے مقام پر مسجد بنانا جائز ہے اور اس جگہ کو اپنی ذاتی اغراض کیلئے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال المرغینانیؒ: واذا بنی مسجداً لم یزل ملکه عنه حتی یفرزہٗ عن ملکه بطریقه ویاذن للناس بالصلوٰۃ فیه فاذا صلی فیه واحدٌ زال عند ابی حنیفةؒ عن ملکه وقال ابو یوسفؒ یزول ملکه بقوله جعلته مسجداً۔ (الهدایة ج۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف فصل فی المسجد)[2]

مسجد کی ضرورت سے زائد اشیاء کی فروخت کا حکم

سوال:۔ ایک پرانی مسجد کا کچھ سامان مثلاً شہتیر وغیرہ زائد از ضرورت پڑا ہے، اگر اسے فروخت نہ کیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ کیا مسجد کے زائد سامان کو فروخت کرنا جائز ہے جبکہ اس کے نفع کو مسجد پر ہی خرچ کیا جائے؟

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احدٌ فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وھو قول محمد وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک البانی ولا الی ملک ورثته وھو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد واوقافه الخ)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۶۲۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: ولو جعل داره مسجداً یجوز بالاجماع ولا یجوز مشاعاً وانما یجوز اذا سلمه والتسلیم ان یصلی فیه بجماعة باذان واقامة باذنه عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۰۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

الجواب:- مسجد کے اموال کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی منقول چیز ہو یعنی جو مسجد کی جزئیت میں داخل نہ ہو، مثلاً دری وغیرہ۔ اگر اس کی ضرورت نہ رہے اور مالک موجود ہو یا مالک کے فوت ہونے کی صورت میں اسکے ورثاء موجود ہوں تو مالک یا ورثاء کی اجازت سے اس کی فروخت جائز ہے۔ اور اگر ان میں کوئی نہ ہو تو پھر اہلِ محلہ کے اتفاق یا قاضی وحاکم کی اجازت سے فروخت جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ چیزیں باقاعدہ مسجد کا حصہ بن جائیں اور علیحدہ کرنے میں مسجد کا نقصان نہ ہو لیکن کہیں تعمیر کی نیت سے یہ چیزیں الگ کی گئی ہوں تو پھر اہلِ محلہ کے اتفاق یا قاضی کی اجازت سے ان کی فروخت جائز ہے۔

وفی الهندية: ذکر ابو الليث فی نوازله حصير المسجد اذا صار خلقاً واستغنى اهل المسجد عنه وقد طرحه انسان ان كان الطارح حيا فهو له وان كان ميتاً ولم يدع له وارثاً ارجو ان لا بأس بان يدفع اهل المسجد الى فقير وينتفعوا به فی شراء حصير آخر للمسجد والمختار انه لا يجوز لهم ان يفعلوا ذلك بغير امر القاضی كذا فی محيط السرخسی۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص۴۵۸ کتاب الوقف) [۱]

مسجد کے چندہ کو کسی شرط سے معلق کرنا

سوال:- کیا مسجد کے چندہ کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کر کے دیا جا سکتا ہے؟ مثلاً بصورتِ نیلام ایک شخص کہتا ہے کہ اگر میری بولی پوری نکلی تو میں ۹۰۰ روپے مسجد میں بطور چندہ دوں گا، اب اس کی بولی پوری نکل آتی ہے اور یہ ۹۰۰ روپے چندہ مسجد کے لئے دے دیتا ہے تو دوسرا شخص

---

[۱] قال ابن عابدینؒ: (حشيش المسجد) ای الحشيش الذی يفرش بدل الحصر كما يفعل فی بعض البلاد كبلاد الصعيد كما اخبرنی به بعضهم قال الزيلعی وعلى هذا حصير المسجد وحشيشه اذا استغنى عنهما يرجع الى مالكه عند محمدؒ وعند ابی يوسفؒ ينقل الى مسجد آخر ۔۔۔۔ وصرح فی الخانية بان الفتوى على قول محمدؒ قال فی البحر وبه علم ان الفتوى على قول محمدؒ فی آلات المسجد۔

(رد المحتار ج ۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف مطلب فيما لو خرب المسجد)

ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۲ کتاب الوقف۔

اس کی بولی پر بولی ہوتا ہے تو یہ شخص چندہ دینے سے انکاری ہے اور واپسی کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا یہ شخص چندہ کی واپسی کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کا چندہ ایک صدقہ ہے جس سے مقصود رضاء الٰہی کا حصول ہے، اگر اس کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا جائے تو شرط باطل ہو کر صدقہ جائز ہو جاتا ہے بعد ازاں اس میں رجوع کا حق حاصل نہیں، لہٰذا یہ شخص متولی کے قبضہ کرنے کے بعد رجوع نہیں کر سکتا۔

وفی الهندیة: وما لا یبطل بالشروط الفاسدة ستة وعشرون) القرض والهبة والصدقة (ج ۴ ص۳۹۶ کتاب الهبة) الصدقة بمنزلة الهبة فی المشاع وحاجتها الی القبض الا انه لا رجوع فی الصدقة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۴ ص۴۰۶ الباب الثانی عشر فی الصدقة)[1]

مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا

سوال:۔ سکھوں کے دور میں بازار کے اندر ایک خالی مقام کو مسلمانوں نے مسجد کے لیے متعین کیا اور اس پر نمازیں پڑھنے لگے، جب اس اراضی کی فروخت شروع ہوئی تو سکھ اس کو خریدنا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں نے اس پر ایک کمرہ تعمیر کر لیا اور بعد میں اس پر دوسری منزل بنا دی اور باقاعدہ اس میں پنجگانہ نمازیں شروع کیں یہاں تک کہ جمعہ و عیدین بھی اس میں پڑھنے لگے۔ اب اس مسجد کے فنڈ میں کثرت کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کے نچلے حصے دوکانیں بنا دی جائیں اور اوپر والا حصہ مستقل طور پر مسجد ہی رہے گا، جبکہ متولی کہہ رہا ہے کہ جس وقت ہم مسجد کی دوسری منزل بنا رہے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ اگر ہمارے پاس گنجائش ہوگی تو ہم نچلے حصہ میں دوکانیں بنائیں گے۔ اندریں صورت مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قبہ مسلمانوں نے مشترکہ طور پر مسجد کے لیے متعین کیا ہے اور حکومتِ وقت کی طرف سے اس پر مسلسل خاموشی اختیار کرنا دلالتاً مسجد کی اجازت ہے۔ لہٰذا جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے تو اب اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا، اسلئے

---

[1] قال الحصکفیؒ: (و) حکمها انها (لا تبطل بالشروط الفاسدة) فهبة عبد علی ان یعتقه تصح و یبطل الشرط۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص۶۸۸ کتاب الهبة)

(والصدقة کالهبة) بجامع التبرع وحینئذٍ (لا تصح غیر مقبوضة ولا فی مشاع یقسم ولا رجوع فیها)۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص۷۰۹ کتاب الهبة)

مسجد کے نچلے حصہ میں دوکانیں بنانا اگرچہ مسجد کے مصالح میں سے ہیں جائز نہیں۔ البتہ اگر کوئی ابتدأ سے ہی نیچے دوکانیں بنائے اور اوپر مسجد بنائے اور وہ دوکانیں مصالح مسجد کے لیے ہوں تو یہ جائز ہے۔

وفی الهندیة: قیم المسجد لایجوز له ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفی فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتاً اومسکناً تسقط حرمته وهذا لایجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد کذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف، الفصل الثانی الوقف فی المسجد) [۱]

منبر کو محراب کی دائیں جانب رکھنا

سوال:۔ زمانۂ قدیم سے منبر عموماً محراب کے دائیں جانب رکھا جاتا تھا، موجودہ دور میں بعض مقامات پر ایسا نہیں ہوتا، کیا محراب کی دائیں طرف منبر کا ہونا ضروری ہے یا محض عرف کا فیصلہ ہے؟

الجواب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں منبر مصلّٰی کے دائیں طرف ہوا کرتا تھا، لہٰذا سنت یہ ہے کہ منبر محراب و مصلّٰی کے دائیں جانب رکھا جائے۔

کان سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم عن یمین المحراب اذا استقبلت القبلة۔ (بذل المجهود ج۲ ص۱۷۸ باب موضع المنبر) [۲]

مسجد کی آمدنی سے تجارت کا حکم

سوال:۔ کیا مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد کا متولی مسجد کی بہتری کے لیے اپنی صوابدید پر مسجد کے چندہ میں تصرفات کرسکتا ہے، اگر خرید و فروخت میں مسجد کا فائدہ ہو تو متولی کو یہ حق حاصل ہے تاہم

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: فی المجتبیٰ لایجوز لقیم المسجد ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفنائه۔ (البحرالرائق ج۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف)

[۲] وقال النوویؒ فی مناسکه ما لفظه وفی احیاء علوم الدین انه ای المصلی یجعل عود المنبر حذا منکبه الایمن ویستقبل الساریة التی الی جانبها الصندوق وتکون الدائرة التی فی قبلة المسجد بین عینیه فذلک موقف رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (وفاء الوفاء ج۱ ص۳۷۲ محراب المسجد النبی ومنبر)

چندہ دہندگان سے اجازت مستحسن ہے۔

وفی الهندیة: القیم اذا اشتری من غلة المسجد حانوتًا اودارا ان یستغل ویباع عند الحاجة جاز ان کان له ولایة الشراء واذا جاز له ان یبیعه کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۶۲ کتاب الوقف) ؎۱

مسجد کے درخت کی ملکیت کا حکم

سوال:۔ مسجد کے صحن میں امام صاحب نے پھلدار درخت لگایا تھا اب جبکہ وہ درخت تناور ہو کر قیمتی درختوں میں اس کا شمار ہوتا ہے تو امام موصوف اس درخت کی ملکیت کا دعوٰی کرتا ہے۔ از روئے شریعت اس درخت کا مالک امام موصوف ہے یا مسجد؟

الجواب:۔ کاشت کرتے وقت جب ذاتی اغراض کی نیت نہیں کی ہو جیسا کہ عام مسلمانوں سے یہی توقع کی جاتی ہے، تو مسجد کی ملکیت شمار ہوگی۔

وفی الهندیة: سئل نجم الدین عن رجل غرس تالة فی مسجد فکبرت بعد سنین فاراد متولی المسجد ان یصرف هذه الشجرة الی عمارة بئر فی هذا السکة والغارس یقول هی لی فانی ما وقفتها علی المسجد قال الظاهر ان الغارس جعلها للمسجد فلا یجوز صرفها ای البئر ولا یجوز للغارس صرفها الی حاجة نفسه کذا فی محیط۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۷۷ کتاب الوقف) ؎۲

مساجد میں تعویذ فروشی کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ مساجد میں مستقل طور پر تعویذ فروخت کرتے ہیں جس کے لیے نامحرم عورتیں بھی مساجد

؎۱ قال ابن نجیمؒ: قیم یبیع فناء المسجد لیتجر فیه القوم او یضع فیه سررا اجرها لیتجر فیها الناس فلا بأس اذا کان لصلاح المسجد ویعذر المستاجر ان شاء الله تعالٰی اذا لم یکن ممر العامة۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۹ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۳ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد۔

؎۲ قال ابن نجیمؒ: وفی المحیط رجل غرس فی المسجد یکون للمسجد لانه بمنزلة البناء بالمسجد۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۰۴ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الخلاصة ج ۴ ص ۴۲۰ کتاب الوقف الفصل الثالث فی صحة الوقف۔

کا رُخ کرتی ہیں، عین ممکن ہے کہ ان میں بعض عورتیں ایسی بھی ہوں جو طبعی بیماریوں کی وجہ سے مساجد میں داخل ہونے کی اہل نہیں ہوتیں۔ تو کیا مساجد میں تعویذ فروشی کرنا جائز ہے اور ایسی حالت میں شرعاً عورتوں کے لیے مسجد میں داخل ہونے کی گنجائش ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں عورتوں کا فی نفسہٖ داخل ہونا جائز ہے لیکن فسادِ ازمنہ کی وجہ سے انہیں مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے تو تعویذ کے لیے کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے، خاص کر جبکہ ان میں بہت سی عورتیں ناپاکی کی حالت میں ہوں اور ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تاہم اگر پاک ہوں تو حدود کی رعایت رکھ کر تعویذ لے سکتی ہیں، لیکن مسجد میں تعویذ فروشی کا دھندہ مطلق جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: (و) یمنع حل (دخول مسجد) ای ولو مسجد مدرسۃ او دار لا یمنع اھلھما الناس من الصلوٰۃ فیہ۔ (ردّ المحتار ج ۱ ص ۲۹۱ باب الحیض) [۱]

مسجد کے ساتھ متصلہ کمروں میں سونے کا حکم

سوال:۔ مساجد کے ساتھ متصل جو کمرے ہوتے ہیں ان میں سونے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ان کمروں اور مسجد کا حکم ایک ہی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے ساتھ متصلہ کمرے اگر ابتداء ہی سے مسجد سے باہر بنائے گئے ہوں تو ان میں سونا بلا کراہیت جائز ہے، البتہ اگر شروع ہی سے یہ کمرے مسجد میں شامل تھے بعد میں انہیں مسجد سے نکال کر کسی عذر کی بناء پر کمرے بنائے گئے ہوں تو ان کا حکم اور مسجد کا حکم ایک ہے، ان میں بلا ضرورت سونا مکروہ ہے۔

وفی الھندیۃ ویکرہ النوم والاکل فیہ لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلک

---

[۱] وفی الھندیۃ (ومنھا) انہ یحرم علیھما وعلی الجنب الدخول فی المسجد سواء کان للجلوس او للعبور ھٰکذا فی منیۃ المصلّی (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۳۸ الفصل الرابع فی احکام الحیض)

رجل یبیع التعویذ فی المسجد الجامع ویکتب فی التعویذ التوراۃ والانجیل والفرقان ویاخذ علیہ المال ویقول ادفع الی الھدایۃ لا یحل لہٗ ذٰلک۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۲۱ کتاب الکراھیۃ الباب الخامس فی آداب المسجد)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۳۸ باب الحیض۔

ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیہ ویذکر اللہ تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ثم یفعل ما شاء کذا فی السراجیۃ ولا بأس للغریب ولصاحب الدار ان ینام فی المسجد فی الصحیح من المذہب والاحسن ان یتورع فلا ینام کذا فی خزانۃ الفتاوی۔
(الفتاوی الہندیۃ ج ۵ ص۳۲۱ کتاب الکراہیۃ) [1]

قبلہ کی تحقیق

سوال:۔ ہمارے ہاں تقریباً ایک سو بیس سال سے آباد ایک پرانی مسجد ہے، اب بوسیدہ ہونے کی بناء پر اس کو شہید کرکے اس کی از سرِ نو تعمیر کرنے کے لیے جب نئی بنیادیں رکھنے کا وقت آیا تو مستری نے کہا کہ میں قطب ستارہ کا ماہر ہوں اور قطب ستارہ کی رُو سے اس مسجد کی سمتِ قبلہ صحیح نہیں۔ اب اگر اس کی بنیادوں میں تبدیلی کی جائے تو اس میں کئی مفاسد شرعیہ ہیں، مثلاً مسجد کے بعض حصے کا راستہ میں شامل ہوجانا وغیرہ جو کہ شرعاً جائز نہیں۔ کیا ایسی صورت میں اس مستری پر اعتماد کرکے اس کی بنیادوں میں برائے تعیینِ سمتِ قبلہ تبدیلی کی جاسکتی ہے یا قدیمی حالت میں بدستور برقرار رکھی جائے؟

الجواب:۔ اس مسئلہ پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ استقبالِ قبلہ فرض ہے البتہ اس کی تفصیل میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ علماء احناف نے عوام کی آسانی کے لیے یہ حکم فرمایا کہ نمازی کا بحالتِ نماز مواجہت مابین المغربین اگر ہو تو استقبالِ قبلہ ہوجاتا ہے۔ یعنی موسمِ سرما میں مغرب کا آخر وقت اور موسمِ گرما میں مغرب کا آخر وقت کے درمیان میں جو فاصلہ ہو، اگرچہ عین قبلہ سے قدرے انحراف ہی کیوں نہ پایا جائے

البتہ مستری کا یہ کہنا کہ میں قطبی ستارہ کا ماہر ہوں، یہ اس کا دعوٰی ہے، اگر وہ اپنے اس دعوٰی میں سچا ہو اور اس میں اُس کی شہرت ہو تو اس پر اعتماد کرلیا جائے ورنہ نہیں، بہرحال تحقیق پھر بھی ضروری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: وقال فی شرح زاد الفقیر وفی بعض الکتب المعتمدۃ فی استقبال القبلۃ الی الجہۃ اقاویل کثیرۃ واقربہا الی الصواب قولان الاول ان ینظر

---

[1] قال القاضی خانؒ: وقیل لا بأس للغریب ان ینام فی المسجد۔
(فتاوی قاضی خان علی ہامش الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۶۶)
ومثلہ فی رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۶۶۱ مکروہات الصلوٰۃ مطلب احکام المسجد۔

فی مغرب الصیف فی اطول ایامه ومغرب الشتاء فی اقصر ایامه فلیدع الثلثین فی الجانب الایمن والثلث فی الایسر والقبلة عند ذلك ولو لم یفعل هکذا وصلی فیما بین المغربین یجوز واذا دفع خارجا منها لا یجوز بالاتفاق ۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۴۳۳ مبحث فی استقبال القبلة)

قال ابن عابدینؒ (قوله کالقطب) هو اقوی الادلة وهو نجم صغیر فی بنات الصغری بین الفرقدین والجدی اذا جعله الواقف خلف اذنه الیمنی کان کان مستقبلا القبلة ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۳۳ مبحث فی استقبال القبلة) [1]

مسجد کی چھت پر بیت الخلاء بنانا	**سوال**: مسجد کے اوپر راستہ کی طرف اگر بیت الخلاء بنا دیا جائے تو کیا شرع میں اس کی گنجائش ہے؟

الجواب: مسجد کی حدود میں بیت الخلاء بنانا شرعاً جائز نہیں، اگرچہ مسجد کی چھت پر ہی کیوں نہ ہو اور اس کا راستہ علیحدہ ہو۔ البتہ مسجد کے نیچے ابتداء سے واقف کے نیت سے بیت الخلاء وغسلخانہ بنانا جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ (و) کرہ تحریما (الوطؤ فوقه والبول والتغوط) لانه مسجد الی عنان السماء ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المسجد) [2]

---

[1] قال ابو اللیثؒ: وقبلة اهل خراسان ما بین مغیب الصیف ومغیب الشتاء قال ابو منصور قبلة ما وراء النهر هو ان یترك الثلثین من یمین المصلی والثلث من یساره من المغربین ۔ (فتاوی نوازل ص۳۷ فصل فی شروط الصلوٰة)
وفی الطحطاوی اما به جهتها ان المغرب قبلة لاهل المشرق بالعکس (ص۱۱۵ باب شروط الصلوٰة)
اما فی البحار فدلیل القبلة النجوم وقد روی عن عمر رضی الله عنه انه قال تعلموا من النجوم ما تهتدوا به الی القبلة اھ۔ وذلك کالقطب ۔ (طحطاوی ص۱۱۷)

[2] قال ابن نجیم (والوطؤ فوقه والبول والتخلی) ای کره الوطؤ فوق المسجد وکذا البول والتغوط لان سطح المسجد له حکم المسجد ۔
(البحر الرائق ۔ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکره فیها)
ومثلهٗ فی الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۰۹ فصل فی غلق باب المسجد)

مسجد کے نیچے آتش خانہ بنانا

سوال: مسجد کے تہہ خانہ میں سردی کے موسم میں بوقتِ ضرورت آگ جلانے کے لیے جگہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: نفسِ مساجد میں آگ لے جانا یا جلانا بذاتِ خود ممنوع نہیں، البتہ مجوسیوں کی طرح معبدگاہ بنانا جائز نہیں۔ اگر یہ آگ مسجد کے مصالح کے لیے جلائی جائے مثلاً پانی گرم کرنے یا مسجد کے گرم کرنے کے لیے، جیسا کہ بعض ممالک میں ایسا ہوتا ہے کہ مسجد کے تہہ خانہ میں آگ جلائی جاتی ہے جس سے موسمِ سرما میں مسجد گرم ہو جاتی ہے۔ تو یہ جائز ہے۔

قال ابن عابدین: (واذا جعل تحته سردابا لمصالحه) ای المسجد (جاز) کمسجد القدس اذا کان السرداب والعلو موقوفاً لمصالح المسجد فھو کسرداب بیت المقدس ھذا ھو ظاھر الروایة وھناک روایات ضعیفة مذکورة فی الھدایة۔

(رد المحتار ج ۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف، مطلب فی احکام المساجد) [1]

مسجد کے متصل غسل خانہ بنانا

سوال: ایک شخص نے مسجد کی دیوار کے متصل غسلخانہ بنایا ہے اور غسل خانہ کی چار دیواری میں سے ایک دیوار مسجد کی ہے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: غسل خانہ کو مسجد کے اندر بنانا جائز نہیں، البتہ واقف مصالح مسجد کی رعایت کرتے ہوئے مسجد کے نیچے غسل خانہ اور بیت الخلاء بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ بہرحال اگر کسی نے مسجد کے ساتھ متصل اپنی زمین میں غسل خانہ بنایا ہے اور مسجد کی دیوار کو بطورِ پردہ استعمال کیا ہے تو یہ جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اس بات کی رعایت ضرور رکھی جائے گی کہ اس سے مسجد کو نقصان نہ پہنچے اور کل کہیں محض پردہ کے استفادہ سے اس دیوار کی ملکیت کا دعویٰ نہ کرے۔

قال ابن عابدینؒ: لو جعل الواقف تحته بیتاً للخلاء ھل یجوز کما فی مسجد

---

[1] وفی الھندیة: ومن جعل مسجداً تحته سرداب او فوقه بیت وجعل باب المسجد الی الطریق وعزله فله ان یبیعه وان مات یورث عنه ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الھدایة۔
(الفتاوی الھندیة ج۲ ص۴۵۵ کتاب الوقف) ـــ ومثلہ فی الھدایة ج۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف۔

محلة الشحم فى دمشق؟ لم اکرہ صریحًا نعم سیأتی متنا فی کتاب الوقف انه لو جعل تحته سردابًا لمصالحه جاز تامل۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۵۶ مکروهات الصلوٰۃ۔ مطلب احکام المسجد) ۔ ۱ھ

مسجد کی آمدنی کے لیے بینک میں کھاتہ کھولنا

سوال:۔ کیا امام یا خزانچی مسجد کا فنڈ اپنے نام پر بینک میں جمع کرا سکتا ہے؟ اور کیا اس فنڈ کو اپنے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد کا فنڈ خرچ ہونے سے پہلے وقف عرفی ہوتا ہے شرعی نہیں ہوتا۔ امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ چندہ دہندگان کی اجازت کے بغیر مسجد کا فنڈ بینک میں داخل کرائے یا اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرے، البتہ اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو امام اسے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔ اور بینک میں جمع کرنا بغیر اضطراری حالت کے اچھا نہیں، اگرچہ بغیر سود کے ہی کیوں نہ ہو۔

وفی الهندية: لو وقف دراهم اومكيلا او ثيابا لم يجز وقيل فى موضع تعارفوا ذلك يفتى بالجواز قيل كيف قال الدراهم تقرض للفقراء يزرعون ثم تؤخذ منهم والثياب والاكسية تعطى للفقراء ليلبسوها عند حاجتهم ثم تؤخذ كذا فى الفتاوى العتابية۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۳۶۲ كتاب الوقف)

قال الحصكفیؒ: (حبس العين على) حكم (ملك الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو فى الجملة والاصح انه (عنده) جائز غير لازم كالعارية (وعندهما هو حبسها على) حكم (ملك الله تعالى و) صرف (منفعتها على من احب)۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۷ كتاب الوقف) ۔ ۲ھ

۱ھ وفى الهندية ومن جعل مسجدًا تحته سرداب او فوقه بيت وجعل باب المسجد الى الطريق وعزله فله ان يبيعه وان مات يورث عنه ولو كان السرداب لمصالح المسجد جاز كما فى مسجد بيت المقدس كذا فى الهداية۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۴۵۵ كتاب الوقف)

ومثلهٗ فى الهداية ج ۲ ص ۶۲۳ كتاب الوقف۔ فصل فى وقف المسجد۔

۲ھ قال المرغينانیؒ: قال ابو حنيفةؒ لا يزول ملك الواقف عن الوقف الا ان يحكم به الحاكم او يعلقه بموته فيقول اذا مت فقد وقفت دارى على كذا۔ وقال ابو يوسفؒ يزول ملكه بمجرد القول۔ وقال محمد لا يزول حتى يجعل للوقف متوليا ويسلمه اليه۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۱۴ كتاب الوقف)

مسجد پر وقف شدہ مال کو واپس لینا

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک ہزار روپے چندہ دیا، اور اس میں سے بعض رقم مسجد کی تعمیر میں خرچ ہو گئی ہے، جبکہ اس شخص کا اب یہ مطالبہ ہے کہ میں نے جو رقم مسجد کی تعمیر کے لیے دی تھی وہ مجھے واپس کی جائے میں اس رقم کو دوسری مسجد کی تعمیر کے لیے دیتا ہوں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اپنی تمام رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں نہیں دے گا بلکہ نصف رقم اپنی ذات کے لیے استعمال کرے گا۔ کیا اس شخص کو وقف کی رقم واپس لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مساجد یا دینی مدارس میں جو چندہ دیا جاتا ہے وہ صدقہ ہوتا ہے اور صدقہ جب متصدق کے ملک میں داخل ہو جائے تو پھر اس میں رجوع کرنا درست نہیں۔

چونکہ فقہاء کی عبارات کی روشنی میں مسجد کے لیے تملیک درست ہے تملیک کے بعد چندہ معطی کی ملک سے خارج متصور ہوتا ہے لہٰذا دینی مدارس یا مساجد میں چندہ دینے کے بعد معطی کو حق رجوع حاصل نہیں۔

لما قال فی الهندية۔ رجل اعطی درهماً فی عمارة المسجد او نفقة المسجد او مصالح المسجد صح لانه وان كان لايمكن تصحيحه وقفاً يمكن تصحيحه تمليكاً للمسجد فاثبات الملك للمسجد علی هذا الوجه صحيح فتم بالقبض...... كما لو قال وقفتُ هذه المائة للمسجد يصح بطريق التمليك اذا اسلمه للقيم۔ (الفتاوی الهندية ج۲ ص۴۶۰ كتاب الوقف، الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القيم ---الخ)

وايضاً قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ: الصدقة كالهبة لاتصح الا بالقبض ولارجوع فی الصدقة لان المقصود هو الثواب وقد حصل۔

(الهداية ج۳ ص۲۹۳ كتاب الهبة، فصل فی الصدقة) [1]

---

[1] لما قال الشيخ ظفر احمد العثمانیؒ: التمليك للمسجد صحيح قلت فی الحديث دليل لما قال علماؤنا من ان التمليك للمسجد صحيح فی الهندية.... الخ (اعلاء السنن ج۱۳ ص۱۹۸ باب الوقف علی المصالح المسجد وحكم مايهدی اليه من الاموال۔)

لما قال العلامة ابوبكر بن علی الحدادی اليمنی: الصدقة كالهبة لاتصح الا بالقبض لانها تبرع كالهبة.....ولاتصح الرجوع فی الصدقة بعد القبض لانه قد كمل فيها الثواب من الله تعالی۔ (الجوهرة النيرة ج۲ ص۱۹ كتاب الهبة)

مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا

سوال:۔ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا اور اسی طرح مسجد کی چار دیواری کا انتظام نہ کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی چار دیواری تو مسجد کے فنڈ اور رقم سے بنائی جاتی ہے اور اگر مسجد کا فنڈ اتنا نہ ہو کہ اس سے مسجد کی چار دیواری تعمیر کی جا سکے اور اہلِ محلہ بھی باوجود قدرت رکھنے کے اس کا انتظام نہیں کرتے جس سے مسجد کی املاک کے تلف یا ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو عند اللہ اہلِ محلہ گنہگار ہوں گے۔ البتہ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا یا اس میں گندے پانی کی نالی گذارنا عند الشرع جائز نہیں، کیونکہ مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قَوْلُہٗ تَعَالیٰ:
طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ (سورۃ البقرۃ) [1]

مسجد کے ساتھ متصلہ زمین کو جبراً مسجد کے لیے لینا

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں مسجد کے ساتھ متصل ایک قطعہ زمین ہے جو کہ حکومت کی ملکیت ہے اور جو مسجد کے تنگ ہونے کی وجہ سے مسجد کو درکار ہے جبکہ حکومت یہ زمین مسجد کو دینے سے انکاری ہے۔ کیا مسجد کی ضرورت کے پیشِ نظر جبراً یہ زمین مسجد میں شامل کی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے ساتھ متصلہ زمین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ متصلہ زمین عام راستہ ہے یا مکان اور دوکان ہے، اگر راستہ ہو تو لوگوں کی مصلحت کو دیکھ کر اس کو مسجد میں شامل کر دیا جائے۔ البتہ اگر اس کو مسجد میں شامل کرنے سے لوگوں کو تکلیف ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں، اور مکان و دوکان کو مسجد میں شامل کرنے کے لیے قاضی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

وفی الهندیة: قوم بنوا مسجدا واحتاجوا الی مکان یتسع المسجد واخذوا من الطریق وادخلوه فی المسجد ان کان یضر باصحاب الطریق لا یجوز و ان کان

---

[1] قال ابن عابدین: (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اھ۔ ومفاده الجواز لو جافة لکن فی الفتاوی الهندیة لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۶۵۶، مطلب فی احکام المسجد)۔ ومثلہٗ فی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۶۳ فصل فی المسجد۔

لا یضر بهم رجوت ان لا یکون بہ بأس کذا فی المضمرات۔ ایضاً لہ ارض وقف علی مسجد والارض بجنب ذلک المسجد وارادوا ان یزیدوا فی المسجد شیئاً من الارض جاز لکن یرفعون الی القاضی لیاذن لہم ومستغل الوقف کالدار والحانوت علی ھذا کذا فی الخلاصۃ۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۲ ص۴۵۶ کتاب الوقف)

تاہم اگر مسجد کے ساتھ متصل زمین ہو اور حکومت دینے سے انکار کرتی ہو تو مسجد کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر جبراً قیمتاً حاصل کی جاسکتی ہے۔

ولو ضاق المسجد علی الناس وبجنبہ ارض لرجل توخذ ارضہ بالقیمۃ کرھا کذا فی فتاوی قاضی خان۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۲ ص۴۵۶ کتاب الوقف) [1]

کس برش کا استعمال مسجد میں جائز ہے؟

سوال:۔ آجکل جو صفائی کے برش رائج ہیں ان میں اکثر خنزیر کے بال استعمال کیے جاتے ہیں، اور یہ برش کئی لوگ اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں، اور بعض مساجد میں بھی دیکھا گیا ہے کہ صفائی کے لیے یہ برش استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیا ایسے برش کا مسجد میں استعمال شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں ان کو نجاست سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے، چونکہ خنزیر کا ہر ہر جزء نجس العین ہے اس لیے اس سے کسی صورت میں بھی انتفاع جائز نہیں، لہٰذا ایسے برش جو نجاست سے مخلوط ہوں مساجد ان سے پاک رکھی جائیں۔ لیکن بلا تحقیق کسی چیز کے بارے میں نجس کا حکم صادر کرنا دانشمندی کا تقاضا نہیں۔

قولہ تعالیٰ: طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ (سورۃ البقرۃ)

قال العلامۃ فخر الدین: ولا یبزق فی المسجد لا فوق البواری ولا تحت الحصیر لا انا امرنا بتعظیم المسجد وصونہ عن النجاسۃ فیاخذ النخامۃ

---

[1] قال الحصکفی: (وتوخذ ارض) ودار وحانوت (بجنب مسجد ضاق علی الناس بالقیمۃ کرھا)۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص۳۷۹ کتاب الوقف)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۶ کتاب الوقف۔

بثوبه ولا یلقیها فی المسجد۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ۱ ص۶۴ فصل فی المسجد)[1]

عوام کی ضرورت کے لیے مسجد کو مسمار کرنا

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں عرصہ قدیم سے ایک مسجد آباد ہے جس میں گردونواح کے لوگ نماز پڑھتے ہیں، جبکہ یہ مسجد سڑک اور دوکانوں کے قریب واقع ہے۔ بعض دوکانداروں نے حکومت کو یہ درخواست دی ہے کہ اس مسجد کو مسمار کیا جائے کیونکہ اس مسجد کی وجہ سے ہمارے کاروبار میں فرق آتا ہے، کیونکہ یہ مسجد ہماری دوکانوں کے سامنے واقع ہے جس سے ہماری دوکانیں مخفی ہو جاتی ہیں۔ اندریں صورت کسی مسجد کو مسمار کرنا بوقت ضرورت جائز ہے؟

الجواب:۔ امتِ مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ کسی مقام یا جگہ میں جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو قیامت تک یہ مسجد ہی رہے گی، اس کو مسمار کرنا یا کسی اور کام میں لانا شرعاً جائز نہیں، جن لوگوں نے اس کو مسمار کرانے کی درخواست دی ہے انہیں توبہ کرنی چاہیئے کسی مسلمان یا مومن سے ایسی درخواست کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

قال الحصکفیؒ: ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ: (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کان یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبیٰ وهو الاوجه۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ باب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد)[2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اھ۔ ومفاده الجواز لو جافة لکن فی الفتاوی الهندیة لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۶۵۶ مطلب احکام المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۱۰ فصل غلق المسجد۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۴ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد)

مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرنا

سوال:۔ اگر ایک شخص کسی جذباتی فیصلہ کے تحت مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرے لیکن بعدازاں اس وعدہ پر پابندی نہیں کرتا ہو۔ کیا اس پر زمین دینا ضروری ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین دینے کے وعدہ سے وقف تام نہیں ہوتا بلکہ وقف کے لیے یہ شرط ہے کہ پہلے زمین کو اپنی ملک سے خارج کرکے باقاعدہ عوام کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے، لہٰذا صرف وعدہ کی صورت میں وقف تام نہیں ہوا، تاہم وعدہ کی خلاف ورزی گناہ ہے۔

وفی الهندیة: من بنی المسجدا لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن بالصلوٰة فیه اما الافراز فلانه لایخلص لله تعالیٰ الا به کذا فی الهدایة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۵۴ کتاب الوقف)[1]

مسجد میں چارپائی بچھا کر سونا

سوال:۔ کیا مسجد میں سونا جائز ہے؟ جبکہ بعض لوگ مسجد میں چارپائی بچھا کر سوتے ہیں، ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں سونا بغیر شرعی عذر کے مکروہ ہے، البتہ عذر شرعی ہو مثلاً معتکف ہو یا مسافر وغیرہ، تو اس کو مسجد میں سونا جائز ہے۔ اور جس طرح مسجد میں بغیر چارپائی کے سونا جائز ہے اسی طرح چارپائی بچھا کر بھی سونا جائز ہے۔

وفی الهندیة: ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلك ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیه ویذکر الله تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ثم یفعل ما شاء کذا فی السراجیة ولا بأس للغریب ولصاحب الدار ان ینام فی المسجد

---

[1] قال برهان الدین المرغینانیؒ: واذا بنی مسجدًا لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن للناس بالصلوٰة فیه فاذا صلی فیه واحد زال عند ابی حنیفه (رحمه الله) عن ملکه اما الافراز فلانه لایخلص لله تعالیٰ الا به۔ (الهدایة ج۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف، فصل فی المسجد)

ومثله فی کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف۔

فی الصحیح من المذھب والاحسن ان یتورع فلاینام کذا فی خزانۃ الفتاوٰی۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۲۱ کتاب الکراھیۃ) ؎۱

البتہ اگر کوئی غیر معذور آدمی بھی اعتکاف کی نیّت سے مسجد میں سو جائے تو جائز ہے۔

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین اور عرفی پیسری کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض مساجد کے ساتھ موقوفہ جائداد ہوتی ہے جس سے امام اور خطیب استفادہ کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ زمین مستقل طور پر مسجد کے لیے وقف ہوتی ہے ائمہ محض منصبِ امامت وخطابت کی وجہ سے اس سے استفادہ کے حقدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسری ایسی جائداد بھی ہوتی ہے جو کسی امام کو شخصی طور پر دی جاتی ہے تاہم اس میں امام کے موجودہ منصبِ امامت کا دخل بھی ضرور ہوتا ہے جو اس کے لیے ترجیح کا کام دیتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں کیا یہ جائداد یں امام قانونی طور پر اپنے نام کرا سکتا ہے ؟ اور امام کی وفات کے بعد اگر اس کی اولاد امامت پر مامور نہ ہو پھر بھی اس کی حقدار ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جہاں تک اول الذکر قسم کا تعلق ہے تو چونکہ یہ مسجد کے لیے موقوفہ جائداد ہے اس کا کسی شخص کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، اس میں ارث جاری نہیں ہو سکتا، جو بھی منصبِ امامت پر فائز ہو وہ اس سے استفادہ کا حقدار ہوگا، اور جب اس ذمہ داری سے علیحدہ ہو جائے تو یہ شخص اس جائداد سے استفادہ کا حقدار نہیں رہتا، اس کی خرید وفروخت یا تقسیم کرنے کا اختیار اس کو حاصل نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجداً لم یکن لہ ان یرجع فیہ ولا یبیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصاً للہ تعالٰی وھذا لان الاشیاء کلھا للہ تعالٰی۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۲۵ باب الوقف)

وفی الھندیۃ :واما حکمہ فعندھما زوال العین عن ملکہ الی اللہ تعالٰی وعند

؎۱ عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اعتکف طرح لہ فراشہ اویوضع لہٗ سریرًا وراء اسطوانۃ التوبۃ۔ (ابن ماجۃ ص ۱۲۷ باب فی المعتکف یلزم مکانا من المسجد)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۶۱ مکروھات الصلوٰۃ مطلب احکام المسجد ۔۔

ابی حنیفۃؒ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ علیٰ ملکہ بحیث لاتقبل النقل...... فانہٗ یصح حتّٰی لایملک بیعہ ولایورث عنہ لکن یبتغوان خرج من الثلث یجوز۔

(الھندیۃ ج۲ ص۳۵۲ کتاب الوقف)[۱]

البتہ مؤخرالذکر جائداد کے بارے میں تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موہوب لہ کی ملکیت ہے کیونکہ یہ اس کو ذاتی طور پر دی جاتی ہے، اس میں مسجد پر وقف کرنے کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا اور محض امام وخطیب کے منصب کی تعظیم کی وجہ سے کوئی چیز دینے سے مسجد پر وقف نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا اس صورت میں امام مسجد کو جملہ مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہے، عین حیات میں اس کی خرید وفروخت جائز ہے اور اس منصب سے معزول ہونے کے بعد بھی یہ جائداد اس کی رہے گی اور مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

غیر مسلم کے اموال کو جبراً مسجد پر خرچ کرنا

سوال:۔ ایک جگہ پر کسی مسجد کی تعمیر کیلئے روپوں اور مال کی ضرورت تھی، بعض لوگوں نے غیر مسلموں سے جبراً مال اور روپے وصول کر کے مسجد کی تعمیر میں خرچ کیے۔ کیا غیر مسلم کا مال جبراً وصول کر کے مسجد کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ دارالاسلام میں غیر مسلموں کی کئی اقسام ہیں۔ ایک غیر مسلم وہ ہے جو مستامن یا ذمی ہے، معاملات کے احکام میں مسلمان وذمی ومستامن آپس میں برابر ہیں، ان کے اموال کو جبراً وصول کر کے مسجد میں خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ احکام کے لحاظ سے مسلمانوں مثل ہیں۔

البتہ جو حربی ہوں اور دارالاسلام میں بغیر امان کے داخل ہوئے ہوں اُن کا مال مالِ فئے

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: (قولہ ولایملک الوقف) باجماع الفقہاء کما نقلہ فی فتح القدیر ولقولہ علیہ السلام لعمر رضی اللہ عنہ تصدق باصلہا لاتباع ولاتورث ولانہ باللزوم خرج عن ملک الواقف وبلا ملک لایتمکن من البیع۔

(البحرالرائق ج۵ ص۲۰۵ کتاب الوقف)

قال المرغینانیؒ: واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولاتملیکہ الا ان یکون مشاعاً عند ابی یوسفؒ فیطلب الشریک القسمۃ فیصح مقاسمۃ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۲۰ کتاب الوقف)

اور غنیمت ہے، ان کا مال مسجد کیلئے جبراً وصول کیا جاسکتا ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: لا یمکن حربی مستامن فینا سنۃ وقیل لہ ان قمت سنۃ وضعنا علیک الجزیۃ فان مکث سنۃ فھو ذمی ولا جزیۃ علیہ فی حول المکث الا بشرط اخذھا منہ فیہ ویجری القصاص بینہ وبین المسلم ویضمن المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا اتلفہ وتجب الدیۃ علیہ اذا قتلہ خطاء ویجب کف الاذی عنہ۔

قال ابن عابدینؒ: (قولہ لا یمکن حربی مستامن) قید بالمستامن لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان وما معہ فیئا ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت۔

(رد المحتار ج۴ ص۱۶۸ فصل فی استئمان الکافر۔ کتاب الجہاد)

تاہم حرام مال کو مسجد پر خرچ کرنا جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: تحت ھذا القول (قولہ ولو بمالہ الحلال) قال تاج الشریعۃ اما لو انفق فی ذلک مالاً خبیثاً ومالاً سببہ الخبیث والطیب فیکرہ لان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا الطیب فیکرہ تلویث بیتہ بما لا یقبلہ۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد ۱ ص۶۵۸ باب الامامۃ۔ مطلب کلمۃ لا بأس دلیل علیٰ انہ المستحب)[۱]

اور حرام مال سے بنائی ہوئی مساجد شرعی مساجد کے حکم میں سے نہیں ہیں لہٰذا ایسی مساجد میں نماز پڑھنے سے اجتناب کیا جائے البتہ پڑھی گئی نمازوں کا اعادہ واجب نہیں۔

بوقتِ ضرورت وقف کا تبادلہ جائز ہے

سوال: مسجد کی کچھ دکانیں ایسی جگہ واقع ہیں جو مسجد سے دور ہیں۔ کیا مسجد کے قرب و جوار میں واقع بعض دکانوں سے ان کا تبادلہ جائز ہے؟ جبکہ قریب کی دکانوں میں یہ احتمال بھی ہے کہ کبھی مسجد کی توسیع میں کام آسکیں گی؟

الجواب: مسجد کے لیے ایسے فائدہ کی توقع میں وقف کا استبدال اور مبادلہ جائز ہے

---

[۱] عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تصدق بعدل تمرۃ من کسب طیب ولا یقبل اللہ الا الطیب فان اللہ یتقبلھا بیمینہ ثم یربیھا لصاحبھا کما یربی احدکم فلوّہ حتی تکون مثل الجبل۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ ج۱ ص۱۶۷ باب فضل الصدقۃ)

ومثلہ فی البخاری ج۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰۃ۔

لہٰذا ان دوکانوں کے تبادلہ میں کوئی حرج نہیں ۔

وفی الهندیة: مبادلة دار الوقف بدار اخری انما تجوز اذا کانت فی محلة واحدة تکون المحلة المملوکة خیراً من محلة الموقوفة وعلی عکسه لا یجوز ۔
(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴۰۱ کتاب الوقف ۔ الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط فی الوقف) ؂۱

جدید قبرستان میں مسجد بنانا

سوال:۔ ایک قبرستان جس میں اب بھی مُردے دفنائے جاتے ہوں، کیا کسی محلہ میں مسجد کی ضرورت پڑنے پر قبرستان کو ہموار کرکے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جس قبرستان میں مُردے فی الحال دفنائے جاتے ہوں اس کو مسجد کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں، تاہم جو قبرستان پرانا ہوچکا ہو اور اس میں مُردوں کی لاشیں گل سڑ کر ان کے نشانات ختم ہوچکے ہوں تو اس کو ہموار کرکے اس پر مسجد بنانا جائز ہے، البتہ مملوکہ ہونے کی صورت میں مالک سے اجازت لینا ضروری ہے ۔

قال ابن عابدینؒ ۔ وقال الزیلعی ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۲۳۲ مطلب فی دفن المیت، کتاب الجنائز) ؂۲

مندر سے مسجد بنانا

سوال:۔ تقسیم ہند کے وقت جو ہندو اور سکھ پاکستان سے چلے گئے تھے، اُن کے مندروں اور گوردواروں کو مسلمان مساجد میں تبدیل کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کرسکتے ہیں تو کیا ان میں تغیر ضروری ہے؟

الجواب:۔ ہندوؤں اور سکھوں کے معابد (مندر اور گوردوارے) مساجد میں تبدیل کرنا

؂۱ قال ابن نجیمؒ ۔ وفی القنیة مبادلة دار الوقف بدار اخری انما یجوز اذا کانتا فی محلة واحدة او تکون المحلة المملوکة خیراً من المحلة الموقوفة وعلی عکسه لا یجوز ۔
(البحر الرائق ج ۵ ص۲۲۳ کتاب الوقف)
ومثله فی رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص۳۸۶ کتاب الوقف، مطلب فی شرط الاستبدال ۔

؂۲ وفی الهندیة: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔
(فتاوی هندیة ج ۱ ص۱۶۷ ۔ الفصل السادس فی القبر والدفن والنقل من مکان الی آخر ۔
ومثله فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۵ کتاب الجنائز ۔

شرعاً جائز ہیں بشرطیکہ ان کی عبادت کے نشانات مٹا دیئے جائیں اور اس میں تغیر کر دیا جائے، مثلاً ان کو قبلہ رو کرنا، اس میں محراب بنانا یا ان کو مستقل طور سے گرا کر از سرِ نو ان پر مسجد بنانا۔

عن طلق بن علی قال خرجنا وفداً الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃً لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ فدعا بماءٍ فتوضأ وتمضمض ثم صبّہ لنا فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانہا بھذا الماء واتخذوھا مسجداً قلنا ان البلد بعید والحرّ شدید والماء ینشف فقال مُدّوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیباً۔ رواہ النسائی۔

(مشکوٰۃ جلد ۱ ص۶۹ باب المساجد)

وفی حاشیتہ فاکسروا الخ غیروا محرابہا وحولوہ الی الکعبۃ وقیل خربوہ۔[1]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال:۔ بعض لوگوں نے مسجد کیلئے چندہ جمع کر کے مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا ہے، لیکن ایک شخص اس تعمیر سے روک رہا ہے اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال کر رہا ہے، ایسے ہی ایک اور شخص مسجد کے راستہ کو بند کر رہا ہے جس سے مسجد ویران ہو رہی ہے اور اس سے مسجد میں آنے جانے والے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد کی تعمیر سے منع کرنا اور ایسے ہی مسجد کا راستہ بند کرنا از روئے شرع جائز نہیں، یہ ایک فاسقانہ کام ہے اور یہ شخص قابلِ تعزیر ہے۔ البتہ اگر یہ راستہ مسجد کا نہ ہو بلکہ اس کی اپنی ملکیت ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کا استعمال مالک کی اجازت پر

---

[1] عن ابیہ طلق بن علی قال خرجنا وفداً الی النبیؐ فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃً لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ فدعا بماءٍ فتوضأ وتمضمض ثم صبّہ فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانہا بھذا الماء واتخذوھا مسجداً قلنا ان البلد بعیدٌ والحر شدیدٌ والماء ینشف فقال مُدّوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیباً فخرجنا حتی قدمنا بلدنا فکسرنا بیعتہا ثم نضحنا مکانہا فاتخذناہا مسجداً فنادینا فیہ بالاذان۔۔۔۔۔ الخ

(سنن النسائی ج ۱ ص۱۱۳ باب اتخاذ البیع مساجد)

پر موقوف ہے۔
قال اللہ تبارک وتعالیٰ :۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا ۔ (الآیۃ)
قال اللہ تعالیٰ : اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (الآیۃ)
(مشکوٰۃ ج ۱ ص۶۹ باب المساجد، الفصل الثانی)

مسجد کی اشیاء کو عاریۃً استعمال کرنا

سوال :۔ مسجد کی اشیاء کو عاریۃً کوئی شخص اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ مسجد کی اشیاء وقف علی المسجد ہیں ان کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو گنجائش ہے۔[1]

قال الحصکفیؒ : فاذا تم ولزم الوقف ولا یملک ولا یعار ولا یرھن۔
قال ابن عابدینؒ : ولا یعار ولا یرھن لاقتضائھما الملک ۔
(ردّ المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص۳۵۱ کتاب الوقف، مطلب فی شرط واقف الکتب الخ)

مسجد کی زمین کا تبادلہ

سوال :۔ ہمارے والد صاحب نے ایک قطعۂ اراضی مسجد کے لیے وقف کیا تھا اور باقاعدہ اس کی حد بندی کی گئی تھی اور اس میں شکرانے کے نفل بھی پڑھے گئے تھے، اب ہمارے والد صاحب فوت ہوچکے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اس زمین کے بدلے دوسری زمین مسجد کے لیے متعین کردیں اور اس قطعۂ اراضی کو اپنے مصرف میں استعمال کریں۔ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب :۔ جب کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی مملوکہ زمین وقف کرکے اپنے سے جدا کردے تو اب اس زمین کے ساتھ اس کا مالکانہ تعلق ختم ہوگیا یہی وجہ ہے کہ واقف کے

---

[1] قال فی الھندیۃ : ولا یحمل القیم سراج المسجد الی بیتہ ویحمل من بیتہ الی المسجد ولا بأس ان یترک سراج المسجد الی ثلث اللیل ولا یترک اکثر من ذٰلک الا اذا شرط الواقف ذٰلک او کان ذٰلک معتاداً ذٰلک الموضع ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۰، ھل فی کرہ غلق باب المسجد)
ومثلہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف، للفصل للرابع فی المسجد۔

مرنے کے بعد اس موقوفہ زمین میں ورثاء کا حق وراثت ثابت نہیں اور اس کی بیع بھی جائز نہیں، جہاں تک استبدال کا تعلق ہے تو اس کی بھی چند صورتیں ہیں :۔

(۱) واقف اپنے لیے یا کسی وارث کے لیے استبدال کی شرط رکھے ۔

(۲) اور اگر شرط نہ رکھی ہو لیکن اس جگہ سے انتفاع کلیۃً ختم ہو چکا ہو تو اس صورت میں باذن القاضی یا حاکم کے استبدال اصح قول کے مطابق درست ہے ۔

چونکہ صورتِ مسئولہ میں دونوں وجود مفقود ہیں اس لیے مذکورہ زمین مسجد کی رہے گی اس کو دوسری کسی زمین میں تبدیل کرنا جائز نہیں ۔

لما قال العلامة ابن الهمامؒ : وقوله ولو شرط ان يستبدل بها ارضا اخرىٰ لتكون وقفا مكانهٗ فهو جائز عند ابي يوسفؒ وهلال والخصاف وهو استحسان وكذا لو قال على ان ابيعها واشترى بثمنها اخرى مكانا وكذا ليس للقيم الاستبدال الا ان ينص لهٗ بذلك ..... ولو قيد شرط الاستبدال للقيم بحياة الواقف ليس له ان يستبدل بعد موته ـ وفى فتاوى قاضيخان قول هلال وابي يوسفؒ هو الصحيح ..... وكذا ارض الوقف اذا قل نزلها بحيث لا تحتمل الزراعة ولا تفضل غلتها عن مونتها ويكون صلاح الارض فى الاستبدال بارض اخرى وفى نحو هذا عن الانصاري صحة الشرط لكن لا يبيعها الا باذن الحاكم وينبغى للحاكم اذا رفع اليه ولا منفعة فى الوقف ان يأذن فى بيعها اذا رأٰه انظر لاهل الوقف ـ

(فتح القدير ج ۵ ص۴۳۹ كتاب الوقف) ؎۱

؎۱ لما قال العلامة ابن عابدينؒ : اعلم ان الاستبدال على ثلاثة وجوہ الاول : ان يشرطه الواقف لنفسه او لغيره او لنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقاً والثاني : ان لا يشرطه سواء شرط عدمه او سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بان لا يحصل منه شئ اصلاً او لا يفى بمؤنة فهو ايضاً جائز على الاصح اذا كان باذن القاضى ورأيه المصلحة فيه ـ والثالث : ان لا يشرطه ايضاً ولكن فيه نفع فى الجملة وبدله خير منه ريعا ونفعا وهذا لا يجوز استبداله على الاصح المختار ـ

(رد المحتار ج ۴ ص۳۸۴ كتاب الوقف ـ مطلب فى استبدال الوقف وشروطه)

وَمِثْلُهٗ فى امداد المفتين المشهور بفتاوى دار العلوم ديوبند ج ۲ ص۹۴۹ ـ

مساجد میں سکول کھولنا

سوال:۔ آجکل حکومت کی طرف سے مسجد مکتب سکول کے نام سے مساجد میں پرائمری سکول کھولے جارہے ہیں، اساتذہ کرام مساجد میں کرسیاں لگا کر عام پرائمری سکولوں کی طرح بے اعتدالیاں کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے مسجد کا تقدس بھی پامال ہوتا ہے اور مسجد کی حالت ایک عام حجرہ اور بیٹھک جیسی ہوجاتی ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ حالات کی روشنی میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے مسجد کا تقدس اور عظمت باقی نہیں رہتا جس سے اس خدشے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ یہ کہیں خیر خواہی کے لبادہ میں شعائر اللہ کی توہین کا منظم پروگرام تو نہیں؟ اس لیے تعلیم کا یہ سلسلہ کسی دوسری جگہ پر جاری رکھنا چاہیئے، مساجد کو نماز، ذکر اللہ اور قرآن وحدیث کی تعلیم تک محدود رکھیں۔

لما قال الشیخ احمد الحمویؒ : فی شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی ولا یجوز تعلیم الصبیان القرآن فی المسجد للمروی جنبوا صبیانکم المساجد انتھیٰ۔ وھو صریح فی عدم الجواز سواء کان بأجرۃ ام لا۔ (الاشباہ والنظائر ج ۲ ص۵۶ القول فی احکام المسجد)[1]

مسجد کی تعمیر میں قادیانیوں کی شرکت

سوال:۔ کسی مسجد کی تعمیر کے لیے ایک قادیانی نے دو ہزار اینٹیں دیں، کیا از روئے شریعت یہ اینٹیں مسجد میں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

الجواب:۔ قادیانی اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان اور اہلِ قبلہ کہتے ہیں، لیکن عقیدۂ ختم نبوت کے انکار اور دیگر بہت سی ضروریاتِ دین میں تاویل کرنے کی وجہ سے مرتد کے زمرہ میں داخل ہیں، اس صورت میں ان کا ہبہ موقوف رہے گا اور اگر یہ اسلام قبول کرلیں تو وہ ہبہ نافذ ہوگا، اور اگر یہ اپنے ارتداد پر بدستور قائم رہیں تو بوجہ مرتد ہونے کے ان کا ہبہ باطل ہے۔

---

[1] قال ابن عابدینؒ ؛ لما اخرجہ المنذری: مرفوعاً جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم وشراءکم ورفع اصواتکم الیٰ اخرہ۔
(ردّ المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المسجد)
ومثلہ فی الھندیۃ ج ۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس فی آداب المسجد۔

قال ابن نجیمؒ: توقف مبايعته وعتقه وهبته فان امن نفذ و ان هلك بطل۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۳۳ باب المرتد) ؎۱

قادیانیوں کے اموال قبول کرنے سے ایک دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ ان کے کفر کے بارے میں پوری اُمتِ مُسلمہ کا جو عقیدہ ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس لیے ان کا ہدیہ کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کی فروخت

سوال:۔ کیا مسجد کی منتظمہ کمیٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کر دے یا اجارہ پر دے یا اُسے کسی اور مصرف کے لیے استعمال میں لائے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ زمین کے تبادلہ کا جواز کتبِ فقہ سے ثابت ہے، یہ تبادلہ بھی اُس صورت میں جائز ہے کہ جس میں مسجد کا فائدہ ہو، اسی طرح مسجد کے نفع کی خاطر اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے۔

وفی الهندیة: مبادلة دار الوقف بدار اخری انما تجوز اذا کانتا فی محلة واحدة تکون المحلة المملوكة خيرًا من محلة الموقوفة وعلی ملکه لا یجوز۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۰۱ کتاب الوقف، الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط فی الوقف) ؎۲

؎۱ قال الحصکفیؒ: يتوقف منه عند الامام وینفذ عندهما کل ما کان مبادلة مال بمال او عقد تبرع (کالمبایعة) والصرف والسلم والعتق والتدبیر والکتابة والهبة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص ۲۵۰ باب المرتد، قریب من مطلب المعصیة تبقی بعد الردة)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۳۷۹ کتاب السیر

؎۲ قال ابن عابدین: قال وفی القنیة مبادلة دار الوقف بدار اخری انما یجوز اذا کانتا فی محلة واحدة او محلة الاخری خیرًا وبالعکس لا یجوز وان کانت المملوکة اکثر مساحة وقیمة واُجرة لاحتمال خرابها فی ادون المحلتین لدناءتها وقلة الرغبة فیها۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۸۶ کتاب الوقف مطلب فی شروط الاستبدال)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۲۳ کتاب الوقف۔

جس مسجد کی زمین کا باقاعدہ وقف نہ ہو تو وہ شرعی مسجد نہیں

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ انگلینڈ میں مکانات کی دو قسمیں ہیں، ایک فری ہولڈ اور دوسرا لیس فری ہولڈ۔ قسم اول میں زمین اور عمارت مالک مکان کی ملکیت ہوتی ہے، اور قسم ثانی میں صرف مکان پر مالک کی ملکیت کا حق ہوتا ہے جبکہ زمین اجارہ کی ہوتی ہے، لیکن یہ فرق بھی صرف امتیازی ہوتا ہے۔ دونوں قسموں کی صورت میں حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہے، کیونکہ ان دونوں قسموں کے لیے حکومت کی طرف سے ایک میعاد مقرر ہوتی ہے۔ اگر مقررہ مدت سے قبل حکومت کو اس زمین کی ضرورت پڑ جائے تو حکومت اس مقررہ مدت کو منسوخ کر کے اس زمین کو اپنے مصرف میں لاسکتی ہے، اس میں کسی شخص کو بھی حکومت کے فیصلے کو چیلنج کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

آیا ایسی زمین جس پر مالک کو مکمل اختیار حاصل نہیں اگر اس پر مسجد تعمیر کر لی جائے اور باقاعدہ اس میں اذان اور جماعت بھی ہوتی ہو، لیکن جب اس زمین کو جس پر مسجد واقع ہے ضرورت پڑنے کی وجہ سے حکومت اسے اپنے مصرف میں لانے کا ارادہ کرے اور اس کے مالک کو اپنی جانب سے اس عمارت کا عوض دے دے، تو کیا ایسی زمین پر مسجد تعمیر کرنا مسجد شرعی کے حکم میں ہوگی؟ اور آیا اس کی خرید و فروخت اور اس میں تغیر و تبدل جائز ہے؟ اور اس شہید کر کے کسی اور مصرف میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

الجواب:- اہل علم کی تحقیق کے مطابق مسجد شرعی کے لیے زمین اور مکان دونوں کا وقف مؤبد ہونا شرط ہے، جبکہ یہ شرط یہاں متحقق نہیں۔ اور اہل علم کے نزدیک مسجد کے معاملہ میں اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جس سے وقف مؤبد میں فرق آرہا ہو تو وہ شرط باطل ہے اور وقف مطلق اور مؤبد ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ: تحت هٰذا القول (قوله ولا ذكر معه اشتراط بيعه الخ) في الخصاف لو قال على ان لي اخراجها من الوقف الى غيره او على ان اهبها واتصدق بثمنها او على ان اهبها لمن شئت او على ان ارهنها متى بدا لي واخرجها عن الوقف بطل الوقف ثم ذكر ان هٰذا في غير المسجد اما المسجد لو اشترط ابطاله او بيعه صح وبطل الشرط۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۳ ص ۳۴۲ کتاب الوقف قبل مطلب فی وقف المرتد والکافر)

جس ملک میں خود مالک کو کسی زمین یا مکان پر ملکِ مؤبد حاصل نہیں اور اُس کو اس زمین میں تصرف من کل الوجوہ حاصل نہیں تو وہ کس طرح وقف مؤبد کر سکتا ہے اور کس طرح اس مسجد کو مسجدِ شرعی کا حکم دیا جا سکتا ہے؟ اس لیے یہ شرعی مسجد نہیں ہوگی ۔

قال ابن عابدینؒ : افاد ان الواقف لا بد ان یکون مالکہ وقت الوقف ملکاً باتا ولو بسبب فاسدٍ وان لا یکون محجوراً عن التصرّف حتٰی لو وقف المغصوب لم یصح وان ملکہ بعد بشراءٍ اوصلح ولو اجاز المالک وقف فضولی جاز۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف ، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ) ؎۱

مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی

سوال :۔ ایک شخص نے کسی محلہ میں مسجد بنوائی اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی عام اجازت دیدی، کچھ مدت کے بعد اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ مسجد میری ملکیت ہے لہٰذا اس میں تمام تصرف میرا ہی چلے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد کسی شخص کی ملکیت میں آسکتی ہے یا نہیں ؟ اگرچہ اس نے خود ہی یہ مسجد تعمیر کرائی ہو ؟

الجواب :۔ جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے اور اس میں لوگوں کو نماز کے لیے باقاعدہ اذنِ عام ہو تو پھر یہ کسی کی ملکیت نہیں رہتی ، البتہ بانی کو تولیت کا حق حاصل ہے۔

قال الحصکفیؒ : ارا د اھل المحلۃ نقض المسجد و بنائہ احکم من الاول ان البانی من اھل المحلۃ لھم ذٰلک الا لا ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ص۳۵۷ ج ۴ ، کتاب الوقف ، احکام المساجد) ؎۲

؎۱ قال ابن نجیمؒ : من شرائطہ الملک وقت الوقف حتٰی لو غصب ارضاً فوقفھا ثم اشتراھا من مالکھا ودفع الثمن الیہ او صالح علٰی مال دفعہ الیہ لا تکون وقفاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف ۔

؎۲ قال طاھر بن عبد الرشیدؒ ، رجل بنی مسجدا فی سکۃ فنازعہ بعض اھل السکۃ فی عمارتہ او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولٰی و فی العمارۃ اولٰی باتفاق ۔
(خلاصۃ الفتاوٰی ج ۴ ص۴۲۱ الفصل الرابع فی المسجد و اوقافہ الخ)
وَمِثْلُہٗ فی الاشباہ والنظائر ج ۲ ص۲۳۲ کتاب الوقف ۔

مسجد کے فنڈ سے معاوضہ دینا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں مسجد کے محراب کے ساتھ کچھ دوکانیں تھیں، جب مسجد کو شہید کرکے از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا تو یہ دوکانیں بھی منہدم ہوگئیں، حکومت نے دوکانداروں کی درخواست پر اس کے متبادل جگہ ان کو دے دی، اب اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ جتنے دن ہمارے کاروبار میں فرق آیا ہے اس کا معاوضہ دیا جائے، ہر دوکاندار تقریباً پانچ ہزار روپے کا طالب ہے اس طرح کل رقم تقریباً بیس ہزار روپے بنتی ہے، جبکہ مسجد کے پاس فنڈ بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ کیا دوکانداروں کے مطالبہ پر اُن کو یہ معاوضہ مسجد کے فنڈ سے دینا جائز ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں دوکانداروں کا یہ مطالبہ کہ تعمیرِ مسجد کی وجہ سے جتنے دن ہمارا کاروبار متاثر ہوا ہے اس کا معاوضہ ہمیں دیا جائے، غیر شرعی ہے۔ کیونکہ مالک مکان پر کاروبار کے متاثر ہونے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تاہم ان ایام کا کرایہ دوکانداروں سے وصول نہیں کیا جاسکتا اس لیے ایسا غیر شرعی خرچہ مسجد کے فنڈ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر شر و فساد کا خطرہ ہو تو دفع شر کیلئے کچھ رقم دینا مرخص ہے لیکن دوکانداروں کے لیے اس کی وصولی ناجائز اور حرام ہے۔

قال ابن عابدینؒ: الثالث اخذ المال یسوی امرہ عند السلطان دفعاً للضرر اوجلباً للنفع وھو حرام علی الاخذ۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار ج۴ ص۳۰۳، کتاب ادب القاضی، مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والھدیۃ) [1]

مسجد کی خرید و فروخت کا عدم جواز

سوال:۔ قیامِ پاکستان کے وقت جب ہندو اور سکھ پاکستان سے کوچ کرکے ہندوستان چلے گئے تو اپنے بہت سے مکانات، زمینیں اور جائداد چھوڑ گئے، مہاجرین کی ایک جماعت نے ایک جگہ کا انتخاب کرکے باقاعدہ ڈپٹی کمشنر سے اجازت لیکر اور نقشہ منظور کرا کر مسجد تعمیر کی، بعد ازاں جب حکومت متروکہ زمین کی قیمت وصول کرنے لگی تو حکومت نے اس جگہ کی قیمت وصول

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ومنھا اذا دفع الرشوۃ یسوّی امرہ عند السلطان حل لہ الدفع ولا یحل للاخذ ان یأخذَ۔ (البحرالرائق ج۶ ص۲۶۲ کتاب ادب القاضی)
وَمِثلُہٗ فی فتح القدیر علی الھدایۃ ج۶ ص۳۵۹ کتاب ادب القاضی۔

کرنے سے پہلے ہی مسجد اپنی تحویل میں لے لی اور تقریباً اٹھارہ سال تک اپنی تحویل میں رکھا اور مسجد کے لیے موقوفہ دوکانوں کی آمدنی بھی حکومت وصول کرتی رہی، اب جبکہ حکومت نے اس سے اپنا قبضہ اٹھالیا ہے تو حکومت اس مسجد کی جگہ کی قیمت کا مطالبہ کرتی ہے، حالانکہ ہم نے یہ مسجد حکومت کی اجازت سے ہی بنائی تھی۔ اندریں صورت کیا اب مسجد کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے؟ اور کیا یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: مستفتی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد حکومت کی اجازت سے تعمیر کی گئی۔ لہٰذا اگر کسی سرکاری جگہ پر قیمت کی ادائیگی کے بغیر حکومت کی اجازت سے مسجد تعمیر کی جائے تو اس سے وہ جگہ مسجدِ شرعی بن جاتی ہے، کیونکہ مساجد کا اہتمام کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانہ یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجداً من بیت المال اومن مالھم ان لم یکن لھم بیت المال۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۳۹، کتاب الوقف، مطلب لو وقف علی الاغنیاء وحدھم لم یجز)

اور حکومت کا نقشہ کی منظوری دینا باقاعدہ اجازت کے مترادف ہے، اب باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد اس کی خرید وفروخت جائز نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجداً لم یکن لہٗ ان یرجع فیہ ولا بیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصاً للہ تعالیٰ وھذا لان الاشیاء کلھا للہ تعالیٰ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۴۴ باب الوقف۔ فصل فی وقف المسجد) [1]

---

[1] وفی الھندیۃ: اما حکمہ عندھما زوال العین عن ملکہ الی اللہ تعالیٰ وعند ابی حنیفۃؒ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ عن ملکہ بحیث لا تقبل النقل عن ملک الی ملک والتصدق بالغلۃ المعدومۃ متی صح الوقف بان قال جعلت ارضی ھٰذہ صدقۃ موقوفۃ مؤبدۃ او اوصیت بھا بعد موتی فانہ یصح حتی لا یملک بیعہ ولا یورث عنہ لکن ینظر ان خرج من الثلث یجوز۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۹۱ کتاب الوقف۔

عیدگاہ میں کھیل کود اور اسے راستہ بنانے کا حکم

سوال: ہمارے گاؤں میں ایک مسئلہ بڑی شدت اختیار کر گیا ہے وہ یہ کہ گاؤں کی وقف عیدگاہ ہے، محلے کے بچے جوتوں سمیت اس میں کھیلتے رہتے ہیں اس عیدگاہ کے دو دروازے ہیں، ایک دروازہ گاؤں کی طرف اور دوسرا سڑک کی طرف کھلتا ہے گاؤں کی طرف کھلنے والے دروازے کو لوگ عیدگاہ سے گذرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں بعض اوقات حیض اور نفاس والی خواتین بھی گذرتی ہیں۔ اب ایک صاحب نے عیدگاہ کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے اس کے ایک دروازے کو بند کر دیا ہے مگر گاؤں کے لوگ خصوصاً عیدگاہ کے قرب وجوار میں رہنے والے اس صاحب کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں اور اس پر سخت ناراض بھی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ عیدگاہ کو گذرگاہ بنانا، اس میں چلنا پھرنا اور کھیلنا کودنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: عیدگاہ اور جنازہ گاہ کا مسجد شرعی کے حکم میں ہونا اگرچہ مختلف فیہ ہے مگر راجح مذہب یہ ہے کہ عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے۔

کما قال العلامۃ قاضی خانؒ: مسجد اتخذ لصلاۃ الجنازۃ اولصلوٰۃ العید هل یکون لہٗ حکم المسجد اختلف المشائخ فیہ قال بعضھم یکون مسجد حتی لومات الواقف لایورث۔ (فتاوٰی قاضی خان علی ہامش الھندیہ ج۳ ص۲۹ کتاب الوقف)

وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: المتخذ لصلوٰۃ الجنازۃ العید فھومسجد فی جواز الاقتداء وان انفصل الصفوف رفقا بالناس لافی حق غیرہ بہ یفتی نہایۃ۔ اھ وعبارۃ النھایۃ والمختار للفتوٰی انہ مسجد فی حق جواز الاقتداء.... فان الباقی لم یعدہ لذلک فینبغی ان لایجوز.... وما صححہ تاج الشریعۃ ان مصلی العید لہٗ حکم المساجد وتمامہ فی الشرنبلالیۃ۔ (ردالمحتار ج۱ ص۶۶۲ کتاب الوقف)

وفی احسن الفتاوٰی: جمیع احکام میں عیدگاہ کا بحکم مسجد ہونا مختلف فیہ ہے، شامیہ سے جمیع احکام میں بحکم مسجد ہونے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ (احسن الفتاوٰی ج۶ ص۴۲۸ کتاب الوقف)

اس لیے عیدگاہ میں ہر وہ عمل جو اس کی بے حرمتی اور بے احترامی کی طرف مفضی ہو ناجائز و حرام ہے، مثلاً عیدگاہ میں راستہ بنانا اور اس میں ہر قسم کے لوگوں (حائضہ، نفساء، جنب وغیرہم) کا گذرنا، اس کو کھیل کود کا میدان بنانا، اس کی بے حرمتی کرنا وغیرہ۔

کما قال العلامة ابن نجیمؒ : وقال بعضهم له حکم المسجد حال اداء الصلوٰة لاغیر وهو والجنانة سواءٌ ویجتنب هٰذا المکان عما یجتنب المسجد احتیاطاً۔
(البحر الرائق ج ۵ صـ۲۴۸ کتاب الوقف)

وفی کفایت المفتی : عیدگاہ کے احاطے کے اندر کارخانہ کھولنا جس میں ہر قسم کے آدمی کام کرتے ہوں جائز نہیں ہے۔ (کفایت المفتی جلد ۷ صـ۱۱۴)

وفی امداد المفتیین : نیز احتیاطاً تعظیم و حرمت میں بھی فقہاء نے اس کو مثل مسجد قرار دیا ہے اور زراعت اس کے خلاف ہے۔ (فتاوٰی دار العلوم دیوبند جلد ۲ صـ۸۱۵)

وفی احسن الفتاوٰی : عیدگاہ کا احترام بہرکیف واجب ہے اگرچہ اس کے مسجد ہونے میں اختلاف ہے مگر بجز مٹی سے حفاظت بہر حال ضروری ہے لہٰذا امور مسئولہ (کھیل کود، دعوت وغیرہ کا انتظام کرنا) کی اجازت نہیں۔ (احسن الفتاوٰی جلد ۶ صـ۴۲۸ کتاب الوقف)

اور عیدگاہ میں یہ امور اس لیے بھی جائز نہیں کہ واقف نے اس زمین کو ان امور مذکورہ کیلئے وقف نہیں کیا ہے بلکہ اس کا وقف صرف اور صرف عیدگاہ تک محدود ہے اور واقف کی نیت کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ شامی میں ہے : نیة الواقف کنص الشارع۔
(رد المحتار ج ۴ صـ۴۳۳ کتاب الوقف)

اور پھر جب عیدگاہ کے ساتھ دوسرا متبادل راستہ موجود ہو تو پھر بھی اس میں راستہ بنانا مسجد میں راستہ بنانے کے مترادف ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، لاتجعلوا المساجد ممراً (الحدیث) کہ مسجد کو راستہ مت بناؤ۔

اس لیے شریعت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عیدگاہ کی حفاظت کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کو راستہ نہ بنایا جاسکے، اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس شخص کے ساتھ تعاون کریں جو اس کی حفاظت کرتا ہو، عیدگاہ کو کھیل کود کا میدان یا راستہ بنانے سے منع کرنے والے پر کسی کو بھی اعتراض کرنے کا شرعاً حق حاصل نہیں، اس جگہ کو صرف عیدین کی نماز یا دیگر دینی تقریبات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس کو بطور راستہ، کھیل کے میدان اور دیگر خلافِ شرع امور میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

واللہ اعلم و علمہ اتم

جنوبی افریقہ کی قدیم مساجد و مدارس وغیرہ کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل سوالوں کے اندر کہ:

(۱) جنوبی افریقہ ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں کبھی بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی ہے، حقیقت میں یہ ملک غیر آباد تھا۔ سب سے پہلے ہالینڈ کی ڈچ قوم جا واسے تین سو سال پہلے یہاں آئی تھی۔ اور یہی ڈچ قوم قریباً ڈیڑھ سو ملائی مسلمان، جو کہ سیاسی قیدی تھے، اپنے ساتھ لائی تھی، پھر انگریز آئے اور انہوں نے ہندوستان سے ہندوستانیوں کو کام کاج کے واسطے بلایا، جب ان ہندوستانیوں کا وقت پورا ہو گیا تو بعض واپس ہندوستان چلے گئے اور اکثر یہاں پر ہی مقیم ہو گئے جن میں سے کچھ تو تجارت، کچھ مزدوری اور کچھ زراعت میں مشغول ہو گئے۔ اس ملک میں سفید فام قوم ۳۵ لاکھ جبشی نژاد ۱۵ لاکھ، ایشیائی قوم ۵ لاکھ، خالص حبشی ایک کروڑ بیس لاکھ اور مسلمان تقریباً ایک لاکھ ہوں گے۔ اور حکومت اس ملک پر سفید فام عیسائی قوم کی ہے، مسلمان نماز اذان، قربانی اور حج وغیرہ ادا کرنے میں آزاد ہیں، مسلمانوں کی مسجدیں اور مدرسے آباد ہیں، اب حکومت نے نسلی امتیاز کا قانون بنا لیا ہے جس کی بنیاد رنگ پر ہے مذہب پر نہیں۔ اس قانون کی وجہ سے ہر قوم کو الگ الگ جگہوں پر آباد کیا جاتا ہے، اب جو علاقے سفید فاموں کے لیے مخصوص کئے گئے ہیں وہاں سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے اور ان کے مکانوں اور زمینوں کی معمولی قیمت دے کر زبردستی ان کو بے دخل کیا جا رہا ہے — اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ملک دارالحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر دارالحرب ہے تو پھر مسلمانوں کو یہاں پر رہنا جائز ہے یا ہجرت کر کے چلے جانا چاہیئے؟

(۲) جو علاقے سفید فام قوم کے لیے مقرر ہو چکے ہیں ان علاقوں کے اندر جو مسجد آ گئی ہیں ان کو فروخت کر کے قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟ یا ان کو ویسے ہی چھوڑ دینا چاہیئے، جبکہ آج ان کی قیمت کئی لاکھ پونڈ سے بھی زیادہ ہے، اور جب ان علاقوں میں مسلمان ہی نہ رہیں گے تو یہ مسجدیں بھی غیر آباد اور شہید ہو جائیں گی۔ اب آپ سے التجا ہے کہ یہ ملک کیسا ہے، اور جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے اندر آ گئی ہیں اُن کے

واسطے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مطلوب ہے؟

الجواب: محترم! آپ کے سوالات کے جوابات شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں حسب ذیل ہیں:-

(۱) عباراتِ فقہیہ پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کا ملک یعنی جنوبی افریقہ آپ کے واسطے نہ دارالحرب ہے کہ جس سے ہجرت لازم ہو جائے اور نہ مکمل دارالاسلام ہے، بلکہ دارالامن اور دارِ عہد اگر اس کو کہا جائے تو بجا ہے۔ اس بارے میں فقہائے کرام کی چند عبارات ملاحظہ ہوں:-

(ا) فتاویٰ عالمگیری میں ہے: اعلم ان دار الحرب تصیر دار الاسلام بشرط واحد وھو اظھار حکم الاسلام فیھا قال محمدؒ فی الزیادات انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفۃؒ بشروط ثلاثۃ احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتھار وان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لا یتخلل بینھما بلد من بلاد الاسلام والثالث ان لا یبقی فیھا مؤمن ولا ذمی آمنا بامان الاول الذی کان ثابتا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ والذمی لعقد الذمۃ۔ وقال ابو یوسفؒ بشرط واحد لا غیر وھو اظھار احکام الکفر وھو القیاس۔ (ج۲ ص۲۳۲)

(ب) خزانۃ المفتیین میں ہے: دار الاسلام لا تصیر دار الحرب الا باجراء احکام الشرک فیھا وان یکون متصلا بدار الحرب لا یکون بینھا وبین دار الحرب مصر آخر للمسلمین وان لا یبقی فیھا مسلم وذمی بالامان الاول فما لم توجد ھذہ الشرائط لا تصیر دار الحرب وقالا اذا اجدوا فیھا احکام الشرک فانھا تصیر دار الحرب سواء کانت متصلۃ بدار الحرب او لم تکن بقی فیھا مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول او لم یبق۔

(ج) اور فتاویٰ بزازیہ میں ہے: قال السید الامام والبلاد التی فی ایدی الکفرۃ الیوم لا شک انھا بلاد الاسلام بعد اتصالھا ببلاد دار الحرب ولم [illegible] فیھا احکام الکفر بل القضاۃ مسلمون اما البلاد والتی

علیہا قال مسلم جھتھم فیجوز فیہا اقامۃ الجمع والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاۃ وتزویج الایامٰی والاد امل لا یتلاء المسلم علیہ اما البلاد والتی علیہا ولاۃ کفار فیجوز فیہا ایضًا اقامۃ الجمع والاعیاد والقاضی قاض بتراضی المسلمین الخ۔ وذکر الحلوائی انہ انما لقیل دار الحرب باجراء احکام الکفر وان لا یحکم فیہا بحکم من احکام الاسلام وان یتصل بدار الحرب وان لا یبقٰی فیہا مسلم ولا ذمی آمنًا بالاول فاذا وجدت الشرائط کلہا صارت دار الحرب وعند تعارض الدلائل والشرائط یبقٰی ما کان اویترجح جانب الاسلام احتیاطًا ۔ انتہٰی ملخصًا۔

(د) *اور شرح زیادات للعتابی میں ہے*: دار الاسلام انما لقیل دار الحرب بثلاث شرائط احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتہار والثانی ان تکون متا بدار الحرب ای متصلۃ لا یتخلل بینھما بلدۃ من بلاد المسلمین والثالث ان لا یبقٰی فیہا مسلم اوذمی آمنًا بالامان الاول فشرط ھٰذہ الشرائط لا یکون علمًا علی تمام القہر والاستیلاء اذا دار الاسلام یحتاط لا نباطلہا وعندھما یصیر دار الاسلام دار الحرب باجراء احکام الکفر فیہا۔ انتہٰی

(ہ) *اور طحطاوی حاشیہ در مختار میں ہے*: قولہ باجراء احکام الشرك ای علی الاشتہار وان لا یحکم فیہا بحکم اھل الاسلام ھندیۃ۔ وظاھرہ انہ لو اجریت احکام المسلمین واحکام اھل الشرك لا تکون دار الحرب۔ انتہٰی

ان مجموعہ عبارات اور ان کے امثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ دار الاسلام کے دار الحرب ہونے میں شرط یہ ہے کہ احکام کفر علیٰ سبیل الاشتہار جاری ہوں اور احکام اسلام بالکلیہ موقوف کر دیئے جائیں اور شعائر اسلام وضروریاتِ دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں، اور یہ شرط اتفاقی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کیں، ایک یہ کہ اس بلاد میں اور دار الحرب میں کوئی بتدہ مملکتِ اہلِ اسلام کا باقی نہ رہے، دوسرے یہ کہ امانِ اول مرتفع ہو جاوے اور بامانِ کفار اقامت کی نوبت آتی ہو، اور دار الحرب سے دار الاسلام ہونے میں ایک شرط ہے، اور وہ ہے اظہار حکم اسلام۔

اس ساری تفصیل کی روشنی میں جب جنوبی افریقہ کے ملک پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ شرائط مذکورہ کی رو سے دارالحرب نہیں ہے، اور یہ اس وجہ سے کہ وہاں شعائر اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت و ممانعت نہیں ہے، جیساکہ آپ کے سوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت سفید فام عیسائی قوم کی ہے اور مسلمان جو کہ تقریباً ایک لاکھ ہیں۔ اذان، نماز، قربانی اور حج وغیرہ شعائر اسلام میں آزاد ہیں، اس لیے اس ملک کو نہ تو دارالحرب کہہ سکتے ہیں اور نہ دارالاسلام کہہ سکتے ہیں کیونکہ سلطنت اور حکومت مسلمانوں کی نہیں ہے، اور نہ پہلے کبھی اس ملک پر اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے، جیساکہ آپ کے سوال سے بھی ظاہر ہے کہ اس ملک پر اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی بلکہ یہ ملک غیر آباد تھا، اور سب سے پہلے ایک ڈچ کافر قوم کی حکومت قائم ہوئی، پھر انگریزوں کی حکومت آئی اور اب سفید فام عیسائیوں کی حکومت ہے۔ غرضیکہ احکام مسلمین اور احکام شرک دونوں اس میں جاری ہیں، لہٰذا جانب اسلام کو ترجیح دے کر دارالسلام بھی نہیں کہا جا سکتا، البتہ ایک درمیانی صورت ہے کہ اس کو دارالامن اور دار عہد کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یا تو آپ کا سفید فام حکومت سے باقاعدہ معاہدہ ہوا ہوگا اور اگر باقاعدہ معاہدہ نہ ہوا ہو تو آپ کے ملک کے حالات پر نظر ڈالنے سے عملاً معاہدہ معلوم ہوتا ہے جس کے ماتحت آپ امن و سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور آپ اپنے تصفیہ طلب معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں، اور دیگر معاملات میں بھی ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے یہ معاہدہ توڑا بھی نہیں ہے کیونکہ آپ نے کوئی قومی تحریک شروع نہیں کی جس کی وجہ سے توڑ پھوڑ، مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی چیزوں تک نوبت پہنچ گئی ہو، اس لیے عہد بھی قائم ہے اور امن بھی، پس آپ کا ملک (جنوبی افریقہ) دارالامن اور دار عہد ہے۔ ھٰذا ما ظھر لی وان لم یشرح بہ القلب و لم تطمئن بہ النفس فان للمقال فیہ مجالاً، واللہ اعلم

(۲) جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے کے اندر آگئی ہیں مجبوراً آپ ان کا عوض لے سکتے ہیں، ان کو فروخت کر کے قیمت لینا اور اس سے اپنے علاقے میں مسجد تعمیر کرنا درست

ہے۔ چند عبارتیں کتب فقہ کی اس مدعیٰ کے اثبات کے لیے درج کی جاتی ہیں؛

وفی الخانیۃ، رباط بعید استغنیٰ عنہ العمارۃ وبجنسہ رباط اٰخر قال السید الامام ابو شجاع: تصرف غلتہ الی الرباط الثانی کالمسجد اذا خرب واستغنیٰ عنہ اھل القریۃ نرفع ذٰلک الی القاضی فباع الخشب وصرف الثمن الی مسجد اٰخر جاز۔

وفی فتاوی النسفی: سئل شیخ الاسلام عن اھل القریۃ رحلوا وتداعیٰ مسجدھا الی الخراب وبعض المتغلبۃ لیستولون علی خشبہ وینقلونہ الی دورھم ھل الواحد من اھل المحلۃ ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسک الثمن لیصرفہ الی بعض المساجد او الی ھٰذا المسجد قال نعم۔ اھ (شامی ج ۳ ص۵۱۳)

اس فتویٰ کی تائید میں علامہ شامیؒ نے یہ دلیل بیان کی ہے؛ فان المسجد اوغیرہ من رباط اوحوض اذا لم ینقل یاخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد۔

ہاں اگر ان کے ساتھ اس بات کا سمجھوتہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے شعائرِ دین کو اپنے حال پر ہی رہنے دیں گے اور انہیں ڈھاکر ویران و برباد نہ کریں گے تو اس صورت میں اصل حکم یہ ہے کہ ان مساجد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو فروخت نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انہٗ لایعود الی ملک مالک ابداً کذا فی المضمرات۔ (فتاویٰ عالمگیری ج۲ ص۴۴۵)

فقط واللہ اعلم


كتاب
الحدود
والتعزيرات

ادرءُوا الحدود عن المسلمين ما استطعتم

کتاب الحدود والتعزیرات

(حدود اور تعزیرات کے احکام ومسائل)

حدود جاری کرنا حکام کا حق ہے

سوال:۔کسی مجرم کو کوڑوں یا قصاص کی سزا دینے کا استحقاق صرف حاکم کو ہے یا عوامی جرگہ بھی جاری کرسکتا ہے؟

الجواب:۔حدود جاری کرنا حکام اور ان کی طرف سے مقرر شدہ قضاۃ وغیرہ کا حق ہے کسی اور کو حدود جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

وفی الهندیة: ورکنه (الحد) اقامة الامام او نائبه فی الاقامة۔

(الفتاوی الهندیه ج۲ ص۱۴۳ کتاب الحدود) ؎۱

کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت

سوال:۔اسلامی قانون میں حدود اور تعزیرات میں جو کوڑے لگائے جاتے ہیں، اس کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ وہ کس طرح کا ہونا چاہیے اور کس چیز سے بنا ہوا ہونا چاہیے اور اس کی لمبائی چوڑائی کا کیا اعتبار ہے؟

الجواب:۔حدود وتعزیرات میں استعمال ہونے والے کوڑے کی ساخت متوسط ہونا ضروری ہے خواہ کسی بھی چیز سے بنا ہوا ہو، تاہم اگر لکڑی کا ہو تو نرم سی چھڑی ہونی چاہیے حدود وتعزیرات میں لاٹھی کا استعمال جائز نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: (بسوط لا ثمرة له متوسطا) ای لاعقدة له لان

؎۱ وقال الامام علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانیؒ: واما شرائط جواز اقامتها فمنها مایعم الحدود کلها ومنها مایخص البعض دون البعض اما الذی یعم الحدود کلها فهو الامامة وهو ان یکون المقیم للحد هو الامام او من ولاه الامام وهذا عندنا۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۷ ص۵۷ کتاب الحدود)

وَمِثْلُهٗ فی کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ج۵ ص۲۴۹ کتاب الحدود۔

علیا فی اللہ عنہ لما اراد أن یقیم الحد کسر ثمرتہ والمتوسط بین المبرح وھو الجارح وغیر المؤلم لافضاء الاول الی الھلاک وخلوا لثانی عن المقصود وھو الانزجار کذا فی الھدایۃ وحاصلہ انہ المؤلم غیر الجارح۔

(البحرالرائق جلد ۵ ص۹ کتاب الحدود) [1]

زنا کا جرم ثابت ہوجانے پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک بالغ لڑکے نے بالغ لڑکی کے ساتھ زنا کیا تو کیا ان دونوں پر حد جاری کی جائے گی یا نہیں جبکہ آجکل ملک میں اسلامی حکومت بھی نہیں ہے، اگر وہ دونوں آئندہ اور ماقبل تمام گناہوں سے توبہ کرلیں تو کیا ان سے حد ساقط ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانون میں زنا کی سزا محصن (شادی شدہ) مرد وعورت کو زنا ثابت ہونے پر رجم (سنگسار) کرنا ہے اور غیر محصن کے لیے سو کوڑوں کی سزا ہے۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: واذا وجب الحدود کان الزانی محصنا رجمہ بالحجارۃ حتی یموت اھ وان لم یکن محصنا وکان حرا فحدہ مائۃ جلدۃ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۵۰۱ کتاب الحدود)

تاہم اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے حدود کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے اسلئے اگر زناکار مرد اور عورت توبہ کرلیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا یہ گناہ معاف کردے گا علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اس توبہ کا طریقہ کچھ یوں بیان کیا ہے کہ: "اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت نماز نفل خشوع وخضوع سے پڑھے پھر نہایت آہ وزاری سے آنسو بہا کر عاجزی ظاہر کرکے جیسے کوئی مجرم غلام اپنے آقا سے قصور معاف کراتا ہے دعائے مغفرت کرے

---

[1] قال الزیلعیؒ: بسوط لاثمرۃ لہ متوسطاً ان یضرب بسوط لاعقدۃ لہ ضرباً متوسطاً........ وعن علی رضی اللہ عنہ انہ کسر ثمرتہ ولو لم یکسر الثمرۃ بعد کل ضربۃ یضرب بتین........ والضرب المتوسط ھو المؤید غیر الجارح لان الجارح یفضی الی التلف او یبقی فی جسدہ أثر یشینہ ولھذا یکسر عقدتہ وغیر المؤید لایفید والواجب التادیب دون الھلاک۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۱۷۱ کتاب الحدود)

اور دل میں اس گناہ سے ندامت رکھے اور یہ قصد کرے کہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا اللہ اس کے گناہ معاف کردے گا، اور اس عورت کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرے اور اگر ابتداء میں وہ عورت راضی نہ تھی تو اس سے بھی عفوِ قصور کرالے تاکہ وہ حشر میں دامنگیر نہ ہو۔" واللہ اعلم۔ (مجموعۃ الفتاویٰ ج۳ ص۳۵ کتاب الحدود) ؎۱

نابالغہ سے زنا بالجبر کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک عاقل بالغ لڑکے نے نابالغ لڑکی سے زبردستی زنا کیا اور جرم ثابت بھی ہوگیا تو اس نابالغ لڑکی پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی عاقل بالغ لڑکا ایسی نابالغ لڑکی سے زنا کرے جس کے مثل کے ساتھ جماع کیا جاسکتا ہو اور قاضی کے ہاں اس کا ثبوت بھی ہو جائے تو لڑکے پر حد لگائی جائے گی اور لڑکی پر بوجہ عدم بلوغ کے کوئی حد نہ ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (ولا) حد (بزنی غیر مکلف بمکلفۃ مطلقاً) لا علیہ ولا علیہا (وفی عکسہ حد) فقط۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۶، ۱۵۷ الباب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ) ؎۲

حقیقی بیٹی سے زنا کرنے کی سزا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کیا جس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہوگئی اور وہ ناجائز بچے کی ماں بن گئی اور اس نے بلا جبر واکراہ بچے کو اپنے سگے باپ کی طرف منسوب کیا اور

؎۱ قال العلامۃ ابو البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفیؒ: فان کان محصنا رجمہ فی فضاء حتی یموت ولو غیر محصن جلدہ مائۃ۔ (کنز الدقائق ص۱۸۱ کتاب الحدود)
ومثلہ فی الہندیۃ ج۲ ص۱۴۵، ۱۴۶ الباب الثالث فی کیفیۃ الحد واقامتہ۔

؎۲ قال العلامۃ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: (قولہ وبزنا صبی او مجنون بمکلفۃ بخلاف عکسہ) أی لایجب الحد اذا زنی الصبی او المجنون بامرأۃ مکلفۃ وہی البالغۃ العاقلۃ بخلاف العکس وہو ما اذا زنی البالغ العاقل بصبیۃ او مجنونۃ حیث یجب الحد علی الرجل۔
(تبیین الحقائق ج۲ ص۱۸۳ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ)
ومثلہ فی الہندیۃ ج۲ ص۱۴۹ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ۔

باپ نے بھی بلا جبر و اکراہ بیٹی سے زنا کرنے کو تسلیم کر لیا، شریعتِ مقدسہ میں ان دونوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ زنا کو اسلام میں ایک انتہائی قبیح فعل کہا گیا ہے، کسی بھی عورت کے ساتھ زنا کرنا قطعی حرام ہے اور بیٹی تو محرمات میں سے ہے اس کے ساتھ زنا کرنا تو اور بھی زیادہ سخت جرم ہے اور زنا کو حلال سمجھنا موجبِ کفر ہے، برادری کے لوگ ایسے شخص کے ساتھ قطع تعلق کریں اور حکومتِ وقت اس پر حدِ زنا جاری کرے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: من استحل ما حرمه الله تعالیٰ علی وجه الظن لا یکفر وانما یکفر اذا اعتقد الحرام حلالاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۲۶ باب المرتد)[1]

پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کی سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی پاکدامن اور عفیفہ عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور گواہ پیش نہ کرسکے تو اس کی شرعاً کیا سزا ہے؟

الجواب:۔ جو شخص کسی آزاد مسلمان مکلف اور پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر چار گواہ پیش نہ کرسکے تو دارالاسلام میں ایسے شخص کو اسی ۸۰ کوڑے لگائے جائیں گے، اور شریعت میں اس کو حدِ قذف کہا جاتا ہے بشرطیکہ قاذف (تہمتِ زنا لگانے والا) آزاد ہو اس لیے کہ غلام کو آدھی سزا دی جائے گی یعنی چالیس ۴۰ کوڑے لگائے جائیں گے البتہ اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں قاذف توبہ کرے اور مقذوف سے معافی مانگے۔

لما فی الهندیة: اذا قذف الرجل رجلاً محصناً او امرأة محصنة بصریح الزنی بأن قال زنیت او یا زانی وطالب المقذوف بالحد حده الحاکم ثمانین سوطاً ان کان القاذف حراً وان کان عبداً حده اربعین سوطاً کذا فی النهر الفائق۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۱۶۰ الباب السابع فی حد القذف)[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: من استحل ما حرمه الله تعالیٰ علی وجه الظن لا یکفر وانما یکفر اذا اعتقد الحرام حلالاً۔ (رد المحتار ج ۳ ص۱۵۴ باب المرتد)

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: واذا قذف الرجل رجلاً محصناً او امرأة محصنة بصریح الزنا وطالب المقذوف بالحد حده الحاکم ثمانین سوطاً ان کان حراً لقوله تعالیٰ: والذین یرمون المحصنٰت الیٰ ان قال فاجلدوهم ثمانین جلدة والمراد الرمی بالزنا بالاجماع وان کان القاذف عبداً جلد اربعین سوطاً۔ (الهدایة ج ۲ ص۵۲۹ کتاب الحدود، باب حد القذف)

قابلِ تعزیر سرقہ کی مقدار

سوال:- قابلِ تعزیر سرقہ کا نصاب تو دس درہم ہے لیکن آجکل کی کرنسی کے حساب سے یہ نصاب کتنا بنتا ہے؟

الجواب:- "اوزانِ شرعیہ" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک درہم ساڑھے تین ماشہ کا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے دس درہم یا پینتیس ۳۵ ماشے چاندی یا اس کی مالیت نصابِ سرقہ بنتا ہے اور یہ بات تو مسلّم ہے کہ مقدارِ حدِ سرقہ دس درہم ہے، لہٰذا موجودہ کرنسی کے اعتبار سے جتنی قیمت ۳۵ ماشے چاندی کی بنتی ہو سرقہ لازم ہوگا۔

وفی الهندية : أقل النصاب فی السرقة عشرة دراهم مضروبة بوزن سبعة جیاد کذا فی العنایة ۔ (الفتاوٰی الهندیه جلد۲ صـ۱۷۰ کتاب السرقة) لـه

سارق کے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنے کا حکم

سوال:- اگر سارق کا ہاتھ بطورِ حد کاٹ دیا جائے تو اجراءِ حد کے بعد اس کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- سارق کو سرقہ کے جرم میں صرف سزا دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس کو ایک ہاتھ سے محروم کرنا ہے تاکہ وہ آئندہ کے لیے یہ کام نہ کرسکے اور اُسے دیکھنے والے عبرت حاصل کریں، اس لیے سارق کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست نہیں ہے۔

وفی الهندية : وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم وثمن الذیت وکلفة الحسم علی السارق عندنا ۔ (الفتاوٰی الهندية ج۲ صـ۱۸۲ الباب الثانی فیما یقطع فیه وما لا یقطع ۔ الفصل الثالث) ۲ـه

لـه قال العلامة الحصکفی رحمه الله : (هی) الخ (عشرة دراهم) الخ (جیاد او مقدارها)
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ صـ۱۹۲ کتاب السرقة)
وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق صـ۱۷۰ کتاب السرقة ۔

۲ـه قال العلامة ابوالبرکات النسفی رحمه الله : وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم۔
(کنز الدقائق صـ۱۹۵ کتاب الحدود، باب حد السرقة)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج۳ صـ۲۰۶ باب کیفیة القطع اثباته۔

مزارات سے قیمتی اشیاء چرانے کا حکم

سوال :- آجکل کچھ لوگ اولیاء اللہ کے مزارات پر عموماً قیمتی غلاف چڑھاتے ہیں اس کے علاوہ مزارات پر روپے پیسے اور قیمتی چیزیں بھی رکھی جاتی ہیں، اگر کوئی شخص ان اشیاء کو چرالے تو اس پر حدِ سرقہ جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ ان اشیاء کو چوری کرنا جائز تو نہیں تاہم ان اشیاء کو چرانے سے حدِ سرقہ واجب نہیں ہوتی اور ان اشیاء کا وہی مالک ہوگا جس نے مزارات پر رکھی ہوں۔

وفی الهندية : ولو سرق من القبر دراهم اودنا نیرأو شیئاً غیرالکفن لم یقطع بالاجماع اختلف مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ فیما اذا کان القبرفی بیتِ مقفل الاصح انه لایقطع سواء نبش الکفن اوسرق مالاً آخر من ذٰلك البیت وکذا اذا سرق الکفن من تابوت فی القافلة لایقطع فی الاصح کذافی الکافی۔ (الفتاوی الهندية ج۲ ص۱۷۸ الباب الثانی فیما یقطع فیه ومالایقطع فیه)[1]

رہزن کو قتل کرنے کا حکم

سوال :- کیا راہزن، ڈاکو اور ہر وہ آدمی جس کا فساد ظاہر اور عام ہو تو اس کو صرف حاکمِ وقت یا قاضی تعزیراً اور سیاسۃً قتل کر سکتے ہیں یا عوام الناس بھی دفعِ فساد کے لیے اس کو قتل کرنے میں مختار ہیں؟

الجواب :- اگرچہ دفعِ فساد کے لیے حاکمِ وقت اور قاضی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے آدمی کو قتل کردے، تاہم اگر عوام رہزن کو دورانِ واردات قتل کردیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ : (وعلیٰ هٰذا) القیاس (المکابر بالظلم وقطاع الطریق

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله : (ونبش) لقبور (ولوکان القبر فی بیت مقفل فی الاصح) (او) کان (الثوب غیرالکفن) وکذا لوسرقه من بیت فیه قبراو میت لتأوّله بزیادة القبر او التجهیز۔
(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۲۰۳ کتاب السرقة مطلب فی ضمان الساعی)
ومثله فی بدائع الصنائع فی ترتیب احکام الشرائع ج۷ ص۶۹ کتاب السرقة۔

وصاحب المکس وجمیع الظلمۃ اھ) وافق النامی بوجوب قتل کل مؤذ وفی رد المحتار ج ۳ ص۱۸۰ لعل الوجوب بالنظر للامام ونوابہ والاباحۃ بالنظر لغیرھم۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص۱۸۰ مطلب ویکون التعزیر بالقتل) ۱؎

مفسد کو سزا دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص لوگوں میں فساد پیدا کرتا ہو تو اس کے ساتھ شرعاً کیا سلوک کیا جائے گا؟

الجواب:۔ حاکمِ وقت کو چاہیئے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے ایسے شخص کو روکے اور اس کو تعزیراً سزا بھی دے، اور عوام الناس کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ ترکِ موالات کریں حتیٰ کہ وہ اپنے اس فعلِ بد سے باز آجائے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (وعلیٰ ھٰذا) القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمۃ بأدنیٰ شیئ لہٗ قیمۃ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ۳ ص۱۸۰، ۱۸۱ مطلب یکون التعزیر بالقتل) ۲؎

چارپائے کے ساتھ بدفعلی پر تعزیر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بکری کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کیا تو اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے، جبکہ اس کا یہ جرم گواہوں کے ذریعہ ثابت بھی ہوچکا ہے؟

الجواب:۔ بشرطِ صدق وثبوت جانور سے وطی (بدفعلی) کرنے والے پر تعزیر ہے جو قاضی اور حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے تاہم کوڑوں کی سزا کی صورت میں چالیس سے کم کوڑے لگائے جائیں گے، کوڑوں کے علاوہ بھی تعزیر ہوسکتی ہے بشرطیکہ یہ تعزیر

۱؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وعلیٰ ھٰذا القیاس المکابرۃ بالظلم وقطاع الطریق......فیباح قتل الکل ویثاب قاتلھم۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۴۲ باب حد القذف، فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر۔

۲؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وعلیٰ ھٰذا القیاس المکابرۃ بالظلم وقطاع الطریق وجمیع الظلمۃ بأدنیٰ شیئ لہٗ قیمۃ وجمیع الکبائر والاعونۃ والظلمۃ والسعاۃ فیباح قتل الکل ویثاب قاتلھم۔

(البحر الرائق ج ۵ ص۴۲ باب حد القذف، فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر۔

جان ضائع ہونے تک نہ پہنچے، البتہ جانور کو ذبح کر کے جلا دیا جائے، تاوان وطی کرنے والے کے ذمہ ہے۔

قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی شرح الطحاوی رجل وطی بھیمة یعزر، فان کانت البھیمة له تذبح ولا توکل، وعن عمرؓ انه امر بالبھیمة حتی احرقت بالنار۔ وفی الفتاوی الصغری فی الذی یوکل یذبح ویوکل عند ابی حنیفةؒ ولا یحرق وعند ابی یوسفؒ لا یوکل ویحرق بالنار الخ

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۴۵، ۴۴۶ کتاب الحدود، الفصل الثانی فی الزنا) [1]

بیوی کو وطی فی الدبر کے لیے مجبور کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک عورت کا دعویٰ ہے کہ اس کا خاوند اس کو وطی فی الدبر کے لیے مجبور کرتا ہے، تو اس شخص کی سزا شرعاً کیا ہے؟ نیز اس عورت کے والدین اُسے اپنے گھر لے جانے کے حقدار ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں عورت اور اس کے اولیاء کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس کے خاوند کو اس قبیح فعل سے روکیں ورنہ ارتکاب کی صورت میں حاکم اس کو تعزیراً سزا دے اور عادی ہونے کی صورت میں حاکمِ وقت اُس کو قتل بھی کر سکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: أو (بوطأ دُبر) وقالا ان فعل فی الاجانب حد وان فی عبدہ وامته او زوجته فلا حد اجماعاً بل یعزر قال فی الدرر بالاحراق بالنار۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۵ باب التعزیر مطلب فیمن وطی ....) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: (و) لا یحد (بوطأ بھیمة) بل یعزر وتذبح ثم تحرق ویکرہ الانتفاع بھا حیة ومیتة مجتبیٰ وفی النھر الظاھر انه یطالب ندباً لقولھم تضمن بالقیمة۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۵ مطلب فی وطی الدابة)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۳ ص۱۸۱ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه۔

[2] قال العلامة برھان الدین المرغینانیؒ: ومن اتی امرأة فی الموضع المکروہ او عمل عمل قوم لوط فلا حد علیه عند ابی حنیفةؒ ویعزر وقال فی الجامع الصغیر ویودع فی السجن وقالا ھو کالزنا فیحد۔ (الھدایة ج۲ ص۵۱۷ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۲ ص۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه۔

جادُوگر کی سزا کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی کسی پر جادو وغیرہ کرتا ہو اور اس کا یہ فعل گواہی سے ثابت ہو جائے تو شرعاً اس کو کس قسم کی سزا دی جائے گی؟

الجواب:۔ جادوگر چونکہ مفسد فی الارض ہے اس لئے اگر جادوگر جادو کرتے ہوئے پکڑا جائے اور وہ خود بھی اس کا اقرار کرے یا گواہی سے اس کا جادو کرنا ثابت ہو جائے تو قاضی یا حاکمِ وقت اس کو قتل کر سکتا ہے تاہم اگر وہ گرفتاری سے پہلے صدقِ دل سے توبہ کرے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی اور اس کے بعد اُسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة علاؤ الدين الطرابلسيؒ: قال في النوازل الخناق والساحر يقتلان اذا اقرا لانهما ساعيان في الارض بالفساد فان تابا ان كان قبل الظهور بهما قبلت توبتهما وبعد ما اخذ الا ويقتلان كما قطاع الطريق۔ (معين الحكام ص۲۲۹)[1]

فاسق سے ترکِ موالات کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں طلاق کے بعد علماء نے اسے بتایا کہ اب بغیر حلالۂ شرعی کے یہ عورت آپ کے لیے جائز نہیں لیکن اس کے باوجود اُس نے بدستور مطلقہ کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے، تو ایسے اعلانیہ فاسق اور فاجر کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اُس کو اور اُس کے والد کو مسجد میں آنے سے منع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اپنی مطلقہ غلیظہ بیوی کے ساتھ بغیر حلالۂ شرعی کے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا صریح زنا ہے ایسا شخص مستحقِ سزا ہے مگر خود اُسے یا اس کے والد کو مسجد سے یا نماز باجماعت سے منع نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس کے رشتہ داروں اور دیگر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس کا سوشل بائیکاٹ (ترکِ موالات) کریں۔

ونهى رسول الله صلى الله عليه وسلم المسلمين عن كلامنا الخ واما انا فكنت اشب القوم واجلدهم فكنت اخرج فاشهد الصلوٰة واطوف في الاسواق ولا يكلمني احد وآتي رسول الله صلى الله

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: قال ابو حنيفةؒ الساحر اذا اقر بسحره أثبت يقتل ولا يستتاب منه الخ۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۲۹۵ قوله والكافر بسبب اعتقاد السحر۔ باب المرتد)
ومثله في تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق للزيلعيؒ ج۳ ص۲۹۲ باب المرتدين۔

علیہ وسلم فاسلم علیہ وھو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ الخ
(الصحیح المسلم ج ۲ ص۳۶۱ باب حدیث توبۃ کعب بن مالکؓ) لہ ۱

اغلام بازی کی سزا | سوال:- جناب مفتی صاحب! اغلام بازی (مرد کا مرد سے منہ کالا کرنے) کی شرعی سزا کیا ہے؟

الجواب:- اغلام بازی ایک قبیح وخبیث فعل ہے، شریعت نے اس کے لیے کوئی باضابطہ سزا تو مقرر نہیں کی، البتہ اس قبیح فعل کی سزا کو حاکم کی صوابدید کے موافق رکھا ہے وہ چاہے تو اس فعل کے مرتکب کو جلا کر ختم کردے یا کسی بلند مقام سے اُلٹا (سر کے بل) گرا کر اوپر سے پتھر برسانے کا حکم دے یہاں تک کہ وہ مرجائے یا اس پر دیوار گرانے کا حکم دے یا سخت سزا دے کر قید کردے یہاں تک کہ توبہ کرلے یا قید میں مرجائے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یحد بوطء دبر وقالا ان فعل فی الاجانب حد وان فعلہ اوامتہ او زوجتہ فلاحد اجماعاً بل یعذر. قال فی الدرر بنحو الاحراق بالنار وھدم الجدار والتنکیس من محل مرتفع باتباع الاحجار۔
(الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج ۳ ص۱۶۱ کتاب الحدود) لہ ۲

مردہ عورت سے وطی کرنا موجب تعزیر ہے | سوال:- اگر کوئی شخص کسی مردہ عورت سے وطی (زنا) کرے

لہ ۱ قال المفتی علاؤ الدین الطرابلسی الحنفیؒ: والتعزیر لا یختص بفعل معین ولا قول معین فقد عزر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالھجر وذلک فی حق الثلاثۃ الذین ذکرھم اللہ تعالیٰ فی القرآن العظیم فھجروا خمسین یوماً لا یکلمھم احدٌ وقصتھم مشھورۃ فی الصحاح۔ (معین الحکام ص۲۳۱ باب التعزیر)

ومثلہٗ فی شرح الصحیح المسلم للنواوی ج ۲ ص۳۶۳ باب حدیث توبۃ کعب بن مالک

لہ ۲ لما قال المفتی محمد شفیعؒ: اس قبیح فعل کے لیے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے تاہم اس کے لیے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں، مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کردینا، تلوار سے قتل کردینا وغیرہ۔
(معارف القرآن ج ۲ ص۳۴۰ سورۃ النساء)

تو کیا وہ حد کا مستحق ہے یا تعزیر کا؟

الجواب: مردہ عورت کے ساتھ زنا کرنے والے پر حد زنا لازم نہیں آتی تاہم وہ مستحق تعزیر ضرور ہے۔

وفی الهندية: رجل زنی بامرأۃ میتۃ اختلفوا فیہ قال اهل المدینۃ حد وقال اهل البصرۃ یعزر، ولا یحد وقال ابو اللیث رحمه الله تعالیٰ وبه ناخذ۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه) [۱]

والدین کی بے ادبی کرنے والے کی سزا

سوال: ایک شخص اپنے والد سے ہمیشہ بُری طرح پیش آتا ہے اور اس کو گالیاں بھی دیتا ہے، اس کے علاوہ بسا اوقات والد کو ایسی بے رحمی سے مارتا ہے کہ وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: والدین کو مارنے یا گالی گلوچ کرنے پر شرعاً کوئی حد مقرر نہیں بلکہ اس کی سزا حاکم وقت اور قاضی کی صوابدید پر ہے کہ وہ جرم کی نوعیت کے مطابق سزا تجویز کرے، اگر کوڑے مارنے کی سزا تجویز کرے تو یہ سزا انتالیس ۳۹ کوڑوں سے زیادہ اور تین ۳ سے کم نہ ہو، یا پھر اس کو جیل میں اس وقت تک ڈال دیا جائے جب تک کہ وہ اپنے جرم سے توبہ نہ کرے۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: ومن یتهم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس احبسه واخلده فی السجن حتی یتوب۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار جلد۳ ص۱۸۸ مطلب فی تعزیر المتهم) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: وفی الفتاویٰ رجل زنی بامرأۃ میتۃ لا حد علیه ولکن یعزر۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۴۴ کتاب الحدود۔ الفصل الثانی فی الزنا)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ قاضیخان ج۴ ص۴۲۰ کتاب الحدود۔

[۲] وفی الهندية: من یتهم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس یحبس ویخلد فی السجن الی أن تظهر التوبۃ۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۶۹ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۴۲ کتاب الحدود، فصل فی التعزیر۔

نابالغ قاتل کو تعزیراً سزا دینا

سوال:۔ کیا حکومت کسی نابالغ قاتل کو تعزیر کے طور پر قتل کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جن جرائم عظیمہ میں حد اور قصاص عوارض خارجیہ کی وجہ سے ساقط ہوں تو اس میں حسب مصلحت تعزیراً سزا دینا جائز ہے چاہے تعزیر سزائے موت تک پہنچ جائے خواہ مجرم نابالغ ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: رأیت فی الصارم المسلول للحافظ ابن تیمیةؒ ان من اصول الحنفیة أن ما لا قتل فیه عندهم مثل القتل بالمثقل والجماع فی غیر القبل اذا تکرر فللامام أن یقتله فاعله الخ ولیسمونه القتل سیاسة وفیه ایضاً۔ ومن ذلك ما سیذکره المصنف من ان للامام قتل السارق سیاسة أی عن تکرر منه وفیه وان الحد لا یجب علی الصبی والتعزیر شرع علیه۔

(رد المحتار ج۳ ص۱۷۷ باب التعزیر، قوله ویکون التعزیر بالقتل)

شاگرد کو سزا اور تعزیر دینے کا حکم

سوال:۔ دینی مدارس اور سکولوں میں طلباء کو کسی شرارت پر یا سبق یاد نہ کرنے کی وجہ سے بطور تنبیہ اور تادیب کے سزا دی جاتی ہے، تو کیا استاد شاگرد کو شرعاً سزا دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ استاد شاگرد کو تعزیر دینے کا حق رکھتا ہے اگرچہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ نابالغ ہونے کی صورت میں تو معلم اسکے اولیاء کی طرف سے تادیب کا مالک بنا دیا گیا ہے اور بالغ نے خود معلم کو تعزیر کا اختیار دیا، لیکن یہ احتیاط ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ اس سے طالب علم بدنی یا ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله وفی القنیة الخ) وفیها عن الروضة ولو أمر غیره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر فهذا تنصیص علی عدم جواز الضرب ولد الآمر بامره بخلاف المعلم لان المأمور یضربه بنیابة عن الاب بمصلحة والمعلم یضربه بحکم الملك بتملیك ابیه بمصلحة الولد اھ وهذا اذا لم یکن الضرب فاحشاً۔ (رد المحتار جلد۳ ص۱۸۹ باب التعزیر) لے

لے قال العلامة ابن نجیمؒ: ولو أمر غیره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر قال رضی الله عنه فهذا تنصیص علی عدم جواز ضرب ولد الآمر بأمره بخلاف المعلم لان المأمور یضربه بنیابة عن الاب لمصلحة والمعلم یضربه بحکم الملك بتملیك ابیه لمصلحة الولد اھ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۹ فصل فی التعزیر)

بیوی کو بدفعلی کی بناء پر قتل کرنا

سوال:۔ اگر کسی شخص کو پختہ یقین ہو کہ اس کی بیوی بدکردار (زانیہ) ہے اور اسی وجہ سے وہ اسے قتل کر دے تو اس شخص کا یہ انتہائی اقدام درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر شوہر دورانِ زنا بیوی کو قتل کر دے تو مجرم نہ ہوگا، بصورتِ دیگر بیوی کو قتل کرنا قابلِ مواخذہ جرم ہے۔

وفی الھندیة: وان طاوعته المرأة حَلَّ لَهٗ قتلھا ایضاً کذا فی النھایة وفیھا ایضاً ج۲ ص۱۶۷۔ قالوا الکل مسلم اقامة التعزیر حال مباشرة المعصیة واما بعد المباشرة فلیس ذٰلك لغیر الحاکم۔ (الفتاویٰ الھندیة ج۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر) [۱]

جنگل سے جانور چوری ہونے کی صورت میں حد کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جس کو ہم بیلہ کہتے ہیں، گاؤں کے لوگ اپنے مال مویشی اس میں چرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جبکہ وہ جگہ غیر محفوظ ہے، اب اگر کوئی شخص اس بیلہ سے کسی کے مویشی چرا کر لے جائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ قطع ید کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ چوری کسی ایسے مقام سے ہوتی ہو جو محفوظ ہے، اور اگر چوری کسی غیر محفوظ جگہ سے ہو جائے تو سرقہ کی شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے مجرم سے حد ساقط ہوگی تاہم وہ تعزیر سے

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: سُئل الھندوانی عن رجل وجد رجلاً مع امرأة ایحل له قتله قال ان کان یعلم انه ینزجر بالصیاح والضرب بما دون السلاح لا وان کان یعلم انهٗ لا ینزجر الا بالقتل حَلَّ له القتل وان طاوعته المرأة حَلَّ له قتلھا۔ ایضاً وفی المنیة رأی رجلاً مع امرأته وھو یزنی بھا أو مع محرمه وھما مطاوعتان قتل الرجل والمرأة جمیعاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۲) ایضاً قالوا لکل مسلم اقامته حال مباشرة المعصیة وا ما بعد الفراغ منھا فلیس ذٰلك لغیر الحاکم۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۲ باب حد القذف فصل فی التعزیر)
وَمِثْلُهٗ فی شرح النقایة ج۲ ص۳۹ فصل فی التعزیر۔

نہیں بچ سکتا۔

لما قال العلامة ابن البزازؒ: ومنها ان یکون المال الماخوذ محرزاً اما بالمکان للحفظ کالدور والدکاکین الخ (البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج ۶ ص۳۱۴ کتاب السرقة) لہ

سکول، کالج میں طلباء کو جرمانے کا حکم

سوال:۔ عصر حاضر میں سکولوں اور کالجوں کی انتظامیہ کا ایک دستور ہے کہ جب کوئی طالب علم غیر حاضری کرتا ہے یا کسی اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اساتذہ یا ادارے کا سربراہ اس سے مالی جرمانہ وصول کرتے ہیں جو کہ اصلاً ان کے والدین سے وصول کیا جاتا ہے، تو کیا شرعاً یہ جرمانہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طالب علم کا مدرسہ وغیرہ سے انتظامیہ کی اجازت کے بغیر کثرت سے غیر حاضر رہنا یا دیگر کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب کرنا اگرچہ موجب سزا ہے مگر یہ سزا جسمانی حد تک محدود ہونی چاہیئے مالی جرمانہ شرعاً صحیح نہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ جرم تو طالب علم کرے اور سزا کے طور پر مالی جرمانہ اس کے والدین ادا کریں یہ بات مناسب نہیں۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: تعزیر مالی یعنی جرمانہ تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں اور حدیث لایحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منہ اس کی مؤید بھی ہے، پس جرمانہ کے طور پر تو لینا درست نہ ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۵۴۳ کتاب الحدود، حکم جرمانہ بغیر حاضری طالب علم) ۲ہ

لہ وفی الهندیة: وهی فی الشرع اخذ العاقل البالغ نصابا محرزا......علیٰ وجه الخفیة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص۱۷۰ کتاب السرقة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۲ ص۵۲۳ کتاب السرقة۔

۲ہ قال المفتی محمود الحسنؒ: (الجواب) مالی جرمانہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں منسوخ ہے اگر لیا گیا ہو تو اس کی واپسی لازم ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ج ۵ ص۱۸۴ کتاب الحدود)

وَمِثْلُهٗ فی کفایت المفتی ج ۲ ص۱۶۵ کتاب الحدود۔

فصل کو نقصان پہنچانے پر جرمانہ کا حکم | سوال:۔ اگر کسی کا جانور دوسرے کے کھیت میں چلا جائے اور فصل کو نقصان پہنچائے تو شرعاً جانور کے مالک کو کیا سزا دی جاسکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر جانور کے ساتھ مالک خود موجود ہو اور اس کی موجودگی میں وہ جانور دوسرے کے کھیت میں جاکر فصل کا نقصان کرے تو شرعاً صرف نقصان کے مطابق رقم وصول کرنا درست ہے اس سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ تاہم اگر جانور کے ساتھ کوئی بھی نہ ہو اور وہ فصل کا نقصان کرے تو اس صورت میں جرمانہ لینا ناجائز ہے۔

لما قال الشیخ اشرف علی تھانویؒ: (الجواب) اگر جانور کے ساتھ کوئی نہ ہو اس صورت میں تو یہ جرمانہ ناجائز ہے اور اگر کوئی ساتھ ہو تو جتنا نقصان ہوا ہے اتنا وصول کرنا درست ہے مگر وہ کھیت والے کا حق ہے۔

(امداد الفتاوی ج۲ ص۵۴۳ کتاب الحدود) لہ

حفاظت کی نیت سے مال اٹھانے پر سزا کا حکم | سوال:۔ ایک آدمی نے دوسرے پر مال چوری کرنے کا دعویٰ کیا مگر مدعیٰ علیہ (جس پر چوری کا دعویٰ کیا گیا ہے) کہتا ہے کہ میں نے اس شخص کا مال چوری کی نیت سے نہیں بلکہ حفاظت کی نیت سے اٹھایا ہے اور میں نے اس شخص کو اطلاع بھی دی ہے، تو کیا اس شخص پر چوری کی سزا نافذ ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص پر چوری کا دعویٰ کیا گیا ہے اس نے وہ مال کسی غیر محفوظ مقام سے اٹھایا ہے جس کی موصوف نے مال کے مالک کو اطلاع

لہ قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: ولو انہ قال لصاحب الدابة ان دابتك فی الزرع ولم یقل اخرجها فاخرجها صاحبها فافسدت شیئاً فی اخراجها کان ضامناً...... ولو ان دابة رجل انفلتت لیلاً او نهاراً من غیر ارسال فافسدت زرع انسان لا یجب الضمان علی صاحبها لان فعل العجماء هدر۔

(الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۴۵۷ باب جنایة البهائم)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة ج۱ ص۲۵۹ کتاب الجنایة۔

بھی دی ہے اور دوسری طرف ملزم مال کو بطور امانت لینے کا بھی مدعی ہے، اس لیے ان حالات کے پیش نظر ملزم کو چوری کی سزا نہیں دی جائے گی (یعنی اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا) تاہم اگر مدعی گواہان شرعی سے اس بات کو ثابت کردے کہ یہ مال محفوظ مقام میں تھا تو پھر اس صورت میں اثبات جرم کے تحت مجرم کو چوری کی سزا دی جائے گی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویقطع لو سرق من السطح نصاباً لانه حرز شرح وهبانیه او من المسجد اراد به کل مکان لیس بحرز فعم الطریق والصحراء و رب المتاع عندہٗ ای بحیث یراہ ولو الحافظ نائماً فی الاصح۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۲ کتاب السرقة) ؎

جیوان سے بدفعلی کی سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی جیوان سے بدفعلی کرتے پکڑا جائے اور اس کے اس فعلِ بد پر گواہ بھی موجود ہوں تو شریعت مقدسہ میں ایسے شخص کی کیا سزا ہے؟

الجواب:۔ کسی حیوان سے بدفعلی کرنا اگرچہ شرعاً حرام اور غیر فطری فعل ہے لیکن شریعتِ مقدسہ میں ایسے شخص کے لیے کوئی مقررشدہ سزا نہیں ہے البتہ اس فعلِ بد کے مرتکب شخص کو تعزیراً سزا دی جاسکتی ہے جو حاکمِ وقت یا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے وہ جتنی مناسب سمجھے ایسے مجرم کو سزا دے سکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: تحت قوله (ولا عند وطء بهیمة) وفی القنیة مر فی اجناس الناطفی فرج البهیمة کفیها لا غسل فیه بغیر انزال ویعزر وتذبح البهیمة وتحرق علی وجه الاستحباب

؎ قال العلامة وهبة الزحیلی: الاصل فی اشتراط هٰذا الشرط المتفق علیه قوله علیه السلام "لا قطع فی ثمرة ولا کثر حتی یؤویه الجرین فاذا اواه الجرین ففیه القطع" وفی روایة فاذا اواه المراح او الجرین والحرز لغة: الموضع الذی یحرز فیه الشئ وشرعاً هو ما نصب عادةً لحفظ اموال الناس کالدار والحانوت والخیمة والشخص الخ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۱۰۷ الفصل الثالث فی حد السرقة)

ولایحرم اکل لحمھا بہ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۱۲۲ باب الغسل) ؎۱

بجلی چوری کرنے پر سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص بجلی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اور گواہان کے ذریعہ جرم ثابت ہو جائے تو کیا اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی جرم کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسکی جملہ شرائط پوری کی پوری پائی جائیں اگر ان میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہو تو سزا جاری نہیں ہوگی۔ چوری کی سزا کے معاملہ میں یہ ضروری ہے کہ مال محفوظ جگہ سے اٹھایا جائے تب سزا نافذ ہوگی ورنہ نہیں۔ صورت مسئولہ میں چونکہ بجلی مال ہونے کے باوجود غیر محفوظ ہے اسلئے حد نافذ نہ ہوگی تاہم تعزیراً سزا ضرور ملنی چاہیئے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولیقطع لو سرق من السطح نصاباً لانہ حرز شرح وھبانیۃ او من المسجد اراد بہ کل مکان لیس بحرز فعم الطریق والصحراء ورب المتاع عندہ ای بحیث یراہ ولو الحافظ نائماً فی الاصح۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص۲۲۲ کتاب السرقۃ) ؎۲

؎۱ قال الشیخ علامۃ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ: واطئی البھیمۃ یعزر فان کانت البھیمۃ للواطی ففی شرح الطحاوی وحد ودلاصل تذبح ولا توکل۔ وفی فتاوی الصغریٰ انھا توکل وافتیٰ ابوسعید بھٰذا وقال صدر الشھید الاعتماد علیٰ روایۃ شرح الطحاوی۔ (معین القضاۃ والمفتیین ص۹۴ مادۃ ۵۴۴)

وَمِثْلُہٗ فی الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۶ ص۶۶ کتاب الحدود۔

؎۲ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ومنھا ان یکون الماخوذ منہ محرزاً وانما یصیر المکان حرزاً باحد الامرین اما ان یکون مُعدّاً لحفظ الاموال کالدور والدکاکین والخانات والاخبیۃ والفساطیط او بالحافظ حتی لو سرق شیئاً من الصحراء ولہ حافظ بان سرق شیئاً من تحت رأسہ وھو نائم فی الصحراء او فی المسجد یقطع ولو کان المال موضوعاً بین یدیہ اختلف المشائخ قال الامام سرخسیؒ انہٗ محرز۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۴۳۷ کتاب السرقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی التاتارخانیۃ ج ۵ ص۱۶۸ کتاب السرقۃ۔

بیماری کی حالت میں حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص پر زنا کا جرم بطریقہ شرعی ثابت ہو جائے اور وہ دل کا مریض بھی ہو، اب اگر اس پر حد جاری کی جائے تو وہ ہلاک ہو جائے گا، تو اس صورت میں شرعاً کیا کیا جائے، حد جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: اگر حدود کا مجرم کسی ایسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کہ حد جاری کرنے کی صورت میں اس کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو مرض کے ختم ہونے تک حد کو موقوف کر کے مجرم کو جیل ہی میں رکھا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: تقطع یمین السارق من زندہ وتحسم الا فی حر وبرد شدیدین فلا تقطع لان الحد زاجر لا متلف ویحبس لیتوسط الامر۔
قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله الا فی حر وبرد شدیدین) والا فی حال مرض مفتاح وقیدہ فی البنایة بالمرض الشدید افادہ عن الحموی۔

(رد المحتار ج ۳ ص۲۲۶ کتاب السرقة باب کیفیة القطع واثباته)[1]

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وشرط اصحابنا لقطع الید الیمنی ان تکون الید الیسریٰ والرجل الیمنی صحیحتین حتی انه اذا کانت یدہ الیسریٰ بحیث لا ینتفع بها لا تقطع یدہ الیمنی وکذلک اذا کانت الید الیسریٰ صحیحة الا ان الرجل الیمنی مقطوعة او هی شلاء او بها عرج یمنع المشی علیها تقطع الیمنی۔

(الفتاوی التاتارخانیة ج ۵ ص۱۱۲ کتاب السرقة الفصل الاول فی بیانها)

ومثله فی فتح القدیر ج ۵ ص۱۵۶ کتاب السرقة، فصل فی کیفیة قطع واثباته۔

زنا بالرضاؔ اور زنا بالجبر میں تفریق کی تحقیق

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زنا جو حرام قطعی ہے، اس کی قطعی حرمت کے پیش نظر صوبائی اسمبلی میں بعض اسلام پسند ممبروں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ چونکہ ہمارا یہ ملک ایک اسلامی ملک ہے اس لیے شادی شدہ مرد اور عورت دونوں کو قرآنی ہدایت کے مطابق زنا کی پاداش میں سنگسار کرنا چاہیئے اور غیر شادی شدہ زانی مرد و عورت کو سَو سَو دُروں کی سزا دینی چاہیئے اور دونوں قسم کے مجرمین کو سزا دینے میں نرمی یا رعایت سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ مگر بجائے اس کے کہ یہ جائز اور اسلامی مطالبہ منظور کیا جاتا حکومت کی اکثریتی پارٹی نے زنا کو دو حصوں زنا بالرضاؔ اور زنا بالجبر میں تقسیم کر کے زنا بالرضا کو جائز قرار دیا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو حکومتی سطح پر قرآن کریم کی نصوص قطعیہ کی صریح خلاف ورزی کر کے ایک حرام فعل کو قانون کی مدد سے جائز قرار دیا گیا، اور دوسری طرف اسلام کے عمومی حکم حرمت سے زنا بالرضا کو مستثنیٰ کر کے زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان حکم کے لحاظ سے تفریق کر دی گئی ہے۔ تو کیا شرعی طور پر طے شدہ ایک حرام فعل کو جائز کرنے کا اختیار کسی شخص یا ادارہ کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو اسلامی شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟ اور کیا زنا کے بارے میں قرآن کریم کی مقرر کردہ سزاؤں سے زنا بالرضا مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ کو قرآن وحدیث اور فقہاء امت کے فیصلوں کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

الجواب :۔ سوال کے مضمون پر غور کرنے سے حسب ذیل تین امور پر روشنی پڑتی ہے :

(۱) قانونی سزا کے بارے میں اسلامی شریعت زنا بالرضاؔ اور زنا بالجبر کے درمیان تفریق کی قائل ہے؟

(۲) اگر قائل نہیں تو پھر کیا کسی با اختیار ادارہ اور برسرِ اقتدار جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شریعت کی قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کر سکے؟

(۳) حرام قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟

ذیل کی سطور میں تینوں اجزاء کے احکام کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور فقہاء اسلام کے قطعی فیصلوں کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں :۔

(جواب جزء ۱) زنا کے لیے اسلامی شریعت میں جو سزا مقرر کی گئی ہے اس میں شریعت نے زنا کی دونوں قسموں کے مابین فرق اور امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا ہے نہ وہ اس طرح کی کسی

تفریق کی قائل ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کے واضح احکام کی روشنی میں فقہاء اسلام بھی اس بات پر متفق ہیں کہ زنا کی دونوں قسموں میں زنا کرنے والے مرد پر قانونی سزا نافذ کی جائے گی، البتہ عورت زنا بالجبر کی صورت میں قانونی سزا سے مستثنیٰ ہوگی اگرچہ اختیاری زنا کی صورت میں وہ بھی مرد کی طرح سزا کی مستحق رہے گی اور مرد کی طرح اس پر بھی حد شرعی قائم ہوگی۔ ذیل میں مذکورہ بالا دعویٰ کا تفصیلی ثبوت قرآن و حدیث اور فقہاء اسلام کے فیصلوں کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

زنا قرآن کی نظر میں | قرآن کریم نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں تجویز کی ہیں ان میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ یہ سزائیں جبری زنا کے لیے ہیں اور اختیاری زنا میں ان کا نفاذ نہیں کیا جائے گا بلکہ قرآن کریم میں جہاں بھی یہ سزائیں بیان کی گئی ہیں وہاں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے اور زنا بالجبر کا نام تک نہیں لیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا خواہ بالجبر ہو یا بالرضا قرآنی قانون کی نظر میں یکساں طور پر جرم ہیں، اور دونوں قسم کے زنا میں یہ قانونی سزائیں نافذ کی جائیں گی۔ اختیاری اور جبری زنا کا یہ فرق اگر مغربی اور عیسائی شریعت میں ہو تو ہو مگر اسلامی شریعت اس فرق سے قطعی طور پر نا آشنا اور یقینی طور پر نابلد ہے اب ذیل میں وہ قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں زنا کے لیے قانونی احکام بیان کئے گئے ہیں۔

زنا ایک قبیح فعل ہے | وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ٥ (بنی اسرائیل) "زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کہ یہ ایک قبیح فعل اور برا راستہ ہے"۔

اس آیت میں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے، خاص زنا بالرضا یا زنا بالجبر کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے بلکہ مطلق زنا کو فاحشہ (قبیح فعل) کہہ کر مسلمانوں کو اس کے قریب جانے سے روکا گیا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں مطلق زنا فاحشہ اور قبیح فعل ہے اور معاشرے کو اس سے پاک رکھنا انتہائی ضروری ہے ـــــ اس بارے میں جو لوگ اس قسم کے قبیح افعال کو معاشرے میں فروغ دینے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ بے حیائی لوگوں میں پھیل جائے قرآن کریم نے صریح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ:۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ٥ (النور ۱۹) "جو لوگ مسلمانوں اور مسلم معاشرے میں بیحیائی اور قبیح افعال کو فروغ دے کر پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ ہی

خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ خود زنا جیسے قبیح فعل میں اپنے آپ کو ملوث کرے یا دوسرے مسلمانوں میں اس بے حیائی کے پھیلنے کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش ظاہر کرے۔

زنا کے چور دروازے اسلام نے مسلم معاشرے میں زنا اور حرام کاری کے مکمل انسداد کے لیے یہاں تک انتظام کیا ہے کہ جو امور اس قبیح فعل کے لیے مبادی اور ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اس کے لیے بمنزلہ چور دروازہ کے ہیں قرآن کریم نے قفل لگا کر ان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے اور صریح طور پر انہیں ممنوع قرار دیا ہے، چنانچہ "سدًا للباب" اس نے مردوں اور عورتوں دونوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے مسلم معاشرے میں زنا وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے سب سے پہلے عورتوں پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اجنبی اور غیر محرم مردوں کے سامنے بے پردہ ہو کر نہ آئیں اور نہ ہی دورِ جاہلیت کے "تبرّج" کی نقالی کرتی پھریں، ارشادِ قرآنی ہے:۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى وَأَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَأَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (الاحزاب ۳۳) "یعنی اپنے گھروں میں عزت اور وقار کے ساتھ رہو اور دورِ جاہلیت کے تبرّج کی نقالی نہ کرتی پھرو، نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ و رسول کی فرمانبردار رہو۔"

لیکن بعض اوقات گھروں سے نکلنے کی بھی ضرورت پیش آتی رہتی ہے تو اس کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ بے پردہ ہو کر نہ نکلیں بلکہ بڑی بڑی چادریں وغیرہ اپنے اوپر ڈال کر رکھیں تاکہ ایک طرف آپ کی زینت اور حسن و جمال دوسروں کے لیے باعثِ فتنہ نہ بنے اور دوسری طرف آپ کے متعلق یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ شریف اور باحیاء عورتیں ہیں جو شریف اور معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں، تو بدطینت لوگ آپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے اور نہ کوئی بدقماش آپ کو اذیت پہنچا سکے گا۔ ارشادِ قرآنی ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰىٓ اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (الاحزاب ۵۹) "اے پیغمبر حکم دیجئے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو، اور مسلمانوں کی تمام عورتوں کو کہ (گھروں سے نکلنے وقت) اپنے

اوپر بڑی بڑی چادریں وغیرہ ڈال کر نکلیں اس سے بآسانی ان کی پہچان ہو سکے گی اور انہیں کوئی اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔"

ایک دوسرے مقام پر پوری سوسائٹی کو جس میں مرد اور عورت سبھی شامل ہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حجاب شرعی کے بغیر ایک دوسرے سے آزادانہ اختلاط نہ کرو، نہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھو بلکہ دونوں فریق "غضِ بصر" پر عمل کرتے رہو، اس سے آپ کی عفت محفوظ رہ سکتی ہے، اور زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے سے بھی آپ بچ سکتے ہیں ارشاد قرآنی ہے:۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ....وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ - (سورۃ النور ۳۱،۳۰) "اور مومن مردوں کو بھی یہ حکم کیجئے اور عورتوں کو بھی کہ وہ اپنی اپنی نگاہوں کو نیچے رکھ کر شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور بجز اپنے شوہروں اور محارم کے عورتیں اپنی زینت کو دوسروں کے سامنے نہ کھولیں۔"

اس آیتِ مبارکہ میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یہ حکم کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے ہرگز نہ دیکھیں، اور زنا سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں لیکن "غضِ بصر" پر "حفاظت" کو مقدم کرکے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے کا قوی ذریعہ ہے لہٰذا ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ جائے تاکہ زنا میں ملوث ہونے کی نوبت ہی پیش نہ آئے۔ اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام کاروائیاں انسداد زنا کے لیے تدابیر کی حیثیت رکھتی ہیں، اب اگر اسلام کی نظر میں صرف زنا بالجبر ہی ممنوع ہوتا اور اختیاری زنا ممنوع نہ ہوتا تو "غضِ بصر" کا حکم صرف مردوں ہی کو دیا جاتا تاکہ ان کے دلوں میں نظرِ شہوت سے، اجنبی عورتوں کی طرف ناجائز میلان پیدا ہو کر کسی وقت ان سے جبراً زنا کے مرتکب نہ ہوں عورتیں ہرگز اس حکم کے تحت نہ آجاتیں، کیونکہ ان کی طرف سے جبر بالزنا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آیت ہذا میں فریقین یعنی مرد و عورت دونوں کو یکساں طور پر "غضِ بصر" کا حکم دیا گیا ہے، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں زنا بالاختیار بھی اسی طرح ایک سنگین جرم ہے جس طرح زنا بالجبر سنگین جرم ہے اور چونکہ وہ مرد و عورت دونوں کی باہمی نظر بازی سے

پیدا ہوتا ہے اس لیے دونوں کو "غضِ بصر" کا حکم دے کر زنا بالاختیار کے اس چور دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

قانونی سزائیں قرآن کریم میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں ان میں بھی زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزائیں دونوں قسم کے زنا کے لیے مقرر کی گئی ہیں اور زنا بالاختیار ان سے مستثنیٰ نہیں ہے، ارشادِ ربانی ہے :-

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (النور ع۱) "بدکاری کرنے والی عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو مارو سو سو دُرّے اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم کے نافذ کرنے میں اگر تم یقین رکھتے ہو خدا پر اور پچھلے دن پر، اور دیکھیں ان کی یہ سزا کچھ لوگ مسلمانوں میں سے"۔

اس آیت میں کوڑوں کی جو سزا بیان کی گئی ہے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے لیے بیان کی گئی ہے بلکہ زانیہ عورت کو زانی مرد پر مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عورت اس سزا کی زیادہ مستحق ہے، حالانکہ زنا بالجبر کی صورت میں پوری ملت اس پر متفق ہے کہ عورت نہ سزا کی مستحق ہے اور نہ اس پر کسی قسم کی حد جاری کی جا سکتی ہے بلکہ اس میں سزا کا مستحق صرف (زانی) مرد ہوگا اور اُسی پر کوڑوں یا رجم کی سزا نافذ کی جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جو سزا بیان کی گئی ہے وہ اختیاری زنا کی سزا ہے نہ کہ جبری زنا کی، لیکن الفاظ کے عموم میں چونکہ دونوں قسم کے زنا داخل ہیں اس لیے مرد کی سزا تو دونوں قسم کے زنا میں بحال رہے گی، اور عورت جبری زنا میں چونکہ مجرم نہیں ہوتی اس لیے وہ اس صورت میں سزا کی بھی مستحق نہ ہوگی۔ چنانچہ روایات میں آگے اس کی تصریح آتی ہے۔ اب قرآن کریم کی اس تصریح اور واضح فیصلے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یا ادارہ اس حکم سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے تو اُس کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیدہ دانستہ یا نادانستہ طور پر قرآن کریم کے صریح فیصلے میں تحریف کرنا چاہتا ہے۔

عہدِ نبوت میں یہ قانونی سزائیں زنا کے بارے میں قرآن کریم کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی صاف طور پر عہدِ نبویؐ کے ایسے صریح فیصلے ملتے ہیں جن میں زنا بالاختیار کی صورت میں مرد اور عورت دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔ اور اس بات کے لیے عہدِ نبویؐ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کبھی زنا بالاختیار کی صورت میں ثبوتِ جرم کے بعد مرد یا عورت پر قانونی سزا نافذ نہ کی گئی ہو، بلکہ عہدِ نبوت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ زنا بالاختیار میں زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں پر کوڑوں کی سزا بھی اعلانیہ طور پر جاری کی گئی ہے اور سنگساری کی سزا بھی۔

رجم کی سزا چنانچہ مشہور صحابی حضرت ماعزؓ کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا حالانکہ وہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری۔ حضرت ماعزؓ کی سنگساری کے ہولناک واقعہ کے بعد حضرت غامدیہؓ کو بھی حضرت ماعزؓ کی طرح سنگسار کیا گیا تھا، حالانکہ حضرت غامدیہؓ کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ساتھ کسی نے جبراً زنا کیا تھا ورنہ انہیں ہرگز سنگسار نہ کیا جاتا بلکہ اس شخص کو سنگسار کیا جاتا جس نے ان سے زنا بالجبر کیا تھا۔ کیونکہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ وہ سزا کی مستحق ہے۔

کوڑوں کی سزا اس کے علاوہ کوڑوں کی سزائیں بھی عہدِ نبوت میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر دی گئی ہیں، حالانکہ عورت پر جبری زنا کی صورت میں کوڑوں کی سزا بھی جاری نہیں کی جاسکتی۔ ذیل میں ایک دو واقعات ایسے ذکر کیے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اختیاری زنا میں مرد و عورت دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔

زنا کا جرم قابلِ راضی نامہ نہیں ہے عن ابی ھریرۃؓ ان رجلین اختصما الی النبیؐ فقال احدھما ان ابنی کان علی ھذا فزنی بامرأتہ فاخبرونی ان علی ابنی الرجم فافتدیت منہ بمائۃ شاۃ وبجاریۃ لی ثم انی سألت اھل العلم فاخبرونی ان علی ابنی جلد مائۃ وانما الرجم علی امرأتہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ تعالیٰ اما غنمك و جاریتك فرد علیك وجلد ابنہ مائۃ وأمر انیس الاسلمیؓ ان یأتی امرأۃ الا

فان اعترفت فارجمها فاعترفت فرجمها۔ (ابو داؤد ج ۲ صلاا) "حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دو آدمی اپنا ایک مقدمہ لے کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اس شخص کے پاس مزدوری کرتا تھا پس اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا، لوگوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے بیٹے کی سزا سنگساری ہے، میں نے اس کے بدلے میں اس شخص کو سو بکریاں اور ایک جاریہ دے دی، پھر میں نے اہلِ علم سے پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے بیٹے کی سزا سو کوڑے ہے اور سنگساری اس شخص کی بیوی کی سزا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس خدا کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں آپ دونوں کے درمیان اللہ کی کتاب کے موافق فیصلہ کروں گا اور وہ یہ ہے کہ تمہاری بکریاں اور جاریہ تمہیں واپس کی جائیں گی اور سزا کے طور پر تیرے بیٹے کو سو درّے لگیں گے۔ اور انیس اسلمیؓ کو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ اس کی بیوی کے پاس اور معاملہ کی تحقیق کرو، اگر اس نے زنا کا اقرار کر لیا تو اس کو رجم کرو، چنانچہ اس نے اعترافِ جرم کر لیا اور رجم کی سزا اس پر جاری کی گئی۔

اس حدیث میں زنا کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جبری زنا کا واقعہ تھا کیونکہ یہ گھر کے ایک مزدور کا گھر کی مالکہ کے ساتھ زنا کا واقعہ ہے اور اس میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس مزدور کی کیا مجال تھی کہ وہ گھر کی مالکہ کے ساتھ جبراً زنا کرے۔ اس کے علاوہ اگر یہ زنا جبری ہوتا تو عورت پر رجم اور سنگساری کی سزا جاری نہ کی جاتی، کیونکہ جبری زنا میں عورت سرے سے مجرم ہی نہیں تو اس پر سزا جاری کرنے کے کیا معنیٰ؟ اور سزا بھی وہ جو سخت ترین سزا ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت باوجود مجبور ہونے کے سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کی جائے اور مرد باوجود مجرم ہونے کے کوڑوں کی سزا کا مستحق گردانا جائے حاشا وکلا۔

تو معلوم ہوا کہ یہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جرم زنا اسلامی شریعت میں قابلِ راضی نامہ نہیں ہے، ورنہ اگر یہ جرم قابلِ راضی نامہ ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ میں متاثرہ فریقین میں ہونے والے راضی نامہ کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر فسخ نہ فرماتے اور اس کے ہوتے ہوئے زانیہ عورت اور زانی مرد پر سزا جاری نہ فرماتے۔

ایک اور واقعہ عن ابن عمرؓ انہ قال ان الیھود جاء والی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم فذکروالہ ان رجلاً منہم وامرأۃ زنیا فقال لہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما تجدون فی التوراۃ فی شان الزنا فقالوا نفضحہم ویجلدون فقال عبد اللہ بن سلامؓ کذبتم ان فیہا الرجم فأتوا بالتوراۃ فنشروھا فجعل احدھم یدہ علی اٰیۃ الرجم ثم جعل یقرأ ما قبلہا وما بعدھا۔ فقال لہ عبد اللہ ابن سلام ارفع یدک فرفعہا فاذا فیہا اٰیۃ الرجم فقالوا صدق یا محمد فیہا اٰیۃ الرجم فامر بہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرجما۔ قال عبد اللہ بن عمرؓ فرأیت الرجل یحنی علی امرأۃ یقیہا الحجارۃ انتہی (سنن ابی داؤد جلد ۲ ص۲۵۶)

(ترجمہ) "حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر یہ واقعہ بیان کیا کہ ہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ زنا کے بارے میں تمہاری تورات میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم زنا کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور ان پر کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں، عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو، تورات میں تو زنا کی سزا رجم ہے، انہوں نے تورات کو لا کر کھولا تو ان میں سے ہی ایک شخص نے آیتِ رجم پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنا شروع کر دیں تو عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ اس نے جب ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیتِ رجم موجود تھی، اس پر انہوں نے کہا کہ عبد اللہ واقعی تم سچے ہو تورات میں آیتِ رجم موجود ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (زانی اور مزنیہ) کے بارہ میں رجم کا حکم فرمایا اور وہ دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ وہ مرد عورت پر جھکتے ہوئے پتھروں سے اس کو بچا رہا تھا۔"

اس حدیث میں یہودیوں کے جس سنگسار شدہ مرد اور عورت کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی باہمی محبت کا یہ عالم تھا کہ عین سنگساری کے دوران بھی زانی مرد زانیہ عورت پر جھک کر آخر دم تک پتھروں سے اُسے بچانے کی کوشش کرتا رہا، کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ خیال تک دل میں لا سکتا ہے کہ یہاں مرد نے عورت کے ساتھ جو زنا کیا تھا وہ اختیاری نہیں بلکہ زنا بالجبر تھا؟ حالانکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں اصلاً مجرم نہیں نہ وہ سزا کی مستحق ہے، پھر اس پر سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کر کے یہ دوہرا ظلم کیوں کیا گیا؟

زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے

ذیل میں ہم ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ زنا بالجبر کی

صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر زنا کی حد جاری کی جاسکتی ہے۔

عن وائل ابن حجر قال استکرهت امرأة علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدرأ عنها الحد واقامه علی الذی اصابها۔ (جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰة ج ۲ ص ـــــ)

(ترجمہ) "وائل ابن حجرؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت سے جبراً زنا کیا گیا تو آپؐ نے عورت سے حد ساقط کر کے اسے معاف فرما دیا اور زنا کرنے والے مرد پر حد قائم کر دی۔"

وعنه ان امرأة خرجت علی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم تریدالصلوٰة فتلقاها رجل فتجللها فقضی حاجته منها فصاحت وانطلق ومرت عصابة من المهاجرین فقالت ان ذٰلك رجل فعل بی كذا وكذا فاخذوا الرجل فاتوا به رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لها اذهبی فقد غفراللہ لك وقال للرجل الذی وقع علیها ارجموه۔

(جامع الترمذی بحوالہ المشکوٰة ج ۲ ص ۳۱۲،۳۱۱)

(ترجمہ) یہ بھی وائل ابن حجرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت گھر سے نماز کے ارادہ سے نکلی، راستہ میں اسے ایک شخص ملا جس نے اسے پکڑ کر زبردستی اس سے زنا کیا، اس پر عورت نے شور مچانا شروع کر دیا جس سے گھبرا کر زنا کرنے والا شخص بھاگ گیا، اتنے میں مہاجرین کی ایک جماعت پہنچ گئی، عورت نے انہیں بتایا کہ فلاں آدمی نے مجھ سے جبراً زنا کیا ہے، انہوں نے اس آدمی کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا (اور عورت بھی اس کے ہمراہ تھی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تجھے معاف کیا ہے اور زانی مرد کے بارے میں رجم کا حکم فرمایا۔ (چنانچہ وہ آپؐ کے حکم سے رجم کر دیا گیا)۔"

اس حدیث کو اوپر والی روایتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو مجموعہ روایات حدیثیہ اور نصوص قرآنیہ سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت اسلامی قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر قانونی سزا جاری کی جاسکتی ہے، دوسری یہ کہ قرآن وحدیث میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زنا کے واقعات میں جن لوگوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر واقعات زنا اختیاری سے متعلق تھے نہ کہ زنا بالجبر سے متعلق، ورنہ پھر عورت پر مرد کی طرح ہرگز یہ قانونی سزائیں جاری نہ کی جاتیں ـــــ بہرحال قرآن وحدیث کی رُو سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی

مخفی نہیں ہے کہ اسلامی شریعت نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں مقرر کر رکھی ہیں، ان میں زنا بالاختیار اور زنا بالجبر میں کوئی فرق تسلیم نہیں کیا گیا ہے، نہ ہی اسلامی شریعت نے ان قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کیا ہے، بلکہ زنا کی یہ دونوں قسمیں اسلام کی نظر میں یکساں جرم ہیں اور مرتکب جرم سزا کا مستوجب ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ یہ اسلام کی قانونی سزائیں دراصل زنا بالرضا ہی کے لیے مقرر کی گئی ہیں، کیونکہ ان قانونی سزاؤں سے اصل مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کثرت زنا سے محفوظ رہے۔ اور ظاہر ہے کہ معاشرے میں جو زنا کثیر الوقوع ہے یا ہو سکتا ہے وہ زنا بالجبر نہیں وہ زنا بالرضاء ہے اور اسی کے انسداد کے لیے اسلام نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں۔ تو اگر اس (زنا بالرضاء) کو ان سزاؤں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آجکل کے مغرب سے متاثر بعض مسلم دانشور آخر کس معقول دلیل کی بناء پر زنا بالرضاء کو اسلامی قانون سے مستثنیٰ کر رہے ہیں؟

"کیا اس میں یہ راز پوشیدہ تو نہیں کہ یہ حضرات اپنے اس ملک میں زنا کاری کے کاروبار میں قانون کے ذریعہ سے توسیع کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس ملک میں یورپین تہذیب کی جڑوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر رہے ہیں؟ یا اس ملک میں پہلے سے جو عیاشی و فحاشی کا خطرناک رجحان پایا جاتا ہے اسے یہ حضرات مزید تقویت اور ترقی دینا چاہتے ہیں" (اللّٰھم اھدنا وایاھم صراطك المستقیم، آمین)

(جواب جزء ۲) اب دوسرے سوال کا جواب سن لیجئے۔ یہ بات مسلمات شریعت میں سے ہے اور امت مسلمہ کے ہاں طے شدہ ہے کہ جو حکم قرآن و حدیث میں منصوص طریقہ سے بیان کیا گیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں اس پر اسلامی معاشرے میں عملدرآمد بھی رہا ہو، نیز کتاب و سنت سے اس حکم کا کسی مخصوص زمانے کے لیے ہونا یا کسی جزوی مصلحت پر مبنی ہونا بھی معلوم نہ ہو تو ایسے حکم میں تمام امت اور پوری ملت بھی مل کر قیامت تک ادنیٰ سے ادنیٰ ترمیم اور تغیر و تبدیل نہیں کر سکتی۔ ایسی کوئی بھی ترمیم ایک طرف آسمانی شریعت میں بندوں کی طرف سے ایک تحریف ہے اور دوسری طرف ان کی جانب سے ایک مکمل تشریع ہے اور آسمانی شریعتوں میں امتیں تحریف کی مجاز نہیں ہیں اور نہ مستقل تشریع کا حق رکھتی ہیں مشرکین مکہ نے اس قسم کی ترمیموں اور تبدیلیوں کا مطالبہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے یہ کہا کہ ائت بقرآن غیر ھذا او بدله "ہمیں کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسمیں

ہماری منشاء کے مطابق کوئی تبدیلی کرو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مطالبہ کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہہ ملی: قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (سورة ــــ) (ترجمہ) "ان سے یہ کہہ دو کہ مجھے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے خدا کے اس قانون میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرسکوں، میرا حق صرف اس قانون کی حرف بحرف پابندی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بذریعہ وحی بھیجا جارہا ہے"۔ جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین اور احکام میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں تو دوسرے لوگوں کو ایسی ترمیم اور تبدیلی کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟

قرآن کریم نے اس حقیقت سے بھی پردہ کشائی کی ہے کہ جو لوگ اپنی خود ساختہ قانون سازی کے ذریعہ سے خدائی احکام میں تبدیلی کرتے ہیں پھر لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہمارا بنایا ہوا یہ قانون بھی اسلامی قانون کا حصہ اور مسلمانوں کے لیے قابل عمل ہے، ایسے لوگ خدا کی نظر میں بڑے مبغوض اور عذاب عظیم کے مستحق ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ (بقرہ)

(ترجمہ) "وہ لوگ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے جو اپنے ہاتھوں سے کوئی کتاب (قانون) لکھ لیتے ہیں، پھر لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ بھی خدا کا قانون ہے (ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں) کہ اس سے اپنے لیے دنیا کا قلیل منافع حاصل کریں، یہ لوگ ایسی قانون سازی کی وجہ سے بھی مبتلائے عذاب ہوں گے اور جو منافع ان کو اس سے حاصل ہوگا اس کی وجہ سے بھی ہلاکت نصیب ہوگی۔"

بہرحال قرآن کریم نے متعدد مقامات پر غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ شرعی قوانین اور منصوصی احکام میں پوری نوع انسانی کے افراد مل کر بھی کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں کر نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی نوعیت مستقل تشریع (شریعت سازی) کی ہے اور تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے، البتہ غیر منصوصی مسائل اور معاملات میں ثبوت احکام کیلئے منصوصات شرعیہ سے اجتہاد کے ذریعہ سے احکام اخذ کرکے مستنبط کیے جا سکتے ہیں مگر تشریح کا مجاز کوئی بھی فرد بشر نہیں ہو سکتا ـــــ اور جب یہ ثابت ہوا کہ کوئی بھی فرد بشر شرعی قوانین اور منصوصی احکام میں کوئی تغیر اور ترمیم نہیں کرسکتا تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ زنا جیسے قبیح جرم کی اسلامی شریعت نے جو قانونی سزائیں مقرر کی ہے اُن سے کوئی بھی با اقتدار جماعت یا ادارہ زنا بالاختیار کو

مستثنیٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

(جواب جز ۳) رہا تیسرا سوال کہ حرام قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے بہتر یہی ہے کہ قرآن و حدیث نے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اُسی کو پیش کر دوں، نیز فقہاء اسلام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ایسے لوگوں کے حق میں جو احکام صادر کئے ہیں انہیں کو بیان کر دوں۔

قرآن کریم اور تحلیل حرام | یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور پوری ملّتِ اسلامیہ اس پر متفق ہے کہ کائناتِ عالم کا واحد مالک اور بلاشرکت غیرے حقیقی حاکم اور حکمران صرف اللہ رب العالمین ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خاص ملکیت ہے اور سب کا اصل حاکم وہ ہے۔ جب تمام کائنات کا خالق و مالک وہی ہے تو تمام کا حاکم بھی وہی رہے گا اور تمام کائنات میں حکم اور قانون بھی اُسی کا چلے گا۔ الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین۔ "یہ حقیقت ہے کہ پیدائش بھی خاص اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا، اللہ بڑا بابرکت اور تمام جہانوں کا مالک ہے"۔ ان الحکم الا للہ امر اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِیَّاہُ۔ "حکم نہیں ہے مگر اللہ کے لیے، اُسی نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت و پرستش نہ کرو"۔ وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا۔ "وہ اپنے حکم اور فیصلے میں اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

قانون کی اس بنیادی دفعہ کے تحت اشیاء کی تحریم اور تحلیل دونوں کا حق اور اختیار صرف خالقِ اشیاء کو حاصل ہے مخلوق کو قطعاً اس کا حق حاصل نہیں ہے، اس بارہ میں قرآن کریم کا فیصلہ انتہائی صاف اور واضح ہے۔ اُس نے جس طرح تحریم حلال (خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جاننے کی قطعی ممانعت) ممانعت کر رکھی ہے اور فرمایا ہے کہ: لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ "وہ پاکیزہ چیزیں حرام نہ سمجھو جو خدا نے تمہارے لئے حلال کر رکھی ہیں اور خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو خدا حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اور فرمایا ہے کہ: لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ۔ "کیوں حرام کرتے ہو اپنے اوپر وہ چیزیں جو خدا نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں"۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَھُمْ سَفَھًا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَھُمُ اللّٰہُ افْتِرَآءً عَلَی اللّٰہِ۔ "تحقیق بڑے خسارہ میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے علم کے بغیر حماقت اور نادانی سے اپنی اولاد کو قتل کیا ہے اور

خدانے ان کو جو حلال رزق دیا ہے اُسے خدا پر جھوٹ باندھ کر حرام سمجھ رکھا ہے"۔ بعینہٖ اسی طرح قرآن کریم نے تحلیلِ حرام (خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال جاننے) کی بھی قطعی طور پر ممانعت کر رکھی ہے، ارشادِ ربانی ہے، وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَهٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔ "یعنی مت کہو ان چیزوں کو جنہیں تمہاری زبانیں جھوٹ کے طور پر بیان کرتی ہیں کہ یہ حلال ہیں اور یہ حرام ہیں، اس کا انجام خدا پر جھوٹ باندھنا ہے"۔ لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ شَعَائِرَ اللّٰهِ "اشہرِ حرام اور قربانی کے جانوروں کی ہتک و حرمت کو حلال نہ سمجھو"۔ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَلَا يَدِينُونَ دِيْنَ الْحَقِّ۔ "یہ لوگ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے ہیں اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں"۔

ان آیات میں صریح طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تحریم اور تحلیل کا حق بجز اللہ تعالیٰ کے بالذات کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، یہ حقیقت بھی قرآن کریم سے واضح ہے کہ جو چیزیں آسمانی شریعتوں کی رُو سے قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں، انہیں جب بھی کسی نے حلال سمجھنا شروع کیا آسمانی شریعتوں سے اس کا تعلق بحال نہیں رہا ہے بلکہ منقطع ہو چکا ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں حضرات انبیاء علیہم السلام نے کفر اور عالمِ اسلام کے مابین حدِ فاصل مقرر کی ہے کہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو دل سے حرام سمجھنے اور اس کی حلال کردہ اشیاء کو دل سے حلال جاننے کا مضبوط اعتقاد رکھا جائے، اس اعتقاد کے بغیر کوئی شخص نہ مؤمن سمجھا گیا ہے نہ مسلم ـــــ مثال کے طور پر شرک ہی کو لیجئے، اس کو انسانی تاریخ کے ہر دور میں آسمانی شریعتوں کی رُو سے حُرمتِ قطعی کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جب بھی کسی نے اس کو جائز اور حلال سمجھا ہے تمام آسمانی شریعتوں نے اسے اپنے دائرہ سے خارج تسلیم کیا ہے اور اس کا تعلق ہر آسمانی شریعت سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔

حدیثِ رسولؐ اور تحلیل و تحریم | قرآن کریم کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی تحلیل و تحریم کے بارے میں وہی فیصلہ ملتا ہے جو قرآن کریم نے اس بارے میں کیا ہے۔ یعنی سنتِ رسولؐ کا فیصلہ بھی یہ ہے کہ جس نے خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جانا اس کا اسلامی شریعت سے تعلق بحال نہیں رہے گا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع رہے گا۔

علماء اور مشائخ کے بارے میں اہلِ کتاب کا عقیدہ | قرآن مجید میں یہودی عوام

اور عیسائیوں کے متعلق یہ آیا ہے کہ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا کے سوا اپنے لیے معبود بنا رکھا تھا، ارشاد ربانی ہے اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۃ آیت) جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو اہل کتاب میں سے ایک یہودی عالم "عُدی ابن حاتمؓ" جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! ہم نے تو کسی عالم یا درویش کو خدا نہیں کہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اما کانوا اذا احلوا لهم شیئًا استحلوه واذا حرموا علیهم شیئًا حرموه؟ قال نعم، قال هو ذلك۔ او کما قال (ترمذی) "کیا وہ ایسے نہیں تھے کہ جب ان کے علماء اور مشائخ ان کے لیے کوئی چیز حلال کرتے تو وہ اسے حلال سمجھتے اور جب کوئی چیز ان پر حرام کرتے تو وہ اسے حرام سمجھتے؟ عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسے تو تھے ہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کا شرک تھا"۔

حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتمؓ سے فرمایا کہ خدائی شریعت سے سند حاصل کئے بغیر جب یہود کے علماء اور مشائخ عوام پر کوئی چیز حرام کرتے تو کیا عوام اسے حرام نہیں سمجھتے تھے؟ اسی طرح اگر خدائی شریعت سے دلیل حاصل کئے بغیر کسی چیز کو ان کیلئے حلال کرتے تو یہودی عوام اسے حلال نہیں سمجھتے تھے؟ اس کے جواب میں عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسا تو تھا ہی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو بے سند تحلیل و تحریم تھی جس کی وجہ سے وہ شرک میں مبتلا ہوئے تھے۔

اس حدیث سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ جو بھی شخص یا ادارہ اور جماعت خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھے گا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام سمجھے گا اسلام کے ساتھ اس کا تعلق ختم ہو جائے گا۔

فقہاء اسلام کا فیصلہ قرآن و حدیث کے ان واضح احکامات کی روشنی میں فقہاء اسلام نے بھی اس بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو قرآن و حدیث کے منشاء سے زیادہ قریب ہے۔ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "شرح العقائد" میں لکھا ہے کہ استحلال المعصیة کفر اذا ثبت کونها معصیة بدلیل قطعی "گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ اس کا گناہ ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو"۔ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:۔

وعلی هذا تفرع ما ذکر فی الفتاوٰی من انه اذا اعتقد الحرام حلالًا فان کانت

حرمتہ لعینہ وقد ثبت بدلیل قطعی یکفر والا فلا بان تکون حرمتہ لغیرہ او ثبت بدلیل ظنی۔ وبعضہ لم یفرق بین الحرام لعینہ ولغیرہ وقال من استحل حراماً وقد علم فی دین النبی صلی اللہ علیہ وسلم تحریمہ کنکاح المحارم کافر۔

(بحوالہ شامی ج ۲ ص۳۱۵، ۳۱۶)

(ترجمہ) اسی قاعدے پر وہ مسئلہ مبنی ہے جو کتب فتاویٰ میں ذکر ہے کہ جب کوئی شخص حرام کو حلال جانے تو اگر وہ حرام لذاتہ ہو اور اس کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہو تو یہ شخص کافر ہوگا، اور اگر اس کی حرمت لغیرہ ہو یا وہ دلیل قطعی سے ثابت نہ ہوئی ہو تو کافر نہ ہوگا، اور بعض علماء نے حرام لعینہ اور لغیرہ میں کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ مطلقاً یہ کہا ہے کہ دونوں کا مستحل کافر ہوگا بشرطیکہ دین نبوی میں اس کی حرمت کا ثبوت معلوم ہو جیسے نکاح محارم۔"

علامہ ابن عابدینؒ نے مندرجہ بالا دونوں مذاہب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

وحاصلہ ان مشروط الکفر علی القول الاول شیئان قطعیۃ الدلیل وکونہ حراماً لعینہ وعلی الثانی یشترط الشرط الاول فقط وقد علمت ترجیحہ۔ اھ

(ترجمہ) "اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ کفر کی شرط بنا بر قول اوّل دو چیزیں ہیں۔ ایک دلیل کا قطعی ہونا اور دوسرے اس کا حرام لعینہ ہونا۔ اور بنا بر قول ثانی کفر کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ حرمت کی دلیل قطعی ہو اور بس اس قول کا راجح ہونا معلوم ہے۔"

اسی کے قریب قریب وہ مضمون ہے جو تفتازانیؒ نے "شرح العقائد العضدیہ" میں ذکر کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

واستحلال المحرمات کفر ولا بد من التقیید بکون تحریمہ مجمعاً علیہ دون تکون حرمتہ من ضروریات الدین وبدون القید الثانی ان کان الاجماع مستنداً الی الظن لا یثبت ایضاً وکذا ان کان مستنداً الی دلیل قطعی ولم یکن مشتہراً بحیث یکون من ضروریات الدین۔

(شرح العقائد العضدیۃ ص۱۰۵)

(ترجمہ) "محرمات کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ ان کی حرمت اتفاقی ہو، نیز ان کی حرمت ضروریات دین میں سے ہو، اور اگر ان کی حرمت اتفاقی نہ ہو بلکہ اختلافی ہو تو کفر ثابت اصلاً نہ ہوگا اور اگر ان کی

حرمت ضروریاتِ دین میں سے نہ ہو مگر اتفاقی ہو تو اگر یہ اجماع مبنی بر ظن ہو تو پھر بھی کفر ثابت نہ ہوگا، اسی طرح اگر وہ مبنی بر دلیل قطعی ہو مگر دین میں اس کی حرمت اس قدر مشہور نہ ہو چکی ہو کہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتے کے قابل ہو تو اس وقت بھی کفر ثابت نہ ہوگا۔

مندرجہ بالا تصریحات کا ماحصل فقہاء اسلام کی مذکورہ بالا تصریحات سے جو امور بطور ماحصل ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) کسی چیز کی حرمت اگر قطعی ہو اور لذاتہ بھی ہو، نیز دینِ نبوی میں اس کی حرمت اس قدر مشہور ہوئی ہو کہ وہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتی ہو، تو ایسی حرام چیز کو حلال سمجھنا بالاجماع کفر ہے اور کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

(۲) لیکن اگر اس کی حرمت قطعی تو ہو مگر لذاتہ نہ ہو یا لذاتہ بھی ہو مگر ضروریاتِ دین میں سے نہ ہو تو ایسی چیز کو حلال سمجھنے والے آدمی کا کفر مختلف فیہ ہے، جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کا قطعی ہونا فقط کافی ہے، لذاتہ ہونا اور ضروریاتِ دین میں سے ہونا ان کے نزدیک شرط نہیں ہے ان کے نزدیک تو کافر ہے کیونکہ حرمت کی قطعیت دونوں صورتوں میں موجود ہے۔ اور جن کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کی قطعیت اور اس کا لذاتہ ہونا دونوں ضروری ہیں، ان کے نزدیک پہلی صورت میں کفر نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف حرمت کی قطعیت ہے، اور لذاتہ حرمت نہیں ہے، اور دوسری صورت میں کفر ہے کیونکہ اس میں حرمتِ قطعیہ کے ساتھ اس کا لذاتہ ہونا بھی موجود ہے، اور جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے یہ ضروری ہے کہ حرمت مشہور اور ضروریاتِ دین میں سے ہو ان کے نزدیک ۲ میں کفر اصلاً نہیں ہے کیونکہ یہ حرمت ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہے۔

فقہاء کی ان تصریحات کی روشنی میں جب ہم زنا کی حرمت پر غور کرتے ہیں تو وہ حرمتِ قطعی بھی ہے اور لذاتہ بھی اور اس قدر مشہور بھی ہو چکی ہے کہ ضروریاتِ دین میں شمار ہو چکی ہے لہٰذا اس کو حلال سمجھنا بالاجماع موجب کفر ہوگا —— اس اجماعی فیصلہ کے تحت آپ خود غور فرمائیں کہ جو لوگ محرماتِ شرعیہ کو حلال سمجھ رہے ہیں قرآن و حدیث اور فقہاء اسلام کے ان واضح فیصلوں کی روشنی میں ان کا انجام کیا ہوگا؟

ہم اور تکفیر لیکن ہم بذاتِ خود کسی شخص یا ادارہ پر کفر کا فتویٰ دینے سے اس بناء پر معذور اور قاصر ہیں کہ فتویٰ تکفیر کے لیے ضروری ہے کہ مفتی کو اس بات کے متعلق یقینی علم

حاصل ہو کہ جس شخص یا ادارہ پر وہ کفر کا فتویٰ دے رہا ہے اس کے دل میں قطعیات اور ضروریات دین سے قطعی طور پر انکار پایا جاتا ہے اور یہ علم ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے اور نہ حاصل ہو سکتا ہے، اس کے بغیر کفر کا فتویٰ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ان ممبران اسمبلی کے حق میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ان کو راہ راست اور راہ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جنہوں نے زنا بالاختیار کو شرعی سزاؤں سے مستثنیٰ قرار دینے کا غلط اقدام کیا ہے، اور ان سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ خدارا اپنے اس فیصلہ پر جلد از جلد نظر ثانی فرما کر خدا و رسول ؐ کی ناراضگی اور دنیا و آخرت کی رسوائی کا خطرہ مول نہ لیں۔ امید ہے جملہ ممبران اسمبلی ہماری اس اپیل کو صدا بصحرا ثابت نہ ہونے دیں گے۔ اَللّٰھُمَّ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۔ (آمین)

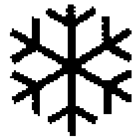
قرائن اور شہرت کی وجہ سے عدالت کا کسی کو سزا دینا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام ذیل کے مسئلہ کے بارے میں کہ یہاں ہمارے گاؤں میں ایک پندرہ سالہ لڑکے نے ایک شخص پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اسلحہ کی نوک پر زبردستی میرے ساتھ بدفعلی کی ہے، لڑکے نے اس واقعہ کی تھانہ میں رپورٹ بھی درج کرائی ہے اور معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، ملزم اس فعلِ بد سے انکاری ہے جبکہ لڑکے کے پاس اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ بھی نہیں البتہ میڈیکل رپورٹ لڑکے کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے اور مذکورہ شخص اس عملِ بد کی وجہ سے مشہور و معروف اور کافی بدنام ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عدالت اس شخص کو اس فعلِ بد میں شہرت اور میڈیکل رپورٹ کی بناء پر سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی جرم کے اثبات کے لیے محض دعویٰ کرنا کافی نہیں جب تک شریعت کے مطابق شہادت موجود نہ ہو، البتہ قرائن اور شہرت کی وجہ سے جب قاضی (جج) کو اس شخص کے متہم بالفعل ہونے کا یقین ہو جائے تو پھر محض سیاسۃً سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر میڈیکل رپورٹ اور اس فعلِ بد میں مذکورہ شخص کی شہرت کے بارے میں عدالت کو اطمینان ہو جائے کہ اس نے مدعی کے ساتھ بدفعلی کی ہے تو عدالت اسے تعزیراً سزا دے سکتی ہے، اور اس قسم کے واقعات میں عدالت اطمینان کر لینے کے بعد مجرم کو سیاسۃً

سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ومن یتہم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس احبسہ واخلدہ فی السجن حتی یتوب لأن شر ہذا علی الناس وشر الاول علی النفس۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۶۷ کتاب الحدود باب التعزیر مطلب فی تعزیر المتہم) [1]



---

[1] لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ: (الجواب) محض عورت کے کہنے سے مرد پر بواسطہ تعزیر نہیں ہو سکتی بلکہ اگر قاضی کی رائے میں قرائن اخر سے وہ متہم کے درجہ میں ہو جائے تو تعزیراً کچھ سزا دی جا سکتی ہے، مگر قاضی آجکل کہاں؟ البتہ بعض قوموں میں پنچایت کا زور ہوتا ہے، تو پنچایت اس بارہ میں بمنزلہ قاضی کے ہے اگر وہ مسائل شرعیہ سے باخبر ہوں یا کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرتے ہوں۔ واللہ اعلم
(امداد الاحکام ج۳ ص۱۲۸ کتاب الحدود)


كتاب
الاشربة

كل مسكر خمر
وكل مسكر حرام

کتاب الاشربۃ

(اشربہ (نشہ آور اشیاء) کے احکام ومسائل)

نسوار کی شکل میں تمباکو کے استعمال کا حکم

سوال:۔ نسوار کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نسوار چونکہ تمباکو سے ہی بنتی ہے لہٰذا اس کا استعمال تمباکو کی طرح فی نفسہٖ مباح اور جائز ہے کیونکہ اس میں نہ نشہ ہے اور نہ مستی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: فانہ لم یثبت اسکارہ ولا تفتیرہ ولا اضرارہ بل ثبت لہٗ منافع فھو داخل تحت قاعدۃ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ وان فرض اضرارہ للبعض لایلزم منہ تحریمہ علی کل واحد۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۶ کتاب الاشربۃ)

البتہ نسوار کی بدبو کی وجہ سے مسجد میں نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے نیز اس میں اسراف اور تبذیر کے علاوہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی مضرِ صحت ہے اس لیے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اذا شرب الماء وغیرہ من المباحات بلھوٍ وطرب علی ھیئۃ الفسقۃ حرامٌ۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاشربۃ)[1]

گنے کے رس سے کشید کی گئی شراب حرام ہے

سوال:۔ جو شراب گنے کے رس سے بنائی گئی ہو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

---

[1] قال الشیخ محمد الکامل الطرابلسیؒ: وقد حقق المتاخرون من اھل مذھبنا الحنفیۃ انہٗ لیس بحرامٍ وانما فی تعاطیہ الکراھیۃ وقد قدمنا ان احسن ماقیل فیہ قول الامیر رحمہ اللہ فاختلف فیہ الدخان والورع ترکہ۔

{الفتاوی الکاملیۃ ص۲۸۶ کتاب الحظر والاباحۃ مطلب فی حکم شرب الدخان فی مجلس قراءۃ القرآن}

الجواب:۔ انگور اور کھجور سے بنائی گئی شراب تو بالاتفاق حرام ہے، ان دو چیزوں کے علاوہ جن اشیاء سے شراب بنائی جاتی ہے تو ایسی شراب امام محمد رحمہ اللہ کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق حرام ہے کیونکہ یہ نشہ آور شراب ہے، ظاہر حدیث سے ہر مسکر شراب کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔

لما اخرجه الامام مسلمؒ: کل مسکر حرام۔ (الصحیح المسلم ج۲ ص۱۶۷ باب بیان ان کل مسکر حرام)

قال العلامة الحصکفیؒ: والکل حرام عند محمدؒ وبه یفتی۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاشربة)[1]

اضطراری حالت میں افیون کا استعمال جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص افیون کھانے کا عادی ہے حتیٰ کہ زندگی افیون کھانے میں گذر گئی، اب بوڑھا ہو گیا ہے، ایسے آدمی کا افیون کھانا اور اس کو کھلانا یا اس بارے میں اس سے تعاون کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص افیون کھانے کا ایسا عادی ہے کہ افیون چھڑانے کی صورت میں اس کی موت واقع ہونے کا خدشہ ہو تو افیون کھانا اس کے لیے جائز ہے اور اس کی اعانت کرنا بھی جائز ہے، اور اگر ایسی حالت نہیں تو کھانا اور کھلانا دونوں طرح ناجائز ہے بشرطیکہ ایسا شخص تدریجاً افیون چھوڑنے کی کوشش اپنے اوپر لازم کرلے ورنہ سخت گنہگار ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: سئل ابن حجر عن من ابتلی باکل نحو الافیون وصار ان لم یاکل منه هلک اجاب ان علم ذٰلک قطعاً حل له بل وجب لاضطراره الی ابقاء روحه کالمیتة للمضطر ویجب علیه التدریج فی تنقیصه شیئاً فشیئاً۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۰۸ کتاب الاشربة)[2]

---

[1] قال العلامة الزیلعی رحمہ اللہ: کل شراب اسکر فهو حرام۔ رواہ البخاری (تبیین الحقائق ج۶ ص۴۷ کتاب الاشربة)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۹۸ کتاب الاشربة۔

[2] قال العلامة الجصاص الرازیؒ: فاقتضی ذٰلک وجود الاباحة بوجود الضرورة فی کل حال وجدت الضرورة فیها۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۲۶ باب ذکر الضرورة المبیحة لاکل المیتة)

الکحل ملی خوشبو کے استعمال کا حکم

سوال :- یورپی ممالک سے درآمد شدہ خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل شامل ہوتی ہے، تو کیا بدن اور کپڑوں پر ان کی اسپرے کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایسی حالت میں نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب :- جن خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل ملی ہوتی ہے اگر یہ الکحل انگور یا کھجور کی ہو تو بالاتفاق ایسی خوشبو کا استعمال ناجائز ہے کیونکہ خوشبو میں الکحل کا استعمال بلا ضرورت ہے اور بلا عذر شرعی شراب کا استعمال خواہ کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ : وحرم الانتفاع بہا ولو لسقی دواب او لطین او نظر للتلہی او فی دواء او دھن او طعام او غیر ذلک۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۵ ص۲۸۹ کتاب الاشربة)

اگر یہ الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ کسی اور چیز سے بنی ہو تو امام محمدؒ کے نزدیک یہ بھی حرام ہے، اگرچہ متقدمین علماء نے امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے لیکن متاخرین محققین نے عموم بلوی کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ کے قول کو توسع کی خاطر قابلِ عمل قرار دیا ہے کہ انگور اور کھجور کے علاوہ دوسرے الکحل ملے پرفیومز کا استعمال حرام نہیں۔

قال العلامة محمد تقی العثمانی : ان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویة والعطور وغیرھا لاتتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغیرہ کما ذکرنا فی باب بیع الخمر من کتاب البیوع وحینئذٍ ھنالک فسحة فی الأخذ بقول ابی حنیفةؒ عند عموم البلوی۔

{ تکملة فتح الملہم ج ۳ ص۶۰۸ کتاب الاشربة حکم الکحول المسکرة }

تاہم اگر استعمال نہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

منشیات ہر قسم کی ممنوع ہیں

سوال :- ایک شخص افیون، بھنگ، چرس کے استعمال کا عادی ہے اور ان اشیاء کے استعمال سے اس شخص پر

کوئی برا اثر مرتب نہیں ہوتا، اگر یہ شخص ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور ترک نہ کرے تو کیا شرعاً اس کے لیے گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویحرم اکل البنج والحشیشة والافیون لانه مفسد للعقل ویصد عن ذکر الله وعن الصلوٰة۔ (رد المحتار ج ۵ ص۲۹۴ کتاب الاشربة)

لہٰذا ان کا استعمال حرام ہے، ان مضر اشیاء کے استعمال کی اجازت نہ عادی کو ہے نہ غیر عادی کو، بلکہ عادی پر واجب ہے کہ ان کے استعمال میں آہستہ آہستہ کمی کرتا جائے تاکہ ایک وقت آئے اور جان چھوٹ جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویجب علیه التدریج فی تنقیصه شیئاً فشیئاً۔ (رد المحتار ج ۵ ص۴۰۸ کتاب الاشربة)[1]

نیگونہ پودے کی جڑوں کے شربت کی تحقیق

سوال:۔ فیجی آئر لینڈ میں نیگونہ (NAGONA) نامی ایک پودا پایا جاتا ہے جس کی جڑیں خشک کرکے اس میں پانی ملا کر لوگ پیتے ہیں جس سے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں: ۱ پینے کے بعد آدمی خاموش رہتا ہے ۲ زیادہ استعمال کرنے سے جوان بوڑھا نظر آتا ہے ۳ زیادہ استعمال سے جسم پر سفید لکیریں نکل آتی ہیں۔ ۴ ہاتھ سخت اور بدن خشک ہو جاتا ہے ۵ بدن میں سستی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۶ اکثر ممالک میں اس کو نشہ آور سمجھ کر اس کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس پودے کے استعمال کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ سوال میں ذکر کردہ مضر اثرات کی وجہ سے نیگونہ (NAGONA) پودے کی جڑوں کا شربت استعمال کرنا ناجائز ہے، اس لیے کہ بدن پر اس کے بُرے اثرات پڑتے ہیں جبکہ یہ نشہ آور بھی ہے، شریعتِ مقدسہ نے کسی بھی مضر صحت و بدن چیز کے استعمال سے

---

[1] قال العلامة ابوبکر بن الحدادی الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشة والافیون وذٰلک کله حرام۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص۲۷ کتاب الاشربة)

ومثله فی فتاویٰ الکاملیة ص۲۷ کتاب الاشربة۔

منع کیا ہے، جیسے زہر میں نشہ تو نہیں مگر پاک ہے لیکن اس کا استعمال حرام ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کالسم القاتل فانہ حرام مع انہ طاھر۔

(رد المحتار ج ۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربۃ)

اور اس پودے (زنگوزہ) میں تو نشہ بھی ہے لہٰذا اس کا استعمال حرام ہے، اگرچہ اس پودے کا ذکر فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وھکذا یقال فی غیرہ من الاشیاء الجامدۃ المضرۃ فی العقل اوغیرہ یحرم تناول القدر المضر دون القلیل۔ اگر نشہ آور کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔ وقال محمدؒ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرامٌ۔

(رد المحتار ج ۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربۃ)[1]

بطور دوائی شراب کے استعمال کا حکم

سوال:۔ ایک قریب المرگ مریض جس پر ہر قسم کا علاج آزمایا گیا لیکن کارگر نہ ہوا، اس کے لیے ڈاکٹر نے آخری علاج کے طور پر شراب تجویز کی ہے، کیا ایسے مریض کے لیے بقدر ضرورت شراب پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی مسلمان ڈاکٹر کو تجربات سے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ شراب سے مریض کو شفاء مل جائے گی تو ضرورتاً اس کا پینا جائز ہے بشرطیکہ شراب کے علاوہ دوسری دوا نہ ہو اسلئے کہ حالتِ اضطرار میں حرام چیز کا استعمال بقدر ضرورت جائز ہے۔

لما فی الھندیۃ: ولو ان مریضاً اشار الیہ الطبیب بشرب الخمر روی عن جماعۃ ائمۃ بلخ انہ ینظر ان کان یعلم یقیناً انہ یصح حل لہ التناول۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)[2]

---

[1] قال العلامۃ الزیلعیؒ: وعن ابن عمر انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قال ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ (تبیین الحقائق ج ۶ ص۴۷ کتاب الاشربۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربۃ

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: انہ یحرم شرب قلیلھا وکثیرھا الا عند الضرورۃ۔

(بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۱۲ کتاب الاشربۃ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۴ ص۲۱۵ کتاب الاشربۃ۔

بطورِ دوا شراب کے خارجی استعمال کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی قوتِ سامعہ خراب ہے، ڈاکٹروں نے بطورِ علاج شراب کے چند قطرے خارجی طور پر استعمال کرنے کی تجویز دی ہے، کیا یہ طریقہ علاج شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ متقدمین فقہاء کے نزدیک شراب کا داخلی و خارجی استعمال اور اس سے نفع لینا حرام ہے۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: ویکرہ الاحتقان بالخمر واقطارھا فی الاحلیل لانہ الانتفاع بالمحرم۔ (الھدایۃ ج۴ ص۵۰۰ کتاب الاشربۃ)

لیکن متاخرین نے جب بطورِ تداوی کے شراب کے داخلی استعمال کی اجازت دی ہے تو خارجی استعمال کے مرخص ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لما فی الھندیۃ: یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتۃ للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح ما یقوم مقامہ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات) [1]

الکحل ملی ادویات کے استعمال کا حکم

سوال:۔ جن دوائیوں میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے اُن کا استعمال ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ انگریزی ادویات کے استعمال کے بارے میں متاخرین فقہاء کرام کا قول یہ ہے کہ اگر ان ادویات میں شراب یا کسی اور حرام شئے کا اختلاط یقینی یا ظنِ غالب کے طور پر معلوم ہو تو ان کا استعمال شرعاً جائز ہے جبکہ اس میں شفاء کا امکان ہو، اگر ان دوائیوں میں الکحل کا صرف احتمال (شک) ہو تو پھر ایسی دوائیوں کے استعمال کرنے میں مزید گنجائش نکلتی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: ففی النہایۃ عن الذخیرۃ یجوز ان

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: اما اذا علم ولیس لہ دواء غیرہ یجوز
(رد المحتار ج۵ ص۲۱۵ باب المتفرقات، مطلب فی التداوی)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربۃ۔

علم فیہ شفاء ولم یعلم دواء آخر (رد المحتار ج۱ ص۲۱۰ مطلب فی التداوی فی المحرم) ¹

افیون بطور دوائی استعمال کرنے کا حکم

سوال:۔ بطور دوائی افیون کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح دیگر حرام اشیاء کا بوقت ضرورت بطور دوائی استعمال جائز ہے اسی طرح افیون کا استعمال بھی دوائی کے طور پر جائز ہے بشرطیکہ حد سکر کو نہ پہنچے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: من غاب عقلہ بالبنج والافیون یقع طلاقہ اذا استعملہ للھو وادخال الآفات قصداً لکونہ معصیۃ وان کان للتداوی فلا لعدمھا کذا فی فتح القدیر وھو صریح فی حرمۃ البنج والافیون لاللدواء۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۴ کتاب الاشربۃ) ²

سیون اپ اور کوکا کولا پینے کا حکم

سوال:۔ سیون اپ اور کوکا کولا مشروبات کے بارے میں سنا ہے کہ ان میں الکحل ملا ہوتا ہے، اس لحاظ سے ان مشروبات کا پینا جائز ہے یا نہیں

الجواب:۔ سیون اپ اور کوکا کولا کے بارے میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ان میں الکحل کی ملاوٹ نہیں ہوتی، صرف شک کی بناء پر یہ بات کی گئی ہے، ایسے شک سے کسی چیز کی حرمت ثابت نہیں ہوتی، البتہ محض شک کی بناء پر اگر کوئی احتیاطاً مذکورہ مشروبات نہ پیئے تو ٹھیک ہے لیکن ان کا پینا حرام نہیں۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز: وھذا بناء علی ان الشک یورث الاحتیاط دون الحرمۃ لان الیقین لایزول بالشک۔ (شرح المجلۃ الاحکام، المادۃ ۴ ص۲۰) ³

---

¹ و ² لما فی الھندیۃ: یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتۃ للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح مایقوم مقامہ۔ (الفتاوی الھندیہ ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربۃ۔

³ قال العلامۃ الشیخ الزرقاء: ومعناھا ان ماکان ثابتاً متیقناً لا یرتفع بمجرد طروء الشک علیہ لان الامر الیقینی لا یعقل ان یزیلہ ماھو اضعف منہ بل ما کان مثلہ او اقوی۔ (شرح القواعد الفقہیہ ص۳۷ القاعدۃ الثالثۃ الیقین لایزول بالشک)

فتاوٰی رشیدیہ کی ایک عبارت پر پیدا ہونے والے سوال کا جواب

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے فتاوٰی رشیدیہ میں حقہ کشی کو مباح قرار دیا ہے۔ تو کیا ان کے اس قول کا فقہ حنفی میں کچھ ثبوت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو حدیث شریف کے ان الفاظ کل دخان حرام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

الجواب:۔ ذوی العقول اہلِ اسلام پر مخفی نہ ہو کہ حقہ کشی کا حدوث سن ایک ہزار ہجری (سنہ ۱۰۰۰ھ) کے بعد ہوا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک علماء مذاہب اربعہ کے اس کے بارے میں نظریات رہے ہیں، بعض نے حرمت کا حکم دیا ہے بعض کراہتِ تحریمیہ کی طرف مائل ہیں اور بعض دوسرے کراہتِ تنزیہیہ کے قائل ہیں اور بعض نے اباحتِ مطلقہ کا حکم لگایا ہے۔

اس مسئلہ کی پوری وضاحت عبارات مع مالہا و ما علیہا کو حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے اپنے ایک رسالہ "ترویح الجنان بتشریح حکم شرب الدخان" میں کی ہے مزید معلومات کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری اور انتہائی مفید ہے اور پوری تشفی کی امید اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ پھر بھی آپ کے سوال کے حوالے سے یہاں چند ضروری باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے:۔

علامہ شامی رحمہ اللہ اس کے بارہ میں لکھتے ہیں: اضطربت آراء العلماء فیہ فبعضہم قال بکراھتہ وبعضہم قال بحرمتہ وبعضہم باباحتہ وافردوہ بالتالیف وفی شرح الوھبانیۃ الشرنبلالیؒ ــــہ

ویمنع من بیع الدخان وشربہ
وشاربہ فی الصوم لا شک یفطر

وللعلامۃ الشیخ علی الاجھوری رسالۃ نقل فیھا انہ افتی بحلہ من یعتمد علیہ من ائمۃ المذاھب الاربعۃ قلت والف فی حلہ سیدنا العارف عبد الغنی النابلسی الحنفیؒ رسالۃ سمیھا الصلح بین الاخوان فی اباحۃ شرب الدخان واقامۃ الطامۃ الکبرٰی علی القائل بالحرمۃ او بالکراھۃ فانھما حکمان

شرعیان لا بد لہما للبعض لا یلزم منہ تحریمہ علی کل احد۔ انتہی۔ یہ تمام عبارات "شامی ج۵ کتاب الاشربۃ" میں موجود ہیں۔

اور عبد الغنی نابلسیؒ "حدیقۃ ندیہ شرح طریقہ محمدیہ" میں لکھتے ہیں، من البدع العادیۃ استعمال التتن والقہوۃ۔ انتہی

اور شیخ عبد الخالق زجاجی زبیدی حنفیؒ اپنے بعض فتاوٰی میں لکھتے ہیں، قد تکلم العلماء المتاخرون فی ذٰلک لانہ لم یکن فی القرون السابقۃ فمن مفرط فی ذمہ حتی جزم بالحرمۃ ومن مفرط فی مدحہ ومنہم من توسط وقال انہ مکروہ تحریما وھٰذا عندی احسن الاقوال واعدلہا اذ لا قاطع بتحریمہ ولیس کل موذ ومنتن حراما والا لکان اکل الثوم والبصل والفجل والکراث حراما ھٰذا کلہ فی شرب دخانہ واما اکلہ وشمہ فہو مکروہ تنزیہا عندی لانہا دون شرب دخانہ۔ انتہی ملخصاً۔

(یہ عبارات مجموعۃ الفتاوٰی ج۲ ص۹۶ سے نقل کی گئی ہیں)

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ علماء کے اس اختلاف کا منشا کیا ہے؟ تو ہمارے نزدیک اس اختلاف کا منشا وہی ہے جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ حقہ قریب تین سو برس ہوئے کہ کفار نے نکالا ہے، پھر سب لوگوں میں شائع ہوا، اور اصل میں یہ ایک دوا ہے، بعض امراض کو نافع بھی ہے اور کثرت اس کی مضر ہے جیسا کہ کتب طب سے معلوم ہوتا ہے۔ اب پینے والوں کی مختلف غرضیں ہیں، مختلف مزاج ہیں، مختلف طور ہیں اور مختلف خیال اور مختلف عادتیں ہیں۔ کوئی مرض کے لیے پیتا ہے، کوئی شوقیہ پیتا ہے، کسی کو کچھ نافع ہے کسی کو مضر ہے، کوئی پی کر منہ صاف کرتا ہے، کوئی سڑا لیتا ہے، کوئی احتیاط سے پیتا ہے، کوئی بے احتیاطی سے، کوئی برا سمجھ کر پیتا ہے، کوئی اچھا جان کر پیتا ہے، یہاں تک کہ بعض روزہ میں پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ نہیں ٹوٹتا، کوئی بہت کثرت سے پیتا ہے، کوئی کبھی کبھی پی لیتا ہے، بعض کو اگر ایک گھنٹہ نہ ملے بے چین ہو جاتے ہیں، بعض کو کئی کئی روز تک خیال نہیں ہوتا۔ پھر تمباکو میں بھی بعض اقسام بہت تیز اور مضر ہیں، بعض کم درجے میں ہیں، کسی میں بو زیادہ ہے کسی میں کم ہے، کسی میں نوبت نشہ یا فتور کی ہے کسی میں نہیں، کوئی ایسی چیز کے ساتھ مرکب ہے جس سے اس کی خباثت کم ہو جاتی ہے کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح حقہ اور نیچہ میں بھی، بعض نیچہ کے کپڑے پاک ہوتے ہیں کسی کے ناپاک، اور کسی کے مشتبہ، کوئی پیچوان ہے اس میں اثر قلیل آتا ہے، کسی میں زیادہ آتا ہے۔ کوئی

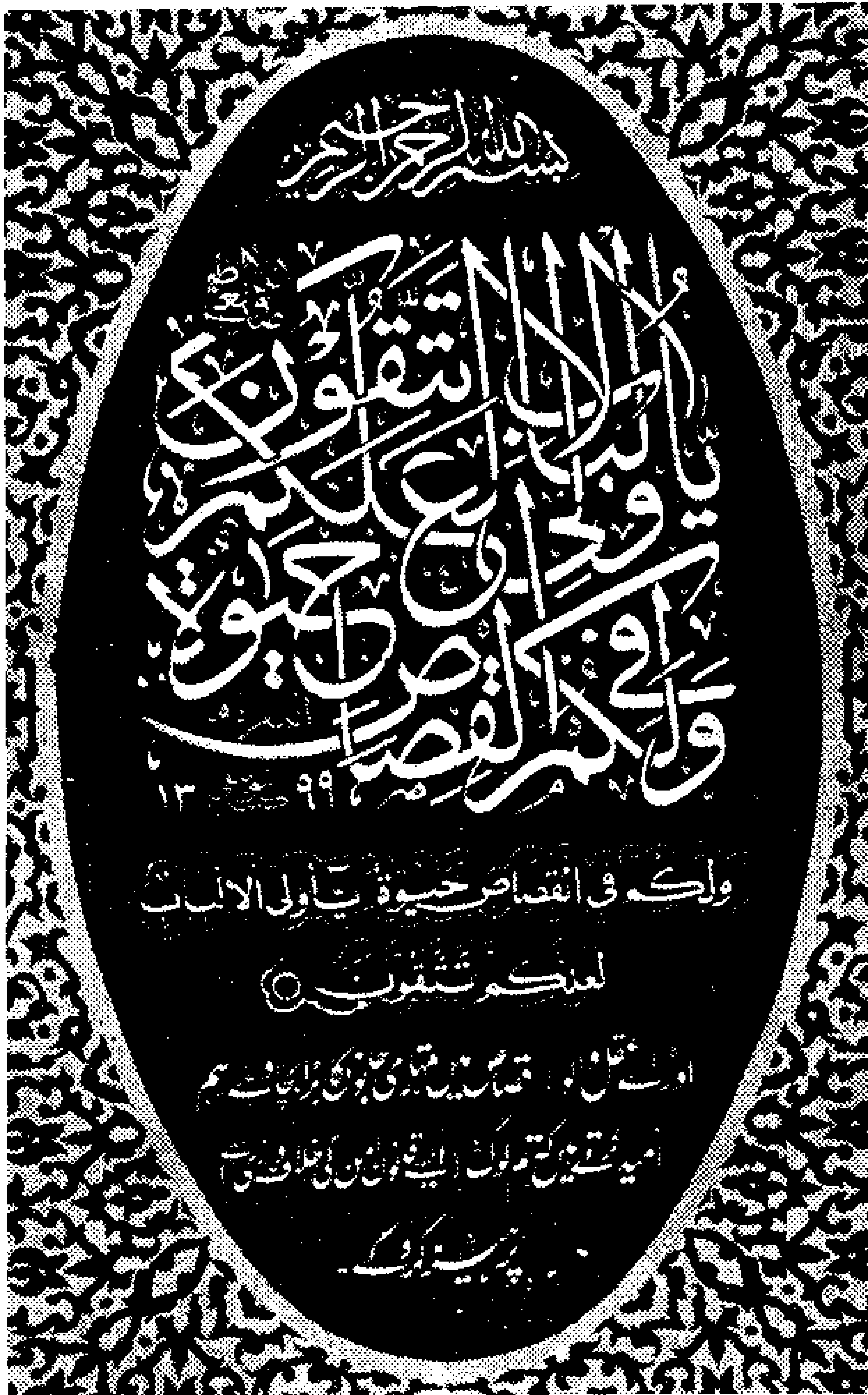
جلد جلد تازہ کیا جاتا ہے، کوئی کئی کئی دن تک سڑتا رہتا ہے، کوئی عام ہے کہ سب کا منہ لگتا ہے جیسے نیکیوں کے حقے، کوئی خاص ہے، غرض نہ سب پینے والے برابر، نہ سب تمباکو ایک طرح کے، نہ سب حقے و نیچہ ایک طرح کے، سب متفاوت اور مختلف، ہر ایک کا حکم الگ ہوا۔ پس اگر کسی نے ضرورتِ شدیدہ میں کسی مرض وشواد کے علاج کے لیے احتیاط سے بطور دوا کے کبھی کبھی ایک آدھ بار پی لیا تو چنداں جرم نہیں ہے، اور جو بعد ازالہ مرض بغیر ضرورت کے شوقیہ پیوے جیسا آجکل شائع ہے کہ یہی محفل کی زیب و زینت ہو گئی ہے اور اسی کی خاطر و تواضع رہ گئی اس کے نہ ملنے کی شکایتیں ہوتی ہیں کہ فلانے نے حقہ تک بھی نہیں پلا یا اور زبان سے چلتے ہے بُرا کہتے ہوں اور شاید دل میں بھی بُرا جانتے ہوں مگر ظاہر میں بے باکانہ اس کو پیتے ہیں اور ذرا بھی محجوب و منقبض نہیں ہوتے، اور آخر میں مُضر بھی ہوتا ہے اور منہ میں برابر بدبو آتی ہے، اور ہر دم منہ میں گھسا رہتا ہے اور حواس میں بھی کدورت آجاتی ہے اور تشبّہ اہلِ نار کے ساتھ ہے کہ منہ اور ناک میں سے دھواں نکلتا ہے، اور خود دھواں اور آگ بھی آلہ عذاب کا ہے، اس کے ساتھ متلبس رہتے ہیں، اس طور پر اس کا عادی ہو جانا بسبب اجتماع ان امور کے بیشک بُرا اور سخت مکروہ ہے، پھر امور مذکورہ سابق کے تفاوت سے کراہت میں بھی تفاوت ہوگا۔ اور بعض پینے والے جو بد احتیاط ہیں اور سڑے ہوئے حقے اور ناپاک نیچے، تیز تمباکو پیتے پیتے نشہ ہو جاتا ہے اور شراب کی سی مدہوشی ہوتی ہے، اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ حاصل یہ کہ کوئی حقہ زیادہ مکروہ کوئی کم مکروہ، کوئی حرام، کوئی ضرورت شدیدہ میں بطور دوا کے ایک آدھ بار مباح۔ اس تقریر پر درمیان اقوال علماء و فقہاء کے جو اس کی اباحت، کراہت و حرمت میں مختلف ہیں، تطبیق بھی ممکن ہے، پس جیسا موقعہ کسی نے دیکھا ہوگا ویسا کہدیا ہوگا۔ بہر حال پینے والا اس کا اکثر حالتوں میں نہ کل حالتوں میں، گناہ سے خالی نہیں۔" انتہیٰ

حضرت تھانویؒ کی اس تقریر سے اختلافِ علماء و فقہاء کا منشاء اور ان کے اقوال کی تطبیق پر روشنی پڑ گئی۔ دلائل کے اعتبار سے جب علماء و فقہاء کے اختلاف پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بعد تنقیح دلائل طرفین یہ واضح ہوتا ہے کہ حرمت کا قول تو لائق اعتبار نہ ہے کیونکہ حرمت قطعی دلیل تحریم پر موقوف ہوتی ہے جن علماء نے حرمت کا حکم دیا ہے انہوں نے کوئی قطعی دلیل اس پر قائم نہیں کی ہے بلکہ ان کے تمام ظنی دلائل بھی مخدوش ہیں، جیساکہ مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ نے "ترویح الجنان" میں اس کی وضاحت کردی ہے۔ اور قول اباحت بلا کراہت بھی خدشات سے خالی نہیں ہے البتہ قول کراہت قابلِ اعتبار

ہو۔ اور بالفرض اگر اس کی حرمت ثابت ہو جائے تو پھر بھی اس کے مختلف فیہ ہونے میں شک نہیں ہے جیساکہ عباراتِ سابق سے معلوم ہوا کہ علماء کی ایک جماعت نے اس کی حرمت سے انکار کیا ہے اور انہوں نے کراہت یا اباحت کا فتویٰ دیا ہے اور کراہت میں بھی بعض نے تحریمی کا قول کیا ہے اور بعض نے تنزیہی کا۔ علامہ ابو السعودؒ کے نزدیک کراہت تنزیہی ہے اور کراہتِ تنزیہی اباحت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے ـــــ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال ابو السعود فتکون الکراھۃ تنزیھیۃ والمکروہ تنزیھاً یجامع الاباحۃ ـــــ اگر حضرت گنگوہیؒ نے جن کو حضرت مولانا شاہ انور شاہ کشمیریؒ نے فقیہ النفس کا موزوں خطاب عطا فرمایا تھا، اس کی اباحت کا قول کر کے فتویٰ دے دیا تو کون سے گناہ کا ارتکاب کیا۔ ہو سکتا ہے کہ فقیہ النفس حضرت گنگوہیؒ نے ان علماء و فقہاء کے اقوال و آراء اور دلائل کو ترجیح دی ہو جو اس کی اباحت کے قائل ہیں۔ اور خود حضرت گنگوہیؒ بھی بہت بڑے درجے کے عالم ہیں اور تمام علوم اسلامیہ میں منصبِ امامت آپ کو حاصل تھا مگر جو خصوصی مناسبت آپ کو فقہ اور حدیث سے تھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ علوم آپؒ کی سرشت میں داخل ہو چکے تھے، وہ مشکل مسائل جن کے حل کرنے میں علماء عصر حیران و پریشان رہتے تھے حضرت گنگوہیؒ ان کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرتؒ نے اپنی تحقیق کی ہو اور ان کی تحقیق میں اس کی اباحت کسی درجہ میں ثابت ہو چکی ہو۔ اس کے علاوہ اگر انہوں نے اباحت کا قول کر کے فتویٰ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی وقت اور حالت اور موقعہ میں بھی یہ کراہت کے درجہ تک نہ پہنچے گی، نیز اگر کوئی اس کی اباحت کا قائل ہو جائے تو یہ کفر تو نہیں، کیونکہ اس کی اباحت، کراہت اور حرمت میں اختلاف تو ہے۔ اور "شرح عقائد نسفی" اور اسی طرح "فتاویٰ بزازیہ" میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ حرام مختلف فیہ کے محلل کو کافر کہنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور کل دخان حرام یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اصل حدیث اس طرح وارد ہے: کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔ (رواہ مسلم) یا یہ حدیث ہے: نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل مسکر و مفتر۔ (رواہ احمد عن ام سلمۃ) جب یہ "کل دخان حرام" حدیث کے الفاظ ہی نہیں ہیں تو ان پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مسئلہ فی نفسہٖ بقدرِ ضرورت واضح ہو گیا۔

فقط واللہ اعلم


كتاب
القصاص
والدية


بسم اللہ الرحمن الرحیم
ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب
لعلکم تتقون

کتاب القصاص والدیۃ

(قصاص اور دیت کے احکام و مسائل)

قاتل کو معاف کردینے کے بعد قصاص کا مطالبہ کرنا جائز نہیں

سوال:- ایک شخص نے دوسرے آدمی پر قتلِ عمد کا دعویٰ دائر کیا، اب اگر مقتول کے ورثاء گواہوں کے سامنے قاتل کو معاف کردیں تو بعد میں کسی وجہ سے دوبارہ قصاص کا مطالبہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- ورثاء کا قاتل کو باقاعدہ معاف کردینے کے بعد حقِ قصاص ساقط ہوجاتا ہے اور مقتول کے ورثاء کو دوبارہ مطالبۂ قصاص کا حق باقی نہیں رہتا، بلکہ کسی ایک وارث کے معاف کردینے سے بھی بقیہ ورثاء کو قصاص لینے کا حق نہیں رہتا۔

وفی الهندیة: ومن عفا عن ورثة المقتول فلا سبیل الی القصاص۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۶ ص۲۲ الباب السادس فی الصلح والعفو) [1]

صلح ہوجانے کے بعد عدالت کا قاتل کو سزا دینا

سوال:- ایک آدمی مثلاً زید نے کسی کو عمداً قتل کیا جس کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا کہ مقتول کے ورثاء نے دیت لے کر مقدمہ کی پیروی چھوڑ دی جس کی وجہ سے زید پھانسی کی سزا سے بچ گیا لیکن عدالت نے اس کو عمر قید کی سزا سنادی ہے کیا یہ سزا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- قتلِ عمد میں قصاص لینا ورثاء کا شرعی حق ہے جبکہ ورثاء قاتل کو معاف بھی کرسکتے ہیں اور دیت لے کر صلح بھی کرسکتے ہیں، صورتِ مسئولہ کے مطابق ورثاء

---

[1] قال العلامة الجصاص الرازی رحمه الله:- قال رسول الله صلی الله علیه وسلم العمد قود الا ان یعفو ولی المقتول۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۶۵ بحث تنازع اهل العلم فی معنی قوله تعالیٰ: فمن عفی له من اخیه شئ۔ الآیة)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۶ بیان ما یسقط القصاص بعد وجوبه، کتاب الجنایات۔

نے جب دیت لے کر قاتل کو معاف کر دیا تو حکومت کو مزید سزا دینے کا کوئی حق نہیں اس لیے اب عدالت کا اسے عمر قید کی سزا سنانا مروجہ قانونی سزا تو ہو سکتی ہے شرعی نہیں۔

لما قال اللہ تعالیٰ: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ...... فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸)

قال العلامۃ المرغینانیؒ: انها نزلت فی الصلح۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۴۳ کتاب الصلح) [1]

بدل صلح صرف قاتل پر ہے

سوال:- ایک آدمی کے باپ کو کسی نے قتل کیا ہے بیٹا اب صلح کرنا چاہتا ہے تو کیا قاتل کے ورثاء دیت ادا کرنے کے پابند ہیں یا نہیں؟

الجواب:- صلح کی صورت میں بدل صرف قاتل پر واجب ہے دیگر رشتہ دار صرف بطور احسان تعاون کر سکتے ہیں۔

کما فی الھندیۃ: وکل ارش وجب بالصلح فھو فی مال القاتل۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۶ ص۲۴ کتاب الصلح) [2]

قتل بالسبب کی دیت کا حکم

سوال:- ایک عورت نے اپنے خاوند کی روٹی میں زہر ملایا لیکن اتفاق سے وہ روٹی کسی دوسرے شخص نے کھالی جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی، جب عورت کو پتہ چلا تو وہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی، پکڑے جانے پر سسر نے اس عورت کو قتل کر دیا، زہریلی روٹی کھانے سے مرنے والے کے ورثاء اب اس عورت کے ورثاء سے دیت طلب کرتے ہیں، جب کہ اس واقعہ کو کافی عرصہ گذر چکا ہے، اس مسئلہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ: من قتل بعد اخذ الدیۃ فعلیہ القتل لایقبل منہ الدیۃ۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۵۱ بحث تنازع اھل العلم فی معنی قولہ فمن عفی لہ من اخیہ شیء)

[2] قال العلامۃ ابوبکر الجصاص الرازیؒ: دلالۃ الدیۃ ظاھرۃ علی ان الصلح دم العمد وسقوط القود بعفو بعض الاولیاء یوجب الدیۃ فی مال الجانی۔

(الاحکام القرآن للجصاص ج۱ ص۱۵۸ بحث تنازع اھل العلم الخ)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۷ ص۲۵۵ بیان من تجب علیہ الدیۃ، کتاب الجنایات۔

الجواب:۔ زہریلی روٹی کھانے سے موت کا واقع ہونا قتل بالسبب ہے، صورت مسئولہ میں جس عورت نے روٹی میں زہر ملایا ہے اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہے اور عورت پر کفارہ نہیں، اگرچہ عورت مرگئی ہے لیکن اس کے عاقلہ تو موجود ہیں اُن سے دیت وصول کرکے مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: لو زلق بماء صبه رجل فوقع فی البئر فا لضمان علی الصّاب۔ (ردالمحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات) [۱]

مریض کو دوائی کھلانے سے موت واقع ہونے پر دیت کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی مریض کو کوئی ایسی دوائی کھلا دی جس سے اس کی موت واقع ہوگئی، تو کیا دوائی کھلانے والے پر دیت یا ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مریض کو دوائی کسی ماہر و تجربہ کار ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق کھلانے سے اس کی موت واقع ہوجائے تو کوئی دیت وضمان نہیں، اور اگر دوائی کھلانے والا نہ ڈاکٹر ہے اور نہ ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق دوائی کھلائی یا تجویز کردہ نسخہ کی مقدار سے زیادہ کھلا دی جس سے مریض کی موت واقع ہوگئی تو اب کھلانے والا ضامن ہے اس پر دیت اور کفارہ دونوں واجب ہوں گے۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تطبب ولا یعلم منہ طب فھو ضامن۔ (ابوداؤد ج۲ ص۲۸۲ کتاب الدیات) [۲]

---

[۱] قال العلامة الزیلعیؒ: موجب القتل بسبب الدیة علی العاقلة إلا الکفارة۔
(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۰۲ کتاب الجنایات)

ومِثلُہٗ فی الھدایة ج۴ ص۵۶ کتاب الجنایات۔

[۲] قال العلامة خلیل احمد سہارنفوریؒ: قال الخطابی لا اعلم خلافًا أن المعالج اذا تعدّی فتلف المریض ضمن ای الدیة ۔۔۔۔۔۔ وفیہ ایضًا: لاضمان علی حجام ولا ختان ولا متطیب بشرطین احدھما ان یکونوا ذوی حذق وبصارة فی صناعتھم فان لم یکن کذلک لم یحل له مباشرة القطع۔ (حاشیة بذل المجھود ج۸ ص۱۰۸ کتاب الدیات)

مقتول کی دیت کے مستحقین

سوال:۔ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہونے والے کے لیے گاڑی کے ڈرائیور کی طرف سے بطور تاوان ملنے والی رقم میت کی بیوہ کو دی جائے گی یا اس کے بھائیوں کو؟ جبکہ بیوہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے۔

الجواب:۔ ایکسیڈنٹ کی صورت میں ہلاک ہونے والے کی دیت ڈرائیور اور اس کے عاقلہ پر واجب ہے اور یہ دیت میت کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔ مذکورہ صورت میں میت کی بیوی بھی اس کی وارث ہے اگرچہ وہ کسی اور سے نکاح کرلے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ان القصاص حق جمیع الورثة وکذا الدیة۔ (الهدایة ج۴ ص۵۲۲ کتاب القصاص فی ما دون النفس) [1]

نیند کی حالت میں ماں کے نیچے دب کر بچہ مر جائے تو کفّارہ اور دیت کا حکم

سوال: بچہ ماں کے پہلو میں سویا ہوا تھا کہ اچانک ماں کے نیچے دب کر مر گیا، اب والدہ کے لیے دیت اور کفارہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں بچے کا مر جانا جاری مجریٰ خطا کی قسم میں آتا ہے جس میں عاقلہ پر دیت اور قاتل پر کفّارہ لازم ہوتا ہے۔ آجکل عاقلہ سے دیت کی وصولی اسلامی قانون کے اجراء نہ ہونے کی وجہ سے مشکل ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں ماں فراغت ذمہ کے لیے کفّارہ ادا کرے گی نیز بچہ مرتے وقت اگر کسی جائیداد کا مالک ہو تو ماں اس قتل کی وجہ سے بچے کی جائیداد سے محروم ہوگی۔

لما قال اللّٰه تبارك وتعالیٰ: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ۔ (سورة النساء آیت ۹۲)

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: والرابع ما جریٰ مجراه مجری الخطاء کنائم انقلب علی رجل فقتله لانه معذور کالمخطئ وموجبه الکفارة

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: والورثة فی ذٰلك کلهم سواء۔ (البحر الرائق ج۸ ص۳۱۰ فصل فی الصلح علی المال)
وَمِثْلُهٗ فی التفسیرات احمدیة ص۱۹۶۔

الدّیۃ علی العاقلۃ ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۴۲ کتاب الجنایات) ؎۱

نیند کی حالت میں ماں کے پہلو میں دب کر بچّہ کے مرنے پر پیدا ہونے والے اشکال کا جواب

سوال :۔ نیند کی حالت میں بچہ ماں کے پہلو میں دب کر مر جائے تو وجوبِ دیت اور کفّارہ پر آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ کنائم انقلب علی رجل فقتلہ، کیا یہ قتلِ خطاء یا اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے؟ کیا بیداری اور نیند میں فرق نہیں ہے؟ اگر فرق نہیں تو اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ رفع القلم عن ثلث النائم حتی استیقظ ۔ آپ کی دلیل کنائم انقلب میں لفظ ام موجود نہیں، نیز آیتِ کریمہ وَلَا تُضَارَّ وَالِدَۃٌ بِوَلَدِھَا اگرچہ رضاعت کے بارے میں ہے لیکن اعتبار عموم الفاظ کا ہے، آپ نے اسقاطِ حمل کی دلیل بھی دی ہے لیکن اس میں عورت کا ارادہ ہوتا ہے جبکہ نیند میں ایسا نہیں ہوتا، روزہ کی حالت میں مرد کو احتلام ہو جائے تو روزے کا کفّارہ یا قضاء نہیں اس لیے کہ روزہ دار مجبور ہے ۔ از راہ کرم میرے ان اشکالات کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب :۔ (۱) رفع القلم عن ثلث کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں پکڑ نہ ہوگی، یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا ضمان نہ ہوگا ورنہ قتلِ خطاء میں وجوبِ دیت پر، نماز میں ترکِ واجب پر سجدۂ سہو، مجنون اور بچہ اگر کسی کا مال ضائع کر دے تو اس پر وجوبِ ضمان کا حکم کیونکر لگتا، بچہ اور مجنون اگر کسی کے ساتھ مل کر کسی کو قتل کریں تو اُن کے عاقلہ پر دیت ہے ۔

قال العلامۃ ابو بکر الکاسانیؒ: فتجب الدیۃ ثم ما یجب علی الصبی والمجنون والخاطئ تتحملہ العاقلۃ ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۳۶ کتاب الجنایات)

؎۱ قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ : النائم ینقلب علی انسان فیقتلہ فھٰذا القتل فی معنی القتل الخطاء من کل وجہ لوجودہ لا عن قصد لانہ مات بثقلہ فترتب علیہ احکامہ من وجوب الکفارۃ والدیۃ وحرمان المیراث ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۷۱ کتاب الجنایات)

ومثلہ فی الھدایۃ ج ۴ ص ۵۶۱ کتاب الجنایات ۔

(۲) فقہاء نے جو مثال دی ہے کنائم انقلب علیٰ رجل یہ عام قاعدہ ہے اس میں ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ سب داخل ہیں، اس سے مراد شخص کلی ہے ماں باپ وغیرہ اس کے افراد ہیں، اس سے ماں کو مستثنیٰ کر کے اوروں کو داخل کرنا غلط ہے۔

(۳) ماں پر وجوب دیت اور کفارہ اس کو ضرر دینا نہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہیں، اس طرح تو باپ کے بارے میں بھی حکم ہے کہ بچے کی وجہ سے اس کو تکلیف نہ دو۔ ولا مولود له بولده لیکن باپ اگر بیٹے کو قتل کر دے تو اس پر دیت واجب ہے، نیز دیت کا مطلب یہ ہے کہ عورت اگر بچے کو دودھ دینے سے بالکل معذور ہو تو خاوند اس کو ضرر نہ دے، یہاں عورت بالکل مجبور ہے لیکن نیند میں اگر ماں کے نیچے بچہ دب کر مر جائے تو اس میں اس کی بے احتیاطی کا دخل ضرور ہے، اس لیے علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فان النائم لیس من اهل القصد اصلاً وانما وجبت الکفارة لترك التحرز عن نومه موضع یتوهم قاتلاً والکفارة فی قتل الخطاء انما یجب لترك التحرز۔ (ردّ المحتار ج ۵ ص ۳۴۲ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه)۔

(۴) چونکہ اسقاطِ حمل نہ قتل عمد ہے نہ شبہ عمد اور نہ فعل سببی ہے لعدم التوریث اسقاطِ حمل کے لیے دوائی کھانا اور ماں کا بچے کے ساتھ سونا اختیاری ہے لیکن قتل دونوں صورتوں میں غیر اختیاری ہے[۱]

روپے کی شکل میں دیت کی مقدار

سوال: قتلِ خطا کی دیت آجکل رائج کرنسی کے حساب سے کتنے روپے بنتی ہے؟

الجواب: قتلِ خطا کی دیت سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہے۔

کما فی الهندیة: ومن العین الف دینار ومن الورق عشرة الاف درهم۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص ۵۸۵ کتاب الدیات)۔

ایک درہم تقریباً ساڑھے تین ماشے چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ (اوزانِ شرعیہ از مفتی محمد شفیع ص ۱۵)

---

[۱] قال العلامة الزیلعیؒ: کنائم انقلب علیٰ رجل بیان لما اجری مجری الخطاء لان هذا لیس بخطاء حقیقة لعدم قصد النائم الی شئ حتی یصیر مخطاء لمقصود ولما وجد فعله حقیقة وجب علیه ما اتلفه کفعل الطفل۔ (تبیین الحقائق ج ۵ ص ۱۰۱ کتاب الجنایات)

اِس حساب سے چاندی کی مقدار ۳۶ سیر ۷ چھٹانک ایک تولہ ۸ ماشے بنتی ہے اس مقدار چاندی کی مارکیٹ ریٹ میں جو قیمت بنتی ہے وہ قتلِ خطا کی دیت ہوگی۔ لہ

دوش (کاندھے) کی ہڈی توڑنے پر حکومت عدل کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کو تین آدمیوں نے خوب مارا جس کی وجہ سے اس کی دوش (کاندھے) کی ہڈی ٹوٹ گئی، مضروب نے ان آدمیوں پر دعویٰ کیا کہ مجھے ضمان دیا جائے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں جس مضروب کے کاندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اس کے لیے تینوں ضاربین (مارنے والے) ضامن ہیں، مساوات کی رعایت ممکن نہ ہونے کی وجہ سے اس میں حکومتِ عدل ہے یعنی مضروب جب علاج معالجہ کرانے کے بعد اچھا ہو جائے تو اس کے علاج معالجہ (یعنی ڈاکٹر کی فیس، ادویات وغیرہ) کا جتنا خرچہ بنتا ہو وہ ان تینوں ضاربین سے مضروب کو دلایا جائے گا۔

قال العلامة ابو بکر الکاسانیؒ: فنقول فی کسر العظام کلها حکومت عدل الا للسن۔ (بدائع الصنائع ج ۸ ص۳۲۸ فصل یجب فیه أرش غیر مقدر) ۲؎

صلح کے بعد اگر زخمی مر جائے تو دیت کا حکم

سوال:۔ دو فریقین میں لڑائی کے بعد صلح ہوگئی، مضروب کے ورثاء نے کہا کہ چونکہ مضروب اس لڑائی میں زخمی ہوا تھا لہٰذا اس کی موت اسی زخم کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ اور واقعی وہ اسی زخم کی وجہ سے فوت ہوا ہے، اب سوال یہ ہے کہ زخمی کرنے والے

لہ قال العلامة ابو بکر الجصاص الرازیؒ: فمن الدراهم عشرة آلاف درهم ومن الدنانیر الف دینار۔ (الاحکام القرآن ج ۲ ص۲۳۲)

ومثله فی بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۵۴ فصل فی وجوب الدیة والکلام فیها۔

۲؎ قال العلامة ابن نجیمؒ: ولا قصاص فی عظم لقوله علیه الصلوٰة والسلام لاقصاص فی العظم وقال عمر وابن مسعودؓ لاقصاص فی عظم الا فی السن۔

(البحر الرائق ج ۸ ص۳۶۱ باب القصاص فی ما دون النفس)

ومثله فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص۳۵۴ باب القود فی ما دون النفس۔

شرعاً دیت ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر یہ صلح اور معافی صرف جنایت اور زخم کی ہے اور زخمی اس جنایت سے پیدا ہونے والے اثرات سے خاموش رہے اور اس زخم کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جائے تو زخمی کرنے والے اور جانی پر دیت لازم ہے اور اگر صلح زخم اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے بارے میں ہو تو اس کے (صلح کے) بعد اگر زخمی مرجائے تو زخم لگنے والے پر کوئی دیت نہیں ۔

لما قال الامام المرغیانیؒ : ومن قطع ید رجل فعفا المقطوعة یدہ عن القطع ثم مات من ذلك فعلی القاطع الدیة فی ماله وان عفا عن القطع ومایحدث منه ثم مات من ذلك فهو عفو عن النفس ۔ (الهدایة ج۴ ص۵۶۷ کتاب الجنایات) [1]

رشتۂ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے

سوال :۔ نیند کی حالت میں ماں سے اگر بچہ ہلاک ہو جائے تو عند البعض ماں پر کفارہ نہیں اس لیے کہ الدر المختار میں ہے : والقتل الموجب للقود اوالکفارۃ وان سقطا بحرمة الابوۃ علی ما مرّ ۔ (ج۵ ص۴۸۹ کتاب الفرائض) یعنی ایسا قتل جو موجب کفارہ یا قصاص ہو تو رشتہ ولادت سے دونوں ساقط ہو جاتے ہیں ۔ مہربانی فرما کر الدر المختار کی اس عبارت کی وضاحت فرمائی جائے ؟

الجواب :۔ ماں سے اگر نیند کی حالت میں بچہ ہلاک ہو جائے تو موجب کفارہ و دیت ہے کیونکہ یہ قتل خطاء ہے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : والرابع ماجری مجراہ مجری الخطاء کنائم انقلب علی رجل فقتله لانه معذور کالمخطئ وموجبه ای موجب هذا النوع من الفعل وما جری مجراہ الکفارۃ والدیة علی العاقلة ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات)

---

[1] قال العلامة التمرتاشیؒ : ومن قطع فعفا عن قطعه فمات منه ضمن قاطعه الدیة ولو عفا عن الجنایة اوعن القطع ومایحدث منه فهو عفو عن النفس ۔
(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۶۱ فصل فی الفعلین)
ومثله فی تبیین الحقائق ج۶ ص۱۱۸ فصل ومن قطع ید رجل ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ دیت اور کفارہ دونوں کا وجوب ہے۔

الدر المختار کی مذکورہ بالا جس عبارت سے عدم قصاص اور کفارہ معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے کفارہ ساقط نہیں ہوتا، اس لیے کہ علی ما مرّ سے مراد کتاب الجنایات کی طرف اشارہ ہے اور کتاب الجنایات سے صرف سقوطِ قصاص معلوم ہوتا ہے اور دیت اور کفارہ کا وجوب، کتاب الفرائض کی عبارت سہوِ کاتب ہے، وجوبِ کفارہ کی تائید "درمختار" کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: شربت دواء تسقطه عمداً فان کان الولد حیاً فمات فعلیها الدیة و الکفارة (رد المحتار ج۶ ص۳۷۹ فصل فی الجنین کتاب الجنایات) حالانکہ یہ نہ قتلِ عمد ہے اور نہ شبہ عمد۔ قتلِ خطاء اور شبہ عمد کے حکم میں فرق نہیں ہے۔[1]

جسم کی کسی ہڈی کو توڑنے پر حکومتِ عدل ہوگی

سوال:۔ ایک بچے کو ٹرک پر جیپ نے ٹکر ماری جس سے اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی اور بدن پر زخم بھی آئے، بچہ ہسپتال میں زیرِ علاج ہے، تو کیا ڈرائیور پر تاوان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس جنایت میں قصاص نہ ہو اور مقرر دیت بھی نہ ہو تو وہاں پر حکومتِ عدل ہوتی ہے یعنی حاکم، قاضی یا تجربہ کار ڈاکٹر متاثرہ حصے کے ٹھیک ہونے کے بعد علاج معالجہ پر ہونے والے اخراجات کا حساب لگا کر زخمی کرنے والے سے وصول کرکے زخمی کو دلوائے جائیں گے۔ بدن کے کسی بھی حصے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں حکومتِ عدل ہوتی ہے لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے میں حکومتِ عدل ہوگی۔

لما قال العلامة ابو بکر الکاسانی رحمه الله: فنقول فی کسر العظام کلها

---

[1] لما قال العلامة الکاسانیؒ: النائم فینقلب علی انسان فیقتله فهو القتل فی معنی قتل الخطأ من کل وجه لوجوده لا من قصد لانه مات بثقله فترتب علیه احکامه من وجوب الکفارة والدیة وحرمان المیراث والوصیة ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ مطلب فی معنی القتل الخطاء)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۵۶۱ کتاب الجنایات ۔

حکومۃ عدلٍ الا للسن ۔ (بدائع الصنائع ج ۸ ص۳۲۳ فصل یجب فیہ اُرش غیر مقدر) [1]

والدین کی عدم حفاظت کی وجہ سے بچہ مرجائے تو موجبِ ضمان نہیں

سوال:۔ ماں نے بچے کو چولہے کے پاس بٹھا رکھا تھا کہ بچہ اچانک چولہے کی آگ کے ساتھ جل کر مرگیا، تو کیا بچے کی والدہ پر ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اگر بچے کی حفاظت سے غافل ہوگئے ہوں یا سرے سے حفاظت ہی نہیں کی ہو جس کی وجہ سے بچہ آگ میں جل کر مرگیا یا کسی اور طریقے سے اس کی موت واقع ہوگئی تو والدین پر یا ان میں سے کسی ایک پر کوئی ضمان نہیں، ہاں ان دونوں کو اللہ سے توبہ استغفار کرنا چاہیئے۔

کما فی الھندیۃ: وعن ابی القاسم فی الوالدین اذا لم یتعاھد الصبیّ حتّٰی سقط من سطح ومات او احترق بالنار لا شیٔ علیھما الاّ التوبۃ والاستغفا[ر] واختیار الفقیہ ابی اللیث علی انہ لا کفارۃ علیھما ولا علیٰ احدھما۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۳۳ باب الامر بالجنایۃ ومسائل الصبیان) [2]

کسی کے ہاتھ سے اچانک کوئی چیز گرنے سے کوئی ہلاک ہوجائے تو موجبِ ضمان ہے

سوال:۔ ایک بچہ چارپائی پر سویا ہوا تھا اس کی والدہ نے اس کے قریب ہی دیوار کے طاق میں گرم دودھ یا پانی رکھا تھا، جب وہ اس کو اٹھانے لگی تو وہ گرم دودھ یا پانی

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ولا قصاص فی عظم لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لا قصاص فی عظم وقال عمرو ابن مسعود لا قصاص فی عظم الاّ فی السن۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۳۰۶ باب القصاص فی ما دون النفس)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۵ ص۳۵۴ باب القود فی ما دون النفس۔

[2] قال الامام قاضی خان رحمہ اللہ: وقال بعضھم لیس علی الوالدین شیٔ الاّ الاستغفار وھو الصحیح۔ (فتاویٰ قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۴۴۴ فصل فی اتلاف الجنین)

بچے کے اوپر گرا جس کی وجہ سے بچے کی موت واقع ہوگئی، تو کیا بچے کی ماں پر دیت اور ضمان ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ والدین سے اس طرح اگر کوئی بچہ ہلاک ہو جائے تو یہ قتل بالسبب کے حکم میں ہے، اس قتل سے قاتل کے عاقلہ پر دیت ہے اور خود اس پر کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ بچہ اس کی غلطی سے ہلاک ہوا اسلئے کہ قاتل کے ہاتھ سے گری ہوئی چیز بچے کی ہلاکت کا سبب ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: وکذلک اذا کان یمشی فی الطریق حاملاً سیفاً اوحجراً اولبنة اوخشبة فسقط من یدہ فقتله لوجود معنی الخطاء فیه وحصوله علی سبیل المباشرة لوصول الآلة بشرة المقتول۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ مطلب قتل الذی فی معنی القتل الخطاء)[۱]

سرکاری ملازم کو دورانِ ڈیوٹی کوئی نقصان پہنچے تو حکومت پر کوئی ضمان نہیں

سوال:۔ ایک آدمی سرکاری ملازم تھا، کام کی زیادتی کی وجہ سے دماغی عارضہ میں مبتلا ہوگیا جبکہ ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے جس پر اُسے قبل از وقت نوکری سے نکال دیا گیا، کیا حکومت پر اس ملازم کی وجہ سے کوئی ضمان ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اس آدمی نے بخوشی یہ ملازمت اختیار کی تھی، اسے معلوم تھا کہ کام زیادہ ہے یا کم، اب اگر زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اس کو کوئی دماغی نقصان پہنچا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی فعل ہے، اب اس آدمی کا دماغی عارضہ میں مبتلا ہو جانے سے حکومت نہ مباشر ہے نہ سبب ہے، اس لیے حکومت پر کسی قسم کا ضمان نہیں۔ حکومت کا

---

[۱] قال العلامة الزیلعیؒ: ومن حمل شیئاً فی الطریق فسقط علیٰ انسان ضمن سواء تلف بالوقوع او بالعثرة به بعد الوقوع لان حمل المتاع فی الطریق علیٰ رأسه اوعلیٰ ظهره مباح له لکنه مقید بشرط السلامة بمنزلة الرمی الی الهدف او الصید۔

(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۴۶ باب ما یحدث الرجل فی الطریق)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۳۵۱ باب ما یحدث الرجل فی الطریق۔

یہ قانون بھی ہے کہ وہ سرکاری ملازم جس کا ریٹائرمنٹ سے قبل میڈیکل بورڈ ہو جائے تو حکومت اس کو یکمشت کچھ رقم ادا کر دیتی ہے یہ حکومت کی اچھی پالیسی ہے۔

فقہاء نے یہاں ایک مثال دی ہے کہ دو آدمی رسہ کشی کر رہے ہوں اور رسی ٹوٹنے کی وجہ سے دونوں پیچھے کی جانب گر کر ہلاک ہو جائیں تو دونوں ایک دوسرے کے ضامن نہیں کیونکہ دونوں کی ہلاکت ان کے اپنے فعل (زور) سے واقع ہوئی ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فلما سقط علی قفاه علم انه سقط بفعل نفسه وهو مده فقد مات کل واحد منهما من فعل نفسه فلا ضمان علی احد۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۳ مطلب فی المعنی القتل الخطاء) ؎۱

قتل کی نیت سے تلوار اٹھانے والے کے قتل کا حکم

سوال: اگر ایک شخص اپنی جماعت میں سے کسی ایک فرد یا تمام جماعت والوں کو قتل کرنے کے لیے تلوار سونت لے تو کیا اس تلوار سونتنے والے کو وہ شخص یا جماعت اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: شاہر کا خون مباح ہے اس کو قتل کر دینے سے کوئی ضمان لازم نہیں آتا۔

وفی الهندیة: ومن شهر علی المسلمین سیفا وجب قتله ولا شیء بقتله وکذلک اذا شهر علی رجل سلاحا فقتله او قتل غیره دفعا عنه فلا یجب بقتله شیء الخ

(الفتاوی الهندیة ج۶ ص۷ الباب الثانی فیمن یقتل قصاصا ومن لا یقتل) ؎۲

؎۱ قال العلامة الزیلعی رحمه الله: فان وقعا علی القفا لا تجب لهما دیة لان کل واحد منهما مات بقوة نفسه۔ (تبیین الحقائق ج۶ ص۱۵۱ باب جنایة البهیمة)

ومثله فی الهندیة ج۶ ص۸۸ کتاب الجنایات

؎۲ قال العلامة الحصکفیؒ: (ویجب قتل من شهر سیفا علی المسلمین) یعنی فی الحال کما نص علیه ابن الکمال الخ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۹۱ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه)

وَمثلهٗ فی الهدایة ج۴ ص۵۶۷ باب ما یوجب القصاص وَما لا یوجب۔

کسی کی ٹانگ کی دیت

سوال:۔ سڑک پر ایک بچہ جارہا تھا کہ اچانک زید نے گاڑی سے اُسے ٹکر ماردی جس کی وجہ سے بچے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، تو کیا زید پر کچھ ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں دیت واجب ہوتی ہے اور جب ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو آدھی دیت واجب ہوتی ہے تاہم یہ دیت حالاً نہیں دی جائے گی بلکہ ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ یہ دیت عاقلہ سے وصول کی جائے گی جو مسلمان حاکم اور قاضی کے بغیر کوئی اور ادا نہیں کرسکتا، موجودہ وقت میں عاقلہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے آپس میں صلح کرلینا بہتر ہے۔

وفی الهندية: وان كان صاحب الدابة راكباً على الدابة والدابة تسير ان وطئت بيدها أو برجلها يضمن وعلى عاقلته الدية وتلزمه الكفارة ويحرم عن الميراث۔ وقال فی الهندية (ج۶ ص۲۷ الباب السابع فی اعتبار حالة القتل) وفی الرجلين كمال الدية فی الخطاء وفی احداهما نصف الدية كذا فی المحيط۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۶ ص۵۰ الباب الثانی عشر فی جناية البهائم والجناية عليها) ـلـه

دیت کی شرعی مقدار

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! شریعتِ مقدسہ میں قتل کی دیت کتنی مقرر فرمائی گئی ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں قتل کی دیت کی مقدار اونٹوں کے اعتبار سے سو اونٹ ہے اور سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار ہے اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار درہم ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ: والدية فی الخطاء مائة من الابل اخماساً عشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون ابن مخاض

ـلـه قال الشيخ علاؤالدين الحصكفیؒ: (ضمن الراكب فی طريق العامة) وطئت دابة وما اصابت بيدها أو رجلها او رأسها۔ والرجلان ففيهما الدية وفی أحدهما نصفها۔
(تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج۵ ص۳۸۶ كتاب الجنايات)
ومثلهٗ فی كنز الدقائق ص۴۶۵ وفيها ايضاً ص۴۵۹ كتاب الجنايات۔

وعشرون حقة وعشرون جذعة وقال ومن العين الف دینار ومن الورق عشرة الاف درهم۔ (الھدایة ج ۴ ص ۵۸۴ کتاب الجنایات) [1]

قتل موجب کفر نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی بے گناہ کو قتل کرنے والا انسان کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر قتل کو حرام سمجھتے ہوئے کرے تو قاتل کافر نہیں ہوتا اگرچہ قتل عمداً ہو اور ایسے قاتل کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، تاہم قتل کو حلال سمجھتے ہوئے کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

قال العلامة بدر الدین العینیؒ: وعندنا ان المؤمن اذا قتل مؤمناً لایکفر بفعله ولایخرج به من الایمان الا ان یقتله استحلالاً۔ (عمدة القاری جلد ۱۸ ص ۱۸۳) [2]

---

[1] قال الامام علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی رحمه الله: فان کان (المقتول) ذکراً خلاف فی ان الواجب بقتله من الابل مائة لقوله علیه الصلوٰة والسلام فی النفس المؤمنة مائة من الابل ولاخلاف ایضاً فی اَنّ الواجب من الذهب الف دینار لماروی انه علیه الصلوٰة والسلام جعل دیة کل ذی عهد فی عهده الف دینار (وقال بعده) واما الواجب من الفضة فقد اختلف فیه قال اصحابنا رحمهم الله تعالیٰ عشرة الاف درهم وزن وزن سبعة۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۷ ص ۲۵۴ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج ۶ ص ۱۲۶ کتاب الدیات۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واعلم ان قتل النفس بغیر حق من اکبر الکبائر بعد الکفر بالله تعالیٰ وتقبل التوبة منه فان قتل مسلماً ثم مات قبل التوبة منه لایتحتم دخوله النار بل هو فی مشیئة الله تعالیٰ کسائر اصحاب الکبائر فان دخلها لم یخلد فیها الخ اما الایة فمؤولة بقتله لایمانه او بالاستحلال او بان یراد بالخلود المکث الطویل۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۳۴۱ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی التفسیرات الاحمدیة ص ۵ سورة البقرة۔

کسی کوزخمی کرنے پر قصاص کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر حملہ کرکے اس کو زخمی کردے اور زخم سے خون نکل آئے تو اس کے قصاص کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب:۔ اگر زخم ایسا ہو کہ جس میں مماثلت ہوسکے تو اس میں قصاص واجب ہے۔

قال العلامة المرغیناني رحمه الله: وفی کل شجة تتحقق فیها المماثلة القصاص انتهی وفی العنایة لقوله تعالیٰ وَالْجُرُوحَ قِصَاص۔ (الهدایة ج۴ ص۵۶۹ باب القصاص فیما دون النفس) [1]

دانت توڑنے کا قصاص

سوال:۔ اگر کوئی شخص ضرب لگا کر کسی کا دانت توڑ دے تو ضارب سے قصاص اور دیت کا معاملہ کیسے طے کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اس ضارب پر قصاص واجب ہے البتہ مصالحت کے طور پر رقم کا لین دین بھی جائز ہے خواہ ہر دانت کے بدلے میں پانچ سو درہم دیا جائے یا کم وبیش دیا جائے۔

لما فی الهندیة: وفی السن القصاص وان کان سن من یقتص منه اکبر من سن الآخر ولا قصاص فی عظم الا السن کذا فی الهدایة۔ ایضاً: وان شاء ضمنه أرش سنه خمسمائة۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۱۲۱ الباب الرابع فی القصاص فیما دون النفس) [2]

---

[1] قال ابوالبرکات عبدالله بن احمد النسفی رحمه الله: و (یقتص) کل شجة یتحقق فیها المماثلة۔ (کنزالدقائق ص۳۹۳ باب القصاص)

وَمِثْلُهٗ فی مختصر القدوری ص۱۷۷ کتاب الجنایات۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وقال عمر وابن مسعود لا قصاص فی عظم الا فی السن۔ البحر الرائق ج ص۳۰۶ وفیه ایضاً ص۳۰۵۔ وفی السراجیة فی السن الرجل خمسمائة وفی السن المرأت نصف ذلك۔

وَمِثْلُهٗ فی الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۵ ص۳۵۳،۳۵۴ باب القود فیما دون النفس۔

متسبب اور مباشر پر دیت

سوال:۔ (۱) ایک شخص ونچ کا ڈرائیور ہے اور ونچ وہ مشین ہے جس کے ذریعے کنوئیں سے پتھر وغیرہ نکالے جاتے ہیں، عام معمول کے مطابق جس کنوئیں میں کام شروع تھا اس پر تین آدمی کام کر رہے تھے کہ ونچ کی رسی ٹوٹ گئی اور اس کا ڈول ان تینوں آدمیوں پر گر پڑا جس سے دو آدمی زخمی اور ایک ہلاک ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ اس ڈرائیور کے ذمہ شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) دوسرا مسئلہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس ہلاک ہونے والے شخص کا صرف ایک رشتہ دار موقع پر موجود تھا جبکہ اصل ورثاء پاکستان میں تھے اور یہ واقعہ سعودی عرب میں پیش آیا تھا اور ہلاک ہونے والے شخص کے اس دور کے رشتہ دار کے پاس اسناد موجود نہیں تھے اس لیے اس کو پاکستان میں تصور کر کے اسناد (کاغذات) پاکستان میں بنا کر بھیجے گئے۔ تو ہلاک ہونے والے شخص کے اس رشتہ دار اور ایک شریک شخص نے جس کے ساتھ سعودی عرب کے اسناد موجود تھے ان دونوں نے سعودی عدالت میں اس ڈرائیور کو معاف کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے کے اس رشتہ دار اور شریک کا ڈرائیور کو معاف کر دینے کے بعد اس کے اصل ورثاء یعنی والد اور بھائیوں کو دعوے کا شرعاً حق حاصل ہے یا نہیں؟ اور ڈرائیور کو ان دونوں کی طرف سے معاف کر دینے سے اصل ورثاء کا حق دعوٰے ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں؟

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہلاک ہونے والا شخص اس کام کا ٹھیکیدار اور ونچ کا مالک بھی خود تھا اور یہ اندوہناک واقعہ ونچ کی رسّی کمزور ہونے کی وجہ سے پیش آیا جبکہ ونچ کا مالک رسّی کی اس کمزوری سے آگاہ بھی تھا اور اس نے اس کمزوری کو دُور نہ کیا۔

الجواب:۔ (۱) صورتِ مسئولہ میں یہ قتل (ہلاکت) اقسامِ قتل میں سے ایک قسم جاری مجری خطاء میں داخل ہے شرعاً اس قسم کے قتل میں دیت لازم ہوتی ہے جو قاتل ادا کرے گا۔ چونکہ بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتول نے خود کمزور رسّی ڈرائیور کو مہیا کی تھی اور بار بار اس کمزوری سے مطلع کرنے کے باوجود لیت ولعل سے کام لیتا رہا اور اس کمزور رسّی کو تبدیل نہ کیا کہ اچانک یہ حادثہ پیش آگیا۔ تو گویا مقتول خود ہی ایک گونہ اس حادثے کا ذمہ دار ہے اس لیے دیت دونوں (قاتل ومقتول) کے مابین مشترک ہوگا اور مقتول چونکہ فوت ہو چکا ہے لہٰذا اس کا حصّۂ دیت ساقط ہوا، باقی قاتل (ڈرائیور) کے

کے ذمے مقتول کے ورثاء کو نصف دیت یعنی پانچ ہزار دراہم چاندی کے یا پانچ سو دینار سونے کے یا اس کی مروجہ قیمت ادا کرنا لازم ہے، مروجہ کرنسی کا حساب کسی ماہر سنار سے لگوایا جائے۔

لما قال الشیخ وهبة الزحیلی: یضمن المتسبب مع المباشر اذا کان للسبب تاثیر یعمل بانفراده فی الاتلاف متی انفرد عن المباشر ای اذا تعادلت قوة السبب والمباشر او اعتدل السبب والمباشر بان تساوی اثرهما فی الفعل کان المتسبب والمباشر مسئولین معاً عن القتل کان اجتمع علی قیادة دابة سائق وراکب علیها فما احدثته من تلف کان الضمان علیهما لان سوق الدابة وحده یؤدی الی التلف وان لم یکن هناك شخص راکب علیها وکذلك اذا نخس رجل الدابة بأمر راکبها یکون الضمان علی الاثنین لأن الناخس بمنزلة السائق۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۶ ص ۲۴۸ ثالثاً تضمین المتسبب والمباشر معاً)۔

(۲) کسی قاتل کو دیت وغیرہ معاف کرنا شرعاً مقتول کے ان ورثاء کا حق ہے جو اس کی میراث میں حصۂ شرعی کے حقدار ہوں کوئی دوسرا شخص ان کے اس حق میں تصرف کا اختیار نہیں رکھتا۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق ڈرائیور کو معاف کرنے والے دونوں حضرات چونکہ مقتول کے حقیقی وارث نہیں تھے ایک تو مقتول کا دور کا رشتہ دار تھا اور دوسرے کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا جبکہ مقتول کے اصل وارث یعنی اس کا باپ زندہ تھا اسلئے ان ہر دو حضرات کی معافی بلا اذنِ باپ صحیح نہیں اور نہ اس سے ڈرائیور کے ذمے سے دیت ساقط ہوتی ہے لہٰذا قاتل اپنا حصۂ دیت مقتول کے باپ یا اسکے دیگر شرعی ورثاء کو ادا کرے گا تاہم اگر وہ دیت معاف کریں تو پھر اس صورت میں ڈرائیور کے ذمے سے دیت ساقط ہوگی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولا یجوز التصرف فی مال غیره بلا اذنه ولا ولایته إلا فی مسائل الخ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار جلد ۵ ص ۱۴۰ کتاب الغصب)

وقال العلامة وهبة الزحیلی: ومن لا حق له فی العفو هو الاجنبی غیر الوارث عند الجمهور وغیر العصبة عند المالکیة وکذا الاب والجد فی قصاص وجب للصغیر عند المالکیة والحنفیة لان الصغیر هو صاحب الحق ولابیه وجده ولایة الاستیفاء فقط۔ (الفقه الاسلامی وادلته جلد ۶ ص ۲۹۸ شروط العفو)

اُجرتی قاتل سے قصاص لینے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حکومتِ پاکستان کے قانون کے متعلق کہ جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی شخص کو پیسوں کے ذریعے یعنی اجرتی قاتل سے قتل کرایا ہے تو اس کی سزا بھی قاتل کے برابر ہے یعنی اس کو بھی قصاصاً قتل کیا جاوے گا۔ شریعتِ مقدسہ میں اجرت پر کسی کو قتل کروانے والے کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں ضابطہ کے مطابق قصاص اجیر پر آتا ہے مستأجر پر نہیں آتا، البتہ مستأجر کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: ولو قال اقتل ابی فقتله کان علی القاتل دیة لابنه۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۴۳۱ کتاب الجنایات۔ فصل فیمن یقتل قصاصاً وفیمن لایقتل)[1]

مقتول کے ورثاء کے ذریعے قصاص کے اجراء کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! امارتِ اسلامی افغانستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی وجہ سے جب قصاص لیا جاتا ہے تو بعض اوقات قاضی مقتول کے وارث کو اسلحہ دے کر اپنی موجودگی میں قصاص کا اجراء کراتا ہے، کیا شرعاً یہ طریقہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حدود و قصاص کا اجراء حاکمِ وقت کی ذمہ داری ہے، البتہ ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ حدود کا اجراء صرف حاکمِ وقت بلاواسطہ کرے گا بخلاف قصاص کے کہ حاکم کی موجودگی میں اس کی اجازت پر مقتول کے وارث سے بھی اس کا اجراء کرایا

---

[1] وفی الهندیة: وفی جنایات المنتقی قال ابو یوسف رحمه الله تعالیٰ قال ابو حنیفة رحمه الله تعالیٰ فی رجلٍ قمط رجلاً فطرحه قدام سبع فقتله السبع لم یکن علی الذی فعل ذلك قودٌ ولا دیة لکنه یعزر و یضرب و یحبس حتی یموت الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۶ کتاب الجنایات۔ الفصل الثانی فیمن یقتل قصاصاً وفیمن لایقتل)

ومثله فی درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۱ ص۹۱،۹۰ المادة ۸۹،۹۰۔

جاسکتا ہے ، اور اگر اس طرح قصاص کا اجراء کرنے سے بعد میں فریقین میں فتنہ و فساد کا خطرہ ہو تو اس کا اجراء بھی قاضی خود کرائے تاکہ کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکے ۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: استیفاء الحدود یکون بواسطۃ الامام الحاکم واما القصاص فیجوز لولی الدم استیفاؤہ بشرط وجود الامام۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۲۶۲ الفرق بین القصاص والحدود الاخری)

قصاص کے اجراء سے گناہ کے ختم ہونے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی قاتل سے شریعت کے مطابق قصاص لیا جائے تو کیا اس سے قاتل کا یہ گناہ معاف ہو جائے گا یا نہیں ؟ یا توبہ و استغفار کرنا بھی لازمی ہے کہ بدون اس کے معاف نہ ہوگا؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب سے مستفید فرمائیں ۔

الجواب:۔ کسی شخص کو قتل کرنے سے دو قسم کے حق قاتل کے ذمے ہوتے ہیں ایک حق العبد یعنی مقتول کے ورثاء کا حق جو کہ قصاص لینے سے پورا ہو جاتا ہے، اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا حق ۔ تو حنفیہ کثر اللہ سوادہم کی اس بارے میں رائے یہ ہے کہ قصاص لینے یا مقتول کے ورثاء کے معاف کر دینے سے اگرچہ حق العبد ادا ہوا لیکن اللہ کے حق کی ادائیگی کا کفارہ نہ ہو سکا بلکہ اس کے لیے توبہ و استغفار ضروری ہے، اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک حدود زواجر ہیں جوابر نہیں، البتہ جمہور علماء کے نزدیک حدود چونکہ جوابر (کفارات) ہیں اسلئے ان کے ہاں قصاص اور عفو سے بھی یہ گناہ ختم ہو جاتا ہے ۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : اختلف العلماء فی امرہ کما اختلفوا فی الحدود ھل ھی زواجر ام جوابر ؟ قال الجمھور القصاص من القاتل او العفو عنہ یکفر اثم القتل لان الحدود کفارات لاھلھا وھذا عام لم یختص قتلا من غیرہ۔ قال النووی: ظواھر الشرع تقتضی سقوط المطالبۃ بالعقوبۃ فی الآخرۃ۔ قال الحنفیۃ: القصاص او العفو لا یکفر اثم القتل لان المقتول المظلوم لا منفعۃ لہ فی القصاص وانما القصاص منفعۃ للاحیاء لیتناھی الناس عن القتل وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ ۔ (الآیۃ) (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۲۶۲ ھل القصاص یکفر اثم القتل)

قاضی کا اپنے علم پر قصاص کے اجراء کا حکم دینا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک شخص بڑا ظالم اور بدمعاش ہے، لوگوں کے

عزت وآبرو اور جان ومال کو ہر وقت اس سے خطرہ رہتا ہے، اور اس نے علی الاعلان کئی قتل بھی کیے ہیں جس کا جج (قاضی) صاحب کو بھی خوب علم ہے جبکہ لوگ اس کے ڈر اور خوف کے مارے اس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے کو بھی تیار نہیں۔ تو کیا جج اپنی معلومات کے حوالے سے اس کو قصاصاً قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حنفیہ کے ہاں اس مسئلہ میں دو قسم کی آراء ہیں۔ (۱) متقدمین احناف کے نزدیک قاضی یا جج اپنے علم کے مطابق قصاص لے سکتا ہے (۲) جبکہ متاخرین احناف عدم اجازت کے قائل ہیں کہ قاضی اپنی معلومات کے مطابق قصاص جاری نہیں کر سکتا اور اسی پر فتویٰ ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: یجوز القضاء بعلمه فی القصاص دون الحدود۔

قال ابن عابدینؒ، تحته مبنی علیٰ ان القاضی یقضی بعلمه فی غیر الحدود والفتویٰ الیوم علیٰ عدم جواز القضاء بعلمه مطلقاً۔ (رد المحتار والدر المختار ج ۶ ص ۵۴۹ کتاب الجنایات)[1]

حالتِ نشہ میں قتل کرنے والے سے قصاص لینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی آدمی نشے کی حالت میں زمین وآسمان کا فرق نہ کر سکتا ہو اور نہ ہی اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی تمیز رہتی ہو، اب اگر وہ اسی حالت میں غیر اختیاری طور پر کسی کو قتل کر دیتا ہے تو کیا شرعاً اس سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ قاتل سے قصاص لینا مقتول کے ورثاء کا شرعی حق ہے اور وہ بالاتفاق مذاہب اربعہ سکران (نشہ والے) سے ساقط نہیں ہوتا، اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ قرآن وسنت کے حکم کا مخاطب ہونے کیلئے نشہ مانع شرعی نہیں۔

لما قال العلامة وهبة الزحیلی: القصاص من السکران ویقتص من السکران

---

[1] قال العلامة وهبة الزحیلی: یجوز للقاضی القضاء بعلمه الشخصی فی القصاص دون الحدود وهذا عند متقدمی الحنفیة وافتی المتاخرون بعدم القضاء بالعلم مطلقاً سداً للذریعة اما قضاء السوء سواء فی القصاص والحدود ودام فی الاموال وغیرها۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۶ ص ۲۶۴ الفرق بین القصاص والحدود الاخری)

بشراب محرم باتفاق مذاھب الاربعۃ لان السکر لاینافی الخطاب الشرعی ای التکلیف فتلزمہ کل احکام الشرع وتصح عباراتہ کلھا فی العقود کالبیع ۔ الخ

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۲۶۵ شروط القاتل) لہ

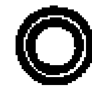
مقدارِ دیت سے کم مال پر صلح کرنا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! ہم چند ساتھی مل کر قتل کے سلسلہ میں دو گروپوں کی آپس کی دشمنی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور فریقین بھی صلح پر آمادہ ہیں، اب اگر ہم مقدارِ دیت سے کم مال پر فیصلہ کریں اور مقتول کے ورثاء اس پر راضی ہو جائیں تو کیا ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب :۔ قتلِ عمد سے صلح کرنے کی صورت میں دیت کی مقدار کی پابندی ضروری نہیں ہے بلکہ جتنی مقدار مال پر فریقین راضی ہو جائیں اور صلح کریں تو قاتل پر مقتول کے ورثاء کو اتنی مقدار میں مال ادا کرنا لازم ہو گا چاہے وہ مال مقدارِ دیت سے کم ہو یا زیادہ ۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وصح فی الجنایۃ العمد مطلقاً ولو فی نفس مع اقرار بأکثر من الدیۃ والأرش أو باقل لعدم الربو۔ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت (قولہ لعدم الربو) لان الواجب فیہ القصاص وھو لیس بمال۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۵۳۰ کتاب الدیات) ؎۲



لہ لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: یجب القود ای القصاص بقتل کل محقون الدم بالنظر لقاتلہ درر .... بشرط کون القاتل مکلفا لما تقرر أنہ لیس لصبی ومجنون عمد ۔

{ الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۵۳۲
کتاب الجنایات ۔ فصل فیما یوجب القود الخ }

؎۲ لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: یجوز الاعتیاض فی القصاص بخلاف الحدود ومنھا حد القذف واجاز الشافعیۃ المعاوضۃ فیہ ۔

{ الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۲۶۴
الفرق بین القصاص والحدود الاخریٰ }

مسودہ آرڈیننس نفاذ قصاص و دیّت

مجریہ ۱۹۸۰ء

اور

دار العلوم حقانیہ کی سفارشات و ترامیم

حکومتِ پاکستان نے نمبر ۳ (۲۱) (۲۲) /۸۰ آر/ س، آئی آئی مجریہ ۱۳ ارکتوبر ۱۹۸۰ء کے تحت جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص و دیت آرڈیننس) ۱۹۸۰ء کا مسودۂ قانون رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسودہ کو دار العلوم حقانیہ کی تجاویز اور اصلاحی ترمیمات کے لئے بھیجا، چنانچہ دار العلوم حقانیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحب، نائب مفتی حضرت مولانا غلام الرحمٰن صاحب نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحبؒ کی راہنمائی، مشورہ اور موجودگی میں اس مسودہ پر از روئے فقہ و شریعت نظر ثانی کی اور جہاں جہاں قابلِ اصلاح چیز نظر آئی اس کی اصلاح کر کے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی خدمت میں ارسال کیا، اور قانونِ قصاص و دیت میں کل ۹ سفارشات پیش کی گئیں۔ (مرتب)

بخدمت اقدس جناب چیئرمین صاحب اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کے مرسلہ مسودہ آرڈیننس جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص و دیت آرڈیننس ۱۹۸۰ء) پر تفصیلی غور کیا گیا، چونکہ بعض دفعات ایسی تھیں جن کا تذکرہ مسودہ میں اجمالاً تھا اور ان کا تفصیلی حوالہ تعزیراتِ پاکستان پر دیا گیا ہے، تعزیراتِ پاکستان اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے

اور ہم ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے فی الوقت جواب دینے سے قاصر ہیں، جیسا کہ دفعہ ۲
(۱۰۵) (الف) (ب)، (ج) (۱۰۶) ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۱۱، (۱) (۲)، ۱۲۱ (۱) ۲ تعزیرات پاکستان سے
متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر دفعات کے متعلق تجاویز اور ترامیم پیش خدمت ہیں:-

(۱) اس مسودہ میں تقریباً ۳۰ مقامات ایسے ہیں جہاں قیدِ محض یا قیدِ با مشقت کو مختلف مدتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یا بعض مقامات پر مختلف تعداد میں کوڑوں کی سزا بیان کی گئی ہے، تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ یہ تمام سزائیں جو بیان کی گئی ہیں ان کے ساتھ ساتھ یہ تصریح ضروری کرنی چاہیئے کہ یہ سزائیں محض تعزیرات ہیں۔ جو حکومت کی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہیں ورنہ یہ سزائیں شرعی نہیں ہیں جو کسی خاص نص کے تحت آتی ہوں، البتہ کوڑوں کی سزا کا جن مقامات پر ذکر ہے تو چونکہ یہ غیر منصوص سزاؤں میں ایک شدید ترین سزا ہے لہٰذا اس کے نفاذ میں نہایت احتیاط چاہیئے اور بصورتِ تعزیر دفع فساد کیلئے بعض مواقع پر اس کا اجرا کرنا چاہیئے تاکہ لوگوں کے لیے عبرت بنے لیکن اس کو کلیہ نہ بنایا جائے۔ مسودہ کے مندرجہ ذیل مقامات پر یہ سزائیں مذکور ہیں۔ دفعہ (۵) شق ب، ج۔ دفعہ ۱۶، دفعہ ۲۱ ب، دفعہ ۲۳ ب، دفعہ ۳۵ الف، ب، دفعہ ۳۷ الف، ب۔ دفعہ ۳۹، دفعہ ۴۳ ب، ج۔ دفعہ ۴۵ ب، دفعہ ۴۷ ب، دفعہ ۴۸، دفعہ ۵۱ ب، دفعہ ۳۵ ب، دفعہ ۵۸، دفعہ ۶۰، دفعہ ۶۲، دفعہ ۶۳، ۶۶، ۶۸، ۷۰، ا، دفعہ ۷۱ ب ۸۱ — ۸۲ الف ۹۰ — ۹۱ — ۹۴ ج، دفعہ ۹۵، ۹۷ الف ب، دفعہ ۹۸ — ۱۰۹ — ۱۱۱۔

(۲) چونکہ یہ آرڈیننس نفاذ قصاص و دیت سے تعلق رکھتا ہے اور شریعت میں قصاص و دیت کے قانون کو حفاظتِ نفس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ مقرر فرمایا ہے، لہٰذا اس میں حفاظتِ نفس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے تاکہ مبادا کسی طریقہ سے مظلوم ورثاء کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ لہٰذا قاتلوں کا پورا پورا محاسبہ ہونا چاہیئے، اور جو لوگ قاتلوں کی حمایت کرتے ہیں یا ان کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں اُن کے لیے بھی از روئے مصلحت کوئی تعزیری قانون مقرر کیا جائے، اگرچہ پناہ دینے والے ایک قوم، ایک قبیلہ یا ایک خاص علاقہ یا حکومت کے بعض افراد ہی کیوں نہ ہوں، اور نیز اُن علاقوں میں بھی قاتلوں کو گرفتار کرنا چاہیئے جو علاقے پولیٹیکل ایجنٹ کے زیرِ نگرانی ہوں جہاں قاتل مفرور ہو کر پناہ لے لیتا ہے۔

(۳) اس مسودہ کے صفحہ ۲ پر دفعہ ۲ کی شق (ج) میں جہاں بالغ[1] کی تعریف کی گئی ہے اس میں کچھ اضافہ ضروری ہے اور یہ تعریف یوں ہونی چاہیئے کہ:۔

"بالغ سے مراد ہر وہ مرد و زن ہے جس پر علاماتِ بلوغ ظاہر ہوتی ہوں مثلاً احبال، حمل یا موئے زیر ناف کا ہونا۔ اور یا عورت سترہ سال اور مرد اٹھارہ[2] سال کی عمر کو پہنچ چکا ہو۔"

مذکورہ دونوں صورتوں میں سے ہر اس صورت کو اعتبار دیا جائے گا جو صورت پہلے وقوع پذیر ہو۔

(۴) صفحہ ۴ دفعہ ۱۲ کی تشریح میں جہاں گلا گھونٹنے کی صورت کو قتلِ عمد کی صورتوں میں شمار کیا گیا ہے وہاں یہ تصریح کرنی ضروری ہے کہ اس گلا گھونٹنے کی صورت میں قاتل کو قتل کرنا[3] حداً نہیں ہوگا بلکہ سیاستہً ہوگا۔

ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسةً۔ (الفتاوی الهندیة ج ۶ ص ۵ کتاب الجنایات، الباب الثالث)[4]

(ترجمہ) "اور اگر کسی کا گلا گھونٹا گیا تو اس قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر قاتل مشہور گلا گھونٹنے والا ہو جس نے اس کے علاوہ اور لوگوں کے گلے بھی گھونٹے ہوں تو پھر اس کو از روئے مصلحت سیاستہً قتل کیا جائے گا۔

---

[1] سرکاری مسودہ میں بالغ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ جو شخص ۱۸ سال یا بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہو الخ۔

[2] یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، صاحبینؒ کے نزدیک ہر دونوں کے لیے پندرہ سال تک پہنچنا عمرِ بلوغت ہے۔

[3] یعنی گلا گھونٹنے اور مطلق زہر پلانے کو قتلِ عمد کہنا صحیح نہیں ہے، البتہ بعض صورتوں میں ایسے شخص کو تعزیراً قتل کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ شرعی اصطلاحات حد اور تعزیر کو بدلنا اور مخلوط کرنا مستقبل میں بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

[4] قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسةً۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۴۴۰ کتاب الجنایات، باب القتل)

(۵) مذکورہ بالا صفحہ۴ دفعہ۴ کی مذکورہ شق میں زہر دلانے کی صورت میں جو قتلِ عمد میں شمار کیا گیا ہے، اس کے متعلق یہ واضح کرنا چاہیئے:۔

"کہ اس سے زہر دلانا مراد ہے جسے پلانے والے نے زور اور جبر کر کے بالاکراہ پلایا ہو تو پھر اس میں قصاص اور دیت دونوں نہیں ہیں، البتہ حکومت اس صورت میں بھی دفعِ فساد کے لیے ازروئے مصلحت سیاسۃً تعزیر دے سکتی ہے۔"

جیسا کہ عالمگیری میں اس کی تصریح موجود ہے:۔

واذا ناولہ فشرب من غیر ان اکرھہ علیہ لم یکن علیہ قصاص ولا دیۃ سواء علم الشارب بکونہ سما اولم یعلم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۶ کتاب الجنایات الباب الثانی)

(ترجمہ) "اور جب کسی کو زہر دے کر بغیر کسی زور اور جبر کے پلایا ہو تو اس صورت میں اس پر قصاص اور دیت دونوں واجب نہیں ہیں اگرچہ پینے والے کو اس کے زہر ہونے کا علم ہو یا نہ ہو۔"

صفحہ۱۲ دفعہ۲۱ میں قاتل کو بصورت عفو یا صلح کے بعد تعزیراً قتل کرنے میں نہایت ہی احتیاط کرنی چاہیئے تاکہ غیر اسلامی قوانین بالخصوص یہودیت سے امتیاز ہو۔

(۶) صفحہ۱۷ دفعہ۲۸ میں قتل کی صورت میں قاتل کو وراثت سے محرومی کا جو حکم بیان کیا گیا ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ یہ قتلِ عمد، شبہ عمد، خطاء، جاری مجریٰ خطا کی صورت میں ہے یعنی ان چار صورتوں کے قتل کی صورت میں قاتل مقتول کی وصیت یا حقِ وراثت سے محروم رہے گا اور قتل بسبب کی صورت میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں رہے گا، جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ کسی دوسرے کی جگہ میں کنواں کھودا اور کوئی شخص اس کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو گیا تو اس کو قتل بسبب کہا جائے گا جس میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ الہندیہ)

واما القتل بسبب فمثل حفر البئر ووضع الحجر فی غیر ملکہ وموجبہ اذا تلف بہ ادمی الدیۃ علی العاقلۃ ولا یتعلق بہ الکفارۃ ولا حرمان المیراث عندنا۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۳ کتاب الجنایات۔ الباب الاول)

(ترجمہ) "اور قتل بسبب جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ میں کنواں کھودا یا کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ کوئی پتھر رکھا اور اس کی وجہ سے کوئی شخص ہلاک،

ہوگیا تو اس میں بصورت ہلاکتِ انسان قاتل کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی اور ہمارے مذہب میں اس میں کفارہ اور وراثت سے محرومی نہیں ہے۔"

(۷) صفحہ ۴۶ دفعہ ۱۱۲ میں سزائے موت کی توثیق کا اختیار جس عدالتِ مرافعہ کو دیا گیا ہے اس میں یہ تصریح ضرور کرنی چاہیئے کہ "بشرطیکہ اس عدالتِ مرافعہ کا فیصلہ بھی شرعی ہو۔"

(۸) صفحہ ۴۸ دفعہ ۱۲۲ کے آخر میں یہ اضافہ کرنا چاہیئے: "نیز خاص اور معتمد علیہ اداروں اور اہلِ حل وعقد سے بھی رائے طلب کرنی چاہیئے۔"

(۹) مذکورہ دفعات میں جہاں جرمانہ کا ذکر آیا ہے وہاں جرمانے سے مراد تعزیر بالضرب یا بالحبس مراد ہو نہ کہ تعزیر بالمال، یہ موجودہ مروجہ جرمانہ ایک غیر شرعی امر ہے۔

مسودہ قانون دیت وقصاص کے بعض زیر بحث نکات

ویسے تو ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں کہ جن کو دین میں جدت پسندی کا بڑا شوق ہوتا ہے اور وہ ہر مسئلے میں چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی ایک جدت پیدا کرنے کی نام نہاد کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دنیاوی امور میں تو ایسا کرنا ممکن ہے مگر دینی امور اور ان کے مسائل میں اپنی ذہنی ساخت کو داخل کر کے اسلام کے مسلمہ اصولوں کو پامال کرنا کسی بھی دور کے علماء حق اور مفتیان کرام نے گوارا نہیں کیا اور جب بھی کسی مغرب زدہ اور مفسد خیال شخص نے اسلامی قوانین پر قلم اٹھا کر بزعم خود ان میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی تو ان محافظین دین نے ایسے لوگوں کا بھرپور تعاقب کیا اور ان کے ہر ایک نقطے کا دندان شکن جواب دیا۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جب دیت وقصاص آرڈیننس نافذ ہوا تو اسی "روشن خیال" طبقہ نے اس آرڈیننس کے مسلمہ نکات کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے رسائل وجرائد اور اخبارات میں مشق سخن بنایا۔ روزنامہ "مشرق" میں نام نہاد "محقق" اور "سکالر" نے ان مسلمہ اور طے شدہ نکات پر سوالات اٹھائے۔ جامعہ حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے اس "محقق" کا بھرپور تعاقب کیا اور قرآن وسنت کی روشنی میں اس کے ہر سوال کا مدلل جواب دیا جو اسی وقت دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا ہے اب افادۂ عام کے لئے فتاوٰی دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)

مسوّدہ قانون دیّت و قصاص کے بعض زیر بحث نکات

عورت، غیر مسلم اور نابالغ کی شہادت

روزنامہ مشرق مؤرخہ میں کسی ایڈوکیٹ کا مضمون بعنوان "دیت اور قصاص کے مسودۂ قانون کا جائزہ، قصاص سے مستثنیٰ قاتل" نظر سے گذرا، مضمون کے عنوان سے بظاہر مضمون نگار کا اخلاص مترشح ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک خالی اور بے معنی بلکہ مفسد اخلاص ہے، مضمون نگار کی اکثر باتیں قرآن و حدیث سے لاتعلقی پر مبنی ہیں کیونکہ صاحب مضمون ہر جگہ اپنی رائے سے قرآن و حدیث کو متصادم کرکے اپنی عقلی توجیہات کو ترجیح دیتے ہیں، مثلاً صاحب مضمون لکھتے ہیں۔

"اسلامی قانون کی بنیاد قرآن و سنت ہے تمام قوانین حالات کو سامنے رکھ کر اجتہاد کے ذریعہ قرآن و سنت کی روشنی میں تشکیل دیئے جانے ضروری ہیں' اجتہاد ہی کے ذریعہ سابقہ فقہاء کی رائے سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ سابقہ فقہاء نے اپنے وقت اور حالات کے تحت قرآن و سنت کی روشنی میں کسی مسئلہ پر رائے دی تھی، چونکہ وہ حالات اب نہیں رہے اس لیے ان حالات کے تحت قائم شدہ رائے بھی بدلی جاسکتی ہے، موجودہ مجوزہ مسودۂ قصاص و دیت میں سابقہ فقہ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن حالات کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے ہیں ــــ"

صاحب مضمون کے مذکورہ جملے اس بات پر دال ہیں کہ ائمہ کرام جو اپنے اپنے زمانوں میں محنت و مشقت کرکے لاکھوں مسائل مستنبط کر گئے ہیں' یہ مسائل موجودہ حالات کے تقاضوں کے موافق نہیں ہیں، چند امور چھوڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوکر کوئی نئے طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ معلوم نہیں کہ مضمون نگار کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، اگر ائمہ اربعہؒ میں سے کسی ایک مسلک سے وابستہ ہوں تو پھر ان کا یہ نظریہ اور رائے غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر اس نظریہ پر عمل کیا جائے تو پھر ائمہ مجتہدین کے ان تمام مسائل کو پس پشت ڈالنا ہوگا جن کے لیے ائمہ کرام نے سالہا سال تک رات دن ایک کرکے محنت کی ہے اور پھر بھی احادیث اور نصوصِ قرآنیہ سے مسائل کا استنباط کرنا بھی کارے دارد، جو عوام کو تو درکنار خواص کو بھی حاصل نہیں ہے، لہٰذا اس فساد و شر کے دور میں ائمہ کرام کی تقلید کے علاوہ کامیابی کا

اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے بلکہ ہم جیسے لاعلموں کے لیے تقلیدِ شخصی واجب ہے، چونکہ تقلید کا موضوع خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں، یہاں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے صرف سید الطائفہ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ایک دو ارشاد تقلید سے متعلق نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

الامة اجتمعت على ان يعتمدوا على السلف فى معرفة الشريعة فالتابعون اعتمدوا فى ذلك على الصحابة وتبع التابعين و هكذا فى كل طبقة اعتمد العلماء على من قبلهم والعقل يدل على حسن ذلك لان الشريعة لا يعرف الا بالنقل والاستنباط والنقل لا يستقيم الا بان يأخذ كل طبقة عمن قبلها بالاتصال -

(عقد الجيد فى الاجتهاد والتقليد ص۳۶ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

(ترجمہ) "بیشک تمام امت اس بات پر متفق ہے کہ شریعت کے سمجھنے میں اسلاف ہی پر اعتماد کرنا ہوگا، تابعین نے صحابہ پر اعتماد کرکے دین کو لیا ہے اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا ہے اور ایسا ہی ہر دور کے علماء نے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر دین پر عمل کیا ہے، اور عقلاً بھی یہ ایک اچھی بات ہے کیونکہ شریعت کا دارومدار نقل پر ہے اور نقل سوائے اس اتباعِ اسلاف (تقلید) کے اور کسی طریقہ پر ممکن نہیں"۔

اور چند صفحات آگے چل کر حضرت شاہ صاحبؒ مزید فرماتے ہیں :-

وبما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج عنها خروجاً عن السواد الاعظم - (عقد الجيد فى الاجتهاد والتقليد ص۳۸ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

(ترجمہ) "اور چوتھی صدی (ہجری) میں ماسوائے ان مذاہب اربعہ کے اور کوئی حق مذہب نہ رہا تو ان مذاہب کی تقلید اجماعِ امت اور تقلید نہ کرنا مخالفِ اجماعِ امت ہے"۔

لہٰذا ائمہ کرام نے جو مسائل مستنبط کئے ہیں وہ آج بھی حالات کے موافق اور مناسب ہیں، اگر کوئی حکم بظاہر ناموافق معلوم ہوتا ہو تو یہ ہمارے ہی فہم کا قصور ہوگا نفس الامر میں یوں نہیں ہوگا۔ تاہم اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کا حکم فقہ کی کسی کتاب میں موجود نہ ہو تو پھر مستند علماء اور با اعتماد صاحب علم حضرات ایسے جزئیات کا حکم باہم مشورہ کرکے قرآن وحدیث اور فقہ کے ان اصولوں کے مطابق نکال سکتے ہیں جن اصولوں پر فقہ کا دارومدار ہے، لیکن ان حضرات کے لیے بھی خاص شروط ہیں جو کتب فقہ میں موجود ہیں۔ "خون کا مسئلہ اور آنکھ کی تبدیلی" پر "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کا بحث وتحقیق کے بعد "انسانی اعضاء کی پیوندکاری" کے نام سے رسالہ جاری کرنا اس کا بیّن ثبوت ہے۔

لیکن قصاص و دیت یا اس کے علاوہ اور اس جیسے مسائل جن کا حکم صرف ایک کتاب میں نہیں بلکہ تمام کتبِ فقہ میں موجود ہیں تو پھر اس کے باوجود ان کو چھوڑ کر نئے راستے تلاش کرنا کہاں کا انصاف ہے بلکہ ماسوائے تضیع اوقات اور باعثِ اضلال و تضلیل کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے ـــــ

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مذکورہ نام نہاد دانشور صاحب اپنے خود ساختہ نظریۂ اجتہاد کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ :۔

ـــــ "مثلاً مجوزہ آرڈیننس میں قتل عمد کے ثبوت کے لیے عورت کی گواہی اور معصوم بچے کی گواہی کو قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا ہے، دفعہ ۱۰ میں قتلِ عمد کے ثبوت کے لیے دو بالغ مردوں کی گواہی کو ہی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اب فقہاء کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا قرآن و سنت میں عورت اور نابالغ کی گواہی کی ممانعت کر دی گئی ہے، قرآن و حدیث میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے"ـــــ

صاحبِ مضمون کی یہ تجویز نفاذِ شریعت کے لیے معاون نہیں بلکہ مبطل ضرور ہے کیونکہ یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے بلکہ حقیقت میں اسلام کی بیخ کنی ہے ـــــ

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　　　که با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

شاید صاحبِ مضمون کو اس حدیث اور آیتِ کریمہ کا علم نہیں جو حدود اور قصاص میں صرف بالغ مردوں کی گواہی کے متعلق وارد ہے، لیکن ان کے عدمِ علم کی وجہ سے آیت اور حدیث کا عدم وجود لازم نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث میں یہ پابندی ہے کہ قتل کے امور میں صرف اور صرف ۲ بالغ مردوں ہی کی گواہی قابلِ قبول ہے عورتوں کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ چنانچہ علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:۔

لحدیث الزهري مضت السنة من لدن رسول الله صلی الله علیه وسلم والخلیفتین من بعده ان لا شهادة للنساء فی الحدود والقصاص۔ وقال الله تعالیٰ واستشهدوا شهیدین من رجالکم۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "حضرت زہریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر خلفائے راشدینؓ میں سے شیخینؓ کے دور تک کسی نے حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ تم دو مردوں کو گواہی کے لیے پیش کرو۔"

اور آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:۔

ولان شهادة النساء فیها شبهة البدلیة لان کل اثنین منهن قائمة مقام رجل فلا یقبل فیما یندرأ بالشبهة۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "اور چونکہ دو عورتوں کا ایک مرد کے قائم مقام ہو کر گواہی دینے کی وجہ سے شبہ بدلیت ہے لہٰذا حدود قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہو گی"

اب صاحبِ مضمون خود غور کریں کہ کیا عورت کی گواہی پر شریعتِ مقدسہ میں کوئی پابندی ہے یا نہیں؟ موصوف ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

—— "اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی قتل کو ایک بچہ جو کہ سمجھ بوجھ رکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے خود دیکھتا ہے وہی اکیلا اس قتل کا گواہ ہے باقی گواہ چشم دید نہیں ہیں بلکہ بچہ ہی واقعاتی گواہ ہے تو اس بچے کی گواہی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، جبکہ فطرتاً ایک بچہ جھوٹ بھی کم بولتا ہے، اسے جھوٹ پڑھایا بھی نہیں جاسکتا، وہ قاتل کو بھی پہچانتا ہے اور آلۂ قتل کو بھی پہچانتا ہے، اپنی زبان سے پورا واقعۂ قتل بتا سکتا ہے، تو پھر اس کی گواہی کو نظر انداز کر دینا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے"۔

واضح ہو کہ ایسے واقعات میں بچے کی گواہی کو اعتبار دینا عقلاً و نقلاً باطل ہے۔ نقلاً تو اس لیے کہ قرآن مجید نے گواہی دینے کے لیے رَجُلَيْنِ کا لفظ استعمال کیا ہے اور قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے بچے کی گواہی کا نا قابلِ قبول ہونا صریح ہے کیونکہ بچے کو رجل نہیں کہا جاسکتا اور نہ اُردو زبان میں بچے کو مرد کہا جاتا ہے، اور عقلاً بھی باطل ہے۔

(۱) فقہاء نے بالاتفاق گواہی کی ادائیگی کے وقت گواہ کا بالغ ہونا شرط قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

ولا تقبل شهادة المملوك والصبي لانهما من الولاية ولا ولاية لهما على انفسهما فالاولى ان لايكون لهما على غيرهما ولاية - (البحر الرائق ج ۷ ص۶۶ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "غلام اور نابالغ کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ گواہی ایک طاقت کا استعمال ہے یہ دونوں عاجز ہو کر غیر پر کیا طاقت استعمال کریں گے"

(۲) یہ مسلمات میں سے ہے کہ گواہی کے لیے عقلِ کامل کا ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاگل کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے، لہٰذا اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا نابالغ بچے کی گواہی درست ہے یا نہیں؟ تو یہ ظاہر ہے کہ بچہ کم عقل اور کم ہوشیار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بچہ نابالغی کی عمر میں اپنے مستقبل کی کامیابی کو نہیں سمجھتا، بلکہ ایسے بچے کو والدین یا کسی دوسرے سرپرست کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ایک بچہ اس حیثیت سے کسی ایسے واقعہ کو کہاں من وعن یاد رکھ سکتا ہے اور پھر

ان حالات میں گواہی کا مکمل اظہار بھی نہیں کر سکتا، اس لیے بچے کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۳) اور اگر بالفرض ایک نابالغ لڑکا کسی گواہی کو زبانی یاد کر بھی لے تو عدالت یا کسی مجاز افسر کے سامنے اس کے رعب و جلال اور ہیبت کی وجہ سے مکمل گواہی نہیں سنا سکتا۔

(۴) نابالغ کی قوتِ ارادی مضبوط نہیں ہوتی اس لیے ڈرانے دھمکانے پر بچہ آسانی سے اپنی گواہی سے منحرف بھی ہو سکتا ہے، حقیقت کو غیر حقیقت اور غیر حقیقت کو حقیقت میں تبدیل کر سکتا ہے، بخلاف بالغ آدمی کے جو اپنی قوتِ ارادی پر مضبوطی سے ڈٹ سکتا ہے، گواہی درست اور صحیح نقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر ایک نابالغ کی گواہی پر عمل کیا جائے تو واللہ اعلم کتنے مفاسد کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔

صاحبِ مضمون آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

—— "غیر مسلم کی گواہی کو نظر انداز کر دینا بھی اسلام کی روح کے خلاف ہے"۔

تو واضح ہو کہ غیر مسلم کی گواہی غیر مسلم پر درست ہے، جیسا کہ خود مذکورہ مسودۂ آئین کی دفعہ ۱۰ کی شق (ب) میں کہا گیا ہے۔ اس لیے غیر مسلم کی گواہی مسلمان پر درست نہیں ہے اور یہ اسلام کی روحِ انصاف کے مخالف نہیں بلکہ عین موافق ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقید بقوله على مثله لانها لا تقبل على مسلم ولاية ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلاً۔ (البحر الرائق ج ۶ ص ۹۴ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "یعنی غیر مسلم کی غیر مسلم پر گواہی درست ہے لیکن غیر مسلم کی مسلمان پر گواہی درست نہیں ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا"۔

اور نیز کفار چونکہ فطرتاً اسلام سے بغض و عناد رکھتے ہیں اور وہ اپنے اسی بغض و عناد کی وجہ سے اسلام کے ماننے والوں پر نہ جانے کیا کیا جھوٹی گواہی دیں گے جو حقیقت میں اصلاحِ معاشرہ کے لیے ایک تباہ کن چیز بن جائے گی۔

صاحبِ مضمون مزید لکھتے ہیں:۔

—— "دس سال کی عمر سے اوپر کے قاتل قصاص سے مستثنیٰ نہ ہونے چاہئیں"۔

یہ تجویز بھی مذکورہ بالا تجاویز کی طرح ایک مضحکہ خیز تجویز ہے، کیونکہ شریعت میں مرد کے بلوغ کے لیے کم از کم دس سال کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے بلکہ کم از کم بارہ سال ہیں لہٰذا دس سال کے

قاتل کو قصاص سے مستثنیٰ نہ کرنا خلافِ شریعت ہے، کیونکہ شریعت میں نابالغ کے فعل پر عدمِ عقل کی وجہ وجہ سے قصاص نہیں ہے، البتہ عاقلہ سے دیت لینا واجب ہے تاکہ ہر ایک اپنے اپنے نابالغ بچوں کا خیال رکھے۔

مضمون نگار آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

—"اولاد کے قاتل کا معاملہ بھی عجیب ہے...... کوئی شخص کسی جنسی ترغیب پر اپنی اولاد کو قتل کر دے یا جب چاہے دوسرے لڑکوں کی ترغیب پر وراثت سے محروم کرنے کے لیے اپنے لڑکے کو قتل کر دے، مستوجب قصاص نہیں، یہ استثنیٰ اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

(۱) والد کو اولاد کے قتل پر قصاص میں قتل نہ کرنا اہلِ اسلام کا ایک اجماعی مسئلہ ہے، خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:۔

لا یقاد الوالد بولدہ۔ (جامع الترمذی ج ۱ ص ۲۵۱ ابواب الدیات) — (ترجمہ) "باپ کو بیٹے کے قتل پر قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔"

(۲) والد کی ہمیشہ کے لیے اپنی اولاد سے نہایت ہی محبت اور شفقت ہوتی ہے اور بتقاضائے شفقتِ پدری کوئی سلیم العقل شخص اپنے بیٹے کو قتل نہیں کرتا، لہٰذا اس شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا۔ جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:۔

ولان الوالد لا یقتل ولدہ غالباً لوفور شفقتہ فیکون ذٰلک شبہۃ فی سقوط القصاص۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "باپ عموماً اپنے بیٹے سے شفقتِ پدری کی وجہ سے بیٹے کو قتل نہیں کرتا تو اس شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا۔"

(۳) باپ چونکہ بیٹے کے احیاء اور زندگی کے لیے بظاہر ایک سبب ہے لہٰذا بیٹے کو اب باپ کے خاتمہ کے لیے سبب نہیں بننا چاہیئے۔

ولان الأب لا یستحق العقوبۃ بولدہ لانہ سبب لاحیائہ فمن المحال ان یکون الولد سببا لافنائہ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "باپ بیٹے کے قتل پر مستحق قصاص نہیں ہے کیونکہ باپ بیٹے کی زندگی کے لیے ایک سبب تھا تو اب بیٹے کا باپ کے فناء کے لیے سبب نہیں ہونا چاہیئے۔"

(۴) باپ اگر مشرک ہو اور بیٹا مسلمان ہو تو باوجود مشرک ہونے کے بیٹا باپ کو قتل نہیں کر سکتا تو

قصاص میں کیسے قتل ہوگا۔

ولهذا لا يقتله اذا وجده في صف المشركين مقاتلته۔ (البحرالرائق ج ۸ ص۲۹۶ کتاب الجنایات)
(ترجمہ) "اور بیٹا مشرک باپ کو جہاد کے دوران بھی قتل نہیں کرسکتا۔"

علاوہ ازیں اگر ایک باپ باوجود اس قدر احترام کے اپنے کسی لختِ جگر کی زندگی کا چراغ گل کردے تو پھر اس پر دیت واجب ہوگی جو کہ خود اس کے اپنے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی، اور بصورتِ مصلحت عدالت کی استصواب رائے سے تعزیر کا بھی مستحق ہے، لیکن ازروئے شرع والد پر قصاص نہیں ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:۔

وهذه الديات كلها على العاقلة إلا في قتل الاب ابنه عمدا فانها في ماله في ثلاث سنين ولا تجب على العاقلة۔ (الفتاوى الهندية ج ۶ ص۲۷ کتاب الدیات)
(ترجمہ) "دیگر تمام دیات قاتل کے عاقلہ سے لیے جائیں گے البتہ اگر باپ بیٹے کو قتل کردے تو اس کی دیت باپ کے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی عاقلہ پر واجب نہیں ہے۔"

بہر آخر میں لاعلم محبانِ دین سے عرض کروں گا کہ دینِ اسلام کا دارومدار نقل پر ہے عقل پر نہیں لہٰذا خدارا اس میں ذاتی رائے نہ دیجئے، مستند علماء سے بات پوچھ کر سپرد قرطاس کیا کریں تاکہ کسی کی گمراہی کا ذریعہ نہ بنے، اور اگر کوئی خواہ مخواہ بغض وعناد سے کام لے تو پھر اربابِ اقتدار پر لازم ہے کہ ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر اس کا مواخذہ کریں۔

عورت کی دیت نصف ہونے کا مسئلہ

وفاقی کونسل میں کی گئی تقریر

مسودہ قصاص و دیت پر ۲۵ جولائی ۱۹۸۴ء کو وفاقی کونسل میں مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی دس منٹ کے محدود وقت میں کی گئی تقریر وفاقی کونسل سیکرٹریٹ کے ضبط شدہ ریکارڈ سے نقل کر کے "ماہنامہ الحق" نے شائع کیا تھا۔ قانون قصاص و دیت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے افادۂ عام کے لیے خطبات میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

مولانا سمیع الحق: نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب چیئرمین! یہ موضوع مختلف پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے اس لیے دس منٹ میں تو اس کو سمیٹنا بڑا مشکل ہے، میں صرف دو چار اصولی باتیں عرض کروں گا اس لیے کہ جو اختلافی نوٹ ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں زیادہ تر انہی باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

حدیث کا تشریعی مقام سب سے پہلی چیز جو سارے نظریاتی انتشار کی اساس بن جاتی ہے اور جس کی طرف میرے ایک دوست نے بھی اشارہ فرمایا کہ حدیث کی جو عظمت اور حیثیت ہے، اور جو تشریعی مقام ہے اسلام میں حدیث کا، اس پر ان دوستوں کی نظر نہیں پڑتی، قرآن کریم نے واضح طور پر بار بار حدیث کی تشریعی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور اس کو حجت تسلیم کرنا اسلام کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (سورۃ النساء ۶۵)

تیرے رب کی قسم (حضور اکرم کو خطاب ہے) کہ یہ لوگ مومن نہیں بن سکتے جب تک تجھے ثالث، فیصلہ کرنے والا اور حکم تسلیم نہ کرلیں پھر ان کے دل میں بھی آپ کے فیصلوں پر کچھ بوجھ محسوس نہ ہو اور آپ کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کرلیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ :۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔

(سورۃ الاحزاب آیت ۳۶)

کسی مومن اور مومنہ کو (خواہ وہ مرد ہو یا خاتون) کوئی حق نہیں کہ جب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ کیا تو ان کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔ (بلکہ وہ لازماً تسلیم کرے گا)۔

ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک خاتون آئی اور جسم پر نقش ونگار بنانے (گودنے) کے مسئلے کے بارے میں دریافت کیا (جیسے آجکل بھی بعض لوگ جسم پر نقش ونگار گوندھتے ہیں) تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اس خاتون نے اس وقت ہی کہا کہ میں نے تو الحمد سے وَالنَّاس تک سارے قرآن کا مطالعہ کیا ہے لیکن اس مسئلے کا ذکر مجھے قرآن میں کہیں نہیں ملا۔ (اس خاتون کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ قرآنِ کریم میں جو بات ہے صرف وہی حجت ہے) تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر تو نے قرآنِ کریم کو غور سے پڑھا ہوتا تو تُو ضرور اس کا حکم قرآن میں پا لیتی، خاتون نے پھر کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں ہو سکا، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا لو قرأتیہ لوجدتیہ یعنی یہ کہ اگر تُو نے غور کیا ہوتا تو تُو معلوم کر لیتی پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ قرآن مجید میں نہیں ہے: مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (سورۃ الحشر ۷) یعنی اللہ نے فرمایا "جو حکم تمہیں رسولؐ نے دیا اور جو کچھ دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رُک جاؤ"۔

جب قرآن نے یہ اصول بیان کیا ہے اور تمام وہ تفصیلات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں تو گویا وہ عین قرآن ہیں۔

تو ایک تو بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے دوستوں نے اس سارے مسئلہ میں حدیث کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا۔ ہمارے فاضل دوست چودھری الطاف وغیرہ نے اپنے اختلافی نوٹ میں صفحہ ۱۳۴ میں یہاں تک لکھا ہے کہ احادیث جن کا زیادہ تر بلکہ ۹۹ فیصد حصہ اخبارِ احاد پر مشتمل ہے ان میں نہ تو حقانیت ہے اور نہ ہی پورا الیقین شامل ہوتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک) حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ان سب سے جو روایت الگ الگ یا ایک ایک راوی کے ذریعہ نقل ہوئیں اور جو اکیلے کسی صحابی نے سنی اور وہ اُمت کو بیان کی

ان سب کو اخبار احاد کہا جاتا ہے، اب اگر احادیث کے سارے ذخیرے کو یہ کہا جائے کہ ان میں حقانیت ہی نہیں (نعوذ باللہ) تو پھر ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا؟

عورت کی دیت نصف ہونے کی روایات

دوسری بنیادی بات جس پر سارا زور دیا جاتا ہے کہ نصف دیت کے بارے میں جو روایت ہے وہ ضعیف ہے، تو اس کے بارے میں صرف اتنی گذارش ہے کہ حدیث کا ایک سلسلہ جو ہے اس مسئلے کا اسی کو انہوں نے نشانہ بنایا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ صرف ایک حدیث میں مذکور نہیں ہوا کہ عورت کی دیت نصف ہے بلکہ حدیث کی وہ مستند کتابیں جو صحاح ستہ میں شامل ہیں ان سب میں منقول ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث کو نقل کیا ہے، ان کی کتاب سُنن النسائی صحاح ستہ میں شامل ہے، مؤطا امام مالک نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جبکہ امت کا ایک بڑا طبقہ امام بخاریؒ کی "صحیح" پر بھی اس کو ترجیح دیتا ہے، گو عام رائے یہی ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری "یعنی قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری ہے"۔ مگر امت کا ایک طبقہ خاص کر مغربی ممالک، الجزائر، مراکش، تیونس اور افریقہ کے کئی علاقے وہ مؤطا امام مالکؒ کو بخاری شریف پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنز العمال، نصب الرایہ اور مصنف عبدالرزاق وغیرہ ——— نے ان روایات کو نقل کیا ہے روایت بھی ایک سے نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ سے، حضرت عثمانؓ سے، حضرت علیؓ سے، حضرت ابوہریرہؓ سے اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے کبار صحابہ کی یہی رائے (نصف دیت کی) تھی۔

اور علامہ کاسانیؒ نے "بدائع الصنائع" میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورت کی نصف دیت کا جو فیصلہ دیا تھا صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت میں سے کسی نے بھی اس پہ اعتراض نہیں کیا بلکہ سب نے اس کو تسلیم کر لیا تو گویا یہ تمام صحابۂ کرامؓ کا اجماع قرار پایا۔ اس کے بعد یعنی خلفائے راشدین کے بعد ائمہ اربعہؒ کا جب زمانہ آتا ہے تو سارے کے سارے ائمہ کرامؒ اس مسئلے پر متفق نظر آتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قدیم و جدید کسی بھی عالم کا ایک قول اس کے خلاف نہیں سنا۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے حامل ہیں، تو گویا ان سب کی اس کے بارے میں یہی رائے تھی۔

فقہ جعفریہ بھی متفق ہے

ہمارے دوست علامہ سید محمد رضی مجتہد یہاں تشریف رکھتے ہیں میں ان کی موجودگی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ فقہ جعفریہ، فقہ زیدیہ اور

شیعہ مکتبِ فکر کے جتنے بھی فقہاء و مجتہد ہیں سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کی دیت نصف دیت ہے۔ تو ہمارے ان دوستوں کو اس سارے ذخیرے میں سے ایک دو قول ہی ملے ہیں۔

جناب والا! یہ ضروری مسئلہ ہے لہٰذا اس کی تشریح کرنے کے لیے آپ مجھے ایک دو منٹ اور دیں کیونکہ یہ مسئلہ اس سارے ہنگامے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، تو نصف دیت کے بارے میں صرف ان دو حضرات کا قول پیش کیا گیا ہے، ایک ابوبکر اصم اور دوسرے ابن عُلیہ۔ جبکہ بدقسمتی سے ہمارے یہ دوست ان میں سے کسی بھی نام کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے، کبھی اس کو ابن اولیاء لکھتے ہیں کبھی اس کو کیا کہتے ہیں۔

اب ابن عُلیہ اور ابوبکر اصم کے بارے میں ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ ہیں کون لوگ؟ تو سب سے پہلے ان کی یہ رائے امام ابن قدامہؒ نے "المغنی" میں نقل کی، ان دو حضرات کی رائے نقل کرتے وقت وہ یہ کہتے ہیں کہ ان راویوں کے علاوہ کسی اور سے (یعنی نامعلوم راوی سے) مذکور ہے کہ ابن عُلیہ اور ابوبکر اصم یہ کہتے تھے کہ عورت کی دیت مرد کے مساوی ہے، ان راویوں کا نام تک نہیں لیا گیا۔ پھر ان (عُلیہ اور اصم) کا قول ذکر کرنے کے بعد ابن قدامہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قول پوری امت کے ہاں متروک ہے کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔

اب ہم ان دونوں کو علم حدیث کے رجال اور اسماء الرجال کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں کہ یہ دونوں کون ہیں؟ اسماء الرجال کا علم اس امت کا عظیم الشان قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ ہر ہر راوی کو محدثین اور علماء جرح و تعدیل نے پرکھا ہے۔ تو اب سب سے پہلے ابوبکر اصم کو لیتے ہیں، جرح و تعدیل کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ انہوں نے ایک کمزور راوی کا نام لے کر کہا کہ میں اس کو بھی ابن عُلیہ پر ترجیح دوں گا۔ امام نسائیؒ نے کہا کہ یہ شخص متروک ہے اور محدثین کے ہاں بالکل مقبول نہیں ہے۔ ابن معینؒ نے کہا کہ یہ متروک ہے۔ اسماء الرجال کی ایک مستند کتاب "لسان المیزان" میں تو ان کی پوری قلعی کھول دی ہے۔

جناب چیئرمین: مولانا قبلہ کل بھی یہ بات ہوئی جو آپ بتا رہے ہیں اور آج صبح آپ سے پہلے بھی ایک صاحب نے انہی کتابوں کے حوالے سے یہ چیزیں بتائیں، بار بار کیوں وہی باتیں آپ دہرا رہے ہیں؟

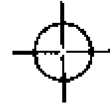
مولانا سمیع الحق: میں نے اس مسئلہ پر یہ اختلافی نوٹ دیا تھا کہ دفعہ ۲۸ کے بارے میں جب قرآن کریم، احادیث اور فقہاء کی واضح ہدایات ہیں تو اسے .....

جناب چیئرمین: اس طرح سے دوسروں کا حق مارا جائے گا اور کوئی بات نہیں۔
مولانا سمیع الحق: میں یہ عرض کروں گا کہ یہ (نصف دیت کا) مسئلہ اتنا واضح، قطعی اور مسلّمہ ہے کہ اگر اس کو اسی ایوان میں طے شدہ قرار دیا جاتا اور اس بارے میں اللہ اور رسولؐ نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر ہم سب سر تسلیم خم کر لیتے اور اس کو سپریم کورٹ یا کسی اور ادارے کے پاس مزید تفصیل کے لیے نہ بھیجتے تو اچھا ہوتا، کیونکہ اس وقت ہزاروں ایسے کیس ہیں جو اس آرڈیننس کے نفاذ کے منتظر ہیں، سینکڑوں لوگ جو کال کوٹھڑیوں میں بند ایک ایک لمحہ اس انتظار میں گن رہے ہیں کہ کب یہ نافذ ہوگا اور کب مصلحت کی راہ کھلے گی اور ہمیں انصاف ملے گا۔ اگر اس کو ہم اسی طرح ملتوی کرتے رہے تو اس کے نفاذ میں مزید تاخیر ہو جائے گی۔ پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کے بیان کردہ مسائل و احکام میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں، اس میں نہ تو عورتوں سے زیادتی کی گئی ہے نہ مردوں سے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور غیر مسلم سب کا خالق ہے اور آزاد اور غلام تک سب کے قصاص میں مساوات رکھی گئی ہے اسلام میں۔

صرف دیت کے ایک مسئلہ میں جو صرف قتل خطا کی صورت سے تعلق رکھتا ہے یہ تفصیل ہے، واضح حدود اور ہدایات ہمارے سامنے ہیں۔ تو میری رائے یہ ہے کہ ہمارے معزز ارکان اس مسئلے کو بھی جس طرح اس کی تشریح قرآن میں ہے اس طرح رکھ دیں، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں بھی اس کی تفصیل تھی کہ مقدار نصف دیت ہوگی تو اسی کو رکھا جائے۔

جناب چیئرمین: مولانا صاحب بہت بہت شکریہ!

الابتدائیہ



جب حکومتِ پاکستان نے قصاص و دیت آرڈیننس جاری کیا تو کچھ لوگوں نے ہڑتالوں اور جلاؤ گھیراؤ کے ذریعہ اس آرڈیننس کو ختم کرنے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔ اس سلسلہ میں علماء کرام، مفتیانِ عظام اور دوسرے اہلِ علم حضرات نے اسلام کے اس عادلانہ قانون کی وضاحت اور لوگوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی تاکہ عقلِ سلیم رکھنے والا انسان بغیر تسلیم و رضا کے رہ نہ جائے ـــــ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے بھی اس آرڈیننس کا اجمالی جائزہ لیا اور اس پر تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ پیش کیا جو دارالعلوم کے ترجمان رسالہ ماہنامہ الحق میں شائع ہوا، بعد از اں گوجرانوالہ کے ایک عالم دین مولانا سید تصدق بخاری صاحب نے اس پر اپنا تنقیدی نکتہ نظر پیش کیا وہ بھی نذرِ قارئین ہے، پھر اس کے جواب الجواب میں حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھرپور تعاقب کیا جو کہ ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا ـــــ چونکہ ان مضامین کا تعلق بھی فقہ اسلامی کے ایک اہم مسئلہ سے ہے اس لیے بطورِ افادۂ عام دارالعلوم حقانیہ کے فتاویٰ میں شامل کیا جاتا ہے ـــــ (از مرتب) ـــــ

اسلام کا نظامِ قصاص و دیت

اجمالی جائزہ و تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ

مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب

قصاص و دیت کے اعلان کے بعد جب ڈرائیور برادری کی طرف سے اس پر ملک گیر احتجاج ہوا تو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے لیے یہ مسئلہ بڑی اہمیت سے موضوعِ بحث بنا رہا۔ موجودہ قصاص و دیت کے حکومتی اعلان میں اگر شرعی تقاضے پورے کئے گئے ہوتے تو اس کی تائید و تصویب اتنے زوردار لہجے میں ہوتی جتنے کہ اس کی مخالفت میں مقالے لکھے گئے۔ بعض اہم امور میں بے احتیاطی اور تساہل کا یہ نتیجہ نکلا کہ پوری دنیا اسلام کے نظام قصاص و دیت سے مذاق کرنے پر اتر آئی۔ خدانخواستہ اگر اسلام کی ان فوجداری دفعات میں شرعی تقاضے پورے نہ کیے گئے تو شاید آئندہ کے لیے کوئی بھی اس ملکِ خداداد میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جرأت نہ کر سکے۔

تادمِ تحریر اس مسئلہ پر جو مقالات سامنے آئے ہیں ان میں کوئی ایسا مقالہ نظر سے نہیں گذرا جس میں قصاص و دیت کے سرکاری شائع کردہ قانون میں سقم اور کمزوری کے ہوتے ہوئے شرعی نقطہ نظر سے اس کے قابلِ عمل ہونے کو ثابت کیا گیا ہو، اربابِ علم و دانش اور نفاذِ اسلام کے مخلص اصحابِ فکر نے اصلاح کی کوشش کی، کمزوریوں اور اسقام کی نشاندہی کرنے کے بعد متبادل تجاویز پیش کیں۔

دوسری طرف بعض جدت پسندوں نے موجودہ مسودۂ قانونِ قصاص و دیت میں سقم اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے نظامِ قصاص و دیت کو اپنا ہدف اور دُرفشانی کا نشانہ بنایا، ایسے رکیک اور غیر معیاری اعتراضات اور شبہات کئے جو کسی مسلمان سے ناقابلِ توقع ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے اکثر اعتراضات کا منشاء مذہب اور عقیدہ سے ناواقفیت کے علاوہ مروّجہ نام نہاد آزادی اور جدت پسندی کی مذموم خواہش رہی۔

قصاص و دیت کے بارے میں اہم شبہ قصاص و دیت آرڈیننس کے بعد قصاص و دیت کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس میں ڈرائیور کو ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے علاوہ خود اس کا فعل بھی موضوع بحث رہا، یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈرائیور کے ہاتھوں کا قتل قابلِ مواخذہ جرم نہیں قرار دینا چاہیئے، کسی بھی ڈرائیور کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کو شوقیہ قتل کرے، ڈرائیور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرتا ہے، موت کے منہ میں بیٹھ کر انسان کی خدمت کرتا ہے، آخر اس سے یہ توقع کیسے ممکن ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کو قتل کرے، جبکہ بسا اوقات ڈرائیور کو خود اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، ایسی صورت میں ایکسیڈنٹ کی موت کو قابلِ مواخذہ جرم قرار دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کا تصور زمانۂ قدیم میں نہیں تھا کیونکہ اس وقت گاڑیاں نہیں تھیں اس لیے اس کو خواہ مخواہ قتل کی پرانی قسموں میں شمار کرنا لایعنی کوشش ہے۔

قصاص و دیت کے بارے میں قابلِ تشریح نکات ان شبہات کے ازالہ کے لیے اسلام کے نظامِ قصاص و دیت کے چند پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ایسے غیر معیاری شبہات کا موقع نہ رہے۔

(۱) ایکسیڈنٹ کی صورت میں قتل کی کیا حقیقت ہے اور یہ قتل النفس کی کون سی قسم میں آتا ہے۔

(۲) اسلامی نظامِ قصاص و دیت میں ایسی قسم کے لیے کون سی سزا مقرر ہے اور اس کے اثرات و منافع کیا ہیں؟

(۳) قصاص و دیت آرڈیننس کے مسودۂ قانون میں اس اعتبار سے کونسی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

تحفظِ نفس کا محیر العقول نظام ایکسیڈنٹ کے قتل کی حقیقت بیان کرنے سے قبل یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام کی رو سے انسانی نفس کو جو عزت و عظمت اور تقدس حاصل ہے وہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں پایا جاتا۔ ایک اسٹیٹ میں انسان کے خون کو بلا امتیازِ مذہب و عقیدہ ہر لحاظ سے تحفظ حاصل ہے، یہ ممکن نہیں کہ نفسِ محترمہ کا خون رائیگاں ہو، جس صورت میں نفسِ محترمہ سے کسی غیر شرعی طریقہ سے کھیلا گیا تو اس کا حساب لیا جائے گا، اگر قصاص کی صورت میں ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا ورنہ دیت لازم ہوگی، اگر قاتل معلوم

نہ ہو تو قسامت کی رُو سے اہلِ محلہ سے دیت لی جائے گی ورنہ بصورتِ دیگر حکومت ذمہ دار ہوگی اس لیے فقہاء کرام نے نفسِ محترم کے ضیاع کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں، جن میں ۱۔ قتلِ عمد میں قصاص اور ۲۔ قتل شبیہ بالعمد، ۳۔ خطاء ۴۔ جار مجرائی خطاء اور ۵۔ قتل بسبب میں دیت لازمی قرار دی ہے۔ موجودہ زیرِ بحث مسئلہ کا تعلق "قتلِ خطاء" سے ہے اس لیے دوسری قسموں کی حقیقت بیان کرنے سے قطع نظر ہم صرف قتلِ خطاء کی حقیقت کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ایکسیڈنٹ کا قتل قتلِ خطاء کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔

قتلِ خطاء کی حقیقت

"خطاء" کے عنوان سے یہ واضح ہے کہ یہ ایسا قتل ہے جس میں قاتل کا ارادہ اور نیت شامل نہیں، گویا "قتلِ خطاء" کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر کسی نیت اور ارادہ کے کسی انسان کے ہاتھ سے دوسرے انسان کی جان ضائع ہو، عموماً اس کی دو صورتیں بنائی جاتی ہیں۔

(۱) خطاء فی القصد (۲) خطاء فی الفعل۔

اوّل الذکر کی حقیقت یہ ہے کہ قاتل غلط فہمی کا شکار ہو یعنی کسی انسان کو حیوان سمجھ کر شکار کی نیت سے اسے مارے، اور مؤخر الذکر کا بیان یہ ہے کہ کسی بے احتیاطی یا فنی غلطی سے کسی انسان کی جان اس کے ہاتھ سے ضائع ہو، مثلاً شکار کو مارتے ہوئے اس کی گولی اچانک انسان کو لگے، یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن میں قاتل کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو قتل کرے بلکہ بغیر قصد و عمد سے انسان کی جان ضائع ہوئی۔

ایکسیڈنٹ کی صورت بھی کچھ اسی طرح کی ہے کیونکہ اس میں ڈرائیور کا ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی انسان کو قتل کرے، ڈرائیور تو اپنے مقصد میں مصروفِ عمل ہوتا ہے، شاید کسی بے احتیاطی یا غفلت اور لاپرواہی سے کسی انسان کی زندگی اس کے ہاتھوں سے تمام ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ بسا اوقات ڈرائیور کی غلطی نہ ہو بلکہ مقتول خود عمداً یا سہواً گاڑی کے آگے آئے، لیکن ایسی صورت میں بھی ڈرائیور کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ قتل ہر صورت میں ڈرائیور کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ مثلاً شکار کو مارتے ہوئے کوئی شخص قصداً شکاری کی بندوق کے سامنے کھڑا ہو جائے تو فقہاء کی رائے میں شکاری کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا، بہرحال ایکسیڈنٹ کا قتل، قتلِ خطاء سے کسی صورت میں زیادہ نہیں۔

قتلِ خطاء کی سزا

دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جس میں خطاء قابلِ مواخذہ جرم نہ ہو، اگر کوئی شخص کسی کی کوئی قیمتی چیز غلطی سے توڑ دے تو کیا توڑنے والے کو معاف کر دیا جائے گا؟ کہ وہ محض یہ کہہ دے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ شریعتِ مقدسہ میں خطاء اور نسیان کو جو اعتبار

قابلِ مواخذہ جرم نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ :۔

"میری امت کا محاسبہ خطا اور بھول پر نہیں ہوگا"

لیکن دنیوی احکام کے اعتبار سے اس پر مواخذہ ہے، جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اس میں خطاء اور نسیان کوئی عذر نہیں خاص کر جب کسی چیز کے ضائع ہونے پر ضمان اور تاوان کا مسئلہ ہو۔

قتلِ خطاء بھی دنیاوی احکام کے اعتبار سے قابلِ مواخذہ جرم ہے، اس پر جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ تین ہیں :۔

(۱) اگر مقتول قاتل کا کوئی ایسا قریبی رشتہ دار ہو جس کی موت پر قاتل کو وراثت کا حق پہنچتا ہو تو قتل کرنے کی وجہ سے قاتل حقِ وراثت سے محروم رہے گا، کیونکہ اس میں اس کا بھی احتمال ہے کہ کہیں قاتل نے جائیداد ہتھیانے کے لیے قتل کا یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔

(۲) دوسری سزا یہ ہے کہ انسانی جان اللہ تعالیٰ کی عظیم مقدس امانت ہے اس میں خیانت کرنے پر قاتل دو مہینے متواتر روزے رکھے گا تاکہ قاتل کو اپنے کیے ہوئے جرم پر ندامت اور افسوس کا احساس ہو۔ اس کا تعلق چونکہ فیما بینہ و بین اللہ ہے اس لیے اس میں جبر اور طاقت کے استعمال کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) تیسری سزا خون بہا کی ادائیگی ہے تاکہ انسان کا خون ضائع نہ ہو۔ قتلِ خطا کی صورت میں خون بہا دس ہزار دراہم ہیں جو دو ہزار نو سو سولہ تولہ آٹھ ماشہ (۲۹۱۶ تولہ، ۸ ماشہ) چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی مروجہ قیمت دیت شمار ہوگی۔ خون بہا کی اتنی خطیر رقم کی تقرری میں بنیادی فلسفہ مقتول کے زخم خوردہ ورثاء کے لیے تسلی ہے، ممکن ہے کہ اس مالی تعاون سے ان کے جذبات ٹھنڈے ہوں اور انتقامی جذبہ کا جو لاوا اُن کے دلوں میں اُبل رہا تھا شاید خون بہا کی وصولی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار کون ہے؟

لیکن اتنی بڑی رقم کی ادائیگی شاید قاتل کے بس میں نہ ہو، ممکن ہے کہ تحمل کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکے جس سے دیت کی ادائیگی ناممکن ہو، اس لیے شریعت نے اس کو ممکن بنانے اور قاتل کو ہلاکت کے اس بھنور سے نکالنے کے لیے دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری "عاقلہ" کے کندھوں پر ڈالی ہے "عاقلہ" سے مراد اہلِ دیوان (دفتری ریکارڈ میں متعلقہ زمرہ) قوم، قبیلہ ہے۔ "عاقلہ" کے تعین میں بنیادی تصور یہ ہے کہ جن لوگوں سے تکلیف اور مصیبت کے وقت قاتل تعاون اور مدد کی امید رکھتا ہو وہی اس کا

عاقلہ متصور ہوگا، موجودہ وقت میں یونین، محکمہ اور کمپنی اس کے ضمن میں آسکتے ہیں۔ مثلاً سکول کا ایک استاد کہیں قتلِ خطاء کا مرتکب ہو تو اس قتل کی دیت پورے صوبہ کے اساتذہ سے لی جائے گی۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک گمنام شخص کے جرم کی سزا پورے محکمہ والوں کو دی جائے، لیکن اسلامی ذہن رکھنے والا شخص ایسے لایعنی شبہات کا کبھی تصور بھی نہیں کرتا، کیونکہ تمام مسلمان بمنزلہ جسدِ واحد ہیں، ایک عضو کی تکلیف پر پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، مشرق میں رہنے والے کی خوشی اور غم کا احساس مغرب میں رہنے والے مسلمان کو بھی ہوگا۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے مصیبت میں مبتلا ہونے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اسلام میں قومی وحدت اور یگانگت بنیادی چیز ہے، لہٰذا ایسی مصیبت میں کم از کم اس کے عاقلہ کو تعاون کا ہاتھ یقیناً بڑھانا چاہیئے۔

عاقلہ پر دیت کے تعین کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی قوم جب دیت ادا کرے گی تو لازماً قاتل کو ایسے اوصاف اور باتوں سے یاد کرے گی جن کا سننا قاتل کے لیے ناگوار ہوگا۔ ایسے قبیح حالات اور مناظر سے بچنے کے لیے آئندہ ہر ایک شخص نہایت احتیاط سے کام لے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ بھی مہذب طریقہ سے قاتل کو سزا دینے کی ایک صورت ہے، ورنہ ایک معزز شخص لاکھوں روپے قربان کر کے اپنے بارے میں ایسی باتیں سننا گوارا نہیں کرتا۔

دیت کی وصولی کا طریقہ کار

عاقلہ پر دیت کا جو بوجھ ڈالا گیا ہے یہ کوئی ایسا بوجھ نہیں جو اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو، عاقلہ سے دیت مجموعی طور پر تین سالوں میں وصول کی جائے گی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کی روشنی میں ایک شخص پر تین سالوں میں چار دراہم یعنی چودہ ماشہ چاندی کی قیمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ لہٰذا اگر چاندی کی قیمت ۲۰ روپے فی تولہ ہو تو ایک شخص سے تین سالوں میں صرف سترہ (۱۷) روپے وصول ہوں گے جو ماہانہ طور پر دو روپے سے بھی کم بنتے ہیں، پھر اگر قریبی علاقہ میں اتنی گنجائش نہ ہو تو عاقلہ کا دائرہ وسیع کیا جائے گا تاکہ ایک شخص پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جا سکے۔

پھر دیت کی وصولی کے لیے آسان طریقہ متعین کیا گیا ہے کہ دیت لوگوں کے ماہانہ، ششماہی اور سالانہ وظائف سے منہا کی جائے گی۔ موجودہ دور میں اگر ہر ملازم کی تنخواہ سے ماہانہ دیت کی رقم کاٹی جائے تو شاید ہی دو روپے سے متجاوز ہو جو کہ تنخواہ دار طبقہ پر کوئی خاص بوجھ نہیں۔

اس مجیر العقول نظامِ تحفظِ جان سے کسی کو ڈرنا نہیں چاہیئے، اسلام دینِ فطرت ہے اس میں نہ ظلم کی حوصلہ افزائی ہے اور نہ ظالم کا استیصال مقصود ہے۔ اسلام میں ظالم اور مظلوم دونوں سے تعاون

کیا جاتا ہے۔ ظالم سے تعاون کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور مظلوم کی طرف ہمدردی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا جاتا ہے۔ اسلام کے نظام دیت میں اگر ایک طرف قاتل کو جھنجھوڑا جاتا ہے تو دوسری طرف عاقلہ پر یہ ذمہ داری ڈال کر اس کے ساتھ سہولت اور آسانی کا رویہ رکھتا ہے، پھر دیت کی وصولی سے مقتول کے غمزدہ ورثاء کے لیے اطمینان دلانے کا ہمدردانہ رویہ اسلام کا انفرادی مقام ہے۔

موجودہ نظام قصاص و دیت کی خامیاں

نظام قصاص و دیت کا آرڈی ننس کے ذریعہ نافذ کردہ مسودہ کوئی نیا نہیں، اس پر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بہترین کام کیا ہے، اس وقت قصاص و دیت کا سرکاری مسودہ علماء کے سامنے پیش کیا گیا تو ہم دارالعلوم حقانیہ کے خدام نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز حکومت کو بھیجی تھیں جو ماہنامہ الحق جلد ۱۶ شمارہ ۱۲ میں شائع ہوئی تھیں۔ حالیہ آرڈیننس میں اسلامی خدوخال کی رعایت نہیں رکھی گئی، قتل خطا کی صورت میں صرف ڈرائیور کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرانا اسلام کے عادلانہ نظام کی روح کے منافی ہے، ڈرائیور سے صرف اتنی رقم لی جائے گی جو اس کی برادری کے عام ممبر سے لی جاتی ہے اس میں عاقلہ کو بری الذمہ قرار دینا اسلامی نظام عدل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں اس لیے کہ چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری رہا ہے، یہ قیمت تو وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے، پھر حکومت کا یہ فیصلہ بھی غیر دانشمندانہ ہے جس میں دیت کی ذمہ داری انشورنس کمپنی کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے کیونکہ انشورنس کمپنی ہر ایک کی عاقلہ نہیں اور بغیر عاقلہ ہونے کے دیت کی ادائیگی اس کی ذمہ داری نہیں۔ اس میں کوئی اشکال نہیں کہ محکمہ، یونین اور قوم قبیلہ عاقلہ قرار دے کر ان کو دیت کی ادائیگی کا پابند قرار دیا جائے۔

علاوہ ازیں شرعی نظام شہادت کے فقدان کی وجہ سے قصاص و دیت آرڈیننس سے خاطر خواہ نتائج کی توقع بے سود ہے، موجودہ نظام شہادت کے ہوتے ہوئے اس نظام کا کامیابی سے ہمکنار ہونا مشکل نظر آتا ہے، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نظام قصاص و دیت کے ساتھ ساتھ نظام شہادت کا بھی شریعت کے مطابق اعلان ہو۔

ایک غلط تاثر کا دفاع

مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی مدظلہٗ

حمد و صلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کے مبارک دن ملک میں قصاص و دیت کا قانون نافذ کیا گیا تو دیندار مسلمانوں نے اسے صدرِ مملکت کا بہترین کارنامہ قرار دیا جو کہ حقیقت کے عین مطابق تھا ۔۔۔ نئی حکومت قائم ہوئی اور معابس ڈرائیوروں کی عام ہڑتال کا سانحہ پیش آیا تو افواہ اڑا دی گئی کہ اسلامی قوانین کا برداشت کرنا آسان کام نہیں یہ تو ایک قانون نافذ کر دینے کا ردِ عمل ہے اور اگر شریعتِ اسلامیہ کو مکمل طور پر نافذ کر دیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اس شرارت کے بین السطور دراصل موجودہ حکومت کو خوفزدہ کرنا ہے کہ وہ سینٹ اور قومی اسمبلی سے شریعت کو منظور کرانے کے وعدوں سے پھر جائے اور جس طرح وہ سابقہ حکومت خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لے کر غرق ہوئی ہے اسی طرح یہ بھی طبعی عمر پوری کرنے سے پہلے پہلے غرق ہو جائے۔

ہڑتالیوں سے بات چیت کے بعد اخبارات میں یہ اعلان چھپا کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قصاص و دیت کے قانون میں ترمیم کرے اور یہ بتایا جائے کہ ڈرائیور پر جو دیت عائد ہوگی وہ اس کا عاقلہ یعنی یونین وغیرہ برداشت کرے گی نہ کہ وہ ذاتی طور پر۔ اب شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ سے خوفزدہ لوگوں نے پینترا بدلا اور کہنے لگے کہ:

"دیکھا! اسلامی قوانین جنہیں ابدی کہا جاتا ہے اس میں طاقت کے بل بوتے پر ترمیم کی جا سکتی ہے اور یہ کہ نفاذِ شریعت کا نعرہ لگانے والے ؎
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں!"

دراصل نفاذِ شریعت کے مخالفین کو موجودہ انتخابات سے جو دھچکا لگا ہے وہ اپنی خفت کو مٹانے کے لیے اس قسم کے حربے استعمال کرنے لگے ہیں۔

اظہارِ حقیقت حقیقت یہ ہے کہ ہڑتالیوں کو جو پریشانی لاحق ہوئی ہے وہ اسلام کے قانونِ دیت سے نہیں بلکہ اسلام کے قانونِ دیت میں ترمیم کرنے سے پیش

آئی۔ باوثوق ذرائع کے مطابق سینٹ میں موجود علماء کرام نے قصاص و دیت سے متعلق جو مسودہ پیش کیا تھا اور اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے متعلق جو سفارشات پیش کی تھیں اس میں پہلے ہی سے یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اسلامی شریعت کی رُو سے قتلِ خطاء کی دیت مجرم پر نہیں بلکہ عاقلہ یونین پر عائد ہوتی ہے اور یہ کہ وہ تین سال تک اس کو ادا کرنے کے پابند ہیں لیکن سابق حکومت کے کارندوں نے دانستہ یا نادانستہ، اسلام سے ناواقفیت کی بناء پر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے "عاقلہ" کا لفظ اڑا دیا جس سے متاثرین کو پریشانی لاحق ہوئی۔ یعنی اسلامی قانونِ دیت سے ستم نے ایک لفظ (عاقلہ) اڑا دیا تو پریشانی لاحق ہو گئی، ہم نے توجہ کی اور حذف شدہ لفظ کو کو واپس لا کر اس قانون کو اسلام کے مطابق کر دیا تو اطمینان ہوا۔ اس لیے ملک کے عوام کو عموماً اور حکمرانوں کو خصوصاً یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ شر اور فساد کا منبع اسلامی قوانین میں ردّ و بدل اور ان سے لاپرواہی ہے نہ کہ اسلامی قوانین کا صحیح نفاذ۔

شاعرِ مشرق کا یہ پیغام ایک لمحہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے وہ فرماتے ہیں ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ



اصل دیت کیا ہے

سو اونٹ یا دس ہزار دراہم؟

جواب مضمون مفتی غلام الرحمٰن صاحب | از مولانا سید تصدق بخاری

موقر جریدہ "الحق" دسمبر ۱۹۹۰ء موافق جمادی الاول ۱۴۱۱ھ میں حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کا مقالہ "اسلام کا نظامِ قصاص و دیت" نظر سے گزرا تو بڑا قلق ہوا کہ حضرت موصوف کو بھی دیت کی مقدار کے تعین میں سخت ذہول ہوا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "قتلِ خطاء کی صورت میں یہ خون بہا دس ہزار دراہم ہیں جو دو ہزار نوسو سولہ تولہ آٹھ ماشہ چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی مروجہ قیمت دیت شمار ہوگی۔" (الحق ص۳۶)۔ (ہرگز نہیں) پھر آگے جاکر یوں خامہ فرسا ہیں کہ:

"چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے۔" (الحق ص۳۸)

حضرت مولانا صاحب موصوف سے اس ذہول کا ارتکاب اس لیے ہوا ہے کہ وہ اصل دیت کی احادیثِ مبارکہ پڑھنے کے باوجود بھول گئے ہیں۔ احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا، چاندی، گائے اور بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی اسی لیے ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی قیامت تک بوقتِ ضرورت ہوتی ہی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں، اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اسی لیے ان کی تعداد میں کبھی بھی کمی بیشی نہیں ہوگی، مولانا موصوف خود لکھتے ہیں کہ:

"یہ قیمت تو اس وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے"۔ (الحق ص۳۸)

موصوف نے جب حکومت کی مقرر کردہ دیت کو غیر شرعی دیت تسلیم کیا ہے تو پھر حضرت موصوف کی تولوں اور ماشوں والی پیش کردہ دیت بدرجۂ اولیٰ واتم غیر شرعی ہے کیونکہ جس طرح حکومت نے سونے یا چاندی کو اصل دیت تصور کرکے مزلت پذیر غلطی کا ارتکاب کیا ہے اسی طرح حضرت صاحب نے دس ہزار دراہم کو اصل دیت تسلیم کرکے بہت ہی بڑی غلطی کا اظہار کیا ہے، آپ خود لکھتے ہیں:-

"ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار (چھ سو دس) روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں لیلئے

چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار لازمی ہے۔" (الحق ص۳۸)

درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلہ کے وقت سو اونٹوں کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے، دوسری جو چیزیں بھی سہولتاً دیت میں دی جائیں گی وہ سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی، مقررہ چیزوں کی صورت میں اس سے کم یا زیادہ دینے سے شرعی دیت ادا نہ ہوگی جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔

۲۹۱۶ تولے ۸ ماشے چاندی کی موجودہ قیمت بحساب ۵۵ روپے فی تولہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار چار سو سترہ روپے بنتی ہے جو کہ شرعی دیت نہیں ہے۔

غور فرمائیے موصوف کی مقرر کردہ دیتِ نفس حکومت کی مقرر کردہ دیتِ نفس سے دس ہزار روپے سے بھی زیادہ کم ہے جو ناقص ہی نہیں بلکہ انقص ہے۔

حکومت نے قصاص و دیت کا جو آرڈیننس ۱۴ اگست ۱۹۹۰ء کو جاری کیا وہ ۲ اکتوبر ۱۹۹۰ء موافق ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کو نافذ العمل قرار دیا گیا جس کی دفعہ ص۳۴ غیر محتاط ڈرائیونگ کے متعلق ناقص ہی نہیں بلکہ انقص تھی اس لیے اس کے خلاف ملک بھر میں زمینی ذرائع آمدورفت کو معطل کر دینے والی ہڑتال ہوئی۔ مذکورہ آرڈیننس میں یہ مرقوم ہے کہ غیر محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوا جو ڈرائیور حادثہ کر کے کسی آدمی کو مار دے گا وہ مرنے والے کے ورثاء کو ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے بطور دیت دے گا۔ اس کے خلاف مظاہرے اور ہڑتال اس لیے ہوتے تھے کہ اس میں بھی دو نقص تھے۔ ایک تو اس میں اصل دیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، دوسرا عاقلہ کا تعارف نہیں کرایا گیا اور نہ ہی ان کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

اس ہڑتال کا مطلب یہ لینا کہ لوگ اسلامی قوانین کو برداشت نہیں کرتے سراسر غلطی اور بے اصل ہے۔ درحقیقت یہ ہڑتال اس لیے ہوئی تھی کہ قصاص و دیت کے آرڈیننس میں ناقابلِ برداشت نقائص تھے جن کی تنقیح لازمی ہے۔ پھر انشورنس کمپنی کو دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار قرار دینا ہر طرح سے شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ہے۔

قانونِ دیت ــــ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں

ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری المعافری المصری المتوفی بہا سنۃ ثمان وعشرۃ ومائتین (۲۱۸ھ مطابق ۸۳۳ء) "الرسالۃ المستطرفۃ" میں رقمطراز ہیں:۔

"پہلا مقتول جس کا خون بہا (دیت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یومِ فتح مکہ

میں ادا فرمایا وہ جنیدب بن اکوع کا ہے، اسے بنو کعب نے قتل کیا تھا، نبی علیہ السلام نے اس کے خون بہا (دیت) میں سو اونٹنیاں دی تھیں۔" (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۴۹۳ باب فتح مکہ)

عن ابن عمر قال قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی درجۃ الکعبۃ یوم الفتح فقال الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ الا ان قتیل العمد الخطاء بالسوط اوالعصا مائۃ من الابل مغلظۃ منھا اربعون خلفۃ فی بطونھا اولادھا۔ (دار قطنی ج ۲ ص۱۰۵۔ البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج۴ ص۸۲۱ ابن ماجۃ ج ۲ ص۸۷۵)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن بیت اللہ شریف کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی پھر فرمایا شکر ہے اللہ کا جس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندہ کو مدد دی اور اس نے تنہا دشمن کے لشکروں کو شکست دی، آگاہ ہو جاؤ خطاء کا مقتول (قتل خطاء) وہ ہے جو کوڑے اور چھڑی سے مارا جائے، اس میں دیت کے سو اونٹ ہیں، ان میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہیں۔"

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال کانت قیمۃ الدیۃ علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثمان مائۃ دینار او ثمانیۃ الاف درھم دیۃ اھل الکتاب یومئذ النصف من دیۃ المسلمین قال فکان ذلک کذلک حتی استخلف عمرؓ فقام خطیباً فقال ان الابل قد غلت قال ففرضھا عمرؓ علی اھل الذھب الف دینار وعلی اھل الْبَقَرَۃِ مائتَیْ بقرۃ وعلی اھل الشاۃ اَلْفَیْ شاۃ وعلی اھل الْحُلَلِ مائتَیْ حُلَّۃٍ۔ قال وترک دیۃ اھل الذمۃ لم یرفعھا فیما رفع من الدیۃ۔ (ابو داؤد ج ۲ ص۲۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خون بہا کے اونٹوں کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار دراہم تھی اور اہل کتاب کا خون بہا اس زمانہ میں مسلمانوں کے خون بہا سے نصف تھا، جب حضرت عمرؓ کا زمانۂ خلافت آیا تو انہوں نے فرمایا چونکہ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے اسلئے سونا رکھنے والوں کیلئے ایک ہزار دینار خون بہا مقرر کیا ہے اور چاندی رکھنے والوں پر بارہ ہزار دراہم اور گائیں رکھنے والوں پر دو سو گائیں اور بکریاں

رکھنے والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے رکھنے والوں پر کپڑوں کے دو سو جوڑے مقرر کئے ہیں اور ذمی لوگوں کی دیت وہی رکھی ہے جو پہلے تھی۔"

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف درھم۔ (جامع الترمذی ج ۲ ص ۲۲۴)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ہزار دراہم خون بہا (دیت) مقرر کیا تھا۔"

علامۃ ابوالفضل جمال الدین عبداللہ بن محمد بن ابی الحسن مکرم بن احمد ابن منظور الانصاری الخزرجی الافریقی المصری ولد ۶۳۰ھ مات فی شعبان ۷۱۱ھ۔
قال وکان اصل الدیۃ الابل ثم قومت بعد ذلک بالذھب والفضۃ والبقرۃ والغنم وغیرھا۔ (لسان العرب ج ۱۱ ص ۶۱۶)

(ترجمہ) صاحب لسان العربؒ فرماتے ہیں کہ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں صرف لوگوں کی سہولت کے لیے ان اونٹوں کی قیمت کے برابر، بعد میں سونا و چاندی، گائیں اور بکریاں وغیرہا دیت مقرر کی گئی۔"

جس سے ثابت ہوا کہ دیت میں سونے چاندی کا اعتبار نہیں، اصل دیت جب اونٹ ہی ہیں تو دیت میں سو اونٹ ہی دیتے ہوں گے یا پھر ان کی قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء۔ دو سو گائیوں اور دو ہزار بکریوں کی قیمت بھی ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے سے کہیں زیادہ بنتی ہے لہٰذا ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے کی دیت درست نہیں۔

فقال الشافعی واحمد فی روایۃ محمد بن المنذر الابل فقط فتجب قیمۃ الابل بالغۃ ما بلغت۔ (البنایۃ ج ۴ ص ۵۹۴)

(ترجمہ) امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ بھی جمہور کے قول فرماتے ہیں کہ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں جو ان کی قیمت بنے اسی قیمت کی دوسری مقرر کردہ اشیاء دیت میں دینا ہوں گی۔"

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا ان فی قتل العمد الخطاء بالسوط والعصاء مائۃ من الابل مغلظۃ منہا اربعون فی بطونہا اولادھا۔
وذھب قوم الی ان الدیۃ المغلظۃ اربع خمسون وعشرون بنت مخاض وخمس و عشرون بنت لبون وخمس وعشرون حقۃ وخمس وعشرون جذعۃ۔

(معالم التنزیل ج ۱ ص ۲۲۵)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خبردار رہو بیشک قتل عمد خطا کوڑے (تازیانے) اور لاٹھی مارنے سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت سو اونٹ ہیں ان میں چالیس حاملہ (گابھن) اونٹنیاں ہیں جن کے بطنوں میں ان کی اولاد ہو ـــــ اور ایک گروہ کا میلان اس طرف ہے کہ بلا شبہ دیتِ مغلظہ چار قسم کے اونٹوں پر مشتمل ہے ـــــ اولاً: ۲۵ ایسی اونٹنیاں جو ایک برس پورا کر کے دوسرے برس میں داخل ہو گئی ہوں ـــــ ثانیاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو دو برس پورے کر کے تیسرے میں داخل ہو گئی ہوں ـــــ ثالثاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو تین برس کی ہو کر چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں اور جفتی کے قابل ہوں ـــــ رابعاً، ۲۵ وہ اونٹنیاں جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی ہوں۔ (امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک)"
دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

...... وانّ فی النفس الدّیۃ مـائـۃ من الابل ۔ (ابو داؤد، نسائی، ابن خزیمۃ، ابن جارود، ابن حبّان، مسند احمد، بلوغ المرام کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن حزم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ قتلِ نفس کی اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں۔

عن جابر بن عبد اللّٰہ قال فرض رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی الدّیۃ علی اھل الابل مائۃ من الابل وعلی اھل البقرۃ مائتی بقرۃ وعلی اھل الشاۃ الفی شاۃ وعلی اھل الحلل مائتی حلۃ ۔ (تفسیر مظہری ج۲ ص۱۸۹، ابوداؤد عن عطاء بن رباح)

(ترجمہ) "حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ والوں پر سو اونٹ اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑوں والوں پر دو سو جوڑے کپڑے دیت مقرر فرمائی ہے۔"

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھتے چلئے کہ اصل دیت سو اونٹ ہیں اس لیے آجکل کپڑوں کے دو سو جوڑوں کی دیت ادا نہ ہوگی، بلکہ اگر کپڑے ہی دیتے ہوں تو پھر سو اونٹوں کی قیمت کے برابر کپڑا دینا ہوگا۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدّہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

قال من قتل خطاءً فدیته من الابل ثلاثون بنت مخاض وثلاثون ابنة لبون وثلاثون حقة وعشر بنی لبون ـــ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقولہا علی القری اربع مائۃ دینار او عدلہا من الورق ویقومہا علی ازمان الابل اذا غلت رفع فی ثمنہا واذا ھانت نقص من ثمنہا علی نحو الزمان ما کان فبلغ قیمتہا علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین اربع مائۃ دینار الی ثمان مائۃ دینار او عدلہا من الورق ثمانیۃ الاف وقضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کان عقلہ فی البقرۃ من اھل البقرۃ مائتی بقرۃ ومن کان عقلہ فی الشاۃ علی اھل الشاۃ الفی شاۃ۔ (ابن ماجہ ج ۲ ص ۸۷۹)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خطاء سے مارا جائے اس کی دیت (سو) اونٹ ہیں (تیس) ایسی اونٹنیاں ہیں جو ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگی ہوں، اور (تیس) ایسی اونٹنیاں جو دو سال پورے کر کے تیسرے سال میں لگی ہوں، اور (تیس) ایسی اونٹنیاں جو تین سال کی ہو کر چوتھے سال میں لگی ہوں، اور (دس) ایسے اونٹ جو دو برس کے ہو کر تیسرے تیسرے برس میں لگے ہوں ـــ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گاؤں والوں پر دیت کی قیمت چار سو دینار لگاتے یا اتنی ہی قیمت کی چاندی، اور دیت کی قیمت اونٹوں کے حساب سے لگاتے، جب اونٹ گراں ہوتے تو دیت بھی گراں (زیادہ) ہوتی اور جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی ارزاں (کم) ہو جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں اونٹ کی قیمت چار سو دینار سے لیکر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی۔"

آجکل اونٹوں کی جگہ اگر گائے بکری دیت میں دی جائے تو ان کی قیمتیں سب سے زیادہ ہیں، بتیل بکری لی جائے تو دو ہزار بکریوں کی قیمت تقریباً چالیس لاکھ روپے بنتی ہے، دو دھیل بتیل بکری دو ہزار روپے کی کم از کم ۴۰۰۰۰۰۰ = ۲۰۰۰ × ۲۰۰۰ ـــ چالیس لاکھ روپے۔

میں بازار سے عام بکری کی قیمت معلوم کی تو دو ہزار بکریاں دس لاکھ روپے کی بنتی ہیں، ملاحظہ فرمائیے :۔

(۱) اگر ایک بکری کی قیمت پانچسو روپے ہو تو دو ہزار بکریوں کی قیمت کیا ہوگی؟

۱۰۰۰۰۰۰ = ۵۰۰ × ۲۰۰۰ ـــ دس لاکھ روپے۔

غور فرمائیے! سو اونٹوں کے بدلے دیت میں اگر دو ہزار بکریاں دی جائیں تو کم از کم دیت دس لاکھ روپے بنتی ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ سو اونٹوں کی جگہ گائیں رکھنے والوں سے دو سو گائیں دیت میں دلائی جائیں۔

میں نے مویشی منڈی سے قیمت معلوم کی تو پتہ چلا کہ ایک عام گائے کم از کم بتیس سو روپے کی ملتی ہے۔

۶۴۰۰۰ = ۲۰۰ × ۳۲۰۰ — چھ لاکھ چالیس ہزار۔

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ولادت ۷۶۲ھ متوفی ۸۵۵ھ) رقمطراز ہیں کہ:-

قال الامام الاستیجابیؒ قیمۃ کل حلّۃ خمسون درھما وقیمۃ کل بقرۃ خمسون درھما وقیمۃ کل شاۃ خمسۃ دراھم۔

(البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج۴ ص۸۵۴)

(ترجمہ) علامہ استیجابیؒ فرماتے ہیں کہ ایک جوڑا کپڑے کی قیمت پچاس درہم اور ایک گائے کی قیمت پچاس دراہم اور ایک بکری کی قیمت پانچ درہم تھی۔

آٹھ سو دینار، دس ہزار درہم، سو گائیں، ہزار بکریاں، دو سو جوڑے کپڑوں کی قیمتیں سو اونٹوں کی قیمت کے برابر نہ تھیں۔ اس لیے سیدنا عمر فاروقؓ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ اب اونٹوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں لہٰذا سو اونٹوں کے بدلے ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار دراہم یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں دیت میں دلائی جائیں گی۔

یاد رہے کہ دراہم و دنانیر اور گائیں اور بکریوں وغیرہا کی تعداد اس لیے بڑھتی گھٹتی رہی ہے کہ وہ اصل دیت نہیں، اصل دیت چونکہ سو اونٹ ہی ہیں اس لیے ہر زمانہ میں اونٹوں کی اصل قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء کی تعداد بھی بڑھتی گھٹتی رہی ہے اور رہے گی۔

خیر القرون میں جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی کم ہو جاتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصل دیت کی قیمت چار سو دینار سے لے کر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی، چاندی کے آٹھ ہزار دراہم اس کے مساوی ہوتے تھے، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بھی

ارشاد فرمایا کہ گائے والوں اور بیل والوں سے دیت میں دو سو گائیں اور بکریوں والوں سے دو ہزار بکریاں لی جائیں۔

ملحوظہ: یہ بات ذہن نشین رہے کہ قتلِ نفس کی اصل دیت چونکہ سَو اونٹ ہی ہیں اس لیے سنتِ قائمہ کے مطابق ہر زمانہ میں اونٹوں کی قیمت کے نرخ کے حساب سے ہی دیت ادا کی جائے گی خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

کما مر۔ ویُقوّمُ ها علیٰ اثمان الابل فاذا غلت رفع قیمتها واذا هاجت رخص نقص من قیمتها۔ الخ (ابو داؤد، نسائی، مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶، مشکوٰۃ ص ۳۰۴)

(ترجمہ) "اور قیمت ٹھہراتے (نبی کریمؐ) دیت خطا کی اوپر مول اونٹوں کے پھر جس وقت مہنگے ہوتے اونٹ تو زیادہ کرتے قیمت دیت کی اور جب ظاہر ہوتی ارزانی اونٹوں کی تو قیمت کم کرتے دیت سے۔" (مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶)

اس حدیث کے تحت شاہ عبد العزیز[1] محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور نواسہ مولانا مخدومنا و مکرمنا حاجی محمد[2] اسحاق روح اللہ روحہ کے شاگرد رشید مولانا قطب[3] الدین ابن محمد محی الدین احراری الدہلوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ:۔

"کہا طیبیؒ نے یہ دلالت کرتی ہے کہ اصل دیت میں اونٹ ہیں پس اگر نہ ملیں (اونٹ) تو واجب ہوتی ہے قیمت ان کی جس قدر کہ ہو۔"

(ملاحظہ ہو مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶ طبع اول شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

ایک اور جگہ قتلِ عمد کی دیت کی بابت ارشاد ہو رہا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل دیت میں سَو اونٹ ہی ہیں۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال من قتل متعمدا دفع الی اولیاء المقتول فان

---

[1] ولادت: ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۹ء۔ وفات ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء

[2] ولادت: ۱۱۹۷ھ ذی الحجہ۔ وفات ۲۵ رجب ۱۲۶۲ھ۔ محدث لاہوری ثم الدہلوی۔

[3] ولادت: ۱۲۱۹ھ وفات ۱۲۷۹ھ

شاؤا قتلوا، وان شاءوا اخذوا الدیۃ وھی ثلاثون حقۃ وثلاثون جذعۃ واربعون خلفۃ وما صالحوا علیہ فھو لھم۔ (جامع الترمذی جلد ۲ صفحہ ۴۲۱)
(لسان العرب جلد ۱۵ صفحہ ۳۱۳)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی جان کو جان بوجھ کر قتل کردے تو قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے گا، وہ اگر چاہیں تو قاتل کو اپنے مقتول کے بدلے قتل کردیں اور اگر وہ چاہیں تو دیت لے لیں اور وہ دیت سو اونٹنیاں ہیں، ان میں سے تیس ۳۰ ایسی اونٹنیاں ہیں جو کہ تین برس پورے کرکے چوتھے برس میں داخل ہوگئی ہوں، اور تیس ۳۰ وہ جو چار برس پورے کرکے پانچویں برس میں داخل ہوگئی، اور چالیس اونٹنیاں گابھن (حاملہ) ہوں گی اور مقتول کے وارث جس بات پر صلح کرکے فیصلہ کرلیں وہی قاتل پر واجب ہوگی۔"

ایک اور جگہ قتلِ خطاء کی اصل دیت بھی سو اونٹ ہی مقرر فرمائے گئے ہیں، ارشادِ نبوی ہے:۔

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دیۃ الخطاء عشرون حقۃ وعشرون جذعۃ وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بنی مخاض۔ (ابن ماجہ ج ۳ صفحہ ۸۷۹)

(ترجمہ) "حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (متوفی ۳۲/۳۳ھ) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتلِ خطاء کی اصل دیت میں بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ ہیں جو تین سال پورے کرکے چوتھے سال میں داخل ہوگئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں ایسی ہوں جو چار سال پورے کرکے پانچویں سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ جو ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ جو دو برس کی ہو کر تیسرے برس میں داخل ہو چکی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹ وہ جو ایک ایک سال کے ہو کر دوسرے سال میں لگے ہوئے ہوں۔"

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دیۃ الخطاء عشرون حقۃ وعشرون جذعۃ وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بنی مخاض۔

(ابوداؤد ج ۲ ص۲۷۷، ابن ماجہ ج ۲ ص۱۹۳ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔ ابن کثیر ج۱ ص۵۳۵، نسائی، ترمذی، مظہری ج ۲ ص۱۸۷، موطا امام مالک ص۲۹۳ باب الدیۃ، کتاب العقول)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا خطاء کی اصل دیت (سو اونٹ ہیں) بیس اونٹنیاں وہ جو چوتھے برس میں لگی ہوں اور بیس اونٹنیاں وہ ہیں جو پانچویں برس میں لگی ہوں اور بیس اونٹنیاں وہ ہیں جو دوسرے برس میں لگی ہوں۔

هٰذا عند امام احمد وامام اعظم رحمہما اللہ

وان قتیل الخطاء شبہ العمد قتیل السوط والعصاء دیۃ مغلظۃ منہا اربعون فی بطونہا اولادھا یعنی مائۃ من الابل۔ (دارقطنی ج ۳ ص۱۰۵، سنن ابن ماجہ ج ۲ ص۸۷۷)

(ترجمہ) "اور قتل خطاء عمد وہ ہے جو کوڑے اور لاٹھی سے مار دیا جائے اس کی اصل دیت مغلظہ سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں۔"

اجمعت الصحابۃ علی المائۃ لکنہم اختلفوا فی سنہا۔

(البنایۃ فی شرح الہدایۃ ج۱۰ ص۲۸۲)

(ترجمہ) "تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کا اس پر اجماع ہے کہ اصل دیت میں سو اونٹ ہی ہیں لیکن ان کی عمروں میں ان کا اختلاف ہے۔"

عن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا دیۃ الخطاء شبہ العمد ما کان بالسوط والعصاء مائۃ من الابل منہا اربعون فی بطونہا اولادھا۔ (نسائی، ابن ماجہ، دارمی، ابوداؤد، مشکوٰۃ باب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مارا جائے وہ خطاء شبہ عمد ہے اس کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں۔"

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمقدار الدیۃ وانہا مائۃ من الابل ضمنہا حدیث سہل بن ابی حثمۃ فی القتیل الموجود بخیبر وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وداہ بمائۃ من الابل۔ وروی سفیان بن عیینۃ عن علی بن زید بن جدعان عن القاسم بن ربیعۃ عن ابن عمر قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ فقال الا ان قتیل خطاء العمد بالسوط والعصا فیہ الدیۃ مغلظۃ مائۃ من الابل اربعون خلفۃ فی بطونہا اولادہا وفی کتاب عمرو بن حزم الذی کتبہ لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی النفس مائۃ من الابل۔ وروی عمرو بن دینار عن طاؤس قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیۃ الخطاء مائۃ من الابل۔

{ احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص۳۲۲ باب مبلغ الدیۃ من الابل
و باب شبہ العمد ج ۲ ص۲۲۹ }

(ترجمہ) "ارشادِ نبویؐ ہے کہ دیت کی مقدار سَو اونٹ ہیں حضرت سہلؓ کی حدیث اس پر گواہ ہے کہ خیبر میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سَو اونٹ دیت میں دیئے تھے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتل خطاء العمد وہ ہے جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مار دیا جائے اس کی دیت مغلظ سَو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن اونٹنیاں ہوں گی۔ اور عمرو بن حزم کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو خط لکھا تھا اس میں بھی یہی تحریر فرمایا تھا کہ قتلِ خطاء کی دیت سَو اونٹ ہے ـــــ حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کی دیت سَو اونٹ ہی مقرر فرمائی ہے۔"

پھر یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام جصاصؒ فرماتے ہیں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ دیت بارہ ہزار یا دس ہزار دراہم ہے اور نہ یہ فرمایا گیا کہ دیت ایک ہزار دینار ہے بلکہ ہر زمانہ میں سَو اونٹوں کی قیمت کو دیکھا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص۲۳۵)

بلا شبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں اصل دیت سَو اونٹ ہی بتائی ہے پھر کسی صحابی نے اس سے انکار نہیں کیا اور اسی پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔

(البنایۃ ج ۴ ص۴۸۲)

اور دیت آزاد مسلم کی سَو اونٹ ہے جب اونٹ نہ مل سکیں تو ان کی قیمت واجب ہے جیسا کہ

حضرت عمرؓ نے سو اونٹوں کی قیمت کے برابر سونے والوں پر ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم دیت کے مقرر کئے تھے۔ اور ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ ذمی اور معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہے۔ (معالم التنزیل ص۲۴۵)

صاحب البنایہ لکھتے ہیں:۔

"یعنی دیت سوائے اونٹوں کے اور کسی چیز کی ثابت نہیں"

حضرت ثوری اور حضرت حسن بن صالح رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ دیت میں دراہم و دنانیر دیتے وقت اونٹوں کی قیمتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے، دراہم و دنانیر کی قیمتیں بڑھتی گھٹتی رہتی ہیں اور ہم نے کتاب میں اسی کو بیان کیا ہے، اور وہ یہ کہ دیت اونٹوں ہی میں موقوف رہی ہے وہ کسی اور چیز سے ثابت نہیں، کیونکہ توقف اسی میں ہے کہ (دیت سو اونٹوں ہی کی) شرع شریف میں وارد ہے اور اسی پر اجماع ہے، اصل دیت کی اونٹوں کے سوا کوئی اور مقدار ہمارے علم میں نہیں، اگر کوئی قاضی اس کا حکم دے تو اس کے اس حکم کا نفاذ ہی نہ ہوگا کیونکہ دیت میں سو اونٹوں کے سوا کسی اور چیز کا حکم نافذ ہی نہیں ہو سکتا، اصل دیت میں سو اونٹوں کی مقدار پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے ان کا اختلاف صرف ان کی عمروں کے بارے میں ہے۔ (البنایۃ ج۴ ص۲۸۳)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہ جعل الدیۃ من الورق قیمۃ الابل لانہا اصل فی الدیۃ۔ (احکام القرآن للجصاص ج۲ ص۲۳۷)

چاندی سے دیت اونٹوں کی قیمت کے حساب سے دی گئی ہے کیونکہ چاندی اصل دیت نہیں ہے۔



اُونٹ کی طرح سونا چاندی بھی اصل دیت ہے

جواب الجواب از مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ

ماہنامہ "الحق" مارچ ۱۹۹۱ء موافق شعبان ۱۴۱۱ھ کے حوالہ سے حضرت مولانا سید تصدق بخاری صاحب زید مجدہم نے "اصل دیت کیا ہے، سو اونٹ یا ہزار درہم؟" کے عنوان سے دیت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، یہ احقر کے اُس مقالہ کا مواخذہ تھا جو دسمبر ۱۹۹۰ء کے "الحق" میں "اسلام کا نظام قصاص و دیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

اختلافی نقطہ نظر موصوف کو احقر کے مقالہ میں جس بات سے تعلق ہوا ہے وہ دیت کی تقرری میں دس ہزار درہم کے تعین کا مسئلہ ہے۔ آپ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دیت کے تعین کا دار و مدار اونٹوں پر ہے یعنی اصل دیت سو اُونٹ ہیں، دراہم و دنانیر یا دوسری چیزوں کا ذاتی طور پر کوئی اعتبار نہیں، جہاں کہیں دیت کے فیصلے ہوئے ہیں اُن میں اونٹ کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے (حالانکہ ایسا نہیں) موصوف فرماتے ہیں۔

"احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا چاندی گائے اور بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی اس لیے ہوتی رہی اور آئندہ بھی قیامت تک بوقتِ ضرورت ہوتی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں اصل دیت سو اُونٹ ہی ہیں اس لیے ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔" (الحق ص ۱۲)

موصوف کے دلائل کا تجزیہ موصوف نے گیارہ صفحات پر مشتمل مضمون میں جن روایات کا سہارا لیا ہے وہ کل پانچ ہیں:۔

(۱) پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے، موصوف نے یہ روایت تین دفعہ ذکر کی ہے، پہلی دفعہ سیرتِ ابن ہشام کے حوالہ سے الحق ص ۱۳ پر، دوسری دفعہ معالم التنزیل کے حوالہ سے الحق ص ۱۵ پر اور تیسری دفعہ احکام القرآن کے حوالہ سے الحق ص ۲۱ پر ہے۔ اس روایت میں کسی دراہم و

دنانیر سے انکار نہیں، صرف یہ آیا ہے کہ قتل خطا کا خون بہا سو اونٹ ہے جن میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں گی۔

(۲) دوسری اہم روایت جس کے بارے میں موصوف اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس سے اُن کا مؤقف صراحتہً ثابت ہے، یہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کی روایت ہے۔ موصوف نے یہ روایت پہلی دفعہ بحوالہ ابو داؤد (الحق ص۱۳ پر) دوسری بار بحوالہ ابن ماجہ (الحق ص۱۶ پر) تیسری بار بحوالہ ترمذی (الحق ص۱۸ پر) ذکر کی ہے۔ اس روایت کا مفاد یہ ہے کہ قتل خطا کی دیت سو اونٹنیاں ہیں جن میں تیس دوسرے سال والی، تیس تیسرے سال والی، تیس چوتھے سال والی اور دس اونٹ دوسرے سال والے ہیں۔ البتہ مؤخرالذکر روایت میں تیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، تیس اونٹنیاں پانچویں سال والی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) کی ادائیگی وارد ہے، مزید برآں دراہم و دنانیر اور دوسری چیزوں کا اندازے سے ادائیگی کا حکم بھی وارد ہے ـــــ ایسا ہی موصوف نے یہ روایت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ کی دوسری سند سے مشکوٰۃ کے حوالے سے الحق ص۲۰ پر نقل کی ہے جس سے سو اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۳) تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے جو موصوف نے ترمذی کے حوالہ سے الحق ص۱۷ پر نقل کی ہے، اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف دراھم۔

(الجامع الترمذی ج۱ ص۲۵۸ باب ما جاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت بارہ ہزار دراہم مقرر فرمائے۔

اس روایت کی رُو سے دیت میں اونٹ کی تقرری کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ اس سے موصوف کے عندیہ کی تردید ہو رہی ہے کیونکہ موصوف کے نزدیک اصل دیت سو اونٹ ہیں جبکہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے اعتبار سے قطع نظر بارہ ہزار دراہم مقرر فرمائے۔

یہ الگ بات ہے کہ احناف نے بارہ ہزار کی جگہ دس ہزار دراہم کو اعتبار کیوں دیا؟ اس کی تحقیق کے لیے احناف کے فقہی ذخائر کی طرف مراجعہ کرنا ہوگا تاہم درہم کی قیمت میں تفاوت کی وجہ سے بعض روایات سے دس ہزار اور بعض سے بارہ ہزار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہنا روایات سے ناواقفیت کی دلیل ہے کہ یہ تفاوت اونٹ کی قیمت کے اعتبار پر مبنی ہے۔ دراہم کا اعتبار صرف اس روایت سے نہیں بلکہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ (کما سیأتی انشاء اللہ) لیکن موصوف کے مؤقف

کی تردید کے لیے یہ ایک روایت ہی کافی ہے، معلوم نہیں کہ آپ کو یہ روایت نقل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

(۴) چوتھی روایت حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی ہے جو موصوف نے تفسیر مظہری کے حوالہ سے الحق ص[16] پر نقل کی ہے۔ اس روایت کی رو سے دیت میں اونٹ کے علاوہ گائیں والوں پر دو سو گائیں، بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے کپڑوں کا ثبوت ملتا ہے۔

(۵) پانچویں روایت حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کی ہے جو موصوف نے ابن ماجہ کے حوالہ سے الحق ص[19] پر اور ابوداؤد کے حوالہ سے الحق ص[20] پر نقل کی ہے، اس روایت سے بھی اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان روایات کے علاوہ حضرت طاؤسؒ کی مرسل روایت احکام القرآن کے حوالہ سے الحق ص[21] پر ہے جس سے اونٹ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ، طیبیؒ، امام اعظمؒ، ثوریؒ اور حسن بن صالحؒ کی طرف آپ نے منسوب اقوال پیش کیے ہیں۔

اونٹ کی اصالت کے باوجود تمام روایات پر عمل ممکن نہیں

مولانا موصوف کا عندیہ درج ذیل ہے:۔

"درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلہ کے وقت سو اونٹ کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے، دوسری جو چیزیں بھی سہولتاً دیت میں دی جائیں گی وہ بحساب سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی۔" (الحق ص[12])

موصوف کے ارشاد کے مطابق اگر ہم سو اونٹ دیت کے لیے اصل مان لیں تو پھر بھی تمام روایات پر عمل ممکن نہیں کیونکہ اونٹ کے بارے میں بھی حدیث کے دیگر ذخائر کی طرف مراجعہ سے قطع نظر صرف موصوف نے جو روایات نقل کی ہیں ان میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ کسی ایک نوع کے اختیار کرنے سے دوسری روایات چھوٹ جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ کی روایت کی رو سے جب سو اونٹ دیئے جائیں گے تو ان میں چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں گی، لیکن اس کے مقابلہ میں عمرو بن شعیب بن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو روایت موصوف نے نقل کی ہے اس میں ابوداؤد کی روایت میں سو اونٹ کی جگہ قیمت کی ادائیگی وارد ہے، لیکن ابن ماجہ کی روایت میں سو اونٹ کی ادائیگی میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ان میں تیس ایسی اونٹنیاں ہوں جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہوں،

تیس ایسی اونٹنیاں جو تیسرے سال میں جا رہی ہوں اور تیس ایسی اونٹنیاں جو چوتھے سال میں لگی ہوں اور دس ایسے اونٹ جو تیسرے برس میں داخل ہو چکے ہوں۔ گویا اس روایت میں سو اونٹ میں چار قسم کا اعتبار ہے، لیکن ترمذی کی روایت میں سو اونٹ میں تثلیث کا اعتبار ہے کہ تیس اونٹنیاں چار سال والی، تیس اونٹنیاں پانچ سال والی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بحوالہ ابوداؤد سو اونٹ کی تقسیم میں تخمیس کا اعتبار دیا گیا ہے۔ بیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، بیس اونٹنیاں پانچویں سال والی، بیس اونٹنیاں دو سال والی، بیس اونٹنیاں تین سال والی اور بیس اونٹ تین سال والے ہوں۔

صرف ان الفاظ کو دیکھ کر کسی ایک نوع کے تعین سے دوسری روایات پر عمل ممکن نہیں لہٰذا محض اونٹ کی اصالت پر قول کر کے روایات کو قابلِ عمل بنانے کی راہ کامیاب نظر نہیں آتی، ایسی صورت میں قتل کی قسموں کا اعتبار کر کے دیتِ مغلظہ اور دیتِ مخففہ کی صورت نکالنی ہو گی۔

دراہم و دنانیر کو دیت کی قیمت کہنا درست نہیں دیت کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی میں معاوضہ کی ماہیت چھپی ہوئی ہے کیونکہ لغوی اعتبار سے دیت مالی معاوضہ کو کہا جاتا ہے۔ اور از روئے شرع دیت اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کی جان کو ختم کرنے یا کسی شخص کے جسمانی اعضاء کو ناقص کرنے کے بدلے میں دیا جاتا ہے۔ (مظاہر الحق جدید از علامہ قطب الدین، جلد ۳ ص ۵۲۳ کتاب الدیات)

گویا دیت حقیقت میں انسان کی قیمت ہے، کیونکہ انسان کی حقیقت میں حیوانیت میں بھی ایک جزء ہے اور حیوان جب ہلاک ہو جائے تو یہ مضمون بالقیمت ہوتا ہے اور قیمت کے تعین کے لیے ایسی چیز کی تقرری ضروری ہوتی ہے جس میں خود تعین ہو تفاوت نہ ہو، مزید برآں ممکن الوصول ہو۔ کسی حیوان کے عوض میں ایسی چیز کو واجب قرار دینا جو متفاوت ہو باہمی نزاع اور فتنہ و فساد کے لیے مواقع فراہم کرنے کے مترادف ہے جبکہ ممکن الوصول نہ ہونے کی صورت میں تعجیز کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں۔ اس وجہ سے عقلاً تو اونٹ کا اعتبار ذاتی طور پہ دیت میں بالکل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس کے باطنی معانی کی وجہ سے ان میں یکسانیت ممکن نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جگہ اونٹ مل سکیں، مثلاً ہمارے ملک میں اگر موصوف کے مشورہ سے اونٹ کو ہی اعتبار دیا جائے تو یہ اسلامی نظام کے نفاذ کو مشکل سے مشکل تر بناتا ہے کیونکہ ملک میں ہر جگہ اونٹوں کا ملنا مشکل ہے اور اگر مقتول کے ورثاء کو سو اونٹ ہی دیئے جائیں تو یہ ان کو الٹا مشقت میں ڈالنا ہے، یہ ضروری نہیں کہ مقتول کے ورثاء

اونٹ اپنے پاس رکھ سکیں اور اگر فروخت کریں تو ملکی رواج نہ ہونے کی وجہ سے ایسی حالت میں اس کو کم سے کم قیمت دی جائے گی۔ لیکن چونکہ حدیث میں سو اونٹ کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا عقلی وجوہات سے قطع نظر تثلیث، تربیع یا تخمیس کا اعتبار کرتے ہوئے ان کا دینا جائز ہے، پھر بھی اونٹوں کی ادائیگی ایسے ملک میں ہونی چاہیئے جہاں ان کا رواج ہو تاکہ ان کو (یعنی ورثاء کو) آسانی رہے۔ اس کے علاوہ دراہم و دنانیر اپنی جگہ بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت کے دیت کی صلاحیت رکھتے ہیں، کیونکہ دراہم و دنانیر خلقی طور پر ثمنیت سے متصف ہیں، اس کی مقدار معلوم ہے اور ہر جگہ آسانی سے میسر ہیں بلکہ دنیا کے ہر کونے میں ان کا اعتبار پایا جاتا ہے کیونکہ دنانیر سونے اور دراہم چاندی کے ہوتے ہیں اور سونا چاندی بین الاقوامی لین دین کا ذریعہ ہے اس لیے دیت میں اس کی تقرری سے کوئی مشکلات پیدا نہیں ہوں گی۔

دراہم و دنانیر کو دیت کی قیمت کہنے میں ایک دوسری خرابی یہ بھی ہے کہ اگر ہم اصل دیت اونٹ کو مان کر دراہم و دنانیر اس کا بدل تسلیم کرلیں تو ایسی حالت میں اونٹ بحیثیت نہیں لیے جاتے یہ قاتل کے ذمے محض واجب الادا ہوتے ہیں، اگر دراہم و دنانیر اس کا بدل ہوا اور اس کے عوض میں دیئے جائیں تو دراہم و دنانیر کے بارے میں قاضی تین سال کی مدت ادائیگی کے لیے مقرر کرسکتا ہے لہٰذا پھر ایسی حالت میں بھی یہ قاتل کے ذمہ محض واجب الادا رہیں گے تو یہ "دیناً بدینٍ" "نسیئۃ بنسیئۃ" کی صورت لازم آئے گی جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ (المبسوط للسرخسیؒ ج۲۶ ص۶۰ کتاب الدیات)

دیت کے تعین میں ائمہ مجتہدین کے مذاہب

یہاں تک تو موصوف کے مضمون کا اجمالی جائزہ تھا اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ دراہم و دنانیر کا تعین راقم الحروف کی کوئی خود ساختہ رائے نہیں بلکہ یہ محققین و مجتہدین کی تحقیقات کی روشنی میں مستقل مکاتبِ فکر کی مستند رائے ہے، بدقسمتی سے مولانا صاحب نے اپنے مقالہ میں سو اونٹ کی اصالت ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مذہب کی طرف منسوب کرنے کی زحمت نہیں کی، موصوف نے انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ شاید اپنی صوابدید پر وہ احادیث سے بالذات مسائل مستنبط کر رہے ہیں، آپ نے "الحق ص۱۵" پر "الغایۃ" کے حوالے سے امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول ایسے پیرایہ میں نقل کیا ہے جیسا کہ ان حضرات کے اقوال آپ کی رائے کے لیے محض تائیدی حیثیت رکھتے ہوں، جبکہ بعض جگہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے غلط فائدہ لیا ہے اور ایسی توجیہ کی ہے جو ما لا یرضی بہٖ قائلہ کے مترادف ہے۔

کاش اگر موصوف ابتداء ہی سے اپنا مذہبی رشتہ ظاہر کر دیتے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ آپ کس کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہیں، اس لیے دیت کے بارے میں جملہ مذاہب نقل کرنے کے بعد شاید موصوف کے بارے میں یہ واضح ہوسکے کہ وہ کس مسلک سے وابستہ ہیں تاہم طوالت سے بچنے کی خاطر عربی عبارات کے بجائے باحوالہ اردو تراجم پر اکتفار کیا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے امام شافعیؒ سے دیت کے بارے میں دو اقوال مروی ہیں، پہلے قول (جس کی نسبت آپؒ کی طرف عراق کے حوالے سے کی جاتی ہے) کی رُو سے چاندی والوں سے بارہ ہزار دراہم اور سونے والوں سے ایک ہزار دینار لیے جائیں گے جیسا کہ اونٹ والوں سے سو اونٹ لیے جاتے ہیں البتہ مصر میں آپؒ کا قولِ جدید یہ ہے کہ دراہم و دنانیر کے تعین کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اصل دیت سو اونٹ ہے، جہاں کہیں دوسری چیزیں مثلاً سونا چاندی لیے جائیں گے تو اس میں اونٹوں کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ علامہ ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

قال الشافعی بمصر لا یؤخذ من اھل الذھب ولا من اھل الورق الا قیمۃ الابل بالغۃ ما بلغت۔ (بدایۃ المجتھد ج ۲ ص ۳۰۲ کتاب الدیات فی النفوس اختلفوا فی الدراہم والدنانیر)

(ترجمہ) "امام شافعیؒ کا قول مصر میں یہ ہے کہ سونا اور چاندی والوں سے سو اونٹ کی قیمت کے علاوہ کوئی چیز نہیں لی جائے گی خواہ قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔"

لیکن شوافعؒ کے ہاں مفتیٰ بہ قول مصر کا ہے گویا ابھی شوافع کے ہاں دیت کی اصل سو اونٹ ہے، سونا اور چاندی یعنی دراہم و دنانیر اگر دیئے جائیں تو اس میں سو اونٹ کی قیمت کا اعتبار ہوگا بذاتِ ان کا دیت سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہے اس کے سوا دوسری چیزیں دیت نہیں۔"

(الام۔ دار المعرفۃ بیروت ج ۶ ص ۱۰۵)

امام مالکؒ کی رائے امام مالکؒ کے نزدیک سو اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی دیت میں بطورِ اصالت اعتبار ہے۔ علامہ ابنِ رشد فرماتے ہیں:۔

وعمدۃ مالک تقویم عمر بن الخطاب المائۃ من الابل علی اھل الذھب بالف دینار وعلی اھل الورق اثنی عشر الف درھم۔ (بدایۃ المجتھد ج ۲ ص ۳۰۲ کتاب الدیات فی النفوس)

(ترجمہ) "امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سونے والوں پر (دیت) ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم ہیں۔"

امام احمد بن حنبلؒ کی رائے

امام احمد بن حنبلؒ سے بھی دو روایات مروی ہیں، ایک روایت میں آپ بھی امام شافعیؒ کی طرح صرف اونٹ کی اصالت کے قائل ہیں اور دوسرے قول میں اونٹ کے علاوہ سونے اور چاندی کے بھی قائل ہیں۔ محدثِ اعظم ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں :۔

(ترجمہ) "جان لیں کہ دیت کی اصالت میں علماء کا اختلاف ہے، پس امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت کی رُو سے اور ابن المنذرؒ کے نزدیک صرف (سو) اونٹ ہیں لہٰذا اُن کی قیمت واجب ہوگی جتنی بھی ہو، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اونٹ کے علاوہ سونا اور چاندی بھی ہے یہ امام احمد بن حنبلؒ کا قول اور امام شافعیؒ کی قدیم رائے ہے۔" (مرقاۃ المصابیح شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد ۷ ص۸۳ الواب الدیات)

ابن حزم ظاہریؒ کی رائے

دیت کے بارے میں سب سے سخت ترین لہجہ ابو محمد علی بن حزم ظاہریؒ کا ہے، جن سے دراہم و دنانیر کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں جبکہ دوسرے ائمہ سے کسی نہ کسی درجہ میں دراہم اور دنانیر کے بارے میں کچھ نہ کچھ مروی ہے لیکن آپ دوٹوک فیصلہ کر کے فرماتے ہیں :۔

(ترجمہ) "قتلِ عمد اور خطا کی دیت سو اونٹ ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر ان کی قیمت واجب ہو گی۔" (ابو محمد علی بن الحزم، المحلی، ج ۷ ص۴۷۱)

مزید لکھتے ہیں :۔

(ترجمہ) "ہماری طرح جن سے اونٹ کے علاوہ دوسرا کوئی قول نقل نہیں یہ ایک عظیم جماعت ہے جن میں زید بن ثابتؓ، علی بن ابی طالبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ ہیں، ان تمام کی رائے یہ ہے کہ دیت میں سو اونٹ ہیں۔" (ابو محمد علی بن الحزم، المحلی، ج ۷ ص۴۷۳)

ان متعدد اقوال پر نظر ڈالتے ہوئے قارئین آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ موصوف مسلک کے اعتبار سے کن کے قریب ہیں اگرچہ آپ نے کسی جگہ اپنے مذہبی رشتہ کے اظہار کی جرأت نہیں کی بلکہ مجتہدانہ اندازِ بیان اختیار کر کے احادیث سے بالذات احکام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیت کے بارے میں احناف کثرہم اللہ کا مؤقف

احناف بھی دیگر فقہی مکاتبِ فکر کی طرح دیت میں الابل کی اصالت کے قائل ہیں لیکن احناف نے اپنا زاویۂ فکر صرف چند روایات تک محدود نہیں رکھا بلکہ

پوری روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اونٹ کے علاوہ سونے (دینار) اور چاندی (دراہم) کے تعین پر بھی قول کیا۔ گویا احناف کے نزدیک سو اونٹ کی طرح ایک ہزار دینار یا دس ہزار دراہم بھی دیت کے لیے اصل ہیں۔ اگر کسی علاقہ میں اونٹ ہوں تو وہاں پر دیت میں اونٹ وصول کیے جائیں گے اور اگر کہیں اونٹ نہ ہوں تو پھر علاقہ کی حالت اور عرف کو دیکھ کر سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار دراہم وصول کئے جائیں گے۔

پاکستان میں اونٹوں کا رواج بعض خاص علاقوں تک محدود ہے اس لیے میں نے اپنے مقالہ میں اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کا حساب لگایا تھا، زکوٰۃ اور دوسرے نصابوں میں چاندی کا اعتبار زیادہ کرتے ہیں اور عام عرف میں بھی دراہم کا حساب آسان تھا اس لیے احقر نے دس ہزار دراہم کا حساب تولہ اور ماشہ میں بحساب ۳½ ماشہ چاندی فی دراہم کے حساب سے دو ہزار نوسو تولہ آٹھ ماشہ چاندی کی قیمت کا مشورہ تھا کیونکہ اس کی قیمت کے تعین میں کوئی اشتباہ نہیں رہتا، لیکن میں نے اس سے انکار کب کیا ہے کہ دیت میں اونٹ نہ دیئے جائیں؟ اور نہ احقر اس کی جرأت کر سکتا ہے، ہماری کتابوں میں ان تینوں چیزوں کے بارے میں صراحتاً لکھا ہے، چنانچہ علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "قتلِ خطا میں دیت سو اونٹ ہے ...... سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے حساب سے دس ہزار دراہم ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان تین چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں سے دیت ثابت نہیں۔" (ھدایہ جلد ۴ ص۵۹۹ کتاب الدیات)

ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم سیدنا امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں اور مقلد ہونے کی حیثیت سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے مقتداء اور پیشوا سیدنا امام ابوحنیفہؒ نے جو فرمایا ہے وہ کسی نہ کسی حدیث سے لازماً ثابت ہے، ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آپ نے کوئی بات اپنی طرف سے کہہ کر کسی حدیث کی مخالفت کی ہوگی اور نہ ہم بالذات کسی حدیث یا آیت سے مسائل کے استنباط کی قوت اور طاقت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفتیانِ کرام فتویٰ دیتے وقت کسی حدیث یا آیت کے حوالہ کی جگہ کسی مستند فقہی کتاب کے حوالہ پر اکتفاء کرتے ہیں، ہمارے فقہاء کرام نے دراہم و دنانیر کی اصالت کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کر کے فرمایا ہے:۔

قال العلامة السرخسیؒ، واختلفوا فی ان الدراهم والدنانیر فی الدیة اصل ام باعتبار قیمة الابل فالمذهب عندنا انهما اصل۔ (المبسوط ج ۲۶ ص ۷۸ کتاب الدیات، اختلفوا فی الدراهم والدنانیر)

(ترجمہ) "علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ دراہم و دنانیر دیت میں بطور اصالت معتبر ہیں یا قیمت

کے اعتبار سے، تو ہمارے نزدیک (اونٹ کی طرح) یہ دونوں (دراہم و دنانیر بھی) دیت میں اصل ہیں۔"

بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے اجل تلامذہ سیدنا امام ابویوسفؒ اور سیدنا امام محمدؒ کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی رُو سے گائے، بکری اور کپڑوں سے بھی ثابت ہے، گویا صاحبینؒ کے نزدیک دیت کے چھ اصول ہیں، یعنی جس علاقہ میں لوگوں کو اس میں سہولت ہو اُن سے وہی وصول کیا جائے، چنانچہ بعض علماء کے نزدیک صاحبینؒ کی یہ رائے امام ابوحنیفہؒ سے دوسری روایت ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) "میرے نزدیک حق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول صاحبین کا مذہب ہے۔" (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۵۳ کتاب الدیات)

جبکہ عام کتابوں میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف اول الذکر تین انواع کی نسبت ہوتی ہے اور مؤخر الذکر تینوں کا ثبوت صرف صاحبینؒ کی رائے تک محدود ہے، پھر اونٹ کی دیت میں بسا اوقات سختی اور شدت بھی پائی جاتی ہے جبکہ دراہم اور دنانیر میں خاص مقدار مقرر ہونے کی وجہ سے سختی کا امکان نہیں، اس لیے جہاں کہیں قتل کی نوعیت سخت ہو تو دیتِ مغلظہ ادا کی جائے گی، پھر یہ شدت دراہم اور دنانیر میں نہیں پائی جاتی ہے اس لیے اونٹ ہی سے ادا کی جائے گی۔ چنانچہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

(ترجمہ) "اونٹ کے علاوہ کسی دوسری نوع میں تغلیظ ثابت نہیں کیونکہ شرع صرف اسی میں وارد ہے۔" (الہدایہ جلد ۴ ص ۴۹۹ کتاب الدیات)

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک جب دیتِ مغلظہ کی ادائیگی کی ضرورت پڑے تو اونٹ سے چار قسم ادا کیے جائیں گے جن میں پچیس ۲۵ بنت مخاض (دوسرے سال والے)، پچیس ۲۵ بنت لبون (تیسرے سال والے)، پچیس ۲۵ حقہ (چوتھے سال والے) اور پچیس ۲۵ جذعہ (پانچویں سال والے) شامل ہیں، جبکہ دیتِ مخففہ دس ہزار دراہم یا ایک ہزار دینار ہے، اور اگر اونٹوں سے ادا کرنا پڑے تو پھر پانچ قسموں سے ادا کی جائے گی جس میں قیمت کے اعتبار سے یقیناً آسانی رہے گی۔

دراہم اور دنانیر کی اصالت احادیث کی رُو سے

مقالہ نگار کا یہ تجزیہ بالکل غلط ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم اور دنانیر کا اعتبار

بطور اصالت دیت میں ثابت نہیں، یہ روایات کے ذخیرہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہر وہ روایت جس سے بارہ ہزار یا دس ہزار دراہم یا ایک ہزار دینار کا ثبوت ملتا ہو تو وہ آپ کی رائے کی تردید کے لیے کافی ہے کیونکہ دراہم میں بارہ ہزار یا دس ہزار کا تفاوت مروجہ سکّہ کی قیمت میں کمی و بیشی پر مبنی ہے۔ ذیل میں چند روایات اس کے بارے میں نقل کی جاتی ہیں:۔

(۱) امام ترمذیؒ نے "جمع بین البابین" کی عادت اپناتے ہوئے پہلے جب "باب ما جاء فی الدیۃ کم ھی من الابل" کا تذکرہ کیا تو اس سے فارغ ہو کر دوسرا باب "مَا جَآءَ فِی الدِّیَۃِ کم ھی من الدراھم" لایا، آپ نے اس میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت دو سندوں سے لائی ہے کہ:۔

(۱) عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ جعل الدیۃ اثنیٰ عشر

(جامع ترمذی ج۱ ص۲۵۹ باب ماجاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) "حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے دیت بارہ ہزار دراہم مقرر کی۔"

حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت امام ترمذیؒ کے علاوہ امام ابوداؤدؒ، سنن النسائی، اور دارمی نے بھی نقل کی ہے، یہی وہ روایت ہے جو حضرت مولانا نے الحق ص۱۴ پر نقل کی۔ بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ:۔

(۲) ان رجل من بنی عدی قتل فجعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم دیتہ اثنیٰ عشر الفا۔ (مرقاۃ ج۷ ص۸۳ باب الدیات)

(ترجمہ) "بنی عدی کا ایک آدمی قتل ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار دراہم مقرر کی۔"

(۲) حضرت عمر بن خطابؓ سے امام ابوحنیفہؒ کی سند سے روایت نقل کرتے ہوئے امام محمدؒ فرماتے ہیں:۔

اخبرنا ابوحنیفۃؒ عن الہیثمؒ عن عامر الشعبی عن عبیدۃ السلمانی عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال علیٰ اھل الورق من الدیۃ عشرۃ الاف درھم وعلیٰ اھل الذھب الف دینار۔ (کتاب الآثار ص۹۶ کتاب الدیات)

یہ روایت عبیدہ السلمانی سے اس طریقہ پر بھی مروی ہے کہ:۔

بلغنا عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ جعل الدیۃ علی اَھْلِ الْاِبِلِ مائۃ اِبِلٍ وعلیٰ اھل الورق عشرۃ الاف درھم۔ (المبسوط ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب نظام زندگی کے لیے رجسٹر تیار ہوئے تو آپ نے اونٹ والوں پر سو اونٹ، سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر دس ہزار دراہم مقرر کیے۔"

ظاہر بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب نظام زندگی کا دستور مرتب فرما رہے تھے تو اس میں بڑے بڑے صحابہؓ بھی شریک تھے اور آپ کے اس اقدام پر کسی صحابی کا اعتراض منقول نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہؓ نے آپ کی اس رائے کی تصویب کی، گویا اس پر صحابہؓ کا اجماع ہوا کہ سو اونٹ کی طرح ہزار دینار اور دس ہزار درہم بھی دیت میں دیئے جا سکتے ہیں، ہمارے لیے یہی اجماع صحابہؓ بڑی سند ہے۔

(۳) حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضع الدیۃ علی الناس فی اموالھم علی اھل الابل مائۃ بعیر واھل الشاۃ الفی شاۃ وعلی اھل البقر مائتی بقرۃ وعلی اھل البرود مائتی حلۃ۔ (کتاب الخراج ص۱۵۵ الحدود وعلی اھل الجنایات)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر ان کے اموال میں دیت مقرر فرمائی، پس اونٹ والوں پر سو اونٹ، بکری والوں پر دو ہزار بکریاں، گائے والوں پر دو سو گائیں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے۔"

اس روایت میں اگرچہ دراہم و دنانیر کا تذکرہ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کو بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت سے اعتبار دیا جبکہ ہمارے بعض ائمہ سے یہ دوسری چیزیں بھی مروی ہیں، اور بقول بعض امام ابوحنیفہؒ سے بھی دراہم و دنانیر کے علاوہ دوسری چیزوں کے بارے میں روایت آئی ہے۔

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقولہ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی اعتبار ہے، آپ فرماتے ہیں:۔

ان النبی علیہ السلام قال من سبح فی کل یوم ولیلۃ مثل دیۃ اثنی عشر الف تسبیحۃ فکانما حرر رقبۃ من ولد اسمٰعیل۔ (المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دن رات میں اپنی دیت کی طرح بارہ ہزار دفعہ تسبیحات پڑھیں گویا اس نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک غلام آزاد کیا۔"

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:۔

"حضرت ابوہریرہؓ رات و دن میں بارہ ہزار تسبیح پڑھتے اور فرماتے کہ میں اپنی دیت کے

اندازہ سے تسبیحات پڑھتا ہوں"   (دفاع ابوہریرہ ص۳۸)

جبکہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے دس ہزار دراہم کے بارے میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے ۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۸ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۵) عمرو بن حزمؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعل الدیۃ من الدراھم اثنیٰ عشر الفا۔

(المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(۶) حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ :۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال دیۃ کل ذی عہد فی عہدہ الف دینار۔

(المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(۷) حضرت عثمانؓ کے دور میں بھی ایک واقعہ پیش آیا تو آپ نے ایک ہزار دینار دیت مقرر فرمائی ۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۵ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۸) ایسے ہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے بھی دس ہزار دراہم دیت کی روایت منقول ہے ۔

(اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۵ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

ان تمام روایات کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اونٹ کی طرح دراہم اور دنانیر بھی دیت میں بطورِ اصالت ثابت ہیں، لہٰذا دس ہزار دراہم کے حساب سے چاندی کی مروجہ قیمت بطورِ دیت ادا کرنا روایات سے ذہول نہیں بلکہ روایات کے مطابق عمل کرنے کی ایک آسان صورت ہے ۔


كتاب
الجهاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

[التوبۃ : ۴۱]

ترجمہ: اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو

باب شرائط الجهاد وآدابه
(جہاد کے شرائط وآداب کا بیان)

جہاد کے شرائط

سوال:۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ وقت میں تبلیغی جماعت والے حد سے بڑھ گئے ہیں لہٰذا ان پر بجائے تبلیغ کے جہاد فرض ہوتا ہے تو کیا ان لوگوں کا یہ کہنا درست ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے جہاد کی فرضیت کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ اہلِ اقتدار کے علاوہ عوام الناس میں نہیں پائے جاتے ہیں اس لیے تبلیغی حضرات پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا ہے، اور وہ شرائط یہ ہیں:۔

لما فی الهندیة: واما شرائط فشیئان احدهما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیه من الدین الحق وعدم الامان والعهد بیننا وبینهم والثانی ان یرجوا لشوکة واهل للمسلمین فی القتال فانهٗ لا یحل له القتال لما فیه من القاء نفسه فی التهلکة۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر-الباب الاول فی تفسیرہ شرعاً وشرطه وحکمه)[1]

جہاد کی قسمیں

سوال:۔ کیا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟

الجواب:۔ جہاد کی دو قسمیں ہیں (۱) فرض عین (۲) فرض کفایہ۔ اگر نفیر عام کی صورت میں پیش آئے یعنی دشمن اتنا زیادہ طاقتور ہو کہ قریب والے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس صورت میں جہاد فرضِ عین ہے، اور اگر بعض لوگ دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہوں تو دوسروں پر جہاد فرض کفایہ ہے یعنی بعض افراد کا جہاد کرنا دوسروں سے اس

---

[1] وقال العلامة التمرتاشیؒ: ولا بد لفرضیته من قید اخر وهو الاستطاعة۔ وقال العلامة الحصکفیؒ تحته وفی السراج وشرط لوجوبه القدرة علی السلاح لا امن الطریق فان علم انهٗ اذا حارب قتل وان لم یحارب اسر لم یلزمه القتال۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ کتاب الجهاد، مطلب طاعة الوالدین)
ومثلهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر۔

ذمہ داری ساقط کر دیتا ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: کل ما فرض لغیرہ فھو فرض کفایۃ اذا حصل المقصود بالبعض والا ففرض عین۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۱۸ کتاب الجھاد) [1]

جہاد کے دوران امیر کی اہمیت

سوال:۔ جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب ونظم ونسق برابر کرنے کے لیے امیر بنانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب اور نظم ونسق درست کرنے کیلئے ایک ماہر جنگ کے اصول اور طریقہ کار سے باخبر، نیک اور متبع سنت امیر کی تقرری سنتِ نبویؐ ہے، اس لیے جنگ سے پہلے امیر مقرر کرنا اچھا اقدام ہے تاکہ مجاہدین کے نظم ونسق کو برقرار رکھا جاسکے۔

لما قال ملک العلماء الکاسانیؒ: ومنھا ان یؤمر علیھم امیرًا لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما بعث جیشًا الا وأمر علیھم امیرًا ولان الحاجۃ الی الامیر ماسۃ لانہ لابد من تنفیذ الاحکام وسیاسۃ الرعیۃ ولا یقوم ذلک الا بالامیر لتعذر الرجوع فی کل حادثۃ الی الامام۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۹۹ فصل فی بیان ما یندب الیہ الامام…الخ) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: واما بیان کیفیۃ فرضیۃ الجھاد فالامر فیہ لا یخلوا من احد وجھین اما ان کان النفیر عامًا وأما ان لم یکن النفیر عامًا فھو فرض کفایۃ ومعناہ ان یفترض علی جمیع من ھو اھل للجھاد لکن اذا قام بہ البعض سقط عن الباقین فاما اذا عم النفیر بان ھجم العدو علی بلد فھو فرض عین یفترض علی کل واحد من آحاد المسلمین ممن ھو قادر علیہ۔
(بدائع الصنائع ج۷ ص۹۸ کتاب السیر)
ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۸۹ کتاب السیر۔

[2] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: قال فی الملتقی وینبغی الامام ان یعرض الجیش عند دخول دار الحرب لیعلم الفارس من الراجل قال فی شرحہ وان یکتب اسماءھم وان یؤمر علیھم من کان بصیرًا بامور الحرب وتدبیرھا ویوصی المولی وعلیھم طاعتہ لان مخالفۃ الامیر حرام الا اذا اتفق الاکثر انہ ضرر فیتبع۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۳۴ کتاب الجھاد۔ فصل فی کیفیۃ القسمۃ)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۲ ص۱۹۲ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ

جہاد کی ذمہ داری کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک شخص کی منگنی ہو چکی ہے لیکن تاحال شادی نہیں ہوئی جبکہ اُسے جہاد پر جانے کا شوق ہے اور والدین کی طرف سے اجازت بھی مل چکی ہے۔ تو کیا اس شخص کا جہاد کے لیے جانا موجبِ مواخذہ ہے یا نہیں؟

الجواب :- چونکہ جہاد کی فرضیت کے لیے استطاعت یعنی آلاتِ حرب اور قدرت علی الجہاد شرط ہے اس لیے یہ جہاد عوام پر فرضِ عین نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے لہٰذا مذکورہ شخص کا جہاد کے لیے جانا یا نہ جانا موجبِ مواخذہ نہیں ہے البتہ جانے سے اجر ضرور ملتا ہے جبکہ نیت صحیح ہو۔

لما قال الشیخ التمرتاشی رحمه الله: ولا بد لفرضیته من قید آخر هو الاستطاعة
قال العلامة الحصکفی رحمه الله تحته وفی السراج وشرط لوجوبه القدرة علی السلاح لا امن الطریق فان علم انه اذا حارب قتل وان لم یحارب أسر لم یلزمه القتال ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ کتاب الجهاد) [1]

نفیرِ عام کی تعریف

سوال :- نفیرِ عام کا معنیٰ اور تعریف کیا ہے؟ اور کون سی حالت میں نفیرِ عام کا حکم لگایا جا سکتا ہے؟

الجواب :- فقہاء کرام نے نفیرِ عام کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ جب کفار بلادِ اسلام میں داخل ہو جائیں تو اس وقت ہر ذی قدرت جو اُن بلاد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: (تحت قوله وان هجم العدو) ای دخل بلدة بغتة وهذه الحالة تسمّٰی النفیر العام قال فی الاختیار والنفیر العام

---

[1] وفی الهندیة: واما شرائطه فشیئان احدهما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیه من الدین الحق وعدم الامان والعهد بیننا وبینهم والثانی ان یرجوا الشوکة للمسلمین فی القتال فانه لا یحل له القتال لما فیه من القاء نفسه فی التهلکة ۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر ۔

ان یحتاج الی جمیع المسلمین۔ (رد المحتار ج ۳ ص۲۱ کتاب الجہاد۔ مطلب طاعة الوالدین فرض کفایة)[1]

افغانستان کا جہاد کن لوگوں پر فرض ہے

سوال:۔ کیا افغانستان کا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ اگر فرضِ عین ہے تو کن لوگوں پر فرض ہوتا ہے؟ اور کیا پاکستان کے لوگوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ افغانستان کا جہاد نفیرِ عام ہونے کی وجہ سے فرضِ عین ہے تاہم کمزور اور قدرت نہ رکھنے والے افراد پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ ذمہ داری اہلِ اقتدار اور سربراہوں کی ہے، اس لیے اگرچہ عوام الناس اور رعیت پر یہ جہاد فرض نہیں ہوتا لیکن ان کے لیے مجاہدین کی اعانت اور ہمدردی کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: واما بیان من یفترض علیہ فنقول انہ لا یفترض الا علی القادر علیہ فمن لا قدرة لہ لا جہاد علیہ لان الجہاد بذل الجہد وھو الوسع والطاقة بالقتال او المبالغة فی عمل القتال ومن لا وسع لہ کیف یبذل الوسع۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۹۸ کتاب السیر)[2]

جہادِ کشمیر کی فرضیت کا حکم

سوال:۔ مسلمانانِ مقبوضہ کشمیر جو کہ عرصۂ دراز سے ایک جابر اور ظالم حکومت کے زیرِ تسلط ہیں، وہاں ان

---

[1] وفی الھندیة: ومعنی النفیر العام ان یخبر اھل مدینة ان العدو قد جاء یرید انفسکم وذراریکم واموالکم فاذا اخبروا علی ھذا الوجہ افترض علی کل من قدر علی الجہاد من اھل تلک البلدة ان یخرج للجہاد۔
(الفتاوی الھندیة ج ۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص۹۸ کتاب السیر)

[2] وفی الھندیة: واما شرائط اباحتہ فشیئان احدھما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیہ من الدین الحق وعدم الامان والعھد بیننا وبینھم والثانی ان یرجو الشوکة والقوة لاھل الاسلام باجتہادہ لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکة۔
(الفتاوی الھندیة ج ۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج ۳ ص۲۲۱ کتاب الجہاد، مطلب طاعة الوالدین۔

ظالموں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر رکھا ہے، ان کے گھر اور جائیداد وغیرہ کو تباہ کیا جا رہا ہے، پردہ نشین مسلم عورتوں کی آبروریزی ہو رہی ہے، تو کیا ایسی حالت میں اس ظالم اور جابر حکومت کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟ اور ان مظلوم مسلمانوں کی اعانت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: مسئولہ حالات کے پیشِ نظر اس جابر اور ظالم حکومت کے خلاف جہاد فرض عین ہے کیونکہ مسلمانانِ کشمیر پر بھارتی حکومت نے جبر و ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے اور ان کی عزت وعصمت کو پائمال کیا جا رہا ہے لیکن عوام اور رعیت کا ان کافروں سے مقابلہ دشوار ہے اس لیے تمام تر ذمہ داری اہلِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے اگر ان کے قریب کی مملکتِ اسلامیہ کفار کا مقابلہ نہ کر سکے تو الاقرب فالاقرب پر حتیٰ کہ شرقاً وغرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا التدريج۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجهاد مطلب في الفرق فرض عين و فرض الكفاية)[1]

---

[1] وفي الهندية: وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد واما على من وراءهم ممن يبعد من العدو فانه يفترض فرض كفاية لا فرض عين حتى يسعهم تركه فاذا احتيج بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ کتاب السير الباب الاول في تفسيره)

ومثله في فتح القدير ج۵ ص۱۹۱ کتاب السير۔

برما کے مظلوم مسلمانوں پر جہاد کا حکم

سوال :۔ سرزمینِ برما میں مسلمان بہت عرصہ سے آباد ہیں جبکہ وہاں پر تا حال غیر مسلموں کی حکومت ہے اور گذشتہ کئی سالوں سے حکومت کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و بربریت کا سلسلہ جاری ہے تو کیا مسلمانانِ برما پر جہاد فرضِ عین ہے یا نہیں؟ اور طاقت نہ رکھنے کی صورت میں ان کے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ جب مسلمانوں پر ظلم و تشدد میں اضافہ ہو جائے تو ان پر وہاں کے کافروں اور ظالموں کے خلاف جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے، صورتِ مسئولہ میں برما کے مسلمانوں کی کمزوری اور جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے پڑوسی اسلامی ممالک پر ان کی امداد کے لیے جہاد باقاعدہ فرض ہے، لہٰذا الاقرب فالاقرب شرقاً وغرباً تمام اسلامی حکومتوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هٰذا الترتيب ۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ كتاب الجهاد مطلب في الفرق بين فرض العين وفرض الكفاية)[۱]

---

[۱] وفي الهندية: ثم بعد مجئ النفير العام لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفترض فرض عين على من كان يقرب من العدو ويقدرون على الجهاد .... الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هٰذا الترتيب ۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره ۔

ومثله في فتح القدير ج۵ ص۱۹۱ كتاب السير ۔

بوسنیا میں جہاد کا شرعی حکم

سوال:۔ بوسنیا ہرزیگوینا میں جو جنگ مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے اور ان کا قتلِ عام ہو رہا ہے، ان کی عورتوں کی اجتماعی آبروریزی ہو رہی ہے، مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو پائمال کی جارہی ہے لیکن وہاں کے مسلمان کمزور وناتواں ہونے کی وجہ سے کفار کے مقابلہ سے قاصر ہیں، تو کیا ان کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور ان کے فساد کو دفع کرنا اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت کرنا تمام ممالکِ اسلامیہ پر فرض ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار جب مسلمانوں کے کسی ملک میں داخل ہو جائیں اور وہاں کے مسلمان کفار کا مقابلہ نہ کرسکیں تو ایسی صورت میں جہاد الاقرب فالاقرب پر باقاعدہ فرض ہو جاتا ہے حتیٰ کہ شرقاً وغرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، لہٰذا بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کی ہر ممکن طریقہ سے اعانت کرنا اور ان کفار کے فساد کو دفع کرنا تمام اسلامی ممالک کی ذمہ داری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج عليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هٰذا الترتيب۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ كتاب الجهاد۔ مطلب في الفرق بين فرض العين وفرض الكفاية)[1]

---

[1] وفي الهندية: ثم بعد مجئ النفير العام لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدوّهم ويقدرون على الجهاد۔۔۔۔۔ الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هٰذا الترتيب۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير۔ الباب الاول في تفسيره)

وَمِثْلُهٗ في فتح القدير ج۵ ص۱۹۱ كتاب السير۔

مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد کا حکم

سوال :۔ پاکستان جوکہ ایک اسلامی مملکت ہے اور اس کے بیشتر قوانین غیر شرعی ہیں تو اس کے حکمرانوں کے ساتھ مسلح جہاد کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمان فاسق حکمران کے ساتھ جہاد بالسیف اور قتل وقتال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ احادیثِ نبویہ اور فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد اور قتل ومقاتلہ بالاجماع جائز نہیں، البتہ بغیر قتال کے اس کے خلاف آواز اٹھانا اور منکرات سے روکنا خواہ جلسے جلوس سے ہو یا ہڑتال وغیرہ سے ہو ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث : عن امّ سلمۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ستکون امراء فتعرفون وتنکرون فمن عرف برئ ومن انکر سلم ولکن من رضی وتابع قالوا افلا نقاتلہم قال لا ما صلّوا ۔ (مسلم شریف ج ۲ ص۱۲۸ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب الانکار الخ) [1]

جہادِ افغانستان کی شرعی حیثیت

سوال :۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جوکہ کمیونسٹوں کے خلاف ہورہی ہے کیا یہ شرعی جہاد ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جوکہ کمیونسٹوں اور روسیوں کے خلاف جاری ہے بلا شک وشبہ شرعی جہاد ہے کیونکہ کمیونسٹوں اور روسیوں نے افغانستان پر جبراً قبضہ کرکے وہاں ظلم وزیادتی اور بربریت ودرندگی کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کی جان ومال

---

[1] وقال العلامۃ ملّا علی القاریؒ : والمراد بالکفر ھنا المعاصی والمعنی لا تنازعوا ولاۃ الامور فی ولایتھم ولا تعترضوا علیھم الا ان تروا منھم منکرًا محققًا تعلمونہ من قواعد الاسلام فاذا رأیتم ذٰلک فانکروہ علیھم وقوموا بالحق حیثما کنتم واما الخروج علیھم وقتالھم فمحرم باجماع المسلمین وان کانوا فسقۃ ظالمین واجمع اھل السنۃ علیٰ ان السلطان لا ینعزل بالفسق لتھییج الفتن فی عزلہ واراقۃ الدماء وتفریق ذات البین فتکون المفسدۃ فی عزلہ اکثر منھا فی بقائہ۔

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۷ ص۲۰۱ کتاب الامارۃ والقضاء الفصل الاول)

ومثلہ فی شرح المسلم للنووی ج ۲ ص۱۲۸ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب الانکار علی الامراء۔

اور عزت و آبرو کو پامال کیا ہوا ہے اور دینِ اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہیں، اس لیے ان غاصبین کے خلاف جنگ کرنا اور ان کے فساد کو رفع کرنا عین جہاد ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمامؒ: اوردا لجهاد عقیب الحدود لانه بعد ان ناسبها بوجهین باتحاد المقصود من کل منهما ومن مضمون هٰذا الکتاب وهو اخلاء العالم من الفساد ویکون کل منهما حسناً لحسن الغیرة وذٰلك الغیر فهو اعلاء کلمة الله تعالیٰ یتأدّی بفعل نفس المامور به فهو القتال۔ (فتح القدیر ج ۵ ص۱۸۷ کتاب السیر)[1]

لڑائی شروع ہونے سے پہلے اسلام کی دعوت دینے کا حکم

سوال:- کفار کے ساتھ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کیا ان کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر کسی علاقہ کے رہنے والوں کو اسلام کی دعوت بالکل نہیں پہنچی ہو تو ان کے ساتھ اعلانِ جہاد سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے ہاں اگر انہیں پہلے سے اسلام کی دعوت پہنچی ہو تو پھر ان کو دوبارہ دعوت دینا مستحب ہے ضروری نہیں، لیکن دعوت نہ دینے کی صورت میں جہاد کرنے سے گناہ لازم نہیں آتا۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله: فان کان الدعوة لم تبلغهم فعلیهم الافتتاح بالدعوة الی الاسلام باللسان لقوله تعالیٰ: اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ (الآیة) ولا یجوز لهم القتال قبل الدعوة ۔۔۔۔ الیٰ ان قال فان کانت قد بلغتهم جاز لهم ان یفتتحوا القتال من غیر تجدید الدعوة لما بینا ان الحجة لازمة والعذر فی الحقیقة منقطع وشبهة العذر انقطعت بالتبلیغ مرةً لکن مع هٰذا الافضل ان لا یفتتحوا القتال الا بعد

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: مناسبة الحدود من حیث ان المقصود منهما اخلاء العالم عن الفساد وکان کل منهما حسناً لمعنیً فی غیره وقال لانه ما فرض لعینه اذ هو افساد فی نفسه وانما فرض لاعزاز دین الله ودفع الشر عن العباد۔
(البحر الرائق ج ۵ ص۷۰ کتاب السیر)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره۔

تجدید الدعوة لرجاء الاجابة فی الجملة ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر) ؎۱

کفار کے خلاف مدافعانہ اور اقدامی دونوں قسم کے جہاد مشروع ہیں

سوال، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جہاد مشروع ہے اور اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے کیونکہ اقدامی جہاد اگر کفار کے خلاف شروع ہوجائے تو اسلام ایک خونخوار مذہب شمار ہوگا اور اس سے اسلام کی بدنامی ہوگی، کیا واقعی اسلام میں اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے؟

الجواب:۔ اسلام درحقیقت ایک امن پسند دین ہے وہ خونریزی نہیں چاہتا تاہم بوقتِ ضرورت جب دین کو غیر مسلموں سے خطرہ ہو یا اعلاءِ کلمۃ اللہ مقصود ہو تو اسلام اقدامی اور دفاعی دونوں قسم کے جہاد کی اجازت دیتا ہے لیکن کسی صورت میں بھی ظلم وجبر کا قائل نہیں ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: مناسبته للحدود من حیث ان المقصود منهما اخلاء العالم عن الفساد فکان کل منهما حسنٌ لمعنی فی غیره وقال لانه ما فرض لعینه اذ هو افساد فی نفسه وانما فرض لاعزاز دین الله تعالیٰ ودفع الشر عن العباد ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۷۰ کتاب السیر) ؎۲

؎۱ وقال العلامة التمرتاشی رحمه الله: ولا نقاتل من لا تبلغهم الدعوة الی الاسلام ۔ وقال الحصکفی رحمه الله: وهو وان استشهد فی زماننا شرقًا وغربًا لکن لا شك ان فی بلاد الله تعالیٰ من لا شعور له بذلك وندع ندبًا من بلغتهم الا اذا تضمن ذلك ضررًا ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۳ کتاب الجهاد ۔ مطلب اذا علم انه یقتل یجوز له الخ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۰ کتاب السیر ۔

؎۲ وقال العلامة ابن عابدین رحمه الله: (قوله لاتحاد المقصود) وهو اخلاء الارض عن الفساد الخ (وقوله غیر خفی) کان الحدود اخلاء عن الفسق والجهاد اخلاء عن الکفر ۔

(رد المحتار ج۳ ص۲۱۷ کتاب الجهاد)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۸۷ کتاب السیر ۔

مغلوب ہونے کا یقین ہو تو کمانڈر کا حکم ماننا مناسب نہیں

سوال :- مجاہدین کو لڑائی کے دوران اگر مغلوب ہونے کا یقین ہو اور کمانڈر (امیر) مجاہدین کو حملہ کرنے پر مجبور کرے تو کیا اس صورت میں کمانڈر کا حکم ماننا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر مجاہدین کا اس بات پر یقین ہو کہ کمانڈر کے حکم کی تعمیل کرنے میں مجاہدین کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہے اور ان کے حملے سے کفار کو نقصان اور ضرر کا احتمال بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں کمانڈر (امیر) کے حکم کی تعمیل کرنا مناسب نہیں ہے ۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : فاما اذا علم ان لا ینکی فیهم فانه لایحل له ان یحمل علیهم لانه لا یحصل بحملته شئ من اعزاز الدین ۔
(رد المحتار ج۴ ص۱۲۷ کتاب الجهاد- مطلب اذا علم انه یقتل یجوز له ان یقاتل) [1]

والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جانا

سوال :- ایک شخص جہاد میں شرکت کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس کی والدہ اس کو اجازت نہیں دیتی، تو کیا یہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- جہاد فرضِ عین نہ ہونے کی صورت میں مذکورہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا کیونکہ والدین کی اطاعت فرضِ عین ہے اور فرضِ عین کا مرتبہ فرضِ کفایہ پر مقدم ہے ہاں اجازت کی صورت میں جا سکتا ہے، تاہم اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس وقت والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں ۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله : وکذا الولد لا یخرج الا باذن والدیه او احدهما اذا کان الآخر میتاً لان بر الوالدین فرض عین فکان مقدما علی

---

[1] وفی الهندیة : وان علموا انهم لا ینتفعون به بیقین بل یتفرقون لا یطیعونه فی ذلک ۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۹۲ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)
ومثله فی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۶ کتاب السیر الفصل العاشر ۔

فرض الکفایۃ ملاً الا ان کل سفر لا یؤمن فیہ الہلاک ویشتد فیہ الخطر لا یحل للولد ان یخرج الیہ بغیر اذن والدیہ لانہما یشفقان علی ولدہما فیتضرران بذلک وکل سفر لا یشتد فیہ الخطر یحل لہ ان یخرج الیہ بغیر اذنہما۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۹۸ کتاب السیر) [1]

والدین کے علاوہ دوسرے محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جانا

سوال: اگر ایک شخص کو اس کے والدین جہاد پر جانے کی اجازت دے دیں اور دوسرے محارم مثلاً بھائی وغیرہ اجازت نہیں دیتے ہوں تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص ان محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر والدین کے علاوہ دوسرے محارم کسی کو جہاد کیلئے جانے کی اجازت نہیں دیتے ہوں اور جہاد فرض عین نہ ہو اور ان محارم کے ضیاع کا خطرہ بھی نہ ہو تو بغیر ان کی اجازت کے بھی جانا مرخص ہے، البتہ اگر ان کا نفقہ اس پر واجب ہو اور جہاد کے لیے جانے میں ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واما غیر ھؤلاء کالزوجۃ والاولاد والاخوات والاعمام فانہ یخرج بلا اذنہم الا اذا کانت نفقتہم واجبۃ علیہ وخاف علیہم الضیعۃ اھ ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج ۳ ص۲۳۰ کتاب الجہاد۔ مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین) [2]

---

[1] وقال العلامۃ الحصکفیؒ: لا یفرض علی صبی وبالغ لہ ابوان او احدہما لان طاعتہما فرض عین۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص۲۳۰ کتاب الجہاد، مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۲ ص۱۸۹ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیرہ۔

[2] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: وفی الذخیرۃ ان من سوی الاصول اذا کرھوا خروجہ للجہاد فان کان یخاف علیہم الضیاع فانہ لا یخرج بغیر اذنہم والا یخرج وکذا امرأتہ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۷۲ کتاب السیر)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۲ ص۱۸۹ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیرہ۔

اہل وعیال کیلئے نان ونفقہ کا متبادل انتظام نہ ہونے کی صورت میں جہاد کے لیے جانا

سوال :- ایک آدمی کا جہاد میں جانے کا ارادہ ہے لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بیویاں ہیں اور ان کے لیے اس شخص کے علاوہ اور کوئی کمانے والا (کفیل) نہیں ، تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- چونکہ یہ شخص اپنے اہل وعیال کا اکیلا ضامن ہے اور ان کا نان ونفقہ اس پر واجب ہے اس لیے اگر ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ شخص جہاد کے لیے نہیں جا سکتا ، تاہم اگر ان کے ضائع ہونے یا انہیں ضرر پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو اس کے لیے جہاد پر جانے میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ ، واما غیرهُما كالزوجة والاولاد والاخوات والاعمام فانه يخرج بلا اذنهم الا اذا كانت نفقتهم واجبة عليه وخاف عليهم الضيعة ام ملخصاً من شرح السير الكبير . (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ كتاب الجهاد مطلب طاعة الوالدين فرض كفاية) [1]

جہاد فرض عین نہ ہونے کی صورت میں بھائیوں سے مشورہ کرنا

سوال :- ایک شخص کو جہاد پر جانے کا شوق ہے ، والدین بھی اجازت دیتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ بھائیوں سے بھی مشورہ کر لو ، تو کیا اس صورت میں اس شخص کے لیے بھائیوں سے مشورہ کرنا ضروری ہے یا نہیں ؟ اور بغیر بھائیوں کے مشورہ کے جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب : جہاد کے لیے جانے میں والدین کے علاوہ کسی دوسرے محارم سے اجازت لینا ضروری نہیں ، البتہ اگر ان (دیگر رشتہ داروں) کا نان ونفقہ جہاد میں جانے والے پر ہو اور اس کا متبادل انتظام نہ ہو اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہو تو پھر بغیر ان کی

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ ، وفی الذخیرة ان من سوی الاصول اذا كرهوا خروجه للجهاد فان كان یخاف علیهم الضیاع فانه لا یخرج بغیر اذنهم والا یخرج وكذا امرأته ۔
(البحر الرائق ج۵ ص۷۲ كتاب السیر)
ومثله فی الهندية ج۲ ص۱۸۹ كتاب السير الباب الاول فی تفسيره ۔

اجازت کے جہاد میں جانا مرخص نہیں تاہم اجازت کی صورت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: واما غیرھو لاء کزوجة والاولاد والاخوات والاعمام فانه یخرج بلا اذنہم الا اذا کانت نفقتہم واجبة علیه وخاف علیہم الضیعة ملخصا من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۳ کتاب الجہاد، مطلب طاعة الوالدین فرض عین) ۔[1]

عالم دین کے لیے جہاد میں جانے کا حکم

سوال:۔ علماء کرام اور مدرسین حضرات جہاد کے دوران بھی اپنے مخصوص مشاغل میں مصروف رہتے ہیں، کیا ان پر جہاد فرض نہیں ہوتا؟

الجواب:۔ چونکہ جہاد سے مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور درس و تدریس سے بھی ثبات دین اور قیام دین مقصود ہے اس لیے فقیہ و عالم کے لیے فرض عین نہ ہونے کی صورت میں جہاد کو جانا ضیاع دین کا خطرہ ہے لہٰذا علماء کے لیے جہاد میں جانا مناسب نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وعالم لیس فی البلدة افقه منه فلیس له الغزو لخوف ضیاعہم سراجیة۔ وعمم فی البزازیة السفر ولا یخفی ان المقید یفید غیره بالاولیٰ وفرض عین ان هجم العدو فیخرج الکل ولو بلا اذن۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الجہاد، مطلب طاعة الوالدین فرض عین) ۔[2]

---

[1] وفی الهندیة: واما من سواهم من ذوی الرحم المحرم کبنات وبنیه واخواته وعماته واخواله وخالاته وکل ذی رحم محرم منہم اذا کرهوا خروجه للجهاد وکان یشق ذلك علیہم فان کان یخاف علیہم الضیعة بان کانت نفقتہم علیه بان لم یکن لهم مال وکانوا صغارا او صغائر وکن کبائر الا انه لا ازواج لهن اوکانوا کبارا زمنی لاحرفة لهم فانه لا یخرج بغیر اذنہم وان کان لا یخاف علیہم الضیع ...... الیٰ ان قال کان له ان یخرج بلا اذنہم۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص ۱۸۹ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)

ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۷۲ کتاب السیر۔

[2] وفی الهندیة: عالم لیس فی البلدة احد افقه منه لیس له ان یغزو لما یدخل علیہم من الضیاعة کذا فی السراجیة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص ۱۹۱ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)

ومثله فی السراجیة ص ۲۴ کتاب السیر باب الجهاد فرض کفایة۔

جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں عالمِ اسلام کی ذمہ داریاں

سوال:- اگر کفار مسلمانوں کے ملک پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں جیسا کہ رُوس نے جارحیت کرتے ہوئے افغانستان پر قبضہ کر لیا اور وہاں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے، تو کیا افغانستان کی عوام کے علاوہ ہمسایہ اسلامی ممالک پاکستان وغیرہ کی عوام پر روس کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟

الجواب:- افغانستان پر روسی جارحیت سے جہاد کا حکم نفیرِ عام ہے لیکن جہاد کی فرضیت کے لیے یہ شرط ہے کہ قدرت علی الجہاد ہو لہٰذا افغانستان کی عوام اور پاکستان کی عوام کی عدم قدرت کی وجہ سے روسی فوجوں سے مقابلہ دشوار معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ فرضیت اہلِ اقتدار اور دونوں ممالک کے سربراہانِ حکومت پر عائد ہوتی ہے اور علی الترتیب الاقرب فالاقرب کی بناء پر حتیٰ کہ شرقاً و غرباً تمام اسلامی حکومتوں پر روسی جارحیت کے خلاف جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا منها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً و غرباً على هذا الترتيب۔ (رد المحتار ج ۳ ص۲۳۰ كتاب الجهاد، مطلب فى الفرق بين فرض عين وفرض كفاية) [1]

---

[1] وفى الهندية: ثم بعد مجئ النفير لا يفترض [الجهاد] على جميع اهل الاسلام شرقاً و غرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفترض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الارض شرقاً و غرباً على هذا الترتيب۔

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص۱۸۸ كتاب السير، الباب الاول فى تفسيره)

ومثله فى فتح القدير ج ۵ ص۱۹۱ كتاب السير۔

مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت مسلم ارباب اقتدار کی ذمہ داری ہے

سوال :- موجودہ دور میں مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کافروں نے بزعم خود منصوبے بنا رکھے ہیں جن کے تحت ہر جگہ کافروں کی طرف سے مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے، تو کیا ایسی حالت میں عالم اسلام کے اہلِ اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی امداد و نصرت لازم آتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- تمام ممالکِ اسلامیہ اور اہلِ اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت ضروری ہے اور جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو اُن کے ساتھ قریب کی اسلامی حکومت پر ان کی اعانت اور یہود و ہنود کے ساتھ جہاد فرض ہو جاتا ہے، اور قدرت نہ رکھنے کی صورت میں شرقاً و غرباً تمام اہلِ اسلام اور اہلِ اقتدار پر جہاد کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم ببعدٍ من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج عليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هٰذا التدريج -

(رد المحتار ج ۳ ص۲۲۳ كتاب الجهاد، مطلب في الفرق بين فرض عين وفرض كفاية) لہ

لہ وفي الهندية : وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد واما على من وراءهم ممن يبعد من العدو فانه يفترض فرض كفاية لا فرض عين حتى يسعهم تركه فاذا احتيج بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هٰذا الترتيب - (الفتاوى الهندية ج ۲ ص۱۸۸ كتاب السير- الباب الاول في تفسيره)

وَمِثْلُهٗ في فتح القدير ج ۵ ص۱۹۱ كتاب السير۔

لفظ فی سبیل اللہ کی تحقیق

سوال :- تبلیغی حضرات لفظ فی سبیل اللہ کو صرف تبلیغ ہی میں منحصر کرتے ہیں اور جہاد کو کو اس میں شامل نہیں کرتے، کیا ان حضرات کا یہ انحصار درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- لفظ فی سبیل اللہ ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے، دین کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو محنت و مشقت کی جائے وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لہٰذا دین کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے افراد اس کا مصداق ہیں، دین کے کسی خاص شعبہ کو متعین طور پر اس کا مصداق ٹھہرا کر دوسرے شعبوں کو اس سے خارج کر دینا غلط فہمی پر مبنی ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : وقد قال فی البدائع فی سبیل اللہ جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعی فی طاعة اللہ تعالیٰ و سبیل الخیرات اذا کان محتاجاً۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۶۷) [1]

دشمن کے جاسوس کو قتل کرنے کا حکم

سوال :- جو شخص کافر حکومت کا جاسوس بن کر مسلمانوں کے خفیہ حالات اس تک پہنچائے یا کافر حکومت کے تعاون سے وہاں کے مسلمانوں کو ستائے تو یہ شخص اگر پکڑا جائے تو اسے قتل کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر بدون قتل کے کوئی تدبیر اس کی فہمائش کے لیے کارگر نہ ہو تو اُسے قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اس صورت میں ہے کہ پکڑا جانے والا جاسوس مسلمان ہو اور اگر حربی ہو تو اس کو قتل کرنے میں کوئی کلام نہیں، اگرچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دوسرے ائمہ سے مسلمان جاسوس کو قتل نہ کرنے کے اقوال مروی ہیں۔

لما قال العلامة الامام القرطبیؒ : فان کان الجاسوس کافراً فقال الاوزاعیؒ یکون نقضاً لعہدہ وقال اصبغ: الجاسوس الحربی یقتل والجاسوس المسلم والذمی یعاقبان الا ان تظاهرا علی الاسلام فیقتلان (الجامع احکام القرآن ج ۸ ص ۵۳ سورۃ الممتحنۃ)

---

[1] لما فی الحدیث : وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل اللہ حتیٰ یرجع۔ رواہ الترمذی والدارمی۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۴ کتاب العلم)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۲۲ کتاب السیر۔

وقال الحافظ العینیؒ وقال القدوریؒ: الجاسوس یقتل وانما نفی القتل عن حاطب لما علم النبی صلی اللہ علیہ وسلم منہ ولکن مذھب الشافعی وطائفۃ ان الجاسوس المسلم یعزر ولا یجوز قتلہ وان کان ذا ھیئۃ عفی عنہ بھذا الحدیث وعن ابی حنیفۃ والاوزاعی یوجع عقوبۃ ویطال حبسہ وقال ابن وھب من المالکیۃ یقتل الا ان یتوب وعن بعضھم انہ یقتل اذا کانت عادتہ ذلک وبہ قال ابن الماجشون وقال ابن القاسم یضرب عنقہ لانہ لا تعرف توبتہ وبہ قال سحنون ومن قال بقتلہ فقد خالف الحدیث واقوال المتقدمین وقال الاوزاعیؒ فان کان کافرا یکون ناقضا للعھد وقال اصبغ الجاسوس الحربی یقتل والمسلم والذمی یعاقبان الا ان یظاھرا علی الاسلام فیقتلان۔

(عمدۃ القاری ج ۱۴ ص ۲۵۶ باب الجاسوس کتاب الجہاد) ؎

؎ وقال العلامۃ الحصکفیؒ: وفی المجتبیٰ: الاصل ان کل شخص رأی مسلماً یزنی ان یحل لہ قتلہ وانما یمتنع خوفاً من ان لا یصدق انہ زنی وعلی ھذا القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمۃ بادنی شیء لہ قیمۃ وجمیع الکبائر والاعونۃ والسعاۃ یباح قتل الکل ویثاب قاتلھم انتھی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذ ــــــــــ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: (بعد قولہ وجمیع الکبائر) ای اھلھا والظاھر ان المراد بھا المتعدی ضررھا الی الغیر فیکون قولہ والاعونۃ والسعاۃ عطف تفسیر او عطف خاص علی عام فیشمل کل من کان من اھل الفساد کالساحر وقاطع الطریق واللص واللوطی والخناق ونحوھم ممن عم ضررہ ولا ینزجر بغیر القتل قولہ والاعونۃ کانہ جمع معین او عوان بمعناہ والمراد بہ الساعی الی الحکام بالافساد فعطف السعاۃ علیہ عطف تفسیر وفی رسالۃ احکام السیاسۃ عن جمع النسفی سئل شیخ الاسلام عن قتل الاعونۃ والظلمۃ والسعاۃ فی ایام الفترۃ قال یباح قتلھم لانھم ساعون فی الارض بالفساد فقیل انھم یمتنعون ذلک فی ایام الفترۃ ویختفون قال ذلک امتناع ضرورۃ ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ کما نشاھد وسئلنا الشیخ ابا شجاع عنہ فقال یباح قتلہ ویثاب قاتلہ قولہ وافتی الناصحی لعل الوجوب بالنظر للامام ونوابہ والاباحۃ بالنظر لغیرھم۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۱۹۶، ۱۹۸ باب التعزیر، مطلب یکون التعزیر بالقتل)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۴۲ فصل فی التعزیر۔

دشمنوں کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا

سوال:۔ کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مقصود اس سے ان کی شان وشوکت کو ختم کرنا اور ان پر غصے کا اظہار کرنا ہے اس لیے ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے، اور یہ بھی جہاد میں سے ہے۔

وقال العلامة الكاسانیؒ: ولا بأس باحراق حصونهم بالنار واغراقها بالماء وتخريبها وهدمها ونصب المجانيق عليها لقوله تعالى: يخربون بيوتهم بايديهم وايدی المؤمنين ولان كل شیء من باب القتال لما فيه من قهر العدو وكبتهم وغيظهم۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۰۰ كتاب السير)

اہلِ حرب کے باغات اور فصلوں کو برباد کرنا

سوال:۔ کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران اُن کے باغات اور فصلوں کو تباہ کرنا اور قطع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار کے ساتھ جنگ کی حالت میں ان کے باغات اور فصلوں کو کاٹنے اور برباد کرنے میں چونکہ ان کی شان وشوکت اور غرور وتکبّر کو توڑنا مقصود ہوتا ہے لہٰذا دورانِ جہاد اُن کے باغات اور فصلوں وغیرہ کو تباہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم بلا وجہ مال مویشی اور باغات کو تباہ نہ کیا جائے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغينانی رحمه الله: قال وارسلوا عليهم الماء وقطعوا اشجارهم وافسدوا زروعهم لان فی جميع ذلك الحاق الكبت والغيظ بهم وكسر شوكتهم وتفريق

لـه وقال العلامة ابن عابدينؒ: (تحت قوله وحرقهم) اراد حرق دورهم وامتعتهم قاله عينی والظاهر ان المراد حرق ذاتهم بالمجانيق واذا جازت محاربتهم يحرقهم فمالهم اولیٰ۔

(رد المحتار ج۳ ص۲۲۳ كتاب الجهاد)

ومثله فی الهندية ج۲ ص۱۹۴ كتاب السير- الباب الثانی فی كيفية القتال۔

جمعهم فيكون مشروعاً. (الهداية ج ۲ ص۲۵۵ كتاب السير باب كيفية القتال) ۱؎

جنگ کے دوران کافر اگر کلمہ پڑھ لے تو اسے قتل کرنا جائز نہیں

سوال: ایک کافر اور منکر خدا اگر دورانِ جنگ مجاہدین کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور کلمۂ توحید پڑھ لے تو کیا اسلام لانے کے بعد اس کا قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حالتِ جنگ میں اگر کسی غیر مسلم نے مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر وحدانیتِ باری تعالیٰ کا اقرار کر لیا تو شریعتِ مطہرہ میں ایسے شخص کو قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں صرف اس کے اقرارِ ایمان پر ہی اکتفا کر لینا کافی ہے۔

لما قال العلامة ابن نجيمؒ: والكفار اقسام قسم يجحدون البارى جل وعلا واسلامهم اقرارهم بوجوده وقسم يقرون به ولكن ينكرون وحدانيته واسلامهم اقرارهم بوحدانيته۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۷۴ كتاب السير) ۲؎

جنگ کے دوران کافر باپ کے قتل کا حکم

سوال: اگر کسی کا باپ کمیونسٹوں کی طرف سے مجاہدین اسلام کے خلاف لڑ رہا ہو تو اس کو قتل کرنا بیٹے کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ اسلام میں والدین کے اپنی اولاد پر بہت زیادہ حقوق ہیں

۱؎ وفى الهندية: ونصبوا عليهم المجانيق وحرقوهم وارسلوا عليهم الماء وقطعوا شجرهم وافسدوا زرعهم۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص۱۹۳ كتاب السير، الباب الثانى فى كيفية القتال)

وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج ۵ ص۷۶ كتاب السير۔

۲؎ وفى الهندية: قال القدورى فى كتابه الكفار على نوعين فمنهم من يجحد البارى عزوجل ومنهم من يقربه الا انه ينكر وحدانيته كعبدة الاوثان فمن انكره اذا اقر به يحكم باسلامه ومن اقر وجحد وحدانيته اذا اقر بوحدانيته بان قال لا اله الا الله يحكم بالاسلام۔

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص۱۹۵ كتاب السير الباب الثانى فى كيفية القتال)

وَمِثْلُهٗ فى التاتارخانية ج ۵ ص۲۲۳ كتاب السير الفصل الرابع فى بيان ما ينتهى به الامر بالقتال۔

اس لیے کسی کے والدین اگرچہ کافر ہی ہوں پھر بھی اسلام دنیاوی امور میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے، اس بنا پر باپ جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہو تو بیٹے کے لیے باپ پر اقدام علی القتل مرخص نہیں البتہ اگر اُسے قتل کیے بغیر کوئی اور تدبیر مناسب ممکن نہ ہو یا باپ سے قتل ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس مجبوری کے پیشِ نظر باپ کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ویکرہ ان یبتدء الرجل اباہ من المشرکین فیقتلہ لقولہ تعالیٰ: وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (الآیۃ) ولانہ یجب احیاءہ بالانفاق فیناقضہ الاطلاق فی افنائہ فان ادرکہ امتنع علیہ حتی یقتلہ غیرہ لان المقصود یحصل بغیرہ من غیر اقتحامہ المأثم وان قصد الاب قتلہ بحیث لایمکنہ دفعہ الا بقتلہ لا بأس بہ لان مقصودہ الدفع الا ترٰی انہ لو شھر الاب سیفہ علی ابنہ ولایمکنہ دفعہ الا بقتلہ یقتلہ لما بینا فھٰذا اولیٰ۔

(الھدایۃ ج ۲ ص۵۶۵ کتاب السیر، باب کیفیۃ القتال) —[1]

کمیونسٹوں کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں کے احکام

سوال:۔ افغانستان پر رُوسی قبضہ کے بعد اکثر لوگوں نے ہجرت کر لی لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی اور کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں رہ رہے ہیں، تو کیا ایسے لوگوں کا قتل کرنا اور انہیں نقصان پہنچانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں جن لوگوں نے ہجرت نہیں کی ہے اور وہاں کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں زندگی بسر کر رہے ہوں اور مجاہدین کے خلاف کمیونسٹوں کی اعانت نہیں کرتے ہوں تو اگرچہ وہ لوگ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں

---

[1] وفی الھندیۃ: ولا بأس بان یقتل الرجل من المسلمین کل ذی رحم محرم من المشرکین یبتدأ بہ الا الوالد والوالدۃ والاجداد من قبل الرجال والنساء والجدات۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۱۹۴ کتاب السیر، الباب الثانی فی کیفیۃ القتال)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۰۱ کتاب السیر۔

لیکن شریعتِ مقدسہ ان کو قصداً وارادۃً قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی، البتہ اُن کے اموال کو ضبط کرنا جبکہ اس سے کفار کو فائدہ ہو رہا ہو درست ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: ومنه تعلم من يدخل تحت جوارهم وامانهم من غير اعانة لهم بنفسه وبماله ولا يكون عينا لهم علينا ولا ردءاً دونهم لا يباح قتله وانما هو عاص معصية لا تبيح ما عصمه الاسلام من دمه وماله وانما ابيح اخذ اموالهم ايضاً لكونهم يعينون به العدو على مقاتل اهل الاسلام ومقاومته ومناواته ومناهضته فابيح اخذه لذلك۔

(الفتاوى الكاملية ص۲۵۱ كتاب الجنايات)[۱]

کمیونسٹوں کے معاونین کا حکم

سوال:- کمیونسٹوں کے معاونین اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کا قتل جائز ہے؟

الجواب:- کمیونسٹ چونکہ اپنے عقائد اور نظریات کی بناء پر اہلِ حرب قرار دیئے گئے ہیں لہٰذا واقعی طور پر جو لوگ کمیونسٹوں کے حامی ہوں اور ان کے ساتھ امداد و تعاون کرتے ہوں تو یہ بھی انہی لوگوں کے حکم میں ہیں، لہٰذا ان کو بھی قتل کرنا منصوص ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت عن بلدة استولى عليها الكفار وتمكنوا منها فانضم اليهم بعض القبائل والعشائر وصاروا يقاتلون معهم المسلمين وينهبون مالهم وينصحون الكفار ويعينونهم على اذى المسلمين فكانوا اشد ضرراً على المسلمين من الكفار فما حكم فيهم وهذا حالهم۔ فالجواب انى لم اقف على حكم هؤلاء فى كتب مذهبنا معاشر الحنفية ولكن وقفت على حكمهم

---

[۱] قال العلامة ابن عابدينؒ: قوله بالمجانيق اى يرمى النار بها عليهم لكن جواز التحريق والتغريق مقيد كما فى شرح السير بما اذا لم يتمكنوا من الظفر بهم بدون ذلك بلا مشقة عظيمة فان تمكنوا بدونها فلا يجوز لان فيه اهلاك اطفالهم ونسائهم ومن عندهم من المسلمين۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۲۹ كتاب الجهاد۔ مطلب فى ان الكفار مخاطبون ندبا)

ومثله فى الهداية ج۲ ص۵۶ كتاب السير۔

فی کتب بعض السادۃ المالکیۃ الی ان قال والظاھر ان حکم ھؤلاء حکم اھل الحرب فی قتلھم واخذ اموالھم واما اولادھم فلا یقتلون ولا یکون فیأ وانما أبیح قتل البالغین منھم لکونھم رداء العدو والحرب ومعینون لہ بانفسھم و حکم الردء اذا لم یقاتل مع العدو حکم المقاتل فاحری اذا قاتل۔

(الفتاوی الکاملیۃ ص۲۵ کتاب الجنایات) لہ ......

کمیونسٹوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا

سوال:۔ کیمونسٹوں کے بچوں اور ان کی عورتوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقہاء احناف کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

الجواب:۔ کیمونسٹوں کے بچوں اور عورتوں کو قصداً و ارادۃً قتل کرنا جائز نہیں البتہ اگر کیمونسٹوں کو اور ان کے گھروں کو تباہ کرنا مقصود ہو تو ان میں جو بچے اور عورتیں غیرارادی طور پر قتل ہوجائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، نیز اگر ان میں سے کوئی ذی رائے ہو یا جنگ کرنے والا ہو یا ان کی سربراہ عورت ہو تو قصداً و ارادۃً بھی قتل کئے جاسکتے ہیں تاکہ شر و فساد کا خاتمہ ہوجائے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یقتلوا امرأۃ ولا صبیاً ولا شیخاً فانیاً ولا مقعداً ولا اعمی لان المبیح للقتل عندنا ھو الحراب ولا یتحقق منھم ..... الا ان یکون احد ھؤلاء ممن لہ رأی فی الحراب او تکون المرأۃ ملکۃ لتعدی ضررھا الی العباد وکذا یقتل من قاتل من ھؤلاء دفعاً لشرہ ولان القتال مبیح حقیقتہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۵۶۲ کتاب السیر باب کیفیۃ القتال) ۲؎

لہ وقال العلامۃ الحصکفیؒ: وجمیع الکبائر والاعونۃ والسعاۃ یباح قتل الکل ویثاب قاتلھم انتھی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذ۔ وقال ابن عابدینؒ: بعد قولہ وجمیع الکبائر ای اھلھا والظاھر ان المراد بھا المتعدی ضررھا ای الغیر الی ان قال فیشمل کل من کان من اھل الفساد۔

(ردالمحتار ج۴ ص۱۹۸ باب التعزیر، مطلب یکون التعزیر بالقتل)

۲؎ وقال العلامۃ الکاسانیؒ: اما حال القتال فلا یحل فیھا قتل امرأۃ ولا صبی ولا شیخ فان۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر)

ومثلہ فی البحرالرائق ج۵ ص۷۷ کتاب السیر۔

دشمن سے اسلحہ لیکر اُسے مجاہدین کے خفیہ راز بتانیوالے کو قتل کرنے کا حکم

سوال: پاکستان یا افغانستان کے بعض قبائلی علاقوں میں کچھ لوگ مجاہدین کو نقصان پہنچاتے اور ان کے عسکری راستوں کو قطع کرنے کے لیے روسی کمیونسٹ حکومت سے اسلحہ لیتے ہیں اور مجاہدین کے خفیہ حالات اور مراکز کی اطلاع بھی دشمن کو کرتے ہیں، تو کیا ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جو لوگ مجاہدینِ اسلام کے خلاف کمیونسٹوں یا دیگر مخالفینِ اسلام کے ساتھ کسی بھی قسم کی معاونت کرتے ہوں اور مجاہدینِ اسلام کے خفیہ راز اور عسکری مراکز کی نشاندہی دشمنوں کو کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے، ان کا حکم زنادقہ کا حکم ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: ومنهم من يُجاء للمسلمين وصار يقاتل العدو معهم وهو مع ذلك يعين العدو خفية ويعلّمه باحوال عساكر المسلمين ويطلعه على عوراتهم ويتربص بهم الدوائر وقد اطلع لهم على كتب كتبها في ذلك لوقت كثير من مشائخهم المعروفين بالاجواد..... الى ان قال وحكم اولئك حكم الزنادقة ان اطلع عليهم قتلوا وان لا فامرهم الى الله۔ (الفتاوى الكاملية ص۲۵۱ كتاب الجنايات)[1]

جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا

سوال:- کیا مجاہدین کے لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہاد کے دوران ہر مناسب طریقے سے دشمن پر رعب اور دباؤ ڈالنا

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وجميع الكبائر والاعونة والسعاة يباح قتل كل وبثاب قاتلهم انتهى وافتى الناصحي بوجوب قتل كل موذٍ۔ وقال ابن عابدينؒ: (تحت قوله وجميع الكبائر) اى اهلها والظاهر ان المراد بها المتعدى ضررها الى الغير فيكون قوله والاعونة والسعاة عطف تفسير او عطف خاص على عام فيشمل كل من كان من اهل الفساد كالساحر وقاطع الطريق واللص واللوطي والخناق ونحوهم من عم ضرره ولا ينزجر بغير القتل قوله والاعونة كانه جمع معين او عوان بمعنا والمراد به الساعي الى الحكام بالافساد فعطف السعاة عطف تفسير۔

(رد المحتار ج۴ ص۱۹۸ باب التعزير)

اور اس کی شان و شوکت کو ٹھیس پہنچانا مشروع ہی نہیں بلکہ مستحسن بھی ہے۔ مونچھیں بڑھانے کی صورت میں چونکہ دشمن پر رعب پڑنے کا امکان ہوتا ہے اس لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا ایک اچھا قدم ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: ویندب للمجاهد فی دار الحرب توفیر الاظفار وان کان قصها من الفطرة لانه اذا سقط السلاح من یده ودنا منه العدو ربما یتمکن من دفعه باظافیره وهو نظیر قص الشوارب فانه سنة ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرها وتطویلها لیکون اهیب فی عین من یبارزه والحاصل ان مایعین المرء علی الجهاد فهو مندوب الی اکتسابه لما فیه من اعزاز المسلمین وقهر المشرکین۔
(البحر الرائق ج۵ ص۷۶ کتاب السیر) ؎۱

دشمن سے تحفظِ دین کی خاطر توریہ کا بروئے کار لانا

سوال:۔ جہاد میں کفار کو ہلاک کرنے اور ان کو شکست دینے کے لیے جھوٹ بولنا اور انہیں دھوکہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دھوکہ دہی اور جھوٹ بولنا کسی بھی آسمانی مذہب میں جائز نہیں اس لیے اس کا کسی بھی وقت جائز اور حلال متصور نہیں تاہم بعض مواضع ایسے ہیں جن میں اگر دین کو نقصان پہنچتا ہو اور اس سے بچنے کے لیے ظاہری دھوکہ اور جھوٹ کے علاوہ کوئی تلافی ممکن نہ ہو تو ایسے مواضع پر جھوٹ کا سہارا لیا جاسکتا ہے تو چونکہ درحقیقت یہ جھوٹ نہیں اس لیے دشمن سے حفاظتِ دین کی خاطر ظاہری دھوکہ اور جھوٹ میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: روی عن علیؓ انه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الحرب خدعة فیه دلیل علی انه لا بأس بالخداع فی الحرب ولیس المراد الکذب المحض وانما المراد استعمال المعاریض۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۰ کتاب السیر، الفصل التاسع فی الخدعة فی الحرب) ؎۲

؎۱ وفی الهندیة: قالوا لا بأس بطول الشارب للغزاة لیکون اهیب فی عین العدو وکذا فی الغیاثیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۸ کتاب الکراهیة)

؎۲ قال العلامة العثمانیؒ: بعد ذکر الحدیث ما نصه وفیه علی انه لا بأس للمجاهد ان یخادع قرنه فی حال القتال۔ (اعلاء السنن ج۱۲ ص۴۵ کتاب السیر)

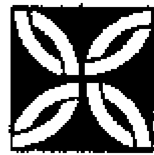
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴۶ کتاب الکراهیة۔ الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی۔

جنگ کے دوران مسلمان افواج کا پیچھے ہٹ جانے کا حکم

سوال: کفار کے سامنے جنگ کے دوران مسلمانوں کی فوج اپنے مورچوں پر آخری دم تک ثابت قدم رہے گی یا کسی موقعہ پر پیچھے ہٹ جانے کی بھی اجازت موجود ہے؟

الجواب: کفار کے مقابلہ میں مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت قدمی پر مامور ہیں اور ان کا میدان چھوڑنا جرم ہے، لیکن کفار کی تعداد اگر اتنی زیادہ ہو کر ان کا مقابلہ ناممکن ہو یا تعداد کے لحاظ سے اگرچہ کم ہوں لیکن مسلمان فوج کا غالب خیال یہ ہو کہ کفار کا مقابلہ نہیں کرسکتے تو ایسی حالت میں دوبارہ تیاری کے لیے پیچھے ہٹ جانا شرعاً جرم نہیں۔

كما قال الله تعالىٰ: يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ ٱلْأَدْبَارَ ـ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُۥٓ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَمَأْوَىٰهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ ۝ (سورة الانفال آیت ۱۵) [1]



---

[1] وقال العلامة الكاسانيؒ: وعلىٰ هٰذا الغزوات إذا جاءهم جمع من المشركين ما لا طاقة لهم به وخافوهم ان يقتلوهم فلا بأس لهم ان ينحازوا إلىٰ بعض امصار المسلمين او الىٰ بعض جيوشهم والحكم في هٰذا الباب لغالب الرأي واكبر الظن دون العدد فان غلب على ظن الغزاة انهم يقاومونهم يلزمهم الثبات وان كانوا اقل عدداً منهم وان كان غالب ظنهم انهم يغلبون فلا بأس ان يتحازوا الى المسلمين ليستعينوا بهم وان كانوا اكثر عدداً من الكفرة ـ

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر فصل بیان من یفترض)

باب الغنائم وقسمتها

(مالِ غنیمت کے احکام و مسائل)

مالِ غنیمت غانمین کا حق ہے نہ کہ حکومت کا

سوال :- کفار کے ساتھ جنگ کے دوران جب اسلامی فوج کافروں کی افواج کو مغلوب کر کے مالِ غنیمت پر قبضہ کرے تو کیا یہ مالِ غنیمت فوج کا حق ہے یا حکومت کا حق ہے ؟

الجواب :- شرعی اعتبار سے مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے ان میں سے ۱/۵ حصہ بیت المال میں داخل کر کے باقی ۴/۵ حصہ خاص اس فوج پر تقسیم کیا جائے گا جس نے دورانِ جنگ اس مالِ غنیمت پر قبضہ کیا ہو اور اس کے برعکس حکومت کا یہ قانون کہ سارا مالِ غنیمت حکومت کا ہوگا دیگر قوانین کی طرح ایک غیر اسلامی اور غیر شرعی قانون ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بھی خلاف ہے ۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ : ویقسم الامام الغنیمۃ فیخرج خمسھا لقولہ تعالیٰ: فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ ۔ استثنی الخمس ویقسم اربعۃ اخماس بین الغانمین لان النبی علیہ السلام قسمھا بین الغانمین ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۲۶ باب الغنائم وقسمتھا)[1]

مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ سرمایہ ہے

سوال :- جب امیرِ لشکر میدانِ جنگ میں دشمن کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے مجاہدین کو چار جماعتوں پر تقسیم کر کے بھیجدے اور ان چار جماعتوں میں سے ایک جماعت اس علاقہ پر قبضہ کر کے مالِ غنیمت پر قبضہ کر لے تو کیا اس مالِ غنیمت میں تمام جماعتیں شریک ہوں گی یا یہ صرف قابض جماعت کا حق ہوگا۔

---

[1] وقال العلامۃ الحصکفیؒ : فی المغرب الغنیمۃ ما نیل من الکفار عنوۃ والحرب قائمۃ فتخمس وباقیھا للغانمین ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۱۳۴ کتاب الجھاد باب المغنم وقسمتہ)
ومثلہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۲۳۴ کتاب الغنائم وقسمتھا فصل فی کیفیۃ القسمۃ

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں یہ مالِ غنیمت مجاہدین کی تمام جماعتوں کا مشترکہ حق ہے خواہ کسی ایک جماعت نے ہی اس مال پر قبضہ کیا ہو، البتہ اگر امیرِ لشکر کسی خاص مصلحت کی بناء پر یہ مالِ غنیمت کسی خاص جماعت پر تقسیم کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: قال الردء والمقاتل فی العسکر سواء لاستوائهم فی السبب وهو المجاوزة اوشهود الوقعة علیٰ ما عرف وکذلك اذا لم یقاتل لمرض اولغیرہ لما ذکرنا۔ (الهدایة ج۲ ص۲۶۳ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتها) [1]

تنفیل (انعام) نہ ہونے کی صورت میں مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ ہوگا

سوال: جہادِ افغانستان میں ایک مجاہد نے ایک روسی کافر کو ہلاک کر کے اس کی کلاشنکوف پر قبضہ کر لیا، اب دیگر مجاہدین اس کو یہ کہتے ہیں کہ یہ کلاشنکوف آپ اکیلے کا حق نہیں بلکہ تمام مجاہدین کا اس میں حق ہے اور یہ مالِ غنیمت ہے جبکہ وہ مجاہد یہ کہتا کہ اس کلاشنکوف پر صرف میرا حق ہے کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے، تو اس مسئلہ کا شرعی حل کیا ہوگا؟

الجواب:۔ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کے درمیان مشترکہ ہوتا ہے کسی ایک مجاہد کا بغیر تقسیم کے مالِ غنیمت میں سے کچھ لینا جائز نہیں، تاہم اگر امیرِ جہاد نے تنفیل (انعام) کا اعلان کیا ہو یعنی جو مجاہد جس حربی کو قتل کرے گا تو مقتول سے جو اسلحہ اُسے حاصل ہوگا وہ اسی کا ہوگا۔ تو ایسی صورت میں اگر کسی مجاہد نے کسی حربی کو قتل کر کے اس کے اسلحہ پر قبضہ کر لیا تو وہ اسلحہ اسی مجاہد کا حق ہوگا کوئی اور اس کے ساتھ اس اسلحہ میں شریک نہیں ہوگا، اس کے علاوہ جملہ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ مال ہے۔

لما فی الهندیة: قال محمدؒ ولا یستحق القاتل سلب المقتول بنفس القتل ما لم

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: (تنبیه) قال فی البحر وافاد المصنف أن المقاتل وغیرہ سواء حتی یستحق الجندی الذی لم یقاتل لمرض وغیرہ وانه لا یتمیز واحد علی آخر بشیء حتی امیر العسکر وهذا بلا خلاف کذا فی الفتح وفی المحیط والمتطوع فی الغزو وصاحب الدیوان سواء۔

(رد المحتار ج۴ ص۱۴۳ کتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته)

ومثله فی البحر ج۵ ص۸۵ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتها۔

ینفل الامام قبل القتال فیقول من قتل قتیلاً فلہ سلبہ وھذا مذھب علمائنا۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۲۱۲ کتاب السیر الباب الرابع الفصل الثالث فی التنفل)[۱]

دارالحرب سے مال غنیمت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کا حکم

سوال:۔ جہاد کے دوران اگر مسلمان کفار کے بہت سارے مال واسباب پر قبضہ کریں اور اس میں بعض ایسی اشیاء بھی شامل ہوں کہ اُن کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو مثلاً حیوانات اور دوسری بھاری اشیاء، تو ایسی اشیاء کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر مقبوضہ اشیاء ایسی ہوں کہ ان کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو جیسا کہ حیوانات اور بھاری اسلحہ وغیرہ، تو شریعت کی رُو سے حیوانات کو پہلے ذبح کرکے بعد میں دارالحرب میں چھوڑا جائے تاکہ کفار ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور اسلحہ وغیرہ کو کسی ایسی خفیہ جگہ دفن کیا جائے کہ کفار کو اس کا پتہ نہ چل سکے، بچوں اور عورتوں کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جائے کہ وہاں بھوک اور پیاس سے دم توڑ جائیں تاکہ کفار کو ان سے تقویت نہ پہنچے اور برتن وغیرہ توڑ دیئے جائیں۔

کما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: وحرم عقر دابۃ شق نقلھا فتذبح وتحرق کما تحرق اسلحۃ وامتعۃ تعذر نقلھا ومالا یحرق منھا یدفن بموضع خفی وتکسر اوانیھم وتراق دھانھم مغایظۃ لھم ویترک صبیان ونساء منھم شق اخراجھا بارض خربۃ حتی یموتوا جوعاً۔ (تنویر الابصار علی صدر ردالمحتار ج۴ ص۱۴۰ کتاب الجہاد باب المغنم وقسمتہ)[۲]

---

[۱] وقال العلامۃ الکاسانیؒ: ھذا اذا نفل الامام فان لم ینفل شیئاً وقتل رجل من الغزاۃ قتیلاً لم یختص بسلبہ عندنا۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۵ کتاب السیر) ومثلہ فی الھدایۃ ج۲ ص۲۶۳ کتاب السیر باب الغنائم وقسمتھا

[۲] قال العلامۃ الکاسانیؒ: وان لم یقدر المسلمون علی حمل ھؤلاء ونقلھم الی دار الاسلام لا یحل قتلھم ویترکون فی دار الحرب لان الشرع نھی عن قتلھم ولا قدرۃ علی نقلھم فیترکون ضرورۃ واما الحیوان والسلاح اذا لم یقدروا علی الاخراج الی دار الاسلام اما الحیوان فیذبح ثم یحرق بالنار لئلا یمکنھم الانتفاع بہ اما السلاح فما امکن احراقہ بالنار یحرق ومالا یحتمل الاحراق کالحدید ونحوہ فیدفن بالتراب لئلا یجدوہ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۲ کتاب السیر)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۰۸ کتاب السیر الباب الرابع فی الغنائم وقسمتھا۔ الفصل الاول فی الغنائم۔

دارالحرب میں مسلمان تاجر کے مال کا حکم

سوال:۔ بعض مسلمان تاجر دارالحرب میں سامانِ تجارت وغیرہ لاتے ہیں اور وہاں خرید وفروخت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، اگر مجاہدین ان کے سامان اور مال پر قبضہ کرلیں تو کیا یہ مال وغیرہ مالِ غنیمت شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دارالحرب کو مالِ تجارت مہیا کرنا مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں کیونکہ اس سے کفار کو تقویت ملتی ہے جو کہ اعانت علی المعصیت کے مترادف ہے، اور مجاہدین کا مسلمانوں کے مالِ تجارت پر قبضہ کرنے سے وہ مال مالِ غنیمت شمار نہیں ہوتا بلکہ مالِ غنیمت وہ ہے جو کفار سے بزورِ شمشیر حاصل کیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: الغنیمة اسمٌ لما یؤخذ من اموال الکفرة بقوة الغزاة وقهر الکفرة۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۳۷ کتاب الجهاد والمغنم) ؎۱

مالِ غنیمت میں خیانت کرنا حرام ہے

سوال:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ میں اس کا کوئی ذکر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً حرام ہے، یہ مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس میں خیانت کرے کیونکہ اس کی حرمت پر قرآنی نصوص اور احادیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) دال ہیں۔

لقوله تعالیٰ: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (سورة آلِ عمران آیت ۱۶۱) ؎۲

؎۱ وقال العلامة الکاسانیؒ: فالغنیمة عندنا اسم للماخوذ من اهل الحرب علیٰ سبیل القهر والغلبة۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۷ کتاب السیر)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۲۰۴ کتاب السیر، الباب الرابع فی الغنائم الفصل الاول فی الغنائم۔

؎۲ وفی الحدیث: عن ابن عباسؓ یقول حدثنی عمر بن الخطابؓ قال قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فلاناً قد استشهد قال کلا قد رأیته فی النار بعباءة قد غلّها قال قم یا عمر فناد انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون ثلاثاً۔ هٰذا حدیث حسن صحیح غریب۔ (ترمذی ج۱ ص۱۹۱ باب ما جاء فی الغلول)

وَمِثْلُهٗ فی ابی داؤد ج۲ ص۱۴ باب فی تعظیم الغلول۔ کتاب الجهاد۔

مالِ غنیمت کی نیت سے جہاد کرنے کا حکم

سوال :۔ مالِ غنیمت کے حصول کی نیت سے جہاد میں حصہ لینے سے ثواب کی اُمید کی جا سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ کسی آدمی کا جہاد کو جانے سے اگر مقصودِ اصلی مالِ غنیمت ہو تو اس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا، ہاں اگر مقصودِ اصلی جہاد اور رضائے الٰہی کا حصول ہو لیکن اس کے ساتھ مالِ غنیمت کا بھی ارادہ ہو تو ثواب ملنے کی اُمید ہے ۔

لما فی الحدیث :عن ابی ھریرۃؓ ان رجلاً قال یارسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی غرضاً من غرض الدنیا فقال علیہ السلام لا اجر لہٗ فاعظم ذٰلک علی الناس وقال للرجل عد لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلعلک لم تفھمہ فقال یارسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی غرضاً من غرض الدّنیا قال لا اجر لہٗ فقالوا للرجل عد لرسول اللہ فقال لہ الثالثۃ فقال لا اجر لہٗ ۔

(سنن ابی داؤد ج ۱ کتاب الجہاد باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا ص۳۳۷)[۱]

شہید کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں حصہ دینے کا حکم

سوال :۔ اگر کوئی مجاہد کفار کے ساتھ جنگ کے دوران شہید ہو جائے تو کیا اس کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب :۔ مجاہدین جب مالِ غنیمت پر قبضہ کرکے دارالاسلام میں لے آئیں یا تقسیم کر لیں اور اس کے بعد کوئی شہید ہو جائے تو ایسی حالت میں اس کا حصہ اس کے

---

[۱] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ : ثم تأویلہٗ من وجھین احدھما ان یری انہٗ یرید الجہاد ومرادہٗ فی الحقیقۃ المال فھٰذا کان حال المنافقین ولا اجر لہٗ او یکون معظم مقصودہ المال وفی مثلہٗ قال علیہ السلام للذی استوجر علی الجہاد بدینارین انما لک دینارک فی الدنیا والاٰخرۃ واما اذا کان معظم مقصودہ الجہاد یرغب معہ الغنیمۃ فھو داخل فی قولہ تعالٰی :لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّکُمْ ۔یعنی التجارۃ فی الحج فکما انہٗ لا یحرم ثواب الحج فکذا الجہاد ۔ (ردّ المحتار ج ۴ ص۱۲۰ کتاب الجہاد مطلب فیمن یرید الجہاد مع الغنیمۃ)

ورثاء کو دیا جائے گا، اور اگر کوئی دارالحرب میں شہید ہو گیا یا تقسیم غنیمت سے پہلے شہید ہو گیا تو ایسی صورت میں اس کے ورثاء کو حصہ نہیں دیا جائے گا۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمه الله : ومن مات من الغانمین فی دار الحرب فلا حق له فی الغنیمة ومن مات منهم بعد اخراجها الی دار الاسلام فنصیبه لورثته لان الارث یجری فی الملك ولا ملك قبل الاحراز وانما الملك بعده۔

(الهدایة ج ۲ ص ۵۶۴ کتاب السیر باب الغنائم وقسمتها) [1]

مالِ غنیمت میں عورتوں کے حصہ کا حکم

سوال:۔ اگر جہاد میں عورتیں بھی شریک ہوں یعنی وہ زخمیوں کو پانی وغیرہ پلاتی ہوں یا ان کی مرہم پٹی کرتی ہوں تو مالِ غنیمت میں ان کو حصہ ملے گا یا نہیں جبکہ وہ مردوں کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہیں؟

الجواب:۔ یہ مسئلہ علماء امت کے ہاں مختلف فیہ ہے، بعض حضرات عورتوں کو بھی مردوں کے برابر مالِ غنیمت میں حصہ دینے کے قائل ہیں جبکہ حنفیہ اور دوسرے علماء ان کیلئے مردوں کے برابر حصہ کے قائل نہیں، تاہم یہ حاکم وقت کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ (سہم) مردوں کے حصے سے کم جتنا مناسب سمجھے عورتوں کو مال غنیمت سے کچھ مال دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانی : قال فی الهدایة والکفایة ولا یسهم لمملوك ولا امرأة ولا صبی ولا ذمی ولکن یرضخ لهم ای یعطون قلیلاً من کثیر فان الرضخة هی الاعطاء کذلك فالرضخ لا یبلغ السهم ولکن دونه علی حسب ما یراه الامام۔ (اعلاء السنن ج ۱۲ ص ۱۹۰ باب لا یسهم لمملوك ولا امرأة الخ)

---

[1] وقال العلامة التمرتاشی رحمه الله : ولا من مات ثمة قبل قسمة او بیع ولو مات بعد احدهما ثمة او بعد الاحراز بدارنا یورث نصیبه لتاکد ملکه۔

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۱۴۲ کتاب الجهاد باب المغنم)

ومثله فی الهندیة ج ۲ ص ۲۰۸ کتاب السیر الباب الرابع فی الغنائم، الفصل الاول فی الغنائم۔

باب المستامن

(دارالاسلام میں رہنے والے کفار کے احکام ومسائل)

دارالاسلام بننے کے لیے شرائط

سوال:۔ دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے کون سی شرائط ہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ احکام میں اسلام کا ظہور ہوجائے تو وہ دارالاسلام شمار ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ودارالحرب تصیر دارالاسلام باجراء احکام اهل الاسلام فیها کجمعة وعید۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۷۷ کتاب الجهاد۔ قبل باب العشر والخراج والجزیة) [1]

دارالحرب بننے کے لیے شرائط

سوال:۔ دارالاسلام سے دارالحرب بننے کے لیے کیا شرائط ہیں؟

الجواب:۔ دارالاسلام سے دارالحرب بننے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تین شرائط کا ہونا ضروری ہے (۱) احکام کفر اس میں ظاہر ہوجائیں (۲) دارالکفر کے ساتھ متصل ہوجائے (۳) مسلمان اور ذمی اپنے امن میں نہ رہ جائے بلکہ کفار کے امن میں داخل ہوجائیں، اور صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک دارالحرب بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ کفر کے احکام کا ظہور ہوجائے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله:۔ قال ابوحنیفةؒ انها لا تصیر دار الکفر إلا بثلث شرائط احدها ظهور احکام الکفر فیها والثانی ان تکون متاخمة دار الکفر

---

[1] وقال العلامة الکاسانیؒ: لا خلاف بین اصحابنا فی ان دار الکفر تصیر دار الاسلام بظهور احکام الاسلام فیها۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۳۰ کتاب السیر)
ومثله فی الهندیة ج۲ ص۲۳۲ کتاب السیر، الباب الخامس فی استیلاء الکفار۔

والثالث ان لایبقی فیہا مسلمٌ ولا ذمیٌّ آمنًا بالامان الاول وھو امان المسلمین قال ابو یوسفؒ ومحمدؒ انہا تصیر دارا لکفر بظھور احکام الکفر فیہا۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۰ فصل الاحکام تختلف باختلاف الدارین) لہ

سمندر کا دار الحرب میں داخل ہونا

سوال:- آجکل جغرافیائی تقسیم میں سمندر کا کچھ کچھ حصہ قریبی ممالک کے قبضے میں ہوتا ہے جس میں کسی دوسرے ملک کا بغیر اجازت کے داخل ہونا سمندری حدود کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا کافر ممالک کے ساتھ سمندر بھی دار الحرب کے حکم میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- جب کفار مسلمانوں کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی سمندری حدود پر بھی قبضہ کر لیں اور بلادِ اسلام سے اس علاقہ کا تعلق ختم ہو جائے تو اس کی سمندری حدود بھی حکماً دار الحرب میں شامل ہو جاتی ہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قولہ واحرزوھا دارھم ویلحق بھا البحر الملح ونحوہ کمفازۃ لیس ورائھا بلاد الاسلام نقلہ بعضھم عن الحمویؒ فی حاشیۃ ابی السعود عن شرح النظم الہاملی سطح البحر لہ حکم دار الحرب۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۶۶ کتاب الجھاد باب استیلاء الکفار)

کسی حربی کی دار الاسلام میں قیام امن کی مدت

سوال:- ایک غیر مسلم شخص کسی اسلامی حکومت میں کتنی مدت تک

لہ وفی الھندیۃ: قال محمد فی الزیادات انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفۃؒ بشروط ثلاثۃ احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتھار وان لایحکم فیھا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لایتخلل بینھما بلد من بلاد الاسلام والثالث ان لایبقی فیھا مومنٌ ولا ذمیٌّ آمنًا بامانہ الاول الذی کان ثابتًا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ وللذمی بعقد الذمۃ وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ بشرط واحد لا غیر وھو اظھار احکام الکفر وھو القیاس۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب السیر الباب الخامس فی استیلاء الکفار) ومثلہ فی تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۷۲ کتاب الجھاد قبل باب العشر والخراج والجزیۃ۔

اجازت حاصل کرکے قیام کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ غیر مسلموں کی عادات واخلاق کو دیکھتے ہوئے ہر وقت اُن سے اسلامی معاشرہ کو خطرہ ہوتا ہے، اس لیے ان کو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک دارالاسلام میں قیام کی اجازت دینا جائز نہیں تاہم اگر حاکم وقت بہتر سمجھے تو زیادہ عرصہ کے لیے قیام کی اجازت دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: لایمکن حربی مستأمن فینا سنة لئلا یصیر عیناً لهم وعوناً علینا وقیل له ان اقمت سنة وضعنا علیك الجزیة فان مکث سنة فهو ذمی۔

(الدرالمختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۴۷ کتاب الجهاد۔ فصل فی استئمان الکافر) [1]

غیر مسلم قیدیوں کے معاملہ کا حکم

سوال:۔ جہاد کے دوران اگر مجاہدین کچھ کافروں کو قیدی بنالیں اور اسی طرح کافروں نے بھی کچھ مسلمانوں کو قیدی بنایا ہو تو ان غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ شرعاً کیا معاملہ کرنا چاہیئے؟ کیا انہیں قتل کیا جائے یا ان کے بدلے میں مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا یا فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں گے؟

الجواب:۔ جہاد کے دوران جب کفار قیدی بنالئے جائیں تو حاکم وقت کی مرضی ہے کہ چاہے تو ان کو قتل کردے یا ان کو غلام بنالے یا اُن پر ذمی کے احکام لگا کر چھوڑ دے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دشمن کی قید میں مسلمان قیدیوں کے بدلے میں غیر مسلم قیدیوں کو آزاد نہیں کیا جائے گا جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ان سے فدیہ لینے کے بجائے مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: وهو فی الاساری بالخیار ان شاء قتلهم ...... وان شاء استرقهم وان شاء ترکهم احراراً ذمة

---

[1] وقال العلامة المرغینانی رحمه الله: واذا دخل الحربی الینا مستأمناً لم یمکن ان یقیم فی دارنا سنة ویقول له الامام ان اقمت تمام السنة وضعت علیك الجزیة۔

(الهدایة ج۲ ص۵۶۸ کتاب السیر، باب المستامن)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۰ فصل من یسع ترکه فی دار الحرب۔

للمسلمین ـــــ الیٰ ان قال ولا یفادی بالاساریٰ عند ابی حنیفۃؒ وقالا یفادی بھم اساریٰ المسلمین ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۵۶۱ کتاب السیر باب الغنائم) [1]

حربی کا بغیر اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونے کا حکم

سوال :- کیا اجازت نامہ (قانونی دستاویزات) کے بغیر اگر کوئی حربی دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس کو کوئی سزا دی جا سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- جب کسی ملک میں دارالاسلام کی شرائط پوری ہوں اور وہاں اسلامی حکومت ہو تو کسی حربی کا اس ملک میں حکام کی اجازت کے بغیر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کفار کا جاسوس بن کر آیا ہے، ایسی حالت میں اس کو بطور سزا کے غلام بنا لیا جائے، اس لیے کسی حربی کا بغیر حاکم وقت کی اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونا صحیح نہیں ۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : قید بالمستأمن لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان وما معہ فیأ ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت ۔ (ردالمحتار ج۴ ص۲۷۲ کتاب الجہاد، فصل فی استئمان الکافر) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : وقتل الاساریٰ ان شاء ان لم یسلموا او استرقہم او ترکھم احراراً ذمۃ لنا الا مشرکی العرب والمرتدین کماسیجئ وحرم منھم ای اطلاقھم مجاناً ولو بعد اسلامھم ابن کمال لتعلق حق الغانمین وجوزہ الشافعی لقولہ تعالیٰ : فَاِمَّا مَنًّا بعد و اما فداء حتیٰ تضع الحرب اوزارھا قلنا نسخ بقولہ : فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ ۔ شرح مجمع وحرم فداؤھم بعد تمام الحرب واما قبلہ فیجوز بالمال لا بالاسیر المسلم درر وصدر الشریعۃ وقالا یجوز وھو اظہر الروایتین عن الامام شمنیؒ ۔

(ردالمحتار ج۳ ص۲۵۱ کتاب الجہاد، باب المغنم وقسمتہ)

[2] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ : لانہ لو دخل دارنا بلا امان فھو وما معہ فیٔ فان قال دخلت بامان لم یصدق واخذ ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۰۱ باب المستأمن)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۲۷۱ کتاب السیر، باب المستأمن ۔

افغانستان کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! جہاد افغانستان کے وقت افغانستان دارالحرب تھا یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کسی ملک کے دارالحرب بننے کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ جہاد کے وقت افغانستان میں مکمل طور پر نہیں پائی جاتی تھیں اس لیے افغانستان کا دارالحرب ہونا فقہی نقطۂ نظر سے درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔

لما قال العلامة بدرالدین محمود بن اسمٰعیل رحمہ اللہ: لا تصیر دار حرب الا باجراء احکام الشرك واتصالها بدار الحرب بان لا یکون بینها وبین دار الحرب مصر للمسلمین وان لا یبقی فیها مسلم او ذمی امنا علی نفسه بالامان الاول لا یبقی امنا الا بامان المشرکین وعندهما باجراء احکام الشرك تصیر دار حرب اتصلت او لا وبقی احد بالامان الاول او لا (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۳ کتاب السیر) [۲]

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک اسلامی مملکت میں جب غیر مسلم رہائش پذیر ہوں تو کیا ان کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی اسلامی مملکت میں رہائش پذیر غیر مسلموں کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ ان کی سابقہ عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

---

[۱] وقال العلامة التمرتاشی: لا تصیر دار الاسلام دار حرب الا بامور ثلاثة باجراء الاحکام اهل الشرك وباتصالها بدار الحرب وبان لا یبقی فیها مسلم او ذمی امنا بالامان الاول۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۱۷۴ کتاب الجهاد، فصل استئمان الکافر)

ومثله فی الهندیة علی هامش الهندیة ج ۲ ص ۲۱۲ کتاب السیر باب الرابع فی المرتد وما یصیر الکافر به مسلماً۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا یحدث بیعۃ ولا کنیسۃ ولا صومعۃ ولا بیت نار ولا مقبرۃ فی دار الاسلام ولو قریۃ فی المختار۔
(تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۲۹۶ کتاب الجہاد، فصل فی الجزیۃ) ؎۱

دارالاسلام میں عیسائیت کی تبلیغ کا حکم

سوال:۔ آجکل مملکتِ خداداد پاکستان میں عیسائی کھلے عام بازاروں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں، کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتاہے کہ غیر مسلم دارالاسلام میں اپنے مذہب کی آزادی سے تبلیغ کرتے پھریں؟

الجواب:۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی غیر مسلم آزادی سے مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرے بلکہ مسلمان حاکمِ وقت پر یہ لازم ہے کہ وہ انہیں اس عمل سے باز رکھے، جہاں تک دارالاسلام میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کا تعلق ہے تو وہ صرف ان کے ہم مذہبوں تک محدود ہے یہاں تک کہ وہ بلند آواز سے اپنی مذہبی کتاب کی تلاوت بھی نہیں کرسکتے۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: وقد حکی ابن تیمیۃ اجماع الفقہاء وسائر الائمۃ رحمھم اللہ علی مراعاۃ تلک الشروط قال ولولا شہرتھا عند الفقہاء لذکرنا الفاظ کل طائفۃ فیھا..... ومن جملۃ الشروط مایعود باخفاء منکرات دینھم وترک اظھارھا کمنعھم من اظھار الخمر والناقوس والنیران والاعیاد ونحو ذلک ومنھا مایعود باخفاء شعائر دینھم کاصواتھم بکتابھم۔

{اعلاء السنن ج۱۲ ص۴۸۸ باب شروط اھل الذمۃ وما یجوز لھم فی دارنا وما لا یجوز لھم}

؎۱ وقال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: واما الکنائس والبیع القدیمۃ فلا یتعرض لھا ولا یھدم شئ منھا واما احداث کنیسۃ اُخرٰی یمنعون عنہ فیما صار مصراً من امصار المسلمین لقولہ علیہ السلام لا کنیسۃ فی الاسلام الا فی دار الاسلام۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۴ کتاب السیر)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۴۷ کتاب السیر، الباب الثامن فی الجزیۃ۔

باب معاملات مع الکفار

(غیرمسلموں کے ساتھ معاملات کے احکام و مسائل)

غیر مسلم کو سلام کرنا

سوال: میں ایک غیر مسلم کمپنی میں ملازم ہوں وہاں میرے کچھ عیسائی اور ہندو دوست ہیں، کیا میں اُن کو سلام کرسکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب: کسی بھی غیر مسلم پر سلام کی ابتداء ممنوع ہے کیونکہ کسی کو سلام میں پہل کرنے سے درحقیقت اس شخص کی عظمت پیش نظر ہوتی ہے جبکہ مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ کسی غیر مسلم کی عزت وعظمت اس پر غالب رہے، تاہم بوقتِ ضرورت اسے مناسب الفاظ سے سلام کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: و یحرم تعظیمہ وتکرہ مصافحتہ ولا یبدأ بالسلام الا لحاجۃ۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۳ ص۲۸۲ کتاب الجہاد) [1]

غیر مسلم کے سلام کا جواب دینا

سوال: غیر مسلم کے سلام کا جواب دینے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ کیا اس کو سلام کا جواب دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: غیر مسلم کے سلام کے جواب میں صرف وعلیک کہنا کافی ہے، تاہم اگر کسی غیر مسلم کے سلام کے جواب میں اللہ سے اس کی ہدایت کا طالب ہوکر یوں جواب دیا جائے السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ تو بہتر ہے۔

لما فی الھندیۃ: واذا کان لہ حاجۃ فلا بأس برد سلام علیٰ اھل الذمۃ

---

[1] قال العلامۃ ابن البزاز الکردری رحمہ اللہ: وفی السیر لا بأس برد سلام اھل الذمۃ والنھی عن البداءۃ الا اذا کان محتاجاً الیہ فلا بأس بھا ایضاً ولکن یکرہ مصافحتھم۔ (الفتاوی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۵۵ کتاب الکراھیۃ۔ فصل نوع فی السلام)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۵ ص۱۱۳ کتاب الجھاد۔ فصل فی الجزیۃ۔ فروع فی الجزیۃ۔

ولکن لایزاد علیٰ قوله وعلیکم۔ قال الفقیه ابو اللیثؒ ان مررت بقوم وفیهم کفار فانت بالخیار انهٔ شئت قلتُ السلام علیکم وترید به المسلمین وان شئت قلت السلام علیٰ من اتبع الهدیٰ کذا فی الذخیرة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراهیة۔ الباب السابع فی السلام الخ) [1]

غیر مسلموں کو عبادت خانے کی طرف راہبری کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان سے اپنی عبادت کی جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ اس بارے میں غیر مسلم کی رہبری کرے؟

الجواب:۔ چونکہ ایسے امور میں کسی غیر مسلم کی رہبری کرنے سے اس کی اصلاح کے جگہ بے دینی اور کفر کو تقویت ملنے کا امکان ہے، اس لیے کسی غیر مسلم کے ساتھ ایسے معاملات میں تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے۔

قال الله تبارك وتعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۲)

وقال العلامة قاضی خانؒ: ذمی سأل مسلماً عن طریق البیعة لاینبغی للمسلم ان یدله علیٰ ذلك لانهٔ اعانة علی المعصیة۔ (فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۵۹۱ الباب الثالث فی الوکالة بالبیع۔ کتاب الوکالة) [2]

غیر مسلم کی عزت وتوقیر کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے پاس مہمان بن کر آئے تو مسلمان کا اس کی عزت واحترام کے لیے

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: اذا سلم الیهودی أو النصرانی أو المجوسی علیٰ مسلم۔ قال محمد رحمه الله: یقول المسلم وعلیك ینوی بذلك السلام لحدیث مرفوع الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال اذ سلموا علیکم فردوا علیهم۔ (فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۸۳ کتاب الکراهیة)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۲۸۳ کتاب الجهاد۔

[2] وَفی الهندیة: ذمی سأل مسلما عن طریق البیعة لاینبغی للمسلم ان یدله علیٰ ذلك لانهٔ اعانة علی المعصیة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۲۵ کتاب السیر۔ الباب الثامن فی الجزیة)
وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۵۹ کتاب الکراهیة الثالث فیما یتعلق بالمناهی۔

محفل میں کھڑے ہو جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلموں سے مدارات یعنی معاشرتی تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر یہ اٹھنا بیٹھنا معاشرہ میں بلا امتیاز مذہب وعقیدہ کسی مہمان کا حق سمجھا جاتا ہو تو ایسی حالت میں یہ تعلقات قائم کرنا جائز ہے، نیز کسی غیر مسلم کے شر و فساد سے بچنے کے لیے بھی اس سے معاشرتی تعلقات قائم کرنا جائز ہے بلکہ ایسے تعلقات سے اگر یہ توقع ہو کہ وہ (غیر مسلم) اسلام قبول کرلے گا تو پھر اسے فرائض منصبی کا تقاضا سمجھے، تاہم اگر اس سے غیر مسلم کے مذہب وعقیدہ یا اس کے کسی غیر اسلامی شعار کی عزت وتوقیر مقصود ہو تو پھر ایک مسلمان کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ ، وجب علی المسلم عدم تعظیم الکل قال فی الذخیرة اذا دخل یهودی الحمام ان خدمه المسلم طمعًا فی فلوسه فلا بأس به وان تعظيمًا له فان كان ليميل الى الاسلام فكذلك وان لم ينو شيئًا كره وان قام تعظيما لذاته وما هو عليه كفر لان رضا بالكفر كفر فكيف بتعظيم الكفر قلت وبه علم انه لو قام له خوفًا من شره فلا بأس بل اذا تحقق الضرورة فقد يجب وقد يستحب على حسب حال ما يتوقعه ـ (ردالمحتار ج ۳ ص ۲۸۳ كتاب الجهاد)[1]

غیر مسلموں کے برتنوں میں کھانا پینا

سوال:۔ ایک مسلمان کے لیے کفار اور مشرکین کے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار کے برتنوں کو استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح دھولیا جائے دھونے سے پہلے ایسے برتنوں میں کھانا پینا مکروہ ہے تاہم اگر دھوئے بغیر ان میں کھا پی لیا جائے تو جائز مع الکراہیۃ ہے اور ایسا کرنے والا حرام کھانے پینے والوں میں شمار نہ ہوگا بشرطیکہ ان برتنوں کی ناپاکی کا علم نہ ہو، اور اگر علم ہو تو دھونے سے پہلے ان برتنوں میں

---

[1] وفی الهندية: اذا دخل ذمی علی مسلم فقام له ان قام طمعًا فی میله الی الاسلام فلا بأس به وان فعل ذلك تعظيمًا له من غير ان ينوی شيئًا مما ذكرنا او قام طمعًا لغناه كره له ذلك ـ (الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۳۴۸ كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر فی اهل الذمة والاحكام الخ)
ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۱۴ كتاب الجهاد۔

کھانا پینا جائز نہیں ۔

لقولہٖ علیہ الصلوٰۃ والسلام: تأکل فی اٰنیتھم فان وجدتم غیرانیتھم فلا تأکلوا فیھا فان لم تجدوا فاغسلوھا ثم کلوا فیھا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۲۵ کتاب الذبائح۔ باب ما جاء فی الصید) ؎۱

غیر مسلموں کے ساتھ کھانا پینا

سوال:۔ غیر مسلموں کے ساتھ ایک برتن میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلموں میں جب تک کوئی ظاہری نجاست نہ ہو تو ان کے ساتھ ایک برتن میں کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اعتقادی اختلاف باعثِ کراہت ہے۔

وفی الھندیۃ: ولم یذکر محمدؒ الاکل مع المجوس ومع غیرہ من اھل الشرک انہ ھل یحل ام لا وحکی عن الحاکم الامام عبد الرحمٰن الکاتب انہ ان ابتلیٰ بہ مسلم مرۃ او مرتین لا بأس بہ واما الدوام علیہ فیکرہ کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الرابع عشر فی اھل الذمۃ والاحکام التی تعود الیھم) ؎۲

غیر مسلم کی ملازمت کرنا

سوال:۔ پاکستان سے کئی لوگ امریکہ اور دوسرے غیر اسلامی ممالک میں روزگار کے سلسلہ میں جاتے ہیں اور وہاں غیر مسلموں کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں، تو کیا غیر مسلموں کے ہاں ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلم کی ملازمت کرنا اس طور پر کرنا کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں

؎۱ قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازؒ: والاکل والشرب فی اوانی المشرکین یکرہ والاکل مع الکفار لو ابتلی بہ المسلم لا بأس لو مرۃ او مرتین اما الدوام علیہ یکرہ۔ (الفتاوی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۶ ص ۳۵۹ کتاب الکراھیۃ۔ الثالث فیما یتعلق بالمناھی)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الرابع عشر فی اھل الذمۃ۔

؎۲ قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازؒ: والاکل مع الکفار لو ابتلی بہ المسلم لا بأس لو مرۃ او مرتین اما الدوام علیہ یکرہ۔ (الفتاوی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۶ ص ۳۵۹ کتاب الکراھیۃ۔ الثالث فیما یتعلق بالمناھی)

کی توہین نہ ہوتی ہو جائز ہے اور اگر اس میں اسلام یا مسلمانوں کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو پھر ایسی ملازمت کرنا جائز نہیں۔

لما فی الحدیث؛ لان خباب بن الارتؓ عمل لعاص بن وائلؓ باجرۃ ولم ینکر علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۳۰۴ باب الاجارۃ)[1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد کا حکم

سوال:- غیر مسلموں مثلاً ہندوؤں وغیرہ کے متروکہ مال کا صحیح مصرف کیا ہے؟ علاوہ ازیں جو غیر مسلم ایک جگہ سے چلے جائیں اور ان کے املاک وہاں رہ جائیں تو از روئے شریعت اس کا صحیح مصرف کیا ہے؟

الجواب:- غیر مسلموں کا متروکہ مال بیت المال میں جمع کرنا چاہیئے، اسی طرح جو مال بلاجنگ کے کفار سے حاصل ہو یا جو مال مسلم عاشر لیتا ہے اس کا صحیح مصرف مسلمانوں کی مصلحتوں میں خرچ کرنا ہے، مثلاً سرحدوں کی حفاظت پر خرچ کرنا، دریاؤں اور نہروں پر پل بنانا، علماء، طلباء اور قاضیوں کے وظائف، اسلامی فوج کی تنخواہیں اور ان کے اہل وعیال کی فلاح وبہبود پر خرچ کرنا وغیرہ۔

قال العلامۃ محمد بن عبداللہ التمرتاشیؒ: ومصرف الجزیۃ والخراج ومال التغلبی وھدیتھم للامام واتما یقبلھا اذا وقع عندھم ان قتالنا للدین لا للدنیا جوھرۃ وما أخذ منھم بلا حرب ومنہ ترکۃ ذمی وما أخذہ عاشر منھم ظھیریۃ مصالحنا۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۳۰۶ باب العشر والخراج والجزیۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: المسلم اذا اجر نفسہ من الکافر لیخدمہ جاز ویکرہ قال الفضلؒ لایجوز فی خدمۃ ومافیہ اضلال بخلاف الزراعۃ والسقی۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارۃ)۔ ومثلہٗ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۵ ص۱۲۵ کتاب الاجارۃ۔

[2] وقال الامام عبداللہ بن احمد حافظ الدین النسفیؒ: وما اخذ منھم بلا قتال یصرف فی مصالحنا کسد الثغور وبناء القناطیر والجسور۔
(کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق ج۵ ص۱۱۷ کتاب الجھاد)
ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۵۹۹ کتاب الجھاد۔

اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ کسی ایسے ملک میں جہاں شرعی طریقہ سے جائز ذبح نہ ہوتے ہوں مسلمانوں کے لیے وہاں کے غیر مسلموں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا کیسا ہے؟

الجواب: اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار کا ذبیحہ مطلقاً حرام ہے چاہے ذبح کرنے والا ہندو ہو یا سکھ، مجوسی ہو یا پارسی، کسی حال میں بھی ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔

قال العلامة ابو بکر الحدادی الیمنیؒ: ولا توکل ذبیحة المجوسی والمرتد والوثنی لان المرتد لاملة له والوثنی مثله واما المجوس فلقوله علیه السلام سنوابهم سنة اهل الکتاب غیر ناکحی نساءهم ولا آکلی ذبائحهم الحدیث۔

(الجوهرة النیرة ج۲ ص۲۴۶ کتاب الذبائح)[1]

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مذہبی حقوق کا حکم

سوال:۔ ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو کہاں تک مذہبی حقوق حاصل ہیں؟ کیا وہ دارالاسلام اپنی مذہبی عبادت ورسومات ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو جان و مال اور مذہبی آزادی کا تحفظ حاصل ہے لیکن اگر وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے تقریر و تحریر کا طریقہ اختیار کریں تو انہیں اس سے منع کیا جائے گا۔

لما فی الهندیة: ولیس للنصرانی ان یضرب فی منزله بالناقوس فی مصر المسلمین ولان یجمع فیه بهم انما له أن یصلی فیه ولا ان یخرجوا الصلیب او غیر ذٰلك من کنائسهم ولو رفعوا اصواتهم بقراءة الزبور والانجیل ان کان فیه اظهار الشرك منعوا عن ذٰلك وان لم یقع بذٰلك اظهار الشرك لا یمنعون ویمنعون عن قراءة ذٰلك

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: لا مجوسی ووثنی ومُرتد ومحرم وتارك التسمیة عمداً یعنی لاتحل ذبیحة هٰؤلاء۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۶۸ کتاب الذبائح)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۳۰ کتاب الذبائح۔

فی اسواق المسلمین ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۲۵۱ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزیة)

غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کھانے پینے کی چیزوں کے استعمال کا حکم

سوال:۔ غیر مسلم ممالک سے گوشت، ذبح شدہ مرغی، گھی اور دودھ وغیرہ سے بنی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں درآمد کی جاتی ہیں جبکہ گوشت کے ڈبے پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ "اس کو اسلامی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہے"۔ کیا ایک مسلمان کے لیے ان چیزوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گوشت کے علاوہ جو حلال چیزیں غیر مسلم ممالک سے آتی ہوں اور ان میں حرام چیزیں مثلاً شراب یا سُور (خنزیر) کے اجزاء شامل نہ ہوں تو ان چیزوں کا کھانا پینا جائز ہے، البتہ اگر گوشت کے ڈبے پر اسلامی طریقہ سے ذبح ہونے کے لکھے ہوئے الفاظ صحیح ہوں تو پھر اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں اور اگر دوسرے قرائن اور ذرائع سے ان الفاظ کا غلط ہونا ثابت ہو جائے تو پھر ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں۔

وفی الهندیة: من ارسل اجیرا له مجوسیا او خادما فاشتری لحما فقال اشتریته من یهودی او نصرانی او مسلم وسعه اکله...... رجل اشتری لحما فلما قبضه فاخبره مسلم ثقة انه قد خالطه لحم الخنزیر لم یسعه ان یاکله۔ [۲]
(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۰۸، ۳۰۹ کتاب الکراهیة۔ الباب الاول)

---

[۱] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: ولیس للنصرانی انه یضرب فی منزله بالناقوس فی مصر من امصار المسلمین۔
(الفتاوی التاتارخانیة ج ۵ ص۳۵۱ کتاب الخراج)
ومثله فی فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص۵۸۹ کتاب السیر۔ فصل فی اهل الذمة۔

[۲] وقال العلامة فخرالدین حسن بن منصورؒ: مسلم اشتری لحما وقبضه فاخبره مسلم ثقة انه ذبیحة المجوس فانه لاینبغی للمشتری ان یاکل ولا یطعم غیره لان المخبر اخبر بحرمة العین وبطلان الملک۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ۳ ص۴۰۶ الباب السادس والعشرون)
ومثله فی رد المحتار ج ۵ ص۲۳۳ کتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء۔

اسلامی ملک میں غیر مسلموں کا نئی عبادت گاہ بنانا | **سوال:۔** دارالاسلام میں غیر مسلم اپنے لیے نئی عبادت گاہ تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ دارالاسلام میں غیر مسلموں کو نئی عبادت گاہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تاہم پرانی عبادت گاہیں باقی رکھ سکتے ہیں اور ان کی مرمت وغیرہ بھی کر سکتے ہیں لیکن کسی بھی قدیم عبادت گاہ میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر کسی شہر میں غیر مسلموں کی کوئی عبادت گاہ ویران ہو جائے تو اسے از سرِ نو آباد کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

كما فى الهندية: ان اراد اهل الذمة احداث البيع والكنائس او المجوس احداث بيت النار ان ارادوا ذلك فى امصار المسلمين وفيما كان من فناء المصر منعوا عن ذلك عند الكل۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۲۴۷ كتاب السير، الباب الثامن فى الجزية) [۱]

غیر مسلموں کا مسجد میں داخل ہونا | **سوال:۔** چند دن قبل برطانیہ کی شہزادی پاکستان آئی تو اس کو حکومت کی سرپرستی میں لاہور کی بادشاہی مسجد میں لایا گیا، تو کیا کوئی غیر مسلم مسجد میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کافر حالتِ جنابت میں نہ ہو اور اس کے بدن پر کوئی ایسی ظاہری نجاست بھی نہ ہو جو مسجد کے آداب کے خلاف ہو تو پھر اس کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے۔

كما فى الهندية: لا بأس بدخول اهل الذمة المسجد الحرام وسائر المساجد وهو الصحيح كذا فى المحيط السرخسى۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۴۶ كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر) [۲]

[۱] قال العلامة التمرتاشىؒ: ولا يجوز ان يحدث بيعة ولا كنيسة ولا صومعة ولا بيت نار ولا مقبرة۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج۴ ص۲۰۲ كتاب السير)

ومثله فى فتاوى قاضى خان على هامش الهندية ج۳ ص۵۹۰ كتاب السير، فصل فى اهل الذمة ما يؤخذ الخ

[۲] قال العلامة ابن عابدينؒ: ان الامام سرخسىؒ ذكر فى شرح السير الكبير ان ابا سفيان جاء الى المدينة ودخل المسجد ولذلك قصته قال فهذا دليل لنا على مالكؒ بمنعه المشرك من ان يدخل شيئا من المساجد ثم قال ان الشافعىؒ: قال يمنعونه من دخول المسجد الحرام خاصة للاية انما المشركون نجس فاما عندنا لا يمنعون كما لا يمنعون عن دخول سائر المساجد ويستوى فى ذلك الحربى والذمى۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۰۱ كتاب الجهاد، باب العشر والخراج مطلب)۔ ومثله فى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۷۱ كتاب الكراهية۔

مساجد میں غیر مسلم کا چندہ استعمال کرنا

سوال :- اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر اور مرمت کے لیے چندہ دے تو کیا وہ چندہ مسجد میں لگایا جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر کافروں کا چندہ دینے میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کا احتمال نہ ہو اور ان کے مذہب میں اس کی حیثیت قربت اور ثواب کی ہو اور وہ بھی ثواب کی نیت سے دیں تو پھر قبول کرنا اور مسجد کی تعمیر و مرمت پر خرچ کرنا جائز ہے ۔ کیونکہ حنفیہ کے مذہب میں کافر کے وقف کی صحت میں یہ شرط ہے کہ وہ ہمارے اور ان کے نزدیک قربت کا ذریعہ ہو پس ظاہر ہے کہ کفار کا چندہ مسجد میں صرف کرنا اہل اسلام کے نزدیک تو قربت ہے، کفار و ہنود مساجد میں جو کچھ دیتے ہیں وہ اعتقاداً اس کو قربت سمجھتے ہیں، لیکن عصر حاضر میں غیر مسلموں کی امداد برائے مساجد عموماً مسلمانوں کو کسی نہ کسی مخمصہ سے دوچار کرنے کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے ۔

قال العلامة ابن عابدين : ان شرط وقف الذمی ان يكون قربة عندنا و عندهم كالوقف على الفقراء او على مسجد القدس بخلاف الوقف على بيعة فانه قربة عندهم فقط او على حج او عمرة فانه قربة عندنا فقط فافاد ان هذا شرط لوقف الذمی فقط لان وقف المسلم لا يشترط كونه قربة عندهم بل عندنا كوقفنا على حج وعمرة بخلافه على بيعة فانه غير قربة عندنا بل عندهم۔

(ردالمحتار ج ۳ ص۳۹۴ کتاب الوقف) [1]

ہندوؤں کی عبادت گاہ کی جگہ مسجد بنانا

سوال :- ہمارے علاقے میں ہندوؤں کی متروکہ جائیداد میں ایک مندر بھی ہے بعض مسلمانوں کا ارادہ ہے کہ اس کی جگہ مسجد بنادی جائے تو کیا ہندوؤں کی متروکہ عبادتگاہ

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصری رحمه الله : واما الاسلام فليس من شرطه فصح وقف الذمی بشرط كونه قربة عندنا وعندهم كما وقف على اولاده او على الفقراء۔ (البحرالرائق ج ۵ ص۱۸۹ کتاب الوقف)
ومثله فی الهندية ج ۲ ص۳۵۲ کتاب الوقف ـ

کی جگہ مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگرچہ مسلمانوں کی عبادت کے لیے کوئی جگہ خاص نہیں، کرۂ ارض پر کسی جگہ بھی نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن ہندوؤں کے عبادت خانے کو جوں کا توں رکھ کر اس کو بطور مسجد کے استعمال کرنے سے چونکہ ان کے عبادت خانے کی عظمت و برتری قائم رہنے کا شبہ ہے لہٰذا اسے بطور مسجد استعمال کرنا جائز نہیں تاہم اگر اس کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

حدیث میں ہے: عن طلق بن علیؓ قال خرجنا وفدا الیٰ رسول اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ اَنَّ بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہٖ فدعا بماءٍ فتوضاء وتمضمض ثم صبّہ لنا فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروبیعتکم وانضحوا مکانھا بھٰذا الماء واتخذ وھا مسجداً قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مُدُّوہ من الماء فانہ لا یزیدہٗ الا طیبا، رواہ النسائی ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۶۹ باب المساجد) [1]

غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی خوشی وغیرہ کے موقعہ پر مسلمانوں کو دعوت دے اور اس کے ساتھ خوراک کے حلال ہونے کی یقین دہانی بھی کرادے تو کیا مسلمانوں کے لیے اس دعوت کو قبول کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر اس دعوت کی وجہ سے اسلام متاثر نہ ہوتا ہو تو اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، خاص کر اس دعوت میں جہاں پر خوراک کی حلت کی یقین دہانی بھی ہو۔

لما فی الھندیۃ: ولا بأس بالذھاب الیٰ ضیافۃ اھل الذمۃ ھٰکذا ذکر محمدؒ

---

[1] لما ورد فی الحدیث: عن طلق بن علی قال خرجنا وفدا الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہٖ الحدیث۔
(سنن النسائی ج ۱ ص۲ کتاب المساجد)
ومثلہٗ فی مشکوٰۃ المصابیح (حاشیہ) ج ۱ ص۶۹ کتاب الصلوٰۃ ۔ ابواب المساجد۔

وفی اُضحیۃ النوازل المجوس او النصرانی اذا دعا رجل الی طعامہ تکرہ الاجابۃ وان قال اشتریت اللحم من السوق فان کان الداعی نصرانیا فلا بأس بہ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۴۷ کتاب الکراہیۃ ، الباب الرابع عشر) [1]

مسلمانوں کا غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا

سوال:۔ کیا مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا مکروہ ہے لیکن یہ مکروہ اس لیے نہیں کہ مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں بلکہ اسلئے نہیں کہ یہ عبادت گاہیں شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہوتی ہیں۔

کما فی الھندیۃ : یکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ وانما یکرہ من حیث انہٗ مجمع الشیاطین لا من حیث انہٗ لیس لہٗ حق الدخول۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۴۶ کتاب الکراہیۃ ، الباب الرابع عشر) [2]

قادیانیوں سے لین دین کرنے کا حکم

سوال:۔ مسلمانوں کے لیے قادیانیوں کے ساتھ لین دین یعنی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ غیر مسلموں سے دنیاوی معاملات کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے بسا اوقات ان کے کفریہ عقائد مخفی رہ جاتے ہیں، اس لیے یہ مرتدین کے حکم میں ہو کر ان سے کسی قسم کی تجارت کرنا جائز نہیں۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ : ویزیل ملک المرتد عن اموالہ یرتدہ

---

[1] قال الامام ابن البزاز الکردریؒ : وان اجابۃ الدعوۃ ولو لاھل الذمۃ سنۃ۔

(البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۳۳ السادس فی التشبیہ)

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ویکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ۔

(رد المحتار ج ۶ ص۳۸۰ کتاب الحظر والاباحۃ۔ فصل فی البیع)

زوالا مراعی فان اسلم عادت الی حالھا۔ (الھدایۃ ج۲ ص۵۸۶ کتاب السیر) [1]

مُرتد کے ساتھ تعلقات قائم کرنا

سوال:۔ جو شخص اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے تو اس سے دوستی اور محبت رکھنا اور خندہ پیشانی سے ملنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وہ شخص جو دینِ اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے مرتد ہے، اس سے تعلقات اور میل جول رکھنا صحیح نہیں، اسی طرح اس سے خندہ پیشانی سے پیش آنا، مصافحہ کرنا، ملنا جلنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا، رشتۂ عقد و مناکحت قائم کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔

کما قال العلامۃ محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیہ الاسلام استحبابا..... وتکشف شبھۃ ویحبس وجوبا ثلاثۃ ایام فان اسلم فبھا والاقتل لحدیث من بدل دینہ فاقتلوہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب العشر والخراج والجزیۃ) [2]

قادیانی کا چندہ مسجد میں لگانا

سوال:۔ اگر کوئی قادیانی مسجد کی تعمیر کے لیے اینٹیں وغیرہ دے تو کیا ان اینٹوں کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قادیانی چونکہ مُرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور مُرتد کے حالتِ ارتداد میں کئے ہوئے تصرفات موقوف ہوتے ہیں، اگر وہ دوبارہ مسلمان ہو جائے تو حالتِ ارتداد میں کئے ہوئے اس کے تصرفات صحیح ہو جائیں گے اور اگر وہ حالتِ ارتداد

---

[1] قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: ویزیل ملک المرتد عن مالہ زوالا موقوفاً فان اسلم عاد ملکہ۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۳۰ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۳۱۲ کتاب الجہاد۔ احکام المرتدین۔

[2] وقال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبھتہ ویحبس ثلاثۃ ایام فان اسلم والاقتل۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۵۳ کتاب السیر، الباب الثامن فی الجزیۃ۔

میں ہی مرجائے یا قتل کر دیا جائے یا دارالحرب چلا جائے تو حالتِ ارتداد کے تصرفات باطل ہو جائیں گے۔ لہٰذا کسی بھی قادیانی مُرتد کی طرف سے دی ہوئی اینٹیں اور دوسرا تعمیراتی سامان مسجد میں لگانا جائز نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: وما باعه او اشتراه او اعتقه او وهبه او رهنه او تصرف فیه من امواله فی حال ردته فهو موقوف فان اسلم صحت عقوده وان مات اوقتل او لحق بدار الحرب بطلت۔

(الهدایة ج ۲ ص ۶۰۳ کتاب الجهاد، باب المرتد) لہ

قادیانی کی نماز جنازہ کا حکم

سوال:- میرے رشتہ داروں میں ایک شخص قادیانی ہے، اس کے مرنے کے بعد میرے لیے اس کے جنازہ میں شرکت کرنا اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ قادیانی مُرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اس بناء پر ان میں سے کسی کی بھی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہی قادیانیوں کے مذہب کے مطابق موت کی رسومات میں ان کے ساتھ شامل ہونا جائز ہے، اور اگر ایسے رشتہ دار کی تدفین کے لیے اس کا ہم مذہب کوئی آدمی نہ ہو تو تدفین کے شرعی طریقہ سے ہٹ کر صرف زمین میں گڑھا کھود کر اسے دفن کیا جائے گا۔

کما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: اما المرتد فیلقی فی حفرة کالکلب۔

(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۷ باب صلوٰة الجنازة) لہ

لہ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وتوقف مبایعته وعتقه وهبته فان آمن نفذ وان هلك بطل بیان لتصرف حال ردته بعد بیان حکم املاکه قبل ردته

(البحر الرائق ج ۵ ص ۱۳۳ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۳۲ باب احکام المرتدین۔

لہ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: اما المرتد فلا یغسل ولا یکفن وانما یلقی فی حفیرة کالکلب ولا یدفع الیٰ من انتقل الیٰ دینهم۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۱ کتاب الجنائز۔ فصل السلطان احق بصلوته)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج ۱ ص ۱۹۵ کتاب الجنائز۔

قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا حکم

سوال:- قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- قادیانی ضروریاتِ دین سے انکار کی بناء پر کافر اور مرتد ہیں اُن کو اہلِ اسلام کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں۔

کما قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: اما المرتد فلا یغسل ولا یکفن وانما یلقی فی حفیرۃ کالکلب ولا یدفع الی من انتقل الی دینہم۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۱ کتاب الجنائز۔ فصل فی السلطان احق بصلاتہ) [۱]

قادیانی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا

سوال:- اگر کوئی شخص قادیانی ہو اور اس کا بیٹا مسلمان ہو تو بیٹے کے فوت ہو جانے کے بعد باپ اس کے مال میں میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- قادیانی اور مسلمان ایک دوسرے کی میراث کے حقدار نہیں بن سکتے مذکورہ بالا صورت میں قادیانی مرتد کی میراث بیت المال میں داخل کی جائے گی، اسی طرح کوئی قادیانی کسی مسلمان کی میراث میں حقدار نہیں بن سکتا بلکہ مسلمان کی میراث اس کے مسلمان ورثاء میں قاعدہ شرعی کے مطابق تقسیم ہوگی۔

لما قال الشیخ سراج الدین السجاوندیؒ: واما المرتد فلا یرث من احدٍ لا من مسلم ولا من مرتد مثلہ۔ (السراجی ص۷۵ فصل فی المرتد) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: اما المرتد فیلقی فی حفرۃ کالکلب۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۱ ص۶۵۲ باب صلوٰۃ الجنازۃ)
ومثلہ فی فتح القدیر ج ۲ ص۹۴ کتاب الجنائز۔

[۲] قال فی الهندیۃ: المرتد لا یرث من مسلم ولا من مرتد مثلہ کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۶ ص۴۵۵ الباب السادس فی میراث اهل الکفر)
ومثلہ فی الخانیۃ علی هامش الهندیۃ ج ۳ ص۵۸۰ کتاب الفرائض۔

مرتد کی میراث کا حکم

سوال :- اگر مرتد دارالاسلام میں مرجائے تو اس کا ترکہ مسلمان ورثاء کو ملے گا یا مرتد ورثاء کو، اور اگر دارالحرب میں مرجائے تو پھر ترکہ کس کو ملے گا؟

الجواب :- اگر مرتد دارالاسلام میں مرجائے یا قتل ہوجائے تو حالتِ اسلام کا کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد میں کمایا ہوا مال مالِ فئے میں شمار ہوکر بیت المال میں داخل کیا جائے گا، اور اگر دارالحرب میں مرجائے تو حالتِ اسلام میں کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد کا کمایا ہوا مال مرتد ورثاء کے مابین تقسیم ہوگا۔

قال العلامة المرغینانیؒ: وان مات اوقتل علیٰ ردته انتقل ما اکتسبه فی اسلامه الیٰ ورثة المسلمین وکان ما اکتسبه فی حال ردته فیئاً۔ (الهدایة ج۲ ص۶۰۱ باب احکام المرتد)[1]

مرزائی کی دعوتِ طعام قبول کرنا

سوال :- ہمارے محلے میں چند مرزائی رہتے ہیں، وہ کبھی کبھی کسی خوشی کے موقعہ پر دعوت کرتے ہیں اور اس میں ہم مسلمانوں کو بھی بلاتے ہیں، کیا مرزائیوں کی دعوت کو قبول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- مرزائی مرتد ہوکر واجب القتل ہیں، اس لیے مرتد سے کسی قسم کے تعلقات رکھنا یا اس کے ہاں دعوت کھانا جائز نہیں۔

لما قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبهة ویحبس ثلاثة ایام فان اسلم والاقتل۔ (کنز الدقائق علیٰ هامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین)[2]

[1] قال العلامة الحصکفیؒ وابن عابدینؒ: وان مات اوقتل علی ردته اوحکم بلحاقه ورث کسب اسلامه وارثه المسلم ولو زوجته بشرط العدة (زیلعی) بعد قضاء دین اسلامه وکسب ردته فی بعد قضاء دین ردته الخ اما ما اکتسبه فی دارالحرب فهو لا بنته الذی ارتد ولحق معه اذا مات مرتد الانه اکتسبه وهو من اهل الحرب وهم یتوارثون فیما بینهم۔ (الدرالمختار ورد المحتار ج۳ ص۳۲۸،۳۲۹ باب المرتد)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۳۱،۱۳۲ باب احکام المرتدین۔

[2] قال العلامة محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیه الاسلام استحبابا...... وتکشف شبهة ...... ویحبس وجوبا ثلاثة ایام فان اسلم فیها والاقتل لحدیث من بدل دینه فاقتلوه۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب المرتد)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۲۵۳ الباب الثامن فی الجزیة۔

شیعہ کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا حکم

سوال :- جو شخص حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہو، حضرت جبرئیل کی غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا قائل ہونے کے علاوہ امام مہدی کے خروج تک تمام اسلامی احکام کو معطل سمجھتا ہو ایسے شخص کا حکم کیا ہے، کیا ایسے شخص کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- جو شخص الوہیتِ علیؓ کا عقیدہ رکھتا ہو اور حضرتِ جبرائیلؑ کو غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا معتقد ہو اور تمام اسلامی احکام کو خروجِ امام تک معطل سمجھتا ہو وہ بلاشبہ کافر ہے اور ایسے شخص کا حکم مرتد کی طرح ہے۔

كما في الهندية : ويجب اكفار الروافض في قولهم برجعة الاموات الى الدنيا وبتناسخ الارواح وبانتقال روح الاله الى الأئمة وبقولهم في خروج امام باطن و بتعطيلهم الامر والنهي الى ان يخرج الامام الباطن وبقولهم ان جبرائيلؑ غلط في الوحي الى محمد صلى الله عليه وسلم دون على بن ابي طالبؓ وهؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحكامهم احكام المرتدين. كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية ج۲ ص۲۶۴ كتاب السير، الباب التاسع)

اور مرتد کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا مذبوحہ کھانا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات رکھنا ہرگز جائز نہیں۔

قال العلامة المرغيناني : ويزيل ملك المرتد عن امواله بردته زوالاً مراعى فان اسلم عادت الى حالها..... ويا طل بالاتفاق كالنكاح والذبيحة لانه يعتمد الملة ولاملة له. (الهداية ج۲ ص۶۰۱ تا ۶۰۳ باب احكام المرتد، كتاب الجهاد) [1]

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ : ويجب اكفار الروافض في قولهم يرجع الاموات الى الدنيا وبانتقال الاموات وتناسخ الارواح وانتقال روح الاله الى الائمة وان الائمة الهة وقولهم في خروج امام باطن وبتعطيلهم الأمر والنهي الى ان يخرج الامام الباطن ..... وهؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحكامهم احكام المرتدين. (الفتاوى التاتارخانية ج۵ ص۵۳۸ كتاب احكام المرتدين)

ومثله في فتاوى قاضي خان على هامش الهندية ج۳ ص۵۷۳ كتاب الفاظ تكون اسلاما او كفرا الخ

شیعہ کا مال جبراً لینے کا حکم

سوال:۔ شیعوں کے اموال جبراً یا چوری کرکے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ شیعہ کے بعض فرقے غیر مسلموں کے حکم میں ہیں لیکن حربی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اموال محفوظ رہیں گے، ان کے اموال کی چوری کرنا یا جبراً لینا جائز ہے یا نہیں؟

قال العلامۃ الحصکفیؒ: اذا صار ذمیا یجری القصاص بینہ وبین المسلم ویضمن المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا تلفہ وتجب الدیۃ علیہ اذا قتلہ خطاء ویجب کف الاذی عنہ۔ وقال ابن عابدینؒ۔ قید بالمستأمن لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان ہو ومامعہ فیأ۔ (الدرالمختار علی ھامش ردالمحتار ج ۳ ص ۲۷۲ باب المستأمن کتاب الجہاد)[1]

شیعہ پر نماز جنازہ پڑھنا

سوال:۔ جو شیعہ ضروریات دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا اہل سنت والجماعت کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیعوں میں سے جو شخص ضروریاتِ دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں البتہ جس کے عقائد کفریہ نہ ہوں اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

لما فی الھندیۃ: ولو قذف عائشۃ رضی اللہ عنہا بالزنی کفر باللہ ...... من انکر امامۃ ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ فھو کافر۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۲۶۴ کتاب السیر الباب التاسع فی احکام المرتدین)[2]

---

[1] وفی الھندیۃ: وتثبت احکام الذمی فی حقہ من منع الخروج الی دار الحرب وجریان القصاص بینہ وبین المسلم وضمان المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا اتلفہ ووجوب الدیۃ اذا قتل خطاء ووجوب کف الاذی عنہ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۲۳۵ کتاب السیر الباب الثامن فی المستأمن)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۲۷۱ کتاب السیر۔ باب احکام المرتد۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وبقذف عائشۃ رضی اللہ عنہا من نسائہ صلی اللہ علیہ وسلم فقط وبانکارہ صحبۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ الخ

(البحر الرائق ج۵ ص۱۲۱ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج۳ ص۳۲۱ کتاب الجہاد، باب احکام المرتد۔

مسلمان کو کافر کی میراث نہیں مل سکتی

سوال:۔ مسلمان کافر سے اور کافر مسلمان سے میراث لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ اختلافِ دین وعقیدہ مانع ارث ہے، اس لیے کافر مسلمان کی میراث نہیں لے سکتا اور نہ ہی مسلمان کو کافر کی میراث دی جاسکتی ہے۔

لما قال شیخ الاسلام محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: وموانعہ الرق والقتل واختلاف الدین۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج۵ ص۵۴۲ کتاب الفرائض)[1]

کفار کے لیے دعائیں کرنا

سوال:۔ اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ دعا کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اے اللہ مسلمانوں پر رحم فرما اور کفار کو نیست و نابود فرما۔ تو کیا اس قسم کی دعائیں کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کی دعاؤں کی صحت میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ مسلمانوں کی طرح کفار بھی رحم کے مستحق ہیں ان کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرنی چاہیئے۔ ہمارے اکابرین کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے وہ اپنی دعاؤں میں کفار کے لیے بھی رحم کی دعاء کیا کرتے تھے۔

وذکر العلامۃ مسلم بن الحجاج القشیریؒ: عن ابی کثیر قال حدثنی ابوھریرۃ قال کنت ادعو امی الی الاسلام وھی مشرکۃ فدعوتھا یوماً فاسمعتنی فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اکرہ فاتیت رسول اللہ علیہ وسلم وانا ابکی قلت یا رسول اللہ انی کنت ادعوا امی الی الاسلام فتابی علیّ فدعوتھا الیوم فاسمعتنی فیک ما اکرہ فادع اللہ ان یھدی ام ابی ھریرۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللھم اھد ام ابی ھریرۃ۔ الخ (الجامع الصحیح المسلم ج۲ ص۳۰۱ کتاب الفضائل باب فضائل ابی ھریرۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ السجاوندی رحمہ اللہ: المانع من الارث اربعۃ الرق وافر...... واختلاف الدین۔ (السراجی ص۵ فصل فی موانع الارث)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۔۔۔ کتاب الفرائض۔

[2] وذکر العلامۃ ابوعیسٰی الترمذیؒ: عن جابرؓ قالوا یا رسول اللہ احرقتنا نبال ثقیف فادع اللہ علیھم فقال اللھم اھد ثقیفاً۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۲۳۱ ابواب المناقب۔ باب فی ثقیف وجنیفۃ)

غیر مسلموں سے امداد لینے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل ڈائریکٹر کرسچین ہسپتال ٹیکسلا نے اس بات کے پیش نظر کہ دیہ کے غریب عوام علاج معالجہ کے لیے اُن کے قائم کردہ کرسچین ہسپتال ٹیکسلا میں آرہے ہیں، دیہی کے ایک گاؤں انگرام میں ایک ہسپتال بنانے کی منظوری دی ہے اور وہاں پر پائندہ خیل قبیلے کے ایک جرگے نے ۲۲ ایکڑ مشترکہ زمین اس ہسپتال کی تعمیر کے لیے دی ہے۔ جبکہ مقامی طور پر کچھ لوگوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ ہسپتال کی آڑ میں عیسائیت پھیلانے کے لیے تبلیغ کریں گے، پمفلٹ تقسیم کریں گے، مریضوں اور اُن کے تیمارداروں کو عیسائیت کی دعوت دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خدشات جب مجوزہ ہسپتال کی انتظامیہ کے سربراہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے کہا کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوگی، آپ لوگ جو شرط لگانا چاہتے ہیں لگا لیں ہم ان کی پابندی کریں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر مذکورہ کے سامنے چند شرائط پیش کی گئیں جو کہ اس نے تسلیم کریں اور سرکاری سٹامپ پیپر پر بیان حلفی کی صورت میں لکھ کر سٹیمپ (مُہر) لگا کر دستخط کر دیئے ہیں، یہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اغگرام ہسپتال میں کوئی مسیحی تبلیغ نہ ہوگی۔

۲۔ مذکورہ ہسپتال میں کوئی مسیحی لٹریچر تقسیم نہ ہوگا۔

۳۔ اغگرام ہسپتال میں کوئی گرجاگھر تعمیر نہ ہوگا۔

۴۔ اغگرام ہسپتال میں کوئی صلیب کا نشان نہیں لگایا جائے گا۔

۵۔ ہسپتال کے بیت الخلاء اسلامی اقدار کے مطابق شمالاً جنوباً بنائے جائیں گے۔

۶۔ اغگرام ہسپتال کا نام مسیحی نام سے مُبرّا ہوگا۔

۷۔ سٹیشنری پر کسی قسم کی بائیبل مقدس کی آیات طبع نہ ہوں گی۔

۸۔ اغگرام ہسپتال کی بلڈنگ سادہ اور مضبوط بنائی جائے گی جو کسی بھی سرکاری ہسپتال کی بلڈنگ سے اچھی ہوگی۔

۹۔ یہ ہسپتال خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرے گا نیز ہسپتال میں جو کوئی مریض آئے گا اس کا علاج کم خرچ اور رنگ ونسل کے امتیاز کے بغیر کیا جائے گا۔

۱۰۔ ہسپتال کے احاطے کے اندر ایک طرف مسجد کے لیے جگہ مخصوص کی جائے گی لیکن

مریضوں کی تکلیف کے پیشِ نظر لاؤڈ اسپیکر لگانے کی اجازت نہ ہوگی۔

اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر اب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل جو کہ عیسائی ہے، کے تعاون سے اس ہسپتال کی تعمیر شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق کرسچین ہسپتال بنانے والوں نے جرگے کی طرف سے مقرر کردہ جن شرائط کی ہر لحاظ سے پابندی کرنے کا معاہدہ کیا ہے اُن تمام شرائط کا لحاظ اور پابندی کرنے کی صورت میں اس ادارہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ہسپتال بنانا جائز ہے، اگر ہسپتال بنانے والوں کی طرف سے کسی بھی مرحلہ پر ان شرائط کی خلاف ورزی کی گئی تو مسلمانوں کو اس کے بند کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اصولاً تعلیم، صحت، سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر دُنیاوی امور و معاملات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک دوسرے سے افادہ اور استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے بشرطیکہ اسلام اور اسلامی اقدار اس سے متاثر نہ ہوتے ہوں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام و مفتیانِ عظام کہ ایک اسلامی ملک کسی دوسرے اسلامی ملک کے خلاف کسی کافر ملک کی امداد و تعاون کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ ملک خالص اسلامی ہے، اس میں کلی طور پر اسلامی قوانین رائج ہیں اور کافر ملک صرف اسلامی قوانین جاری کرنے کی وجہ سے اس کا مخالف بن گیا ہے اور اس پر ظلم و زیادتی کرنے کے لیے بے بنیاد اور من گھڑت الزامات لگا رہا ہے جس کا اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ مہربانی فرما کر اس بارے میں شرعی نقطۂ نظر سے مطلع فرمائیں ؟

الجواب:۔ کسی مسلمان ملک کے خلاف کسی بھی کافر ملک سے محض دنیاوی مفادات کی خاطر تعاون کرنا یا اس کا آلۂ کار بننا شرعی نقطۂ نظر سے حرام و ناجائز ہے۔ کسی بھی مسلمان ملک کا سربراہ اگر ایسا کرتا ہے تو اس کے خلاف بغاوت کرنا اور ایسی لادین قیادت کو ختم کرکے صالح اور دیندار شخص کو حاکم مقرر کرنا مسلمان رعایا پر لازم اور ضروری ہے، اسلیے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ تو خود اس پر ظلم کرے گا اور نہ بے بنیاد الزامات کی بنا پر اسے کسی کافر کے حوالے کرنے کا شرعاً مجاز ہے۔

لقولہ علیہ السلام: المؤمن اخو المؤمن لا یظلمہ و یسلمہ۔ (الحدیث)



اِبتدائیہ

امریکہ سی ٹی بی ٹی (CTBT) یعنی ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کے جامع معاہدہ کے نام سے پاکستان کو اس معاہدہ پر دستخط کرا کے پابند بنانا چاہتا ہے جس سے بظاہر پاکستان کو حاصل ایٹمی توانائی کے استعمال یا اس کی مزید ترقی کو روکنا مقصود ہے۔ کیا شرعاً کسی مسلمان ملک کے حکمرانوں کو اپنی جہادی قوت، آلات و وسائل اور حربی تکنیک کو کفار کے دباؤ یا کسی لالچ کے نتیجے میں اسے محدود اور معطل یا منجمد و مفلوج کرنے کی اجازت ہے؟ اس مسئلہ کی ازروئے قرآن و سنت شرعی حیثیت واضح کرنے کے لیے ملک اور عالم اسلام کے معروف، معتمد اور ممتاز دینی ادارہ دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء نے مدلل روشنی ڈالی ہے جو اعیانِ حکومت، ممبرانِ پارلیمنٹ، سیاستدانوں، سائنسدانوں، فوجی اداروں، علماء، دانشوروں، صحافیوں اور عام مسلمانوں کے غور و فکر کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر سی خدمت کو ملک و ملت کے بہتر مستقبل اور فلاح و بہبود کا ذریعہ بنا دے۔ (آمین)

(مولانا) سمیع الحق
مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (نوشہرہ)
۱۰ ستمبر ۱۹۹۸ء



استفتاء

سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی یعنی ایٹمی پروگرام، اس کی توسیع اور ٹیسٹ پر پابندی کا جامع معاہدہ

مملکتِ اسلامیہ پاکستان جو کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی قربانیوں کا ثمرہ ہے، اس کی تقسیم کا مقصد ہی یہاں پر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی مملکت کا قیام تھا، الحمدللہ پاکستان اسلام اور مسلمانوں کی قربانیوں کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا اور اس نے عالم اسلام کے لیے ہر دور میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ یہود و ہنود اور مغربی ممالک پاکستان کے قیام کے روز اول ہی سے اس کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں اور مختلف سازشوں سے اس کو آئے دن کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کرنا ہے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں جبکہ پاکستان کے قیام کا ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس پر جنگ مسلط کر دی گئی، اس کے بعد ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں جنگیں ہوئیں اور ہمارے خلاف بدترین جارحیت کی گئی۔ اب جبکہ مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کے مجاہدین ہندوؤں کے خلاف جہاد میں سرگرم عمل ہیں اور پاکستان نے بھی ہر سطح پر خصوصاً بین الاقوامی فورم میں مسئلہ کشمیر اجاگر کیا ہے۔ تو ہندوستان نے تحریکِ آزادی کشمیر کو ختم کرنے اور پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے ۱۱ اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکے کئے، یہ دھماکے ہندوستان میں واجپائی حکومت نے کئے جس کا بنیادی منشور ہی اسلام اور پاکستان دشمنی پر مبنی ہے، یاد رہے کہ ہندوستان ۱۹۷۴ء میں ایٹمی قوت بن چکا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کو یہ حق مکمل طور پر حاصل تھا کہ وہ بھی اپنے دفاع کے لئے قرآنی نص کے مطابق ہر ممکن صلاحیت خواہ وہ عسکری ہو یا حربی، حاصل کرے اور ہر لحاظ سے خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ۔ (سورۃ الانفال آیت ۶۰)

اس وقت حکومتِ پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام یہود و ہنود کے مکروہ عزائم کو بھانپتے ہوئے شروع کیا تھا اور اس عظیم مقصد کے لیے اپنے ذرائع و وسائل اور حیثیت سے بڑھ کر ملک و ملت اور قابلِ فخر سائنسدانوں نے طویل اور صبر آزما ایثار کا مظاہرہ کیا اور اس پر اربوں روپے خرچ ہوئے اور بمشکل تمام اس کو عالمِ کفر کی خونخوار نظروں سے بچائے رکھا، گویا پوری قوم نے خونِ جگر سے اس پروگرام کی آبیاری کی اور اپنے ملک و ملت و عالمِ اسلام کو ایک ناقابلِ تسخیر ایٹمی قوت بنا کر عالمِ کفر اور بھارت کے مذموم ارادوں کو خاک میں ملا دیا جس سے تمام پاکستانی قوم اور پورے عالمِ اسلام کا سر فخر سے بلند ہوا، قوم کو نئی راہ اور نئی سمت مل گئی اور ہم جو اکیسویں صدی میں عالمِ اسلام اور پاکستان کو ایٹمی قوت کی حیثیت سے (جو کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری طاقت کی معراج سمجھی جاتی ہے) داخل ہو رہے ہیں تو موجودہ حکومت جس نے سی ٹی بی ٹی کے معاہدے پر دستخطوں کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے جو ہمارے قومی و فوجی دفاع کی شہ رگ کو کاٹنے کے مترادف ہے حکومت اس معاہدہ (CTBT) پر دستخط کر کے ہمیں ایک بے غیرت، بے حمیت، بزدل اور سوداگر قوم بنانا چاہتی ہے اور معاہدے کے بعد ہمیں ہندوستان و اسرائیل کے خونخوار بھیڑیوں کے سامنے بے دست و پا پھینکنے کی کوشش کر رہی ہے خاص کر ایسے حالات میں کہ جب ہندوستان جس کو ایٹمی پروگرام کو منجمد کرنے کے جامع معاہدے پر دستخط کرنے میں اب تک انکار و تردد ہے اور اگر اس نے دستخط کر بھی دیئے تو اس کی فوجی اور دفاعی ساز و سامان کی صلاحیت، جنگی ٹیکنالوجی اور افرادی قوت ہم سے کئی گنا زیادہ ہے جس کا مقابلہ ہماری ایٹمی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا، حالانکہ خود یہود و نصاریٰ اور عالمی کفر و استعمار کے پانچ بدمعاشوں اور دہشت گردوں نے بھی ابھی تک اس معاہدے کی توثیق نہیں کی ہے اور نہ ان کا کوئی ارادہ ہے۔ اس معاہدے پر دستخط کر دینے کے بعد پاکستان اور عالمِ اسلام کا ناقابلِ تصور نقصان ہوگا، چند نقصانات درج ذیل ہیں:۔

(۱) کشمیر کی تحریکِ آزادی پر ہر لحاظ سے براہِ راست برا اثر پڑے گا۔

(۲) ہندوستان اور عالمِ کفر کے ایٹمی پروگرام روز بروز جاری و ساری اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے اور اس کے برعکس ہمارا ایٹمی پروگرام اس معاہدہ کی پابندی کی وجہ سے منجمد ہو کر رہ جائے گا۔

(۳) بھارت کے مقابلے میں ہماری پوزیشن عسکری، حربی اور سیاسی لحاظ سے کمزور تر ہو جائے گی۔

(۴) معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد عالمِ کفر کی طرف سے ہم سے نت نئے مطالبات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کا مشاہدہ ہم عراق، لیبیا وغیرہ ملکوں میں کر رہے ہیں۔

(۵) ایٹمی دھماکے کرنے کے بعد عالمِ اسلام خصوصاً عالمِ عرب کو ایک ولولۂ تازہ عطا ہوا تھا اور اسرائیل اور دوسری استعماری کفری طاقتیں مرعوب ہو گئی تھیں، معاہدے کے بعد ہماری حیثیت محض ایک سوداگر قوم کی سی ہو جائے گی۔

(۶) اگر مستقبل میں عالمِ اسلام اور عالمِ کفر کے درمیان کوئی بڑی جنگ شروع ہوتی جس کی ابتدا امریکہ عراق، لیبیا، سوڈان اور افغانستان سے کر چکا ہے) تو اس میں پاکستان اس معاہدے کے بعد کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے گا بلکہ پاکستان امریکہ کی ایک کالونی کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

(۷) اس کے نتیجے میں عالمِ اسلام اور دوسرے مقامات میں جہادی قوتوں کو شدید دھچکا لگے گا اور مجاہدین کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

(۸) پاکستان عالمِ اسلام کو کبھی بھی ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل نہیں کر سکے گا۔

اس خطرناک صورتحال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علماء کرام و مفتیان دینِ متین کیا فرماتے ہیں کہ:-

(الف) ملک و ملت کے ان عظیم نقصانات جو کہ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد یقینی اور حتمی ہیں کیا موجودہ حکومت کو اس بات کا حق اور اختیار پہنچتا ہے کہ وہ ایک ارب مسلمانوں کے متفقہ فیصلے کے برعکس ذلّت و رسوائی کے اس محضر نامے اور اپنی موت و قتل کے پروانے پر دستخط کر دے؟ (اور اس کے صلے میں ہمیں جو موہوم امداد بلکہ خیرات اور بھیک ملے گی کیا وہ ماضی کی طرح حکمرانوں کی جیبوں میں نہیں جائے گی؟) ان نقصانات اور خطرناک حقائق کی موجودگی میں اس معاہدے پر دستخط کرنے کیلئے مہم چلانا یا اس کی حمایت کرنا اور اس پر دستخط کرنا دین و شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟ اور یہ معاہدہ شرعی اعتبار سے جائز ہے یا ناجائز؟

(ب) اور وہ لوگ جو اس پر دستخط کرتے ہیں یا اس کی حمایت کرتے ہیں یا اس پر دستخط کے لیے مہم چلاتے ہیں خواہ وہ حزبِ اقتدار سے ہوں یا حزبِ اختلاف سے سیاستدان ہوں یا بیوروکریٹس اور حکومتی مشنری، ان کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(ج) اور آیا یہ لوگ ملک وملت اور اپنے حلف سے انحراف کا ارتکاب کرنے والوں کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

اعداد آلات حرب قرآن کریم کی روشنی میں

اعداد (تیاری) آلات جہاد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ٥ (سورۃ الانفال آیت ۶۰) "اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر ان کے سوا، جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ کے راستے میں وہ پورا ملے گا اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا۔" (ترجمہ از معارف القرآن) اس کی تفسیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وھذہ الآیۃ تدل علی ان الاستعداد للجہاد بالنبل والسلاح وتعلیم الفروسیۃ فریضۃ" (تفسیر کبیر ج ۱۵ ص۱۸۵ سورۃ الانفال) (یہ آیت کریمہ جہاد کے لیے تیاری اسلحہ، تیراندازی اور شہسواری کی تعلیم کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اسی آیت کے ضمن میں فوائد عثمانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

—— "مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو سامانِ جہاد فراہم کریں، نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارکہ میں گھوڑوں کی سواری، شمشیر زنی اور تیراندازی کی مشق کرنا سامانِ جہاد تھا، آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنونِ حربیہ کا سیکھنا بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب جہاد ہے اسی طرح آئندہ جو اسلحہ و آلاتِ حرب و ضرب تیار ہوں وہ سب آیت کے منشا میں داخل ہیں۔" (تفسیر عثمانی ص۲۴۲ سورۃ الانفال)

لہٰذا اس آیت کے عموم میں موجودہ وقت میں جو آلاتِ حرب وضرب اور سائنس وٹیکنالوجی کی بدولت جو بم اور میزائل وغیرہ تیار کئے گئے ہیں مثلاً کروز میزائل، سکڈ میزائل، نیپام بم، ہائیڈروجن بم اور ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار، یہ تمام مااستطعتم کے عموم میں آتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اپنی تفسیر معارف القرآن جلد ۳ ص۲۵۵ سورۃ الانفال پر لکھتے ہیں: لہٰذا اس آیت کی رُو سے

مسلمان حکومتوں پر جدید اسلحہ کی تیاری اور اس کے کارخانوں کا قائم کرنا فرض ہوگا۔ اس لیے کہ اس آیت میں قیامت تک کے لیے ہر زمان و مکان کے مناسب قوت و طاقت کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ جس طرح کافروں نے تباہ کن ہتھیار تیار کیے ہیں ہم مسلمانوں پر بھی اسی قسم کے بلکہ ان سے بھی زیادہ تباہ کن ہتھیاروں کا تیار کرنا فرض ہوگا تاکہ کفر اور شرک کا مقابلہ کر سکیں۔

اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور فقہاء کے اقوال

اسی طرح احادیث کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعداد آلاتِ حرب کی تاکید اور ترغیب فرمائی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو على المنبر يقول واعدوا لهم ما استطعتم من قوة الا ان القوة الرمى الا ان القوة الرمى الا ان القوة الرمى" (صحیح مسلم ج ۲ ص۱۴۳ باب فضل الرمى والحث عليه - كتاب الجهاد)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس حال میں کہ آپ منبر پر تشریف فرما تھے، آپ نے ارشاد فرمایا: اور تیار کرو کافروں کے ساتھ جنگ کے واسطے وہ چیزیں جو تم قوت سے کر سکو، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے۔"

اس حدیث کی تفسیر میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ومعنى قوله الا ان القوة الرمى انه من معظم ما يجب اعداده للقوة على قتال العدو ولم ينف به ان يكون غيره من القوة بل عموم اللفظ شامل لجميع ما يستعان به على على العدو ومن سائر انواع السلاح وآلات الحرب۔ (احکام القرآن جلد ۲ ص۸۵ سورۃ الانفال)

دوسری روایت ہے: عن عقبة بن عامرؓ قال سمعت رسول الله يقول ان الله يدخل بالسهم الواحد ثلاثة نفر الجنة صانعه يحتسب فى صنعته الخير والرامى به ومنبله۔

(رواه ابوداؤد بذل المجهود ج ۱۱ ص۴۲۸ كتاب الجهاد - باب الرمى)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر پر تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے، اس کا بنانے والا جس کے بنانے سے اس کی نیت خیر کی ہو، اور اس کا پھینکنے والا، تیسرا تیر دینے والا تیر انداز کے ہاتھ میں۔"

اس حدیث کے متعلق شارح ابوداؤد مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:۔

ولم یکون فی زمن رسول اللہ الا رمی السھام فیدخل بل یعوض عنه فیه مایرمی به من الرصاص بالبندوقیه والمدافع وغیر ذلک من آلات الحرب الجدیدۃ فی ھذا الزمان فانھا اغنت عن رمی السھام بالقوس وعطلته۔ (بذل المجہود جلد ۱۱ ص ۴۲۸ باب فی الرمی کتاب الجہاد)

فقہائے کرام میں فقہ حنفی کی مشہور و معروف شخصیت علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں :۔

یندب للمجاھد فی دار الحرب توفیر الاظفار وان کان قصھا من الفطرۃ لانه اذا سقط السلاح من یدہ ودنا منه العدو ربما یتمکن من دفعه بالاظافیر وھو نظیر قص الشوارب فانه سنة ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرھا وتطویلھا لیکون اھیب فی عین من یبارزہ۔ فالحاصل ان مایعین المرء علی الجہاد فھو مندوب الی اکتسابه لما فیه من اعزاز المسلمین وقھر المشرکین۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۷۲ کتاب الجہاد)

(ترجمہ) ”یعنی دارالحرب میں مجاہد کے لیے ناخن بڑھانا باوجودیکہ ناخنوں کا کٹوانا ایک فطری امر ہے، مندوب اور مستحب ہے کیونکہ دورانِ جنگ وجہاد اگر اس کے پاس اسلحہ نہ ہو اور دشمن اس کے بالکل قریب ہو تو ناخنوں کے ذریعہ بھی وہ اپنے دشمن کو دفع کر سکتا ہے، اور اس کی نظیر مونچھوں کو ترشوانا ہے کیونکہ یہ سنت ہے، پھر غازی کے لیے دارالحرب میں مونچھوں کا بڑھانا مستحب ہے تاکہ اس سے اُس کے مقابل دشمن پر رُعب اور دھاک بیٹھ جائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کہ مجاہد و غازی کے لیے جہاد میں ممد و معاون ثابت ہو تو وہ مندوب اور مستحب ہے اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کا وقار اور مشرکین کی تذلیل و توہین ہے۔“

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ بات بالکل عیاں ہے کہ مسلمانوں کے لیے ہر قسم کا اسلحہ اور جنگی ساز و سامان دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رکھنا فرض اور ضروری ہے تاکہ جہاد کے وقت ان کی توجہ اسلحہ کی تیاری پر نہ ہو۔

آلاتِ حرب یا عسکری قوت کو ضائع کرنے یا ان کو منجمد کرنے پر وعیدیں

جس مسلمان ملک کے پاس یہ آلاتِ حرب (اور وہ بھی جدید ترین شکل میں) ہوں، ان آلات کو ضائع کرنے یا استعمال میں نہ لانے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے : عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول من علم الرمی ثم ترکه فلیس منا اوقد عصی۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فضل الرمی والحث۔ کتاب الجہاد)

(ترجمہ) ”حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

آپ نے فرمایا کہ جس کسی نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں یا وہ گنہگار رہوا۔"

مندرجہ بالا حدیث کے ذیل میں شارح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔
"ھٰذا تشدید عظیم فی نسیان الرمی" بعد علمہ ومکروہ کراھۃ شدیدۃ من ترکہ بلا عذر۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص۱۴۳ باب فصل الرمی والحث۔ کتاب الجہاد)

اور اس حدیث کی تشریح میں ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں، گویا اُس نے اس میں کوئی نقص دیکھا اور اس کے ساتھ استہزاء کیا اور یہ صورتیں کفرانِ نعمت کے زمرے میں آتی ہیں، شراح حدیث نے اس نعمت کو نعمتِ خطیرہ سے تعبیر کیا ہے۔" (مرقاۃ ج ۷ ص۳۱۴ باب اعداد آلۃ الجہاد)

اور یہی حدیث ایک اور روایت میں یوں بیان کی گئی ہے "من تعلم الرمی ثم نسیہ فھی نعمۃ جحدھا" (مجموعۃ الفتاوٰی لابن تیمیۃ ج ۲۸ ص۹ الجہاد)

مختصراً ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح اعداد آلاتِ حرب مسلمانوں کے لیے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح فن عسکری کو سیکھ کر اس کو ترک کرنا، اسے بھول جانا انتہائی لائق ملامت امر ہے جس کی طرف امام نوویؒ اور ملا علی قاریؒ نے بصراحت تنبیہ کی ہے۔ موجودہ حالات اور زمانے کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک مسلمان ملک کے پاس جو قوت اور طاقت ہو جس سے دشمنانِ اسلام مرعوب ہوتے ہوں اُس طاقت اور قوت کو ختم کرنا یا اس کو استعمال میں نہ لانا یا اس کو منجمد کرنا اسی وعید کے ضمن میں آتے ہیں۔

علامہ برہان الدین المرغینانیؒ نے حرمت اکل لحم فرس (یعنی گھوڑے کے گوشت کی حرمت) کی ایک علت یہ بھی لکھی ہے کہ : ویکرہ لحم الفرس عند ابی حنیفۃؒ .... ولانہ آلۃ ارھاب العدو فیکرہ اکلہ احتراما لہ ولھذا یضرب لہ بسھم فی الغنیمۃ ولانہ فی اباحتہ تقلیل آلۃ الجہاد۔" (الہدایۃ علی صدر فتح القدیر ج ۸ ص۴۲۰، ۴۲۱ کتاب الجہاد)
یعنی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت کھانا مکروہ ہے (اس کی ایک علت یہ ہے کہ دشمن کے ڈرانے دھمکانے اور مرعوب کرنے کا آلہ ہے اس لیے اس کے احترام کی وجہ سے اس کا کھانا مکروہ (تحریمی) ہے اور اسی احترام وعظمت کی بناء پر مالِ غنیمت میں گھوڑے کا مستقل حصہ ہے۔ (اور دوسری علت یہ ہے) کہ اس کی اباحت کی صورت میں آلۂ جہاد کی

تقلیل ہوتی ہے۔"

کفار اور غیر مسلموں کے دباؤ میں آکر ایٹمی صلاحیت اور عسکری قوت کو منجمد یا اس میں تخفیف کرنے کے متعلق کسی بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے کے بارے میں ان نصوصِ قطعیہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے، ارشادِ ربانی ہے :۔

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۔ (سورۃ الفرقان آیت ۵۲)

(ترجمہ) "سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر ان کے ساتھ بڑے زور کا۔"

دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں : وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۔ (سورۃ ہود ۱۱۳)

(ترجمہ) "اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا پھر تم کو لگے گی آگ۔"

ایک اور فرمانِ ربانی ہے کہ : ودَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۰۲)

(ترجمہ) "کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بے خبر ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر حملہ کریں یکبارگی۔"

ان نصوص میں تدبر کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری شد ومد کے ساتھ مسلمانوں کو ہر وقت کفار کے مقابلے میں تیار رہنے کا حکم دیا ہے اور کفار کی طرف معمولی میلان کو بھی موجب دخولِ نار ٹھہرایا ہے۔ اب اگر ہمارے مسلم حکمران یہود و ہنود اور نصاریٰ کے دباؤ میں آکر اس رسوائے زمانہ معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرتے ہیں تو لازمی طور پر ان نصوصِ قطعیہ اور ارشاداتِ ربانیہ کی خلاف ورزی ہوگی۔

وہ معاہدہ جو مسلمانوں کے مفادات کے منافی ہو اس کی پابندی ضروری نہیں

اگر تخفیفِ اسلحہ کے متعلق کوئی بین الاقوامی معاہدہ موجود ہو اور اس کا کنٹرول بھی کفار کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس صورت میں مسلمان اس معاہدہ کے پابند ہیں؟ سو اس بارے میں سب سے پہلے جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل آیات سامنے آتی ہیں : (۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۴۴)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام۔" (۲) وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۵۸)۔ (ترجمہ) ”اور اگر تم کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دو ان کا عہد ان کی طرف اسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز“۔ یعنی اگر آپ کو کسی قوم معاہد سے خیانت اور عہد شکنی کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ان کا عہد ان کی طرف اسی صورت میں واپس کر دیں کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں کیونکہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۲۶۹ سورۃ الانفال)

یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی ممانعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۝ (سورۃ المائدہ آیت ۵۱، ۵۲) ـــــ (ترجمہ) ”اے ایمان والو! مت بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست، وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے، اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہیں میں ہے، اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو۔ اب تو دیکھے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے دوڑ کر ملتے ہیں ان میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش زمانہ کی، سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرما دے فتح یا کوئی امر اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی کی چھپی بات پر پچھتانے“۔

علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ ”ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اذلال سے منع فرمایا اور ان کی اہانت اور اذلال کا حکم فرمایا اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں ان کی عزت اور برتری ہے۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۱۲۳)

ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی پر دستخط کرنے اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے اور اس سلسلے میں تعاون کرنے کی صورت میں جو لوگ کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کا جو مظاہرہ کرتے ہیں ان کا حشر کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہی ہوگا، لہٰذا حکومت کو چاہیئے کہ اس معاہدہ پر دستخط کی صورت میں عقل و ہوش سے کام لے اور اس انجام بد سے اپنے آپ کو بچائے۔ نیز سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے حامیوں کا یہ کہنا کہ دستخط نہ کرنے کی صورت میں ہم

یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، اس کو ان آیات میں عذرِ لنگ قرار دیا گیا ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کے اس معاہدے (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرنے کی صورت میں کفّار کی طرف سے امداد کے وعدے دستخط کرنے

کی صورت میں کفّار کی طرف سے مالی امداد و تحفظات کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کے برعکس اعدادِ آلاتِ حرب کے متعلق جو آیتِ کریمہ ہم نے ذکر کی ہے کہ " وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ " تو اس آیت کے آخر میں فرمانِ ربانی ہے: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ " اس میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جہادی سامان پر جتنا بھی خرچ کریں گے اس کے متعلق خدائی وعدہ ہے کہ "یوف الیکم" یعنی وہ خرچ تم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورا پورا دیا جائے گا بغیر کسی کمی کے۔ گویا یہ آیتِ کریمہ تصریح ہے اس بات پر کہ اگر اعدادِ آلاتِ حرب پر آپ کا کچھ خرچ ہوا ہو اور ضرور ہوتا ہے تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

اب اقتصادی پابندیوں کے خوف سے سی ٹی بی ٹی یا این پی ٹی پر دستخط کرنا گویا اللہ کے وعدے سے انحراف ہے۔ اسی طرح دیگر بھی کئی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اپنی عزت و وقار کو مجروح کر کے کفار سے استعانت لینا صحیح نہیں، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ (آل عمران ۱۱۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں"

علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "وفی ھذہ الآیۃ دلالۃ علی انہ لا تجوز الاستعانۃ باھل الذمۃ فی امور المسلمین من العمالات والکتبۃ" (احکام القرآن جلد ۲ ص۴۲ سورۃ آلِ عمران)

اسی آیت یعنی لا تتخذوا بطانۃ میں اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں اور ملازمتوں میں کفار اہلِ ذمہ سے امداد لینا جائز نہیں ہے۔

(۲) اسی طرح دوسری آیتِ کریمہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۱) میں بھی اس چیز کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ فرماتے ہیں کہ: "ان آیات میں حق تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا ہے اور ان کی اہانت و اذلال کا حکم دیا ہے

اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اسی میں ان کی عزت اور برتری ہے“۔ (احکام القرآن جلد ۳ صفحہ ۱۲۳ سورۃ النساء)

ارشادِ ربانی ہے: الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ایبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعًا۔ (سورۃ النساء آیت ۱۳۹)۔ (ترجمہ ”جو لوگ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں کیا وہ ان کے ذریعے قوت وعزت چاہتے ہیں (وہ یاد رکھیں کہ) قوت وعزت تو ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے، یعنی قوت وعزت اللہ تعالیٰ کے قوانین میں عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے“۔

مندرجہ بالا تصریحات اور نصوص کی رُو سے کفار سے امداد طلب کرنا اور ان کے ساتھ دوستی کرنا اس خاطر سے کہ اس میں ہماری عزت ہے بالکل صحیح نہیں، اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ مسلمان ممالک نے جن کافر ملکوں کے ساتھ جتنے بھی معاہدے کئے ہیں انہوں نے ایفائے عہد کا خیال نہیں رکھا، پاکستان اور عربوں کے کافروں کے ساتھ ہونے والے معاہدے ہمارے سامنے ہیں جن سوائے خسارے کے اور کچھ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔

علامہ ابوبکر الجصاص رازیؒ مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ”وھذا یدل علی انہ غیر جائز للمؤمنین الاستنصار بالکفار علی غیرھم من الکفار اذا کان متی غلبوا کان حکم الکفر ھو الغالب وبذلک قال اصحابنا“۔ (احکام القرآن ج ۲ ص ۳۵۲ سورۃ النساء)

فتویٰ کا خلاصہ اور حاصل مذکورہ بالا دلائل جو قرآن کریم کی صریح آیات، سنتِ نبویؐ کی واضح ہدایات، مفسرین، محدثین اور فقہاء امت کی تشریحات پر مشتمل ہیں اور جن پر تمام فقہی مکاتب کا اجماع ہے، سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:۔

(الف) اعداء اسلام کی جارحیت اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دفاع کیلئے ہر قسم کا فوجی سازوسامان، آلاتِ حرب کی تیاری اور اس میں شب وروز ترقی اور دشمن کے ارعاب کے لیے اعداد آلاتِ جہاد فرضِ عین ہے، یہاں تک کہ اسلام کے اساسی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی فرضیت محدود اوقات اور مقدار سے وابستہ ہیں، مگر دشمن کے مقابلہ کی تیاری غیر محدود، غیر مقید، غیر مؤقت اور تمام ممکنہ استطاعتوں سے وابستہ ہے جسے اللہ نے وَاَعِدُّوا لَہُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ (الآیۃ) میں بیان فرمایا ہے۔

(ب) دشمنانِ اسلام کے کسی دباؤ اور ترغیب و ترہیب میں آکر ایسا کوئی اقدام یا معاہدہ ہرگز جائز نہیں جس سے فوجی اور حربی تیاریوں میں تعطل پیدا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا تیار شدہ حربی سازوسامان کے استعمال کو منجمد کیا جا سکتا ہو یا حربی ٹریننگ، مشق اور تربیت کو نقصان پہنچ سکتا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا ان سارے امور پر کسی قسم کی قدغن لگ سکتی ہو۔

(ج) سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی کی شکل میں زیرِ بحث معاہدہ میں یہ سارے خطرات، خدشات اور گوناگوں پابندیاں موجود ہیں، اس لحاظ سے اس پر کسی بھی مسلمان ملک کیلئے بشمول پاکستان کے دستخط کرنا یا اس کی تحریری اور زبانی کسی قسم کی تائید اور اتفاق کی از روئے قرآن و سنت و اجماعِ اُمت ہرگز اجازت نہیں، اگر کسی بھی مسلم حکومت کا سربراہ، وزیر اعظم یا ممبر پارلیمنٹ یا کوئی عام شہری اس کی موافقت اور تائید کرتا ہے تو وہ قرآن و سُنت اور اللہ و رسول کے واضح احکام کی صریح مخالفت اور ان احکام سے کھلی بغاوت کا مرتکب ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے دین، عقیدہ اور ایمان کی خیر منانی چاہیئے، جان بوجھ کر ایسا کرنے والے ملک و ملت کے غدار ہیں کہ اس طرح وہ ملک کی آزادی، سالمیت اور خود مختاری سلب کرانے جیسے قبیح جرم کے مرتکب ہوں گے۔ از روئے شرع ایسی صورت میں پوری قوم کو دینی، ملی اور قومی جرم کے مرتکب حکمرانوں کے خلاف ہر قسم کی جدوجہد نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو گی۔


كتاب
الدعوى
والقضاء

البينة على المدعي
واليمين على من انكر

کتاب الدعوٰی والقضاء

(دعوٰی اور قضاء کے احکام و مسائل)

قاضی کے علم پر فیصلے کا حکم

سوال :- کیا قاضی اپنے علم پر کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے؟

الجواب :- شریعتِ مطہرہ نے فیصلے کا جو طریقہ کار وضع کیا ہے اور جو قواعد وضوابط مرتب کیے ہیں قاضی فیصلے کرنے میں ان کا پابند ہے، لہٰذا قاضی یا تو مدعی کے گواہوں پر فیصلہ کرے گا اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مدعا علیہ کی قسم پر فیصلہ کرے گا، اس طریقے کے مطابق فیصلہ کرنے میں قاضی پر کوئی تہمت وغیرہ لازم نہیں آتی اور فریقین بھی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر قاضی کو یقینی طور پر کسی فریق کے متعلق معلومات حاصل ہوں کہ یہ حق پر ہے تو اگرچہ متقدمین علماء نے ان یقینی معلومات کے حصول پر قاضی کو فیصلے کا اختیار دیا ہے لیکن معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہونے کے سبب چونکہ دورِ حاضر میں قاضیوں پر وہ اعتماد باقی نہیں رہا جو متقدمین کے دور میں تھا اس لیے متاخرین علماءِ کرام نے قاضی کو تہمت کے اندیشہ سے محفوظ رہنے اور مقضی علیہ کو اطمینان دلانے کی خاطر قاضی کے اپنے علم پر فیصلہ کرنے کو نا جائز قرار دیا ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : والفتوٰی علیٰ عدمہ فی زماننا کما نقلہ فی الاشباہ عن جامع الفصولین وقید بزماننا لفساد القضاۃ فیہ واصل المذہب الجواز۔

(رد المحتار ج۴ ص۴۸۳ کتاب القضاء، مطلب فی حکم القاضی بعلمہ) [1]

قاضی کا مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے کا حکم

سوال :- کیا قاضی مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- قضاء کا منصب چونکہ بڑا نازک اہمیت کا حامل ہے اس لیے شریعت نے

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ : ورجح فی جامع الفصولین قول محمد قال وینبغی ان یفتیٰ بہ لما علم من احوال قضاۃ زماننا ثم نقل ان محمداً قال لایقضی القاضی بعلمہ ثم نقل عن عیون المذاہب ان بقولہ یفتی۔ (البحر الرائق ج۶ ص۲۵۸ کتاب القضاء)

ومثلہٗ فی الاشباہ والنظائر ج۲ ص۳۳۶ کتاب القضاء والشہادۃ والدعاوی۔

تفصیل کے ساتھ اس کے آداب بیان کیے ہیں، دراصل ان تمام آداب کا مقصد یہ ہے کہ قاضی تہمت سے محفوظ رہے تاکہ اس کا وقار معاشرہ میں قائم رہے، اس لیے شریعت نے قاضی کیلئے ہر اس فعل سے اجتناب کرنا لازمی قرار دیا ہے جس کے صدور سے قاضی کے وقار پر حرف آتا ہے اور فریقین کے اعتماد کے اٹھنے کا ذریعہ بنتا ہو، چونکہ مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے سے قاضی پر تہمت لازم آنے کا اندیشہ ہے جس کی وجہ سے اس پر اعتماد باقی نہیں رہے گا جو کہ قضا کے باب میں مطلوب ہے اس لیے قاضی کے لیے کسی ایک فریق کے ہاں قیام کرنا جائز نہیں۔

کما فی الهندیة: فاما اذا کانت لصاحب الدعوة خصومة لا یجیب دعوته وان کانت بینهما قرابة او مباسطة قبل القضاء۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۳ ص ۳۳۱ الباب التاسع فی رزق القاضی) ؎۱

مدعی اور مدعیٰ علیہ کا قاضی کے تعین میں اختلاف کا حکم

سوال:- مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک متنازعہ مسئلہ میں مدعی اپنے علاقے کے قاضی سے فیصلہ کرانا چاہتا ہے اور مدعیٰ علیہ اپنے علاقہ کے قاضی سے، تو اس صورت میں کون سے علاقے کے قاضی کو ترجیح دی جائے گی؟

الجواب:- جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے کسی پر دعویٰ کرتا ہے تو مدعی کو حق دیتے وقت بظاہر مدعا علیہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے اس کو اطمینان دلانا بھی ضروری ہے تو شرعی دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے اس کو جس قاضی کے پاس جانے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اس کو وہاں مقدمہ چلانے کا اختیار حاصل ہے لہٰذا اگر مدعی اور مدعا علیہ میں قاضی کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق مدعا علیہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہوگی۔

لما قال العلامة بدر الدین محمد بن اسماعیل الشهید بابن قاضی سماوةؒ: وان کان من المحلتین فاراد المدعی ان یخاصمه الی قاضی محلته وابیٰ الآخر قال ابو یوسفؒ

؎۱ قال العلامة الحصکفی رحمه الله: ولا یجیب دعوة خصم وغیر معتاد ولو عامة للتهمة۔ (در المختار ج ۴ ص ۳۷۴ کتاب القضاء، مطلب فی حکم الهدیة للمفتی)
ومثله فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸۱ کتاب العاریة۔

العبرة للمدعی قال محمد لا بل للمدعی علیہ و بہ یفتی۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۲۱ الفصل التاسع والثلاثون فی المتفرقات) ۔[1]

فیصلے کو ماننے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنے کا حکم

سوال:۔ فریقین کے مابین فیصلہ کرتے وقت ثالث نے دونوں فریقوں سے پانچ پانچ کلاشنکوف اپنے پاس رکھیں اور شرط یہ لگائی کہ فیصلہ کا اختیار دینے کے بعد جو کوئی بھی فریق فیصلہ ماننے سے انکار کرے تو اس کی کلاشنکوف بطور جرمانہ ضبط کرلی جائیں گی، دونوں فریقوں نے اس وقت یہ شرط قبول کرلی، چنانچہ فیصلے کے بعد ایک فریق نے فیصلہ ماننے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے اس کی پانچ کلاشنکوف ضبط کرلی گئیں، تو کیا اس طرح فیصلے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب فریقین نے خوشی سے ثالث کو فیصلے کا اختیار دیا تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار کرنا جائز نہیں بلکہ اس فیصلے کا ماننا فریقین پر لازم ہے اس لیے کہ ایسے فیصلے سے انکار ایک غیر شرعی امر ہے اور کسی غیر شرعی امر کے ارتکاب پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے اگرچہ اصل مذہب عدم جواز کا ہے لیکن معاشرہ میں برائیوں کے انسداد کے لیے چونکہ شرعی طریقے سے تعزیرات کا نظام مفقود ہے اور برائیوں کا انسداد ضروری ہے اس لیے اگر کوئی ایسی طاقت اور قوت موجود نہ ہو جس سے جرائم کا انسداد ہوسکے اور تعزیر بالمال سے اس کا انسداد ہوسکتا ہو تو ایسی صورت میں معاشرہ کی اصلاح کی خاطر امام ابویوسف رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دینا زیادہ مناسب ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله:۔ قال المصنف سمعت من ثقة ان التعزير باخذ المال ان رأى القاضي او الوالي جاز ومن جملة ذلك رجل

---

[1] قال العلامة سليم رستم بن باز اللبناني: اذا طلب احد الخصمين في البلدة التي تعدد حكامها المرافعة في حضور حاكم وطلب الآخر المرافعة في حضور حاكم آخر ووقع الاختلاف بينهما على هذا الوجه يرجح الحاكم الذي اختاره المدعى عليه۔ (شرح مجلة الاحكام المادة ۱۸۰۳ ص ۱۱۷۱ الكتاب السادس عشر في القضاء۔ الفصل الثالث في وظائف الحاكم) ومثله في تنقيح الحامدية ج ۱ ص ۳۱۷ كتاب القضاء۔ باب هل العبرة بقاضي المدعي الخ

لا یحضر الجماعة یجوز تعزیرہ باخذ المال۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴۴ کتاب الحدود، الفصل الاول) ؎۱

حکومت کی طرف سے مقرر کردہ جج کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا دورِ حاضر میں حکومت کے مقرر کردہ جج یا مجسٹریٹ شرعی قاضی کا قائم مقام ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ قاضی کا تقرر دراصل لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے لیے ہوتا ہے ان تنازعات کو حل کرنے کے لیے شریعت نے باقاعدہ حدود بیان کی ہیں، اسی طرح منصبِ قضاء پر فائز ہونے کے لیے بھی کچھ شرائط عائد کی ہیں اس لیے اگر ان شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے حکومتِ وقت جس کو بھی مسلمانوں کے تنازعات ختم کرانے کے لیے جج یا مجسٹریٹ مقرر کرے تو وہ شرعی قاضی کے قائم مقام ہوگا۔ چونکہ قاضی لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے بارے میں وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حکومت کو اس بارے میں اختیار حاصل ہے کہ اس کام کے لیے جس کو بھی چاہے مقرر کرسکتی ہے، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ جج شرعی اصول کے موافق ہو اور اس کے فیصلے شرعی قواعد کے خلاف نہ ہوں۔

قال العلامة سلیم رستم باز: الحاکم وکیلٌ من قبل السلطان فی اجراء المحاکمة والحکم۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۸۰۰ ص۱۱۶۱ الکتاب السادس عشر الفصل الثالث)

اہلِ بدعت کا اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا حکم

سوال:۔ کیا اہلِ بدعت جو کہ اعتقادی فاسق ہیں، میں سے کسی کو رؤیتِ ہلال کمیٹی کا چیئرمین بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اعلیٰ منصب (کلیدی اسامی) پر کسی عادل اور پابندِ شریعت شخص کو مقرر کرنا

؎۱ قال العلامة الزیلعی رحمہ اللہ، عن ابی یوسفؒ ان التعزیر باخذ الاموال جائز للامام۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۲۰۸ باب حد القذف فصل فی التعزیر)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۴۱ باب حد القذف، فصل فی التعزیر۔

؎۲ قال العلامة الکاسانیؒ: کل ما یخرج به الوکیل عن الوکالة یخرج به القاضی عن القضاء۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۶ کتاب آداب القاضی، فصل فی بیان ما یخرج به الوکیل)

ومثلہٗ فی الاحکام السلطانیة ص۶۵ فی ولایة القضاء۔

حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کیونکہ عادل اور نیک آدمی کے تقرر کے بغیر لوگوں کو ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرنا دشوار ہے، اور رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کے ساتھ تو دینی امور کا خاص تعلق ہے، تو جو شخص خود بدعات کے ارتکاب کی وجہ سے شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے فسق وفجور میں مبتلا ہو وہ دوسرے مسلمانوں کی عبادات کے تحفظ کا کیا لحاظ رکھے گا، اس لیے حکومت کے لیے مناسب نہیں کہ عادل اور پابندِ شریعت لوگوں کے ہوتے ہوئے اہلِ بدعت میں سے کسی کو اس منصب پر فائز کرے، تاہم جب حکومت نے اس کو مقرر کیا ہو تو دینی امور میں اس کا حکم شرعی قواعد کے تحت نافذ العمل ہوگا جیسا کہ فاسق کا حکم نافذ العمل ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: والفاسق اهل للقضاء حتى لو قلد يصح الا انه لا ينبغي ان يقلد كما في حكم الشهادة۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۳۲ كتاب أدب القاضي) [۱]

مدعیٰ علیہ قسم سے انکار کردے تو فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا

سوال:۔ جب مدعی اپنے دعویٰ پر گواہ پیش نہ کرسکے تو مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آتی ہے لیکن اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کردے تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ جب شرائطِ شرعی کے تحت مدعی کا دعویٰ قاضی کے ہاں سماعت کیلئے منظور ہوجائے تو مدعیٰ علیہ پر مدعی کا جواب دینا واجب ہے کہ یا تو مدعی کے حق کا اقرار کرے یا انکار، اگر مدعیٰ علیہ مدعی کے حق سے انکار کرے تو مدعی پر لازم ہے کہ گواہ پیش کرے اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہوجائے تو پھر مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آئے گی اور اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اس پر مدعی کا حق لازم ہوجائے گا اور فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: واذا نكل المدعى عليه عن اليمين قضى عليه بالنكول والزمه ما ادعى عليه۔ (الهداية ج ۳ ص ۲۰۲ باب اليمين، كتاب القضاء) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: والوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذو شوكة وان كان جاهلاً فاسقاً وهو ظاهر المذهب عندنا وحينئذ فيحكم بفتوى غيره۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۳۳ كتاب القضاء)

ومثله في جامع الفصولين ج ۱ ص ۱۶ الفصل التاسع والثلاثون في المتفرقات۔

[۲] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وقضى القاضي عليه بنكوله مرة لنكوله في مجلس القاضي حقيقةً۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۱۲ كتاب الدعوى)

ومثله في مجلة الاحكام۔ المادة ۱۸۱۵ ص ۱۰۶ كتاب الدعوى، الباب الثاني۔

جج کا ثالث کے فیصلے پر فیصلہ سنانے کا حکم

سوال:۔ فریقین نے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا، ثالث کے فیصلے کے بعد وہ مقدمہ عدالت میں پیش کیا گیا، جج نے چھان بین کے بعد بعینہٖ ثالث کے فیصلے کے مطابق فیصلہ سنایا، تو کیا جج کے لیے ثالث کے فیصلہ پر فیصلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے لیے باہمی رضامندی سے کسی کو ثالث مقرر کرتے ہیں تو وہ جو بھی فیصلہ کرے فریقین پر نافذ ہوتا ہے، جب اس کا فیصلہ عدالت میں پیش کیا جائے تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی قواعد وضوابط کے عین مطابق ہو تو جج کے لیے یہ فیصلہ توڑنا جائز نہیں کیونکہ اس کے توڑنے میں فریقین کا فائدہ نہیں بلکہ انتشار کا سبب بن سکتا ہے البتہ اگر اس کا فیصلہ کسی مختلف فیہ امر میں ہو اور وہ جج کی رائے کے موافق ہو تو پھر جج کے لیے اس کا توڑنا مناسب نہیں اور اگر جج کی رائے کے خلاف ہو تو جج اپنی رائے کے مطابق اس میں تغیر وتبدل کا اختیار رکھتا ہے اس لیے مذکورہ صورت میں اگر ثالث کا فیصلہ جج کی رائے کے موافق ہو تو جج اس فیصلے کو مدار بنا کر اس پر اپنا فیصلہ سنا سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها انه اذا حکم فی فصل مجتهد فیه ثم رفع حکمه الی القاضی ورأیه یخالف رأی الحاکم المحکم له ان یفسخ حکمه۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب القضاء فصل فی بیان من یصلح للقضاء) [1]

دعویٰ کے اثبات کے لیے تحریری ثبوت پیش کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زندگی میں اپنی جائیداد سے ایک مکان اپنے بیٹے پر فروخت کیا اور مکان کا اسے قبضہ بھی دے دیا، اس کے مرنے کے بعد دوسرے ورثاء نے اس مکان میں شرکت کا دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ کے اثبات کیلئے میت کی طرف سے باقاعدہ وصیت نامہ پیش کیا جس میں مکان ورثاء میں تقسیم کیا گیا ہے، تو کیا

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: ان قضی المحکم فی فصل مجتهد فیه ثم رفع حکمه الی قاض مولی من السلطان امضاه ان وافق مذهبه لانه لا فائدة فی نقضه۔
(شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۹ ص۱۱۹۹ الباب الرابع)
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۹ کتاب القضاء۔ الفصل الرابع۔

اس تحریری وصیت نامہ کے تحت دوسرے ورثاء کے حق میں فیصلہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ازروئے شریعت جو دستاویزات تغیر و تبدل سے محفوظ ہوں ان کو اعتبار دے کر اس پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے لیکن موجودہ حالات میں چونکہ مکر و فریب نے معاشرہ میں اکثر لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جس کی وجہ سے سچے اور جھوٹے کاغذات میں تمیز مشکل ہوگئی ہے اس لیے اگر تحریری معاہدہ پر باقاعدہ گواہ موجود ہوں تو اس کو اعتبار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔ صورتِ مرقومہ میں جو لوگ مکان میں شرکت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ کے اثبات کیلئے تحریری وصیت نامہ پیش کرتے ہیں اگر وہ اس پر گواہ پیش کرتے ہیں تو پھر اس وصیت نامہ کی شرعی حیثیت ہوسکتی ہے اور فریقین کے دعویٰ کی چھان بین کے بعد فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ:۔ ولا یعمل بالخط والختم وحدهما الا اذا کان سالماً من شبهة التزویر والتصنیع فیعمل به یعنی انه یکون مداراً للحکم ولا یحتاج الی الثبوت بوجه آخر۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۳۶ ص۱۰۹۰ الباب الثانی)[۱]

مُدعی کا مُدعیٰ علیہ سے مقدمہ کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ مقدمہ جیتنے کی صورت میں مدعی عدالت کا خرچہ مدعیٰ علیہ سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے عدالت میں دعویٰ دائر کرتا ہے تو عدالت کا عملہ اس کے حق کے احیاء کیلئے مصروفِ عمل ہوتا ہے تو اس کا تمام تر فائدہ مدعی کو ہی پہنچتا ہے اور عدالت کی اشیاء کا استعمال اس کے فائدہ کے لیے ہوتا ہے اس لیے ان اشیاء کا خرچہ مدعی پر عائد ہوتا ہے کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کو اختیار ہے اگر وہ مقدمہ کے رجسٹرڈ وغیرہ کا خرچہ مُدعی سے وصول کرنا چاہے تو وصول کرسکتا ہے، جب عدالت کا خرچہ مُدعی پر آتا ہے تو مُدعیٰ علیہ کو اس کا ضامن ٹھہرانا اور اس سے خرچہ وصول کرنا

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ:۔ فالحاصل ان المدار علی انتفاء الشبهة ظاهراً وعلیه فما یوجد فی دفاتر التجار فی زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما علیه فی دفتره الذی یقرب من الیقین انه لا یکتب فیه علی سبیل التجربة والهزل یعمل به۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیة ج ۲ ص۲۱ کتاب الدعوی)
ومثله فی تقریرات الرافعی ج ۲ ص۹۲ کتاب الدعوی۔

شرعاً جائز نہیں ہے۔

کمافی الهندیة : وعلیٰ هذا الصحیفة التی یکتب وفیها دعوی المدعین وشهادتهم ان رأی القاضی ان یطلب ذٰلك من المدعی فله ذٰلك۔ (الفتاوی الهندیة ج ۳ ص۳۳۰ الباب التاسع فی رزق القاضی) [1]

حاکم وقت کا مملوکہ زمین قاضی کو بطور عطیہ دینے کا حکم

سوال:۔ چار بھائیوں کی مشترکہ جائیداد ایک نواب نے کسی قاضی کو بطور عطیہ دے دی، قاضی نے اس جائیداد پر باضابطہ قبضہ کیا اور باقاعدہ لفع حاصل کرتا رہا، مذکورہ نواب کا اقتدار ختم ہوتے ہی ان بھائیوں نے حکومت سے اپنی جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا عدالت میں تقریباً سترہ (۱۷) سال مقدمہ جاری رہنے کے بعد فیصلہ دو بھائیوں کے حق میں ہوا اور باقی دو بھائیوں کو محض اس وجہ سے اپنے حق سے محروم رکھا کہ انہوں نے نواب کو دستخط کر دیئے تھے۔ اب یہ مشترکہ اور غیر منقسم جائیداد قاضی کے قبضہ میں ہے، مذکورہ بھائیوں نے قاضی سے جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ یہ میرے قبضہ میں ہے اور مذکورہ نواب نے مجھے دی ہے اس لیے یہ میرا ہی حق ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قاضی کے لیے ایسی زمین پر قابض رہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے حاکم صرف اس جائیداد سے عطیات دینے کا حق دیا ہے جو کسی کی مملوکہ نہ ہو اور جو جائیداد پہلے ہی سے کسی کی ملکیت چلی آرہی ہو اس کا کوئی کسی کو بطور عطیہ یا انعام دینا جائز نہیں، اس لیے مذکورہ نواب نے اپنی حکومت میں جو مملوکہ زمین قاضی کو دی ہے اس پر قاضی کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور خاص کر جب مذکورہ نواب کی حکومت ختم ہونے پر حکومت نے مالکوں کے حق میں فیصلہ کیا ہو تو یہ جائیداد اصل مالکوں کو واپس کی جائے گی قاضی کے لیے اس پر سے جا قبضہ کرنا جائز نہیں بلکہ یہ غصب کے حکم میں ہوگا، اس لیے اگر قاضی کے تصرفات کی وجہ سے اس زمین کو نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری قاضی پر عائد ہوگی۔

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ: واذا اراد القاضی ان یکتب السجل ویأخذ علیٰ ذٰلك اجراً یاخذ منه مقدار ما یجوز اخذه لغیره۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۸)
ومثله فی منحة الخالق علیٰ هامش البحر الرائق ج ۶ ص۲۷۹ کتاب القضاء الفصل الثانی۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولو غصب ارضاً فبنیٰ علیها اوغرس فیها لاینقطع ملک المالک ویقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردّها فارغة لان الارض بحالها لم تتغیر ولم تصر شیئاً آخر۔ (بدائع الصنائع ج۷، ص۱۴۹ کتاب الغصب، فصل فی حکم الغصب)[1]

ایک بھائی کی عدم موجودگی میں مشترکہ جائیداد کے فیصلے کا طریقۂ کار

سوال: بھائیوں کی آپس میں مشترکہ جائیداد تھی اس پر کسی شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان بھائیوں میں سے ایک بھائی موجود نہیں تو کیا اس کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ وغیرہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر غائب نے اپنی طرف سے کسی بھائی کو اپنی جائیداد کے تنازعہ کے متعلق مکمل اختیار دیا ہے تو وہ بھائی اس کی طرف سے وکیل بن کر باقاعدہ خصومت کر سکتا ہے اور اس کی موجودگی میں قاضی فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن اگر اس نے اپنی طرف سے مکمل اختیار نہ دیا ہو تو پھر جو بھائی موجود ہے وہ شریک کی مانند ہو کر جن شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے انہی شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے بھائی کی طرف سے خصم بن سکتا ہے۔ اس لیے اگر یہ مشترکہ جائیداد بھائیوں کے قبضہ میں ہو تقسیم نہیں کی گئی ہو اور ایک ہی سبب کے تحت سب بھائیوں کو اس پر ملکیت حاصل ہو تو جو بھائی موجود ہے اس کی موجودگی میں فیصلہ کیا جائے گا اور اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو تو پھر غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ:۔ انه ینتصب احدهم عن الباقین بشروط ثلاثة کون العین کلها فی یده وان لاتکون مقسومة وان یصدق الغائب انها ارث عن المیت۔ (ردالمحتار ج۴ ص۳۴۵ کتاب القضاء)[2]

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: ومن غصب ارضاً فغرس فیها اوبنی قیل له اقلع البناء والغرس وردها وفیه ایضاً فان کانت الارض تنتقص بقلع ذلک فللمالک ان یضمن له قیمة البناء وقیمة الغرس مقلوعاً ویکونان له۔ (الهدایة ج۳ ص۳۷۹ کتاب الغصب فصل فیما یتغیر بفعل الغاصب) ــــ ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۹۰۵ ص۵۰۱ الفصل الثانی۔

[2] قال العلامة قاضی سماوةؒ: کون المدعی شیئین بینهما لامحالة فی هذه الصور یحکم علی الغائب وفیه ایضاً وذکر عامة المشائخ ان التسبیبة تشترط فی ماکان المدعی شیئاً واحداً وهو الاشبه والاقرب الی الفقه۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۵۵ الفصل الخامس فی القضاء علی الغائب الخ)

ومثله فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة ج۱ ص۳۱۳ کتاب القضاء۔

مکرہ کے اقرار پر فیصلے کا حکم

سوال :۔ ایک شخص پر اپنے باپ کے قتل کا دعویٰ کیا گیا، دعویٰ کے اثبات پر کوئی گواہ بھی پیش نہیں ہوا، صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کی غرض سے مُدعیٰ علیہ نے اقرارِ جرم کیا، جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے اپنے اقرار سے رجوع کر لیا، تو کیا پولیس کے سامنے اقرار کو مدار بنا کر اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنے کا فیصلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل موانع میراث میں سے ہے اور باپ کو قتل کرنے سے بیٹا باپ کی میراث سے محروم ہو جاتا ہے لیکن اس شرط پر کہ قتل کا ثبوت شرعی قواعد و ضوابط کے تحت ثابت ہو اور قتل کے ثبوت کی دو صورتیں ہیں، ایک معائنہ کی شہادت کہ قتل پر چشم دید گواہ پیش ہو جائیں اور دوسری صورت اپنی مرضی سے قتل کا اقرار کرنا، چونکہ مذکورہ بالا صورت میں صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کے لیے بیٹے نے باپ کے قتل کا اقرار کیا ہے اس لیے یہ شخص مکرہ کے اقرار کے حکم میں ہوگا، جس طرح مکرہ کا اقرار حجت نہیں ہوتا اسی طرح اس شخص کا اقرار بھی حجت نہیں لہٰذا اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنا جائز نہیں ہے۔

كما في الهندية : وكذا الرضا والطوع شرط حتى لايصح اقرار المكره كذا في النهاية ۔

(الفتاوى الهندية ج۴ ص۱۵۶ كتاب الاقرار، الباب الاول) [1]

شریک کی عدم موجودگی میں قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال :۔ دو اشخاص کے درمیان ایک مشترکہ زمین تھی ایک شریک کی عدم موجودگی میں دوسرے پر کسی نے دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کیے، قاضی نے شریک کی عدم موجودگی میں مدعی کے حق میں فیصلہ کر دیا، تو کیا جو شریک موجود ہے اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس پر فیصلہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ اب غائب شریک واپس آگیا ہے اور دوبارہ دعویٰ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا دعویٰ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ جو شریک حاضر ہے اگر زمین مذکورہ اس کے قبضہ میں ہو اور تقسیم نہ کی گئی ہو اور غائب شریک اس کا اعتراف بھی کرتا ہو کہ یہ زمین ہم دونوں میں مشترکہ ہے تو اس صورت میں

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ : اقرار المكره باطل ۔ (الاشباه والنظائر ج۴ ص۲۹۶ باب الاقرار۔

ومِثلُهٗ فى مجلة الاحكام ، المادة ۱۵۷۵ ص۸۶۲ كتاب الاقرار۔ الباب الاول۔

جو شریک موجود ہے وہ دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے اور اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس کی موجودگی میں فیصلہ کرنا درست ہے، اگر ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضی نے فیصلہ کیا ہو تو یہ فیصلہ صحیح اور نافذالعمل ہوگا۔ اسی بناء پر اگر غائب واپس آجائے اور دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ درست نہیں لیکن اگر ان شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو تو جو شریک موجود ہے وہ غائب کی طرف سے خصم بننے کا اہل نہیں، اس لیے ایسی صورت میں اگر قاضی غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ کرے تو یہ فیصلہ صحیح نہیں تو جب وہ حاضر ہو جائے اور دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کرنا چاہے تو اس کا دعویٰ درست ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشي رحمہ اللہ: لا یقضی علی غائب ولا له الا بحضور نائبه حقیقة کوکیله ووصیه ومتولی الوقف۔

وفی الدر المختار: افاد السکات عدم الحصر فان احد الورثة کذلك ینتصب خصما عن الباقین وکذا احد شریك الدین۔

وفی رد المحتار: انه ینتصب احدهم عن الباقی بشروط ثلاثة کون العین کلها فی یده وان لا تکون مقسومة وان یصدق الغائب انها ارث عن المیت۔

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۳۲۳ کتاب الحوالة) [1]

اقرار کے بعد مقروض کا قرض سے انکار اور اس پر ایک عدالتی فیصلے کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو بارہ سو روپے (۱۲۰۰) بطور قرض دیئے اور اس شخص نے گواہوں کے سامنے بارہ سو روپے (۱۲۰۰) وصولی کا اقرار بھی کیا، جب قرض دینے والے شخص نے مقروض سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مقروض نے دو (۲) آدمی قرض کی ادائیگی میں مزید مہلت مانگنے کے لیے اس شخص کے پاس بھیجے چنانچہ وہ مزید مہلت دینے پر راضی ہوگیا، کچھ عرصہ کے بعد مقروض نے قرض واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا، قرض خواہ

---

[1] قال العلامة قاضی سماوۃ: کون المدعی شیئین بینهما سببیة لا محالة فی هذه الصور یحکم علی الغائب وفیه ایضا وذکر عامة المشائخ ان السببیة تشترط فی ما لو کان المدعی شیئا واحدا وهو الاشبه والاقرب الی الفقه۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۵۵ الفصل الخامس فی القضاء علی الغائب)
ومثله فی تنقیح الفتاوی الحامدیة ج ۱ ص ۳۱۳ کتاب القضاء۔

نے مجبور ہوکر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا اور مقروض کے اقرار پر باقاعدہ گواہ بھی پیش کیے لیکن اس کے باوجود جج نے مقروض کے حق میں فیصلہ سُنا دیا، کیا جج کا یہ فیصلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک عاقل بالغ شخص کسی کے حق کا اقرار کرلے تو وہ اپنے اقرار پر ماخوذ ہوتا ہے اور اس کے اقرار کے موافق اس پر ضمان لازم آتا ہے۔ مذکورہ صورت میں جب مقروض نے ایک دفعہ لوگوں کے سامنے بارہ ۱۲۰۰ سو روپے بطور قرض لینے کا اقرار کر لیا تو پھر قرض کی واپسی سے انکار جائز نہیں اور مزید برآں قرض کی ادائیگی کے لیے مزید مہلت مانگنے کے لیے دو آدمی قرض خواہ کے پاس بھیجنے سے قرض کے اقرار کی مزید تاکید ہوتی ہے اسلیے اگر قرض دہندہ نے مقروض کے اقرار پر گواہ پیش کیے ہوں تو ان گواہوں کے ہوتے ہوئے جج کا اس کے حق میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں۔

قال العلامة طاهر بن عبدالرشيد البخاريؒ: وكذا لو قال أخرها عني أو صالحني فاقرار۔
(خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۱۴۱ کتاب الاقرار، الفصل الاول)[1]

باپ کو عدالتی سزا سے بچانے کے لیے اعترافِ جرم کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قتل میں باپ بیٹا دونوں شریک تھے عدالت نے جرم ثابت ہونے پر دونوں کو سزا کا مستحق قرار دیا لیکن بعد میں باپ کو بچانے کی خاطر بیٹے نے اعتراف کیا کہ میں نے مقتول کو اپنی بہن کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کیا لیکن میرا والد اس میں شریک نہیں تھا، اُس کے اِس بیان پر عدالت نے باپ کو سزا سے بری کر دیا اور بیٹے کو عمر قید کی سزا سُنا دی، حالانکہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ تو کیا بیٹے کے اس بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے شہادت کو ہر قسم کے خطرات سے تحفظ دلانے کے لیے احتیاط پر مبنی زرّیں اصول مرتب کیے ہیں کیونکہ فیصلے کا اصل دار ومدار صحیح شہادت پر ہے، اس میں ذرہ برابر تغیر و تبدل سے فیصلے کی پوری نوعیت بدل جاتی ہے، اس لیے جہاں کہیں بھی

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: لو قال لي عليك ألف فقال اتزنه أو انتقده أو أجلني به أو قضيتكه فهو اقرار۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۲۵۱ کتاب الاقرار۔)

ومثله في شرح المجلة (۱۵۸۰) ص ۱۵۲ الكتاب الثالث عشر في الاقرار۔

اس میں شبہ کا احتمال موجود ہو تو شریعت نے ایسی شہادت کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اس بناء پر جس شہادت میں بھی ذاتی منفعت یا باہمی قریبی رشتہ کی وجہ سے دوسرے کو منفعت لانے کا تصور پایا جاتا ہو وہ شہادت مقبول نہیں، چونکہ باپ بیٹے کے منافع اکثر ایک ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں۔ صورتِ مذکورہ میں حسبِ بیان جب مجرم نے اعترافِ جرم کیا تو اس وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہوا لیکن اس کے باپ کے بارے میں اس کی گواہی قبول نہیں لہٰذا بیٹے کے بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح نہیں۔

لما قال العلامة ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا شهادة الوالد لولده وولد ولده ولا شهادة الولد لِاَبَوَیْهِ ولاجداده۔ (الهداية ج ۳ ص۱۶۱ باب من يقبل شهادته ومن لا يقبل) [1]

مدعی کے بیانات میں تعارض کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص کی زمین اس کے چچا زاد بھائی کے زیر قبضہ تھی اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہا، بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین چونکہ دیہہ شاملات ہے اور اس کو میں نے آباد کیا ہے اس لیے اب یہ میری ہے، بعد میں اس نے دوبارہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ زمین مجھے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، از روئے شرع اس شخص کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ مدعی کے بیانات کا آپس میں تناقض نہ ہو، اگر اس کے بیانات میں تناقض آجائے تو اس سے اس کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جب مدعی نے ایک دفعہ یہ بیان دیا کہ یہ زمین دیہہ شاملات ہے اور میں نے آباد کی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین پہلے سے کسی کی مملوکہ نہیں تھی بلکہ آباد کرنے سے یہ میری مملوکہ بن گئی ہے لیکن بعد میں جب اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاری رحمه الله: لا يجوز شهادة الرجل لولده ولا لوالده وان علا من قبل الاب والأم ولحافده وان سفل۔
(خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۶۰ الفصل الثانی فی الشهادات)

وَمِثْلُهُ فی مجلة الاحكام، المادة ۱۷۰۰ ص۱۰۲۳ الكتاب الخامس عشر، الفصل الثالث۔

مجھے آباؤ اجداد سے تقسیم میں ملی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین پہلے سے میرے آباؤ اجداد کی مملوکہ ہے تو مدعی کے دونوں بیانات کا آپس میں تناقض ہے اس لیے اس کا دعویٰ صحیح نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها عدم التناقض فی الدعوٰی وهو ان لا یسبق منه ما یناقض دعوٰه لاستحالة وجود الشئ مع ما یناقضه و ینافیه۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۳ کتاب الدعوٰی، فصل فی الشرائط المصححه للدعوٰی) ؎۱

ملک اور بیع کے دعویٰ میں فیصلہ بیع کے گواہوں پر ہوگا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر سو کنال زمین فروخت کی اور کاغذات میں مشتری کا نام درج کر دیا اور اس کے عوض آٹھ سو روپے وصول کیے، بعد میں بائع نے دعویٰ کیا کہ میں نے آٹھ سو روپے صرف دس کنال زمین کے عوض وصول کیے ہیں اور باقی ۹۰ کنال بطور امانت دی تھی جبکہ مشتری یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے پوری سو کنال زمین کے آٹھ سو روپے ادا کیے ہیں، دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کرتے ہیں، تو اس صورت میں کس کے گواہوں پر فیصلہ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرتا ہے اور بائع ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے اور زمین چونکہ مشتری کے قبضہ میں ہے اس لیے مشتری ذوالید ہے اور بائع خارج، تو عام طور پر فقہاءؒ کے بیان کردہ اصول کے تحت خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوتے ہیں لیکن اگر ذوالید خارج سے شراء کا دعویٰ کرے تو پھر ذوالید کے گواہ خارج پر مقدم کیے جائیں گے، اور حسب بیان چونکہ مشتری ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اسلئے اگر طرفین اپنے اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں تو مشتری کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں کے موافق ہوگا۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ولو برهن الخارج وذوالید علی الشراء منه فذوالید احق۔ (البحرالرائق ج۷ ص۲۴۲ باب دعوی الرجلین) ؎۲

؎۱ قال العلامة سلیم رستم بازؒ:۔ التناقض یکون مانعا لدعوی الملکیة۔ (مجلة الاحکام، المادہ ۱۶۴۷ ص۹۵۹)
وَمِثْلُهُ فی جامع الفصولین ج۱ ص۱۲۳ الفصل العاشر فی التناقض فی الدعوٰی۔

؎۲ قال العلامة المرغینانیؒ: وان اقام الخارج البینة علی الملك المطلق وصاحب الید البینة علی الشراء منه کان صاحب الید اولٰی۔ (الهدایة ج۳ ص۲۲۴ کتاب الدعوٰی)
وَبِمِثْلِهٖ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۷۶۳ ص۱۱۳۲ کتاب الدعوٰی۔ الفصل الثانی۔

حدود بیان کیے بغیر زمین پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر دعویٰ کیا کہ میں نے اس سے سولہ کنال زمین خریدی ہے اور یہ میری ملکیت ہے، لیکن دعویٰ میں حدود بیان نہیں کیں، تو کیا حدود بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی بھی دعویٰ میں یہ ضروری ہے کہ مُدّعی کو اپنے مُدّعیٰ پر علم حاصل ہو اور اپنے حق کا تعین کر سکتا ہو، کیونکہ اگر مُدّعیٰ ہی معلوم نہ ہو تو جہالت کی وجہ سے مُدّعی کے حق کی تمیز اور اثبات مشکل ہوگا، چونکہ زمین میں حق کا تعین اور تمیز حدود کے بیان کرنے سے ہوتا ہے اس لیے فقہاءؒ نے زمین پر ملکیت کے دعویٰ میں حدود کا بیان کرنا شرط قرار دیا ہے کہ حدود کے بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعویٰ صحیح نہیں، اس لیے مذکورہ صورت میں مُدّعی جب تک اپنے دعویٰ میں زمین کی حدود بیان نہ کرے اس وقت تک اس کا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (وان ادعیٰ عقارا ذکر حدوده) لانه لا تعذر التعریف بالاشارة لتعذر النقل فیصار الی التحدید وکما یشترط التحدید فی الدعوی یشترط فی الشهادة۔

(البحر الرائق ج ۷ ص ۱۹۷ کتاب الدعوی) [1]

فصل کے نقصان کی وجہ سے پڑوسی سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کے مطالبہ کا حکم

سوال: ایک شخص کی زمین میں درخت ہے جس کی کچھ شاخیں پڑوسی کے کھیت کی طرف جھکی ہوئی ہیں جن کے سایہ سے اسکی فصل کو نقصان پہنچتا ہے، اب پڑوسی اس شخص سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا پڑوسی کا یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں معاشرتی زندگی میں باہمی اُلفت ومحبت کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس محبت واُلفت کے بغیر پُرسکون زندگی کا تصور بھی محال ہے، اور یہ اُلفت ومحبت صحیح طریقے سے تب قائم ہو سکتی ہے جب معاشرے کا ہر فرد دوسرے حقوق کا لحاظ رکھے اور ہر کوئی دوسرے

---

[1] قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: ویشترط التحدید فی دعوی العقار کما یشترط فی الشهادة علیه۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۶۹ کتاب الدعوی)

ومِثلُهُ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۶۲۳ ص ۱۹۱ کتاب الدعوی۔

کو اذیت پہنچانے سے گریز کرے، اس لیے اگر کسی کے تصرفات سے دوسرے کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اسلام نے اس قسم کے تصرفات سے اس کو باز رہنے کی تاکید کی ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں اگر درخت کی شاخوں سے پڑوسی کے کھیت کو نقصان پہنچتا ہو تو درخت کے مالک سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اگر شاخ کو اوپر باندھنے سے پڑوسی کے نقصان کا ازالہ ممکن ہو تو مالک کو شاخیں باندھنے پر مجبور کیا جائے گا اور اگر باندھنے سے بھی نقصان دور نہ ہوتا ہو تو پھر مالک کو شاخیں کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا البتہ درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز: من امتدت اغصان شجر بستانہ الی دار جارہ او بستانہ فلجارہ ان یکلفہ تفریغ ہوائہ بالربط او القطع (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۱۹۶ ص ۶۵۷) [1]

عاریۃً کسی کی زمین پر تصرفات کی وجہ سے استحقاق کا دعویٰ کرنا

سوال:۔ ایک قوم نے اپنی کچھ زمین حکومتِ افغانستان کو عاریۃً دی، حکومت نے اس زمین پر پولیس اسٹیشن (تھانہ) بنایا، تیس ۳۰ سال بعد اب ایک افغان کمانڈر نے اس زمین پر قبضہ کیا ہے اور وہ اس پر آبادی کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے حکومت نے اس زمین پر آبادی کی اجازت دی ہے، ازروئے شریعت اس زمین میں مذکورہ کمانڈر کے تصرفات جائز ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین غیر مملوکہ ہو اس میں حاکمِ وقت کو تصرفات کا اختیار حاصل ہے اگر وہ اس زمین میں سے کسی کو کچھ دینا چاہے تو دے سکتا ہے لیکن جو زمین پہلے سے مملوکہ ہو حاکمِ وقت کو اصل مالک کی مرضی کے بغیر کسی کو دینا جائز نہیں۔ اس لیے مذکورہ صورت میں جب ایک قوم نے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو عاریۃً دے دی تو اس زمین پر اُس قوم کی ملکیت برقرار ہے اور وہ جب بھی واپسی کا مطالبہ کرے زمین اُسے واپس کی جائے گی لہٰذا کمانڈر مذکور کا اس زمین پر قبضہ کرنا اور اس میں آبادی کرنا جائز نہیں، اور جو آبادی وغیرہ کی ہو تو اُسے گرا کر زمین اصل مالکوں کو

---

[1] قال الامام فخر الدین حسن بن منصورؒ: رجل لہ نخلۃ فی ملکہ وخرج سعفہا الی ارض جارہ کان الجار ان یقطع ویفرغ ہواء ملکہ لان من ملک ارضاً ملک ما تحتہ الی الثریٰ وما فوقہ الی السماء فکان لہ ان یقطع وھٰذا اذا کان لایمکنہ تفریغ الہواء الا بالقطع۔

(الفتاوی الخانیۃ علی ہامش الہندیۃ ج۳ ص۱۰۳ باب الصلح فی العقار الخ)

واپس کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا استعار ارضاً لیبنی فیها او لیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیها ویکلفه قلع البناء والغرس۔ (الهدایة ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریة)[1]

کسی کی مملوکہ زمین پر قبضہ کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص تیس ۳۰ سال قبل اپنی مملوکہ زمین میں تصرف کرتا رہا، کسی عذر کی وجہ سے اسے وطن چھوڑ کر باہر جانا پڑا، اس کی عدم موجودگی میں اس کے تین چچازاد بھائیوں نے اس میں تصرف شروع کر دیا، جب یہ شخص واپس آیا تو اس نے اچھے تعلقات کی وجہ سے ان کو تصرف سے نہیں روکا، اب تقریباً دس ۱۰ سال سے وہ زمین پر قابض ہیں اور زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں، مالک کے پاس زمین کی ملکیت پر باقاعدہ گواہ موجود ہیں، تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ مدتِ مدید تک غیر کی مملوکہ زمین محض تصرف کی وجہ سے کسی کی ملک میں نہیں آسکتی بلکہ ملکیت کے لیے باقاعدہ اسباب مقرر ہیں، ان اسباب میں سے کسی بھی سبب کے عدم موجودگی میں کسی چیز پر ملکیت کا تصور ہی ناممکن ہے اس لیے اگر مالک شہادتِ شرعیہ سے اپنی ملکیت ثابت کرے تو اس کو اپنی زمین واپس کی جائے گی، صورتِ مسئولہ میں چچازاد بھائیوں نے اس پر جبراً قبضہ کر رکھا ہے یہ سب غاصب ہیں اور غاصب پر مغصوبہ چیز کی واپسی لازم ہے۔ اگر انہوں نے زمین میں تصرفات کی وجہ سے اس کو کوئی نقصان پہنچایا ہو تو اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہوگی۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ومن غصب ارضاً فغرس فیها او بنی قیل له اقلع البناء والغرس وردها (وفیه ایضاً) فان کانت الارض تنقص بقلع ذلک فللمالک ان یضمن له قیمة البناء وقیمة الغرس مقلوعاً ویکونان له۔ (الهدایة ج۳ ص۳۷۹ کتاب الغصب)[2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: استعارة الارض لغرس الاشجار والبناء علیها صحیحة لکن للمعیر ان یرجع عن الاعارة متی شاء فاذا رجع لزم المستعیر قلع الاشجار ورفع البناء۔ (مجلة الاحکام، المادة ۸۳۱ ص۲۶۰)

وَمِثلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۹۲ کتاب العاریة۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: ومن غصب ارضاً فبنی علیها او غرس فیها لا ینقطع ملک المالک ویقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردها فارغة لان الارض بحالها لم تتغیر ولم تصر شیئاً اخر۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۴۹ کتاب الغصب فصل حکم الغصب) ـــــ وَمِثلُهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۹۰۵ ص۱۵۰ الکتاب الثامن الفصل الثانی)

مدعی کا زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں

سوال:۔ ایک آدمی کافی مدت سے کسی کی زمین پر قابض ہے اور مالک کو باقاعدہ اجارہ دیتا ہے، دریں حالات کسی نے اس زمین کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا، مزارع نے جب دعویٰ کیا تو مدعیٰ علیہ نے چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ زمین تمہاری نہیں ہے اس لیے میں تمہیں فصل کا حصہ نہیں دوں گا، مالک اگر دعویٰ کرے تو دیکھا جائے گا۔ کیا ایسے حالات میں مزارع کا یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں ؟ اور مدعیٰ علیہ رفع سے انکار میں کہاں تک حق بجانب ہے ؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مزارع کا دعویٰ درست ہے اور جب تک زمین پر مزارع تصرف کر رہا ہو تو اس کو دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے اور مدعیٰ علیہ کا اس سے جان چھڑانا بے سود ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم باز: ولکن اذا غصب الودیعة او المستعار او الماجور او المرهون فللودیع والمستعیر والمستاجر والمرتهن ان یدعی بها علی الغاصب وحده ولا یلزم حضور المالک۔ ولیس للمالک ان یدعی بها وحدہ مالم یحضر هؤلاء (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۶۳۷ ص۹۴۱ الفصل الثالث)[1]

زمین کے نامعلوم حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کسی کی مملوکہ زمین کے کچھ حصہ کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمین میں میرا حصہ ہے اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کرتا ہے کہ اس زمین کا کچھ حصہ میرے والد نے مالکِ زمین کو دیا ہے لیکن نہ تو اس کو مقدار معلوم ہے اور نہ حدودِ اربعہ، جبکہ مالکِ زمین اس کی ملکیت سے انکار کرتا ہے، تو کیا اس شخص کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مدعی جس چیز پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہو وہ چیز معلوم ہو، اگر مجہول ہو تو پھر اس پر دعویٰ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اگر مدعیٰ بہ مجہول ہو تو پھر اس پر نہ تو صحیح شہادت قائم ہو سکتی ہے اور نہ

---

[1] لما فی الهندیة: اذا ادعی رجل دارا فی یدی رجل انها فی اجارتی آجرفیها فلان وادعی ذوالید انها فی اجارتی آجرنیها فلان آخر تسمع دعوی المدعی وینتصب صاحب الید خصماً۔
(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۱۳۷ الباب الخامس فیمن یصلح خصماً لغیرہ)
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۸۴ کتاب الدعوی۔

صحیح فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مدعی کو نہ تو مدعیٰ بہ کی مقدار معلوم ہے اور نہ حدود اربعہ، جبکہ زمین کے دعویٰ میں حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہے اس لیے اس آدمی کا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: معلومیة المال المدعیٰ اذ لا یقضی بمجهول ولا یقال مدعیٰ فیه وبه الا ان یتضمن الاخبار۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۴۶۱ کتاب القضاء)[1]

عاریہ پر لی ہوئی زمین سے معیر کو تنگ کرنے کیلئے مستعیر کا درخت نہ کاٹنے کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زمین کسی کو بطور عاریہ دی ہے اُس نے زمین میں درخت لگائے اور پھر بیچ دیئے لیکن زمین واپس ہونے کے باوجود صرف تنگ کرنے کی غرض سے نہ تو خود درخت کاٹتا ہے اور نہ مشتری کو کاٹنے دیتا ہے جس کی وجہ سے زمین کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس بارے میں فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ چونکہ عاریت پر زمین دینے والا اس زمین کا مالک ہے اور اپنی زمین میں ہر قسم کے تصرف کا حق رکھتا ہے، تو جس طرح کسی کو زمین عاریہ پر دینے کا اُسے اختیار ہے اسی طرح اسی زمین کو کسی سے واپس لینے کا بھی اس کو اختیار حاصل ہے، جب بھی وہ اپنی زمین کی واپسی کا مطالبہ کرے تو بے چون وچرا اُسے زمین واپس کرنا مستعیر کی ذمہ داری ہے اس لیے عاریہ پر دینے والے کو تنگ کرنے کی غرض سے اپنے لگائے ہوئے درختوں کو چھوڑ دینا جائز نہیں اسلئے اُسے درخت کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا۔

کما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: استعارة الارض لغرس الاشجار والبناء علیها صحیحة لکن للمعیر ان یرجع عن الاعارة متی شاء فاذا رجع لزم المستعیر قلع الاشجار ورفع البناء۔ (مجلة الاحکام، المادة ۸۳۱ ص۲۶۰ الفصل الثانی فی احکام العاریة وضمانها)[2]

---

[1] قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: ومنها ان یکون المدعیٰ معلوماً لتعذر الشهادة والقضاء بالمجهول (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۲ کتاب الدعویٰ فصل لشرائط المصححة للدعویٰ)

ومثلهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۶۱۹ ص۹۱۱ الباب الاوّل، الفصل الاوّل فی شروط صحة الدعویٰ۔

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: واذا استعار ارضاً لیبنی فیها اولیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیها ویکلفه قلع البناء والغرس۔ (الهدایة ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریة)

ومثلهٗ فی مجمع الضمانات، النوع الثالث ضمان العقار ص۶۶۔

والد کا عقدِ بیع کی اجازت سے انکار کے متعلق فیصلہ کا حکم | سوال:۔ ایک شخص کا سسر کراچی میں مقیم تھا اس نے اپنے داماد کو زمین کا کچھ حصہ مکان تعمیر کرنے کے لیے دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر زمین لینے سے انکار کر دیا کہ جب تک سسر بیع قطعی پر مجھے زمین نہیں دیتے میں اس پر مکان تعمیر نہیں کروں گا، کچھ عرصہ بعد اس کا بیٹا کراچی سے آیا اور بہنوئی سے کہا کہ مجھے والد نے مکمل اختیار دیا ہے اور اجازت نامہ بھی پیش کیا ہے، اس لیے اگر آپ بیع قطعی پر زمین لینا چاہیں تو میں دینے کو تیار ہوں چنانچہ بہنوئی نے دس ہزار روپے کے عوض زمین خرید لی اور بیع نامہ تحریر کیا جب سسر واپس آیا تو لوگوں نے اس کو اکسایا جس پر اس نے بیع پر زمین دینے سے انکار کر دیا، کیا از روئے شرع سسر زمین واپس لینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال اگر واقعی والد نے اپنے بیٹے کو بیع کی اجازت دی ہو تو بیع نافذ ہے اور والد کو بیع رد کرنے کا اختیار نہیں لیکن مشتری کو اس پر گواہ پیش کرنے ہوں گے کہ واقعی والد نے بیٹے کو بیع کی اجازت دی تھی، اگر مشتری اس پر گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کے مطالبہ پر بائع کے والد کو قسم دی جائے گی اگر اس نے قسم سے انکار کیا تو بیع نافذ ہو کر اس کو واپسی کا حق نہیں اور اگر وہ قسم کھائے تو پھر بیع فضولی کے حکم میں ہو کر والد کی اجازت پر موقوف ہے اگر وہ اجازت نہیں دیتا تو بیع نافذ نہیں۔

اخرج الامام البیہقیؒ: فکتب ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواھم لادعیٰ رجال اموال قوم ودماءھم ولکن البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر۔ (رواہ البیہقی ج ۱۰ ص۲۵۲ کتاب الدعویٰ)[1]

مشترکہ چشمہ پر ملکیت کے دعویٰ کے متعلق فیصلہ | سوال:۔ دو اشخاص کے مابین مشترکہ زمین تھی جس میں بعض حصہ بنجر اور بعض قابلِ کاشت تھا، دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس زمین کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے

---

[1] وذکر الامام مسلمؒ: عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص۷۴ کتاب الدعویٰ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص۲۰۳ کتاب الدعویٰ۔

زمین سیراب ہوتی تھی، اب ان میں سے ایک شخص نے اس چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، کیا ایک جاری چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ جاری پانی کے ساتھ عام لوگوں کے حقوق وابستہ ہوتے ہیں، تو اگر اس پر کسی کی ملکیت تسلیم کرلی جائے یا کسی کے زیرِ قبضہ رکھا جائے تو اس میں لوگوں کے حقوق تلف ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے شریعتِ مطہرہ نے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ہر ایک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا برابر اختیار دیا ہے اور کسی کو بھی ملکاً قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی، لہٰذا حسب بیان مذکورہ بالا صورت میں یہ شخص نہ اپنے شریک کو چشمہ سے روک سکتا ہے اور نہ اس پر ملکیت کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

اخرج الامام ابو داؤدؒ: عن رجل من مہاجرین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال غزوت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثا اسمعہ یقول المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۶ باب فی منع الماء) [1]

رنجش کی وجہ سے پانی کا قدیم راستہ روکنے کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ دو بھائیوں نے اپنی مشترکہ زمین تقسیم کر کے ہر ایک نے اپنے حصہ پر قبضہ کیا، ایک بھائی نے اپنے حصہ کی زمین میں مکان بنایا اور تقریباً تیرہ ۱۳ سال اس میں رہا، بعد میں اس نے اپنا مکان کسی پر فروخت کر دیا، مشتری بھی تقریباً ۶ سال اس میں رہا اب اول مالک کے بھائی نے باہمی رنجش کی وجہ سے اس شخص کے مکان اور ساتھ والے دوسرے مکانات کے پانی کا راستہ بند کر دیا ہے، تو کیا کسی کی ملک میں ۶۶ سال سے قائم شدہ پانی کا راستہ کوئی بند کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب مدتِ دراز سے لوگوں کے مکانات کے پانی کا راستہ قائم ہو تو ملک بدلنے سے اس میں تغیر نہیں آتی بلکہ ہر ایک کو دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنی ہوگی تاکہ آپس میں الفت و محبت کی فضا قائم رہے، اگر ملک بدلنے سے ہر کوئی اس میں تصرف کرتا رہے کبھی

---

[1] قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: الماء والکلاء والنار مباحۃ والناس فی ھذہ الاشیاء الثلاثۃ شرکاء۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۳۴ ص ۶۷۶ الباب الرابع فی شرکۃ الاباحۃ الفصل الاول)
ومثلہٗ فی الھدایۃ ج ۲ ص ۴۸۳ کتاب الشرکۃ۔

بند کرے اور کبھی کھلا رکھے تو اس سے اہلِ محلہ کو تشویش لاحق ہوگی اور بے چینی کا شکار ہو جائیں گے، اس لیے اگر واقعی پانی کا یہ راستہ پہلے ہی سے قائم ہے تو پھر اس آدمی کو راستہ بند کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ پانی کا یہ راستہ مدتِ دراز سے قائم ہے تو پھر مشتری اور دوسرے مکانات والوں کو گواہوں سے اسی راستے سے پانی گذارنے کا حق ثابت کرنا ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: اذا کان لرجلٍ ارض وللاٰخر فیھا نھر واراد رب الارض ان لا یجری النھر فی ارضہ لم یکن لہٗ ذٰلک ویترک علیٰ حالہ۔

(الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج ۵ ص۳۱۴ کتاب احیاء الموات)[1]

حصہ دار کی اجازت کے بغیر اس کی زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ زمین مشترکہ شاملاتِ دیہہ ہے جس میں سرکاری کاغذات کی رُو سے تین سو افراد شریک ہیں، ان میں سے ایک شریک نے دیگر شرکاء کی اجازت کے بغیر زمین کسی پر فروخت کردی، شرکاء کی بار بار تنبیہ کے باوجود مشتری نے اس زمین پر مکانات تعمیر کیے، اب دیگر شرکاء زمین خالی کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ ہماری ملکیت ہے جبکہ مشتری زمین خالی کرنے سے انکار کرتا ہے اُس کا کہنا ہے کہ یہ زمین چونکہ میں نے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، تو اس بارے میں اب فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اگر یہ قطعہ زمین جو کہ شاملاتِ دیہہ ہے حکومت کی طرف سے گاؤں کے لوگوں کو دی گئی ہو تو جن لوگوں کو اس میں حصہ دیا گیا ہے وہ سب اس کے مالک ہیں اس لیے یہ زمین ان سب کی مشترکہ ہوگی اور مشترکہ مال میں ہر ایک شریک دوسرے کے حصہ کے بارہ میں اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اور اجنبی شخص کسی کی مملوکہ زمین میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کا حق نہیں رکھتا اسلئے صورتِ مسئولہ میں شرکاء کی اجازت کے بغیر ان کے حصّہ کی زمین فروخت کرنا جائز نہیں، لہٰذا ان کے مطالبہ پر ان کے حصہ کی زمین خالی کرا کر ان کے حوالہ کی جائے گی۔

کما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: کل من الشرکاء فی شرکۃ الملک اجنبی فی حصّۃ

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: رجل لہ ارض وللاٰخر نھر یجری فیھا فاراد رب الارض ان یمنع النھر ان یجری فی ارضہ لم یکن لہ ذٰلک۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۲۱۵ کتاب احیاء الموات)
وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۲۸ ص۶۷۳ کتاب احیاء الموات۔

سائرہم فلیس احدہم وکیلاً عن الآخر ولا یجوز لہ من ثم ان یتصرف فی حصۃ شریکہ بدون اذنہ۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ١٠٧٥ ص ٦٠١ الباب الاول فی شرکۃ الملک۔ الفصل الثانی)[1]

متوفیٰ بھائی کے بیٹوں کی موجودگی میں اسکی ذاتی جائیداد باپ کے ترکہ میں شامل کرکے تقسیم کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص فوت ہوگیا اور اس کے ورثاء میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں رہ گئے، ان چار بھائیوں میں سے ایک نے والد کے ترکہ کے علاوہ ایک قطعہ زمین کسی اور شخص سے خریدا جو کہ کسی کی شرکت کے بغیر وہ زمین اس کی ملکیت میں آئی، والد کے ترکہ کی تقسیم سے قبل ہی وہ وفات پاگیا اور اس کے ورثاء میں ٢ دو معصوم بچے رہ گئے، مرحوم کے بیٹے جب بالغ ہوئے تو انہوں نے اپنے چچوں سے دادا کے ترکہ کی تقسیم کا مطالبہ کیا، اب تک ان کو اپنے والد کی اپنی زرخرید زمین کے بارے میں معلومات نہیں ہوسکیں اور نہ ہی کسی نے اس بارے میں انہیں بتایا لہٰذا دادا کے ترکہ کی تقسیم کے وقت وہ قطعہ زمین ایک چچا کے حصہ میں آگیا، دادا کے ترکہ کے تین حصے کرکے مرحوم کا حصہ اس کے بیٹوں کو دے دیا گیا، تقسیم کے تقریباً ١٢ سال بعد مرحوم کے بیٹوں کو معلوم ہوا کہ جو قطعۂ زمین ان کے فلاں چچا کے حصہ میں آچکی ہے وہ ان کے باپ کی زرخرید اپنی ذاتی ملکیت تھی، اور اس درمیانی عرصہ میں ان کے چچا نے وہ زمین اپنے دوسرے بھائی پر فروخت کردی، مرحوم کے بیٹوں کو جب علم ہوا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ جو زمین ہمارے والد کی زرخرید ملکیت ہے وہ ہمیں والد کے ترکہ میں دادا کے ترکہ کے علاوہ الگ ملنی چاہیئے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شریعت کی رُو سے ان کا دعویٰ درست ہے؟ جبکہ مدعیٰ علیہم اس قطعہ زمین کے مُدعی کے والد کے ترکہ سے نہ ہونے اور دادا کے ترکہ سے ہونے کے قائل ہیں، مرحوم کے بیٹوں کے پاس ہر قسم کا ثبوت موجود ہے، اگر شہادت کی ضرورت پڑی تو گواہ کس کے معتبر ہونگے؟

الجواب:۔ محض مدتِ دراز کے گذرنے سے کسی کا حق باطل نہیں ہوتا خاصکر ایسی حالت میں جبکہ اس کو اپنے حق کا علم بھی نہ ہو اور لاعلمی کی صورت میں چاہے جتنی بھی تاخیر ہوجائے پھر سماعتِ دعوے

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکل من شرکاء الملک اجنبی فی الامتناع عن تصرف مضر فی مال صاحبہ لعدم تضمنہا الوکالۃ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ٣ ص ٣٦٥ کتاب الشرکۃ)

ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج ٦ ص ٦٥ کتاب الشرکۃ۔

کے لیے مانع نہیں، چونکہ علم نہ ہونے کو فقہاء نے شرعی عذر قرار دیا ہے اور وراثت میں تو اطلاع کے باوجود بھی تاخیر ہو جانے سے دعویٰ کا حق ساقط نہیں ہوتا اس لیے صورتِ مسئولہ میں میت کے بیٹوں کا دعویٰ صحیح ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ :- ویتخصص بزمان ومکان وخصومة حتی لو امر السلطان بعدم سماع الدعوی بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ینفذ الا فی الوقف والارث ووجود عذر شرعی وبه افتی المفتی ابوالسعود۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۸۰ کتاب القضاء)[1]

جب دونوں کے پاس گواہ موجود ہوں تو میت کے بیٹے چونکہ قطعہ اراضی کے زرخرید ہونے کے مدعی ہیں اور ان کے چچا اس کے زرخرید ہونے کی نفی کرتے ہیں، اور دعویٰ میں جب اثبات اور نفی کا تقابل آجائے تو اثبات میں چونکہ زیادت کا معنیٰ پایا جاتا ہے اور زیادت کے گواہ چونکہ نقصان کے گواہ پر مقدم ہوتے ہیں اس لیے اثبات کے گواہوں کو نفی کے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی اسلیے صورتِ مذکورہ میں میت کے بیٹوں کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ ان کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله : فالاصل فیه ان البینة المظهرة للزیادة اولیٰ۔
(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۴۱ کتاب الشرکة)[2]

حکومت کی طرف سے دی گئی زمین پر فریقین کے دعویٰ ملکیت میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال :- افغان حکومت نے ۱۳۴۲ھ کو یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے حکومت انہیں زمین دے گی، ایک قوم نے کسی کی وکالت سے حکومت کو درخواست دی، حکومت نے درخواست منظور کرلی اور اس قوم کو مالکانہ حقوق کے ساتھ زمین دے دی گئی اور باقاعدہ اسناد جاری کی گئیں، ۱۳۹۸ھ تک یہ قوم

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ : لاتسمع دعوی الدّین والودیعة والعقار الملوك والمیراث بعد ان ترکت خمس عشرة سنة۔ (شرح المجلة، المادة ۱۶۶۰ ص۹۸۴ الباب الثانی فی مرور الزمان)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۲۸ باب التحالف۔

[2] قال العلامة سلیم رستم بازؒ : بینة الزیادة اولیٰ۔ (شرح المجلة، المادة ۱۷۶۲ ص۱۱۳۱ الباب الرابع)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۵۱۲ الباب التاسع فی الشهادة علی النفی والبینات الخ۔

بطور کاشت کار اس سے فائدہ حاصل کرتی رہی، جب اس قوم نے پاکستان ہجرت کی تو مذکورہ بالا زمین ایک اور قوم کو اجارہ پر دے دی، اب اس قوم نے اس زمین پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ ہماری زمین ہے اور ہم سے غصب کی گئی تھی، شرعاً اب یہ زمین کس کی ملکیت میں رہے گی؟

الجواب:۔ جو زمین کسی کی مملوکہ نہ ہو اور موات کے حکم میں ہو یا وہ زمین جو بیت المال کے زیرِ تصرف ہو اس کے بارے میں حاکم وقت کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طریقہ سے بھی چاہے مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے استعمال کر سکتا ہے، اس لیے اگر وہ کسی قوم کو اس میں سے کچھ دینا چاہے تو اس کو اختیار حاصل ہے اور جس کو بھی حاکم وقت کی طرف سے کچھ زمین مل جائے وہ اس کا مالک تصور کیا جائے گا اور یہ زمین شرعی قواعد وضوابط کے تحت اس کے مرنے کے بعد ورثاء میں بھی تقسیم ہوگی لہٰذا حاکم وقت کی طرف سے غیر مملوکہ زمین کسی کو دینے کے بعد کسی کو بھی اسے واپس لینے یا اس پر قبضہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وللامام ان یقطع کل موات وکل مالیس فیه ملك لاحد ویعمل بما یریٰ انه خیر للمسلمین واعم نفعاً۔ (ردالمحتار ج ۳ ص۲۹ فی احکام الاقطاعات من بیت المال۔ باب العشر والخراج والجزیة) ؎۱

کسی غیر کے نام مندرج زیرِ قبضہ زمین میں فریقین کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: سرکاری کاغذات میں ایک شخص کے نام زمین درج ہے اور اس زمین پر ۱۹۳۰ء سے کسی دوسرے شخص نے قبضہ کر رکھا ہے اس زمین میں ایک بہت بڑا درخت تھا جو کہ قابض کاٹ کر گھر لے گیا، زمین کی ملکیت جس شخص کے نام درج ہے اب اس نے زمین پر قبضہ کر کے قابض پر زمین کی ملکیت اور درخت کا دعویٰ کیا، تو مذکورہ صورت میں فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: اگر سرکاری کاغذات صحیح ہوں ان میں دھوکہ، جعل سازی اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو تو ان کے مطابق عمل کیا جائے گا، ان کاغذات کے موافق زمین جس کے نام درج ہو اس کی

؎۱ قال العلامة الکاسانیؒ: فالامام یملك اقطاع الموات من مصالح المسلمین لما یرجع ذلك الی عمارة البلاد والتصرف فیما یتعلق بمصالح المسلمین للامام۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی) ومثله فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۷۲ ص۶۸۸۔

ملکیت تصور کی جائے گی اور درخت بھی اسی کا ہوگا لیکن اگر اس میں جھوٹ وفریب کا احتمال ہو تو متعلقہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنے والا خارج ہے اور قابض ذوالید ہے، اس لیے اگر فریقین گواہ قائم کریں تو خارج کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا، اگر خارج کے پاس گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کے گواہوں پر فیصلہ ہوگا، اگر طرفین میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کو قسم دی جائے گی، اگر قسم سے انکار کرے تو زمین پر خارج کی ملکیت ثابت ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: فان قامت علیٰ ملك مطلق عن الوقت فبینة الخارج اولیٰ۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۳۲ کتاب الدعوٰی، فصل فی حکم تعارض الدعوتین) [1]

حکومت کی اجازت سے مواتِ اراضی آباد کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک دفعہ صوبائی حکومت نے اعلان کیا کہ جو کوئی غیر آباد زمین کو آباد کرے گا تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، چنانچہ ایک علاقہ میں غیر آباد بنجر پہاڑ کے کچھ حصہ پر بعض لوگوں نے محنت کرکے قابلِ کاشت بنایا اور بعض حصہ میں گھر بنالئے، لیکن وہاں کے بعض بااثر لوگوں نے جبراً ان لوگوں کی زمینیں چھین لیں اور مکانات بھی خالی کرالیے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ حکومتِ وقت کے باقاعدہ اعلان کے بعد اگر کوئی شخص غیر آباد زمین کو آباد کرلے تو وہ اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ بالا پہاڑ پہلے سے کسی کا مملوکہ نہ ہو اور نہ قریبی لوگ اس کو اپنے مفادات میں استعمال کرتے ہوں تو حکومتِ وقت کی اجازت کے بعد جو بھی اس کو آباد کرے چاہے کاشت کے قابل بنانے سے آباد کرے یا مکانات تعمیر کرنے سے آباد کرے تو آباد کرنے والا اس کا مالک بن جائے گا، اس لیے اس زمین پر ملکیت ثابت کیے بغیر محض طاقت کے بل بوتے پر غریب لوگوں سے زمین خالی کرانا سراسر ظلم وزیادتی ہے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: من احیا ارضاً من الاراضی الموات بالاذن السلطان

---

[1] قال العلامة علاؤالدین التمرتاشیؒ: تقدم حجة خارج فی ملك مطلق علیٰ حجة ذوی الید۔

(تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۴۸۶ باب دعوٰی الرجلین)

ومِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۷ ص۱۱۱۶ کتاب الدعوٰی۔

صادرما لگا لها۔(شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۷۲ ص۶۸۸ الباب الرابع فی شرکة الاباحة) ۱؎

موات کو آباد کرنے کی وجہ سے چشمہ کا پانی دوسری اراضی پر بند کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ایک زمین مدتوں سے ایک شخص کے زیر تصرف چلی آرہی ہے اس کے قریب ایک غیر آباد پہاڑ میں چشمہ تھا جس سے زمین سیراب ہوتی تھی، اب اس غیر آباد پہاڑ کو کسی نے آباد کر کے قرب وجوار میں واقع آباد زمین پر پانی بند کر دیا ہے، تو کیا اس شخص کا دوسروں کی اراضی پر پانی بند کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔جب ایک غیر آباد زمین جاری چشمہ سے مدت دراز تک سیراب ہوتی رہی ہے تو اس غیر آباد زمین پر قبضہ کر کے اس کو آباد کرنے سے قرب وجوار میں واقع اراضی پر اس چشمہ کا پانی بند کرنا جائز نہیں کیونکہ موات اراضی کو آباد کرنے سے اس کے قرب وجوار میں واقع اراضی پر کچھ اثر نہیں پڑتا بلکہ اس زمین کے متعلقہ حقوق بدستور قائم رہیں گے، جس طرح موات میں پہلے سے قائم شدہ راستہ موات آباد کرنے کی وجہ سے کوئی نہیں روک سکتا اسی طرح موات میں پہلے سے قائم دوسری اراضی کے پانی کا راستہ روکنا جائز نہیں۔

وفی الهندیة : رجل احیا ارضاً میتة ثم جاء انسان واحیا اراضی حولها حتی احاط الاحیاء بجوانبها الاربعة کان له ان یتطرق الی ارضه من الارض التی احیاها آخر۔

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۸۷ کتاب احیاء الاموات، الباب الاول) ۲؎

مشترکہ زمین میں دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حکم

سوال:۔ایک علاقہ میں

۱؎ قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فالملك فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفةؒ
(بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی)
وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۵ ص۳۰۷ کتاب احیاء الموات۔

۲؎ قال العلامة سلیم رستم بازؒ: اذا احیا رجل ارضا من اراضی الموات ثم جاء آخرون ایضاً فاحیوا الاراضی التی فی اطرافها الاربع یتعین طریق ذلك الشخص فی ارض المحی الاخیر یعنی ان طریقه تکون مستهلا (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۷۳ ص۶۸۹ الباب الرابع فی شرکة الاباحة الفصل الثانی)
وَمِثْلُهٗ فی تنویر الابصار ج ۵ ص۳۰۷ کتاب احیاء الموات۔

چھ سو ایکڑ زمین مشترکہ شاملات دیہہ ہے جس میں پانچسو افراد شریک ہیں، اب اس میں شریک چند اشخاص نے دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر مکانات بنائے اور باغات لگائے دوسرے شرکاء ان کو اس تصرف سے منع کرتے ہیں جبکہ یہ اشخاص اس تصرف سے باز نہیں آتے تو کیا دوسرے شرکاء ان اشخاص کو اس تصرف سے منع کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ یہ زمین کسی کی مملوکہ نہیں اور موات کے حکم میں ہے تو حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والا اس کا حقدار ہوگا، اس میں دوسرے شرکاء سے اجازت کی ضرورت نہیں بلکہ ان کی اجازت کے بغیر بھی اس میں تصرف جائز ہے، البتہ اگر یہ زمین حکومت نے ان پانچسو افراد کو دی ہو جیسا کہ عام طور پر مقامی لوگوں میں شاملات زمین قرب وجوار میں موجود اراضی کے تناسب سے دی جاتی ہے، تو یہ زمین سب میں مشترکہ ہوگی اور مشترکہ املاک میں تصرف کرنے سے اگر دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو پھر اس میں بعض شرکاء کا تصرف جائز ہے لیکن اگر ان کے تصرف سے دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچتا ہو تو پھر ان شرکاء کا اس زمین میں تصرف جائز نہیں اور دوسرے شرکاء ان کو تصرف سے منع کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وکل من شرکاء الملك اجنبی فی الامتناع عن تصرف مضر فی مال صاحبه لعدم تضمنها الوکالة۔ (الدر المختار ج ۳ ص۳۶۵ کتاب الشرکة)

عرصہ دراز تک آمدورفت کی وجہ سے راستہ پر حقِ مرور کا دعویٰ کرنے کا حکم

سوال:۔ دو اشخاص کا ایک راستہ پر تنازعہ ہے ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ چونکہ ساٹھ سال سے اس راستہ پر میری آمدورفت جاری ہے اس لیے اب کوئی بھی مجھے اس راستے پر گذرنے سے منع کرنے کا حق نہیں رکھتا، جبکہ دوسرا شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ راستہ میری ملکیت ہے اور محض تعلقات کی وجہ سے میں نے اس شخص کو اس راستہ پر سے گذرنے کی اجازت دی تھی لہٰذا مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اس شخص کو راستے پر گذرنے سے روک دوں، تو کیا زمین کا مالک اس شخص

ؔ قال العلامة سلیم رستم بازؒ: انتفاع الحاضر بالملك المشترك بوجه لا یضر الغائب یعد رضی من الغائب۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۰۷۶ ص۶۰۴ الباب الاول فی شرکة الملك)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۶ ص۶۵ کتاب الشرکة۔

راستے پر گزرنے سے روک سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: محض آمد و رفت کی وجہ سے حقِ مرور کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں بلکہ مدعی پر لازم ہے کہ مدعیٰ علیہ کی مملوکہ زمین میں اپنے لیے راستہ ثابت کرنے پر گواہ پیش کرے، اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر مدعیٰ علیہ کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

كما في الهندية: لو ادعىٰ على آخر حق المرور ورقبة الطريق في داره فالقول صاحب الدار ولو اقام المدعي البينة انه في هذه الدار لم يستحق بهذا شيئًا كذا في الخلاصة ۔ (الفتاوىٰ الهندية ج ۳ ص۱۰۴ الباب التاسع فيما يجوز بيعه) [1]

ایک ہی شخص سے خریدی ہوئی زمین پر ملکیت کے دعویٰ میں تاریخ کی تقدیم و تاخیر کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین اپنے بھتیجے پر فروخت کی پھر دوبارہ خفیہ طور پر یہی زمین اپنے بھائی پر فروخت کی، بائع کا بھتیجا اور بھائی دونوں اپنی اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ پر ثبوت بھی پیش کرتے ہیں جبکہ بائع لاپتہ ہے تو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کس طرح کیا جائے گا ؟

الجواب: ایک ہی وقت میں دو اشخاص پر زمین فروخت کرنا جائز نہیں یہ سراسر دھوکہ ہے اور اس دھوکہ اور فریب کی وجہ سے دونوں آپس میں دست و گریبان ہیں، صورتِ مذکورہ میں جب بائع نے زمین دو افراد پر فروخت کی تو اگر دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں اور دونوں نے ایک ہی تاریخ پیش کی ہو اور ہر ایک اپنے دعویٰ کے اثبات پر گواہ پیش کرتا ہو تو زمین فی الحال جس کے قبضہ میں ہے اس کے گواہوں کو دوسرے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی البتہ اگر

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: ولو ادعىٰ على آخر حق المرور ورقبة الطريق في داره القول قول صاحب الدار ولو اقام المدعي البينة انه كان يمر في هذه الدار لم يستحق بهذا شيئًا ولو شهدوا ان له طريقا فيها وبينوا حدوده .... يقضىٰ له بذلك ۔

(خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۹۵ كتاب الدعوىٰ ۔ الفصل الثاني)

ومثله في شرح المجلة للعلامة سليم رستم بازؒ المادة ۱۱۵۵ فصل في دعوى الحائط والطريق ۔

دونوں نے مختلف تاریخیں بیان کی ہوں تو پھر جس کی تاریخ مقدم ہو اس کے گواہ بھی دوسرے کے مقابلے میں مقدم ہوں گے۔

قال العلامة محمد علاؤالدین آفندیؒ: ولو ادعیٰ الخارج وذوالید بسبب من الاسباب نحو شراء وارث وشبهه فلا یخلوا اما ان یدعیا تلقی الملک من جهة واحدا ومن جهة اثنین فلو ادعیاه من جهة واحد وبرهنا حکم به لذی الید لو لم یؤرخا او ارخا سواءً فلو ارخا وتاریخ احدهما اسبق فهو اولی۔ (تکملة رد المحتار ج ۲ ص۱۵۱ باب دعوی الرجلین)[1]

مقتول کے وارث کی طرف سے قاتل کو معاف کرنے کے بعد قتل کے دعوے کا جائزہ

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی شخص پر اپنے بیٹے کے قتل کا دعویٰ کیا جبکہ مُدعاعلیہ قتل سے منکر ہے، گواہوں کی شہادت سے قبل مُدعیٰ علیہ نے دعویٰ کو ان الفاظ سے رفع کیا کہ مقتول کے باپ سے میرے بھائی نے قتل کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میرے بیٹے کو مدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر اس نے قتل کیا بھی ہو تو میں نے اس کو معاف کر دیا ہے، تو کیا یہ معافی دفع دعویٰ کیلئے کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قصاص جاری کرنا چونکہ سنگین نوعیت کا حامل معاملہ ہے کیونکہ یہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے اس باب میں شریعت نے مقتول کے ورثاء کے عفو و درگذر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اگر مقتول کے ورثاء میں سے کوئی بھی قاتل کو معاف کر دے تو اس سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ حسب بیان اگر شرعی طریقے سے ثابت ہو جائے کہ مقتول کے والد نے اعتراف کیا ہے کہ میرے بیٹے کو مدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہو تو میں نے معاف کیا ہے، تو اس کا یہ اعتراف اور معافی دعویٰ کے دفاع کے لیے کافی ہے اور اس سے قتل کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔

---

[1] وفی الهندیة: ان کانت فی ید احدهما فهی لذی الید سواء ارخ اولم یؤرخ الا اذا ارخا وتاریخ الخارج اسبق فیقضی بها للخارج کذا فی الکافی۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۷۰ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملک فی الاعیان)

ومِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام (۱۱۲۷) کتاب الدعوی۔

کمافی الهندیة: ومن عفامن ورثة المقتول عن القصاص رجلً اوامرأةً او أم اوجدة ومن سواهن من النساء اوکان المقتول امرأة فعفا زوجها عن القصاص فلا سبیل الی القصاص۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۲ الباب السادس فی الصلح والعفو والشهادة فیه)[۱]

بیٹے کو ہبہ کی ہوئی زمین پر ورثاء کے دعویٰ ملکیت کا جائزہ

سوال:- ایک شخص نے کچھ زمین خریدی، خریدنے کے بعد زمین کا کچھ حصہ اپنے بیٹے کے نام منتقل کر دیا اور اس کو باقاعدہ قبضہ بھی دے دیا اس کی وفات کے بعد جو زمین اس کے نام درج تھی وہ ورثاء میں تقسیم کر دی گئی اور جو زمین بیٹے کے نام درج تھی وہ اس کے قبضہ میں اپنے حال پر باقی رہی، اب ورثاء نے اس کی زمین میں بھی وراثت کا دعویٰ کیا ہے کہ وراثت کے تحت ہمارا بھی اس میں حصہ ہے جبکہ بیٹا اپنی زمین میں ان کو حصہ دینے سے انکار کرتا ہے۔ اندریں صورت کیا بیٹے کے حصہ کی زمین میں ورثاء کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:- درحقیقت حالتِ حیات میں باپ اپنی جائیداد میں سے جو حصہ اپنے کسی بیٹے کو دیتا ہے تو یہ اس کی طرف سے بیٹے کے لیے ہبہ ہوتا ہے اور ہبہ کی تمامیت کے لیے قبض شرط ہے اگر موہوب لہ ہبہ کی ہوئی چیز پر قبضہ نہ کرے تو بغیر قبضہ کے ہبہ تام نہیں ہوتا اس لیے حسبِ بیان اگر واقعی والد نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے نام زمین منتقل کر دی ہو اور اس کی زندگی میں بیٹے نے اس پر قبضہ کر لیا ہو تو یہ زمین محض اس کی ملکیت ہوگی اس میں دوسرے ورثاء کا حق نہیں اس لیے اس زمین پر دوسرے ورثاء کا ملکیت کا دعویٰ کرنا صحیح ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ومنها ان یکون الموهوب مقبوضاً حتی لا یثبت الملك للموهوب له قبل القبض وان یکون مقسوماً اذا کان مما یحتمل القسمة۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۲ ص۹۳ کتاب الهبة)[۲]

---

[۱] قال العلامة الکاسانیؒ: فاما اذا کان اثنین او اکثر فعفا احدهما سقط القصاص عن القاتل لانه سقط نصیب العافی بالعفو فیسقط نصیب الآخر ضرورة انه لا یتجزأ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۷ کتاب الدعوی)
ومثله فی الهدایة ج۴ ص۵۵۶ کتاب الدعوی۔

[۲] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: یملك الموهوب له الموهوب بالقبض۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۸۶۱ ص۴۷۳ الباب الثالث)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۳۲ فصل حکم الهبة، کتاب الهبة۔

ہلاک شدہ مال کے بارے میں قرض اور مضاربت کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: ایک شخص جو کہ اسلحہ کا کاروبار کرتا تھا اور وہ اپنے ایک ساتھی سے چار ہزار روپے، دوسرے سے دو ہزار روپے اور تیسرے سے ایک ہزار روپے لے کر چلا، اس نے کل سات ہزار روپے ایک دلال کو دیئے، دلال نے کہا کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر میں آپ کو کارتوس دوں گا، یہ شخص جب طے شدہ مقام پر پہنچا تو اس کی موجودگی میں پولیس نے دلال کو گرفتار کر لیا اور کارتوس وغیرہ ضبط کر لیے، یہ شخص خالی ہاتھ وہاں سے واپس آ گیا، بعد میں اس کو پتہ چلا کہ یہ سب دلال کا اپنا چکر تھا اور واقعہ بناوٹی تھا، اس لیے اس نے دلال سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا لیکن دلال نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا، وہاں سے ناکام واپس لوٹا، جب ساتھیوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے اس سے اپنی اپنی رقم کا مطالبہ کیا، اس وقت اس شخص نے کہا کہ تم پرواہ نہ کرو تمہاری رقم میں واپس کروں گا، بعد میں اس نے اپنے ساتھیوں سے یہ کہا کہ چونکہ آپ لوگوں نے رقم مجھے مضاربت پر دی تھی اس لیے اس ہلاکت کے بعد میں رقم کا ضامن نہیں جبکہ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم نے یہ رقم قرضِ حسنہ کے طور پر دی تھی۔ فریقین میں سے کسی کے پاس گواہ موجود نہیں، تو اب فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساتھیوں نے یہ رقم اسے بطور قرضِ حسنہ دی تھی کیونکہ مدعیٰ علیہ نے جب یہ کہا کہ تم پرواہ نہ کرو میں تمہاری رقم واپس کروں گا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرضِ حسنہ کا قائل تھا، اب یہ تینوں ساتھی مدعی ہیں اور وہ شخص مدعیٰ علیہ چونکہ ساتھیوں کے پاس گواہ موجود نہیں اس لیے البینة للمدعی والیمین علی من انکر کے تحت اس شخص کو قسم دی جائے گی اور اگر وہ قسم کھائے کہ یہ رقم مضاربت پر لی تھی تو مضاربت ثابت ہونے کے بعد وہ ضمان سے بری الذمہ ہوگا کیونکہ مضاربت میں مال مضارب کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے اور امانت میں اگر مال ہلاک ہو جائے تو موجبِ ضمان نہیں اس لیے یہاں بھی ضمان لازم نہیں آئے گی۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: فان زاد الهالك على الربح فلا ضمان على المضارب لانه يمين۔

(الهداية ج ۳ ص۲۶۴ كتاب المضاربة، فصل فى العزل والقسمة) [1]

---

[1] قال العلامة سليم رستم بازؒ: اذا تجاوز مقدار الربح سرى الى راس المال فلا يضمنه المضارب سواء كانت المضاربة صحيحة او فاسدة۔ (شرح المجلة۔ المادة ۱۴۲۷ ص۷۵۷ الباب الرابع۔ الفصل الثالث)

وَمِثْلُهٗ فى خلاصة الفتاوى ج ۴ ص۱۸۸ كتاب المضاربة۔

غیر اختیاری کاموں میں کسی کی ذمہ داری قبول کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ایک شخص سعودی عرب میں ایک کمپنی میں ملازم تھا اور اس کی نگرانی میں تقریباً ۳۵ آدمی کام کرتے تھے، یہ سارے آدمی چونکہ غیر قانونی طور پر وہاں مقیم تھے اس لیے حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا، اب ان آدمیوں میں سے ایک نے اپنے نگران پر دعویٰ کر دیا کہ اس نے ہماری ذمہ داری لی تھی کہ تم یہاں سے نہ جاؤ اور جو بھی نقصان ہوگا میں اس کا ذمہ دار ہوں، جبکہ نگران انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم بھاگ جاؤ لیکن یہ خود نہیں بھاگ سکے اس لیے میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب مذکورہ بیانات کے تحت فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ دراصل جس شخص نے ان لوگوں کی ذمہ داری قبول کی تھی وہ ان کی طرف سے کفیل بن گیا تھا اور کفالت کے لیے فقہاء کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ صرف ان امور میں کفالت معتبر ہے جو کفیل کے دائرہ اختیار میں ہو اور جو کام اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہو اس کے بارے میں کفیل بن سکتا نہیں، تو غیر قانونی طور پر مقیم لوگوں کو حق سکونت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے یہ کفیل کے دائرہ اختیار میں نہیں اس لیے اس بارہ میں اس آدمی کا اپنی طرف سے وکیل بننا صحیح نہیں، تو جب کفالت ہی صحیح نہیں تو نقصان کی ذمہ داری بھی اس پر عائد نہیں ہوتی۔

لما قال العلامة المرغیناني: وکل حق لا یمکن استیفاءہ من الکفیل لا یصح الکفالة بہ کالحدود والقصاص۔ (الھدایة ج ۳ ص ۱۲۰ کتاب الکفالة) [1]

کسی کے عقد پر دوبارہ عقد بیع کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ۱۹۶۶ء سے ایک شخص نے دوکان کرایہ پر لے رکھی ہے اور حسب دستور دوکاندار مالک دوکان کو کرایہ ادا کرتا رہا، مالک دوکان کے فوت ہونے کے بعد اس کا بیٹا مسلسل کرایہ وصول کرتا رہا، ۱۹۷۷ء میں موجودہ مالک دوکان نے اپنی دوکان فروخت

---

[1] قال العلامة الکاساني: ان یکون المکفول بہ مقدور الاستیفاء من الکفیل لیکون العقد مفیداً فلا تجوز الکفالة بالحدود والقصاص لتعذر الاستیفاء من الکفیل فلا تفید الکفالة فائدتھا۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۹ کتاب الکفالة۔ فصل شرائط الکفالة)

ومثلہ فی مجلة الاحکام، المادة ۶۳۲ ص ۳۴۴ الفصل الثانی فی شرائط الکفالة۔

کرنے کا اظہار کیا تو کرایہ دار نے اس سے پچاس ہزار کے عوض بات کی، رجسٹری کرانے میں تین دن باقی تھے کہ اس دوران ایک شخص نے دلال کی وساطت سے مالکِ دوکان کے پاس جاکر مذکورہ رقم ادا کرتے ہوئے دوکان اپنے نام رجسٹری کرالی اور اس کے ساتھ دوسری دوکان بھی خرید کر اپنے بھائی کے نام رجسٹری کرالی، اب وہ دوکان فی الحال کرایہ دار کے قبضہ میں ہی ہے اور دوسرا شخص دوکان خالی کرانے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے، اندریں حالات اب یہ دوکان کس کا حق بنتی ہے؟ اس بارے میں شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں فیصلہ صادر فرمائیں؟

الجواب:۔ اگر کرایہ دار اور مالکِ دوکان کے مابین بیع قطعی ہوئی ہو تو کرایہ دار اس مذکورہ عقد سے مالک بن گیا اگرچہ ابھی تک رجسٹری نہ کرائی ہو کیونکہ عقدِ بیع کی تمامیت کے لیے رجسٹری کرانا شرعاً ضروری نہیں۔ جب بیع قطعی سے کرایہ دار مالک بن گیا تو جو دوکان اسکی دوکان کے ساتھ متصل ہے اگر اس دوکان کا کوئی شریک موجود نہ ہو اور نہ اس کے حقوق میں شریک موجود ہو تو پڑوسی ہونے کے ناطے وہ اس دوکان پر شفعہ کا حق رکھتا ہے تو حق شفعہ کی رو سے وہ اس دوکان کو واپس کراسکتا ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني ؒ: الشفعة واجبة للخليط في نفس المبيع ثم للخليط في حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار۔ (الهداية ج ۴ ص ۳۷۷ كتاب الشفعة) ؎

باپ کی وفات کے بعد بیٹوں کا اس کے عقدِ بیع سے انکار

سوال:۔ ایک شخص نے تیس سال قبل اپنی زمین شاملاتِ دیہہ سمیت کسی پر فروخت کی، بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض پر لے لی مگر قرض کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے مشتری نے قرض کی رقم کے بدلے زمین بائع پر دوبارہ فروخت کردی اور واپس کرنے کا وعدہ کیا لیکن واپسی سے قبل ہی وہ وفات پاگیا، اب بائع اس کے بیٹوں سے زمین کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن بیٹے زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ ہمارے باپؒ نے زمین دوبارہ بائع پر فروخت نہیں کی، اب عقدِ بیع پر مدعی کے پاس گواہ موجود نہیں

؎ قال العلامة سليم رستم باز ؒ: الثالث ان يكون جاراً ملاصقاً للعقار المبيع ۔

(شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۰۰۸ ص ۵۶۳ كتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ في خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۱۵۴ كتاب الشفعة ۔

تو فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اگر شاملات موات کے حکم میں ہو اور شرعی اصول کے موافق اس شخص نے اس زمین پر قبضہ کرکے اُسے آباد کیا ہو تو اس زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہونے کی وجہ سے بیع نافذ ہے، جب بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض لے لی اور اس کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تو بائع کو اس عقد کے تحت زمین واپس لینے کا حق حاصل ہے، اب بائع چونکہ عقدِ بیع کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے مشتری کے مرنے کے بعد بائع کو اس عقد پر گواہ پیش کرنے ہوں گے اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مشتری کے بیٹوں کو ان کے علم پر قسم دی جائے گی کہ ان کو معلوم نہیں کہ ان کے والد نے رقم کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تھی، اگر وہ اس پر قسم کھالیں تو فیصلہ بیٹوں کے حق میں ہوگا اور اگر انکار کریں تو زمین بائع کو واپس کی جائے گی۔

كما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: والتحليف على فعل غيره يكون على العلم اي انه لا يعلم انه كذلك لعدم علمه بما فعل غيره۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۴۷۳ کتاب الدعوی) [1]

عقدِ مضاربت کے متعلق ایک فیصلے کی تصحیح

سوال:۔ دو آدمیوں نے مضاربت پر کاروبار شروع کیا، رب المال نے ۲ لاکھ روپے مضارب کو دے دیئے اور مضارب نے اس رقم سے کپڑے کی دوکان کھول لی اور اس پر اپنے ایک دوست کو بٹھا دیا اکثر اوقات وہی دوکان چلاتا رہا، رب المال نے اس پر ناراضگی ظاہر کی لیکن اس کے باوجود مضارب نے اپنے دوست کو دوکان سے نہیں ہٹایا، نتیجتاً اس کاروبار میں تیرہ ۱۳ ہزار روپے کا نقصان ہوا، رب المال نے دعویٰ کیا کہ مضارب نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر تیرہ ۱۳ ہزار روپے کی چوری کی ہے، جب رب المال نے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مضارب نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس دوکان پر

---

[1] قال العلامة قاضي سماوة رحمه الله: ولو وقع الدعوى على فعل الغير من كل وجه يحلف على العلم حتى لو ادعى على وارث ان اباك اتلفه او سرقه او غصبه مني يحلف على العلم وهذا مذهبنا۔
(جامع الفصولين ج۱ ص۱۹۴ الفصل الخامس عشر في التحليف)
ومثله في فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج۲ ص۴۴۴ فصل ما يتعلق بالنكاح من المهر والولد وغير ذلك۔

میرے ۴۵ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں، ان دونوں نے ثالث مقرر کیا، اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ دوکان رب المال کے پاس رہے گی اور مضارب ۴۵ ہزار روپے خرچہ ادا کرے گا، ثالث کے اس فیصلے کے مطابق رب المال کو ۵۸ ہزار روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ ازروئے شریعت یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دراصل مضارب کاروبار میں رب المال کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے رب المال جن شرائط کے تحت مضارب کو تصرف کا اختیار دے اُن شرائط کی پابندی مضارب پر لازم ہے اگر ان شرائط کی خلاف ورزی کرے اور کوئی نقصان ہو جائے تو اس کی ضمان مضارب پر لازم آئے گی، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں جب رب المال نے مضارب کے دوست کو دوکان پر بٹھانے سے روکا تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے دوست کو بدستور دوکان پر بٹھائے رکھے لہٰذا اگر رب المال شہادت سے یہ ثابت کرے کہ مضارب نے واقعی خیانت کی ہے تو تجارت کے سامان کو فروخت کر کے رب المال کی رقم پوری کی جائے گی اور جو رقم اس سے بچ جائے اس کو دونوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا، مضارب نے اپنے خرچہ کے لیے جو رقم لی ہے وہ مضارب کی کمائی سے جُدا کی جائے گی۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: فاذا خالف شرط رب المال صار بمنزلة الغاصب ویصیر المال مضمونا علیہ۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۸۷ کتاب المضاربة۔ فصل فی حکم المضاربة)[۱]

ٹیوب ویل کی نوکری پر فریقین کے تنازعہ کا فیصلہ

سوال:۔ ایک شخص جو کہ اسّی۸۰ سال سے زمین میں تصرف کر رہا ہے اس نے اپنی زمین کا کچھ حصہ حکومت کو ٹیوب ویل لگانے کے لیے اس شرط پر دیا کہ ٹیوب ویل کی نوکری میری ہو گی، ٹیوب ویل لگنے کے بعد اس نے نوکری کے لیے کسی اور شخص کو خرچہ وغیرہ دے دیا، اس شخص نے مالک زمین کو دھوکہ میں رکھا اور ٹیوب ویل کی نوکری اپنے نام منظور کرالی، مالک زمین نے

---

[۱] قال العلامة سلیم رستم باز: ۔ واذا تجاوز المضارب حد ما اذونیتہ وخالف الشرط کان غاصباً وفی هذه الحال یعود الربح والخسار فی تجارتہ لہ وعلیہ واذا تلف مال المضاربة کان ضامناً۔

(شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۴۲۹ ص۷۵۴ کتاب المضاربة)

ومثلہٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۵۴۲ کتاب المضاربة۔

اس پر دعویٰ کیا کہ یہ نوکری میرا حق ہے کیونکہ میں نے اس شرط پر حکومت کو زمین دی ہے۔ دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ نوکری میرا حق بنتا ہے کیونکہ یہ زمین مشترکہ ہے اور شاملات ہے جس میں میرا بھی حصہ ہے اگرچہ متعین نہیں کہ ٹیوب ویل کی جگہ میری ہے یا کسی اور کی، مالک زمین نے یہ جواب دیا کہ یہ زمین مجھے اسی۸۰ سال قبل پوری قوم نے دی تھی تو مذکورہ بالا صورت میں ٹیوب ویل کی نوکری کا حقدار کون ہے؟

سوال:۔ اگر یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین شاملات دیہہ ہے اور پوری قوم نے اس شخص کو دی ہے تو یہ شخص اس پر قبضہ کرنے اور تصرف کرنے سے مالک بن گیا ہے، تو جب اسی۸۰ سال اس نے اس زمین میں تصرف کیا اور کسی نے اس پر ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا تو اس کی زمین میں کسی اور کو تصرف کا حق نہیں۔ لہٰذا جب اس نے اپنی زمین ٹیوب ویل لگانے کے لیے دے دی تو یہ زمین وقف ہو گئی اور وقف زمین میں واقف جو شرط لگائے اس کی رعایت کی جائے گی۔ تو جس طرح موقوفہ زمین کا منافع واقف اپنے لیے خاص کر سکتا ہے، اسی طرح اگر مالک زمین موقوفہ زمین میں ٹیوب ویل کی نوکری اپنے لیے خاص کرے تو یہ اس کا حق ہے اس لیے اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور شخص اس نوکری کا حقدار نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ :وذکر الفقیه ابوجعفر انه لو شرط لنفسه ان یأکل من الغلة یجوز عند محمد وکذالک لو شرط الغلة لابیه فهو کاشتراطها لنفسه۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۴۲۲ الفصل الرابع فیما یتعلق بالشرط الوقف)[1]

بیٹے کا باپ کے ترکہ میں سے اپنے لیے زمین کا کچھ حصہ ہبہ کرنے کے دعویٰ کا جائزہ

فریق اول ـــــــ فریق ثانی

حق تحکیم: مندرجہ بالا فریقین بذاتِ خود تو حاضر نہیں ہوئے لیکن انہوں نے اپنے نمائندے یعنی وکیل بھیج دیئے اور قرآن وسنت کے تحت فیصلے کے لیے تیار ہوئے لہٰذا

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: وجاز جعل غلة الوقف اوالولایة لنفسه عند الثانی وعلیه الفتوٰی۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۴۲۴ کتاب الوقف)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۳۹۸ الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط الوقف۔

ان کے نمائندوں کے واسطے سے فریقین کے بیانات سن لیے گئے۔

<u>تنقیحات</u>: مندرجہ بالا فریقین کے نمائندوں کے واسطے سے بیانات سن لیے گئے، ان بیانات سے چند امور سامنے آئے۔

(۱) دونوں فریق آپس میں حقیقی بھائی ہیں اور ان کے بیان سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ دونوں فریق اپنی بہنوں کو جائیداد سے محروم رکھتے ہیں، جائیداد کی تقسیم کو صرف فریقین تک محدود رکھا جاتا ہے، فریقین کے والد کے تصرفات مابعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے اپنی بہنوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔

(۲) فریق اول اس بات کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے اپنی حین حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی، دیگر حصص کے علاوہ خسرہ نمبر آٹھ سو سات (۸۰۷) جو کہ ارتل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کی مقدار اسی (۸۰) کنال آٹھ (۸) مرلے ہے یہ مجھے دی گئی ہے جو کہ ۱۹۶۶ء و ۱۹۶۷ء کی بندوبست میں بحال رکھی گئی ہے، فریق مذکورہ کے بیان کی رو سے فریق ثانی نے یہ جائیداد اپنے نام منتقل کرائی ہے جس کے خلاف فریق اول نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران ایک شخص نے ان میں مصالحت کرا دی۔

(۳) فریق اول مصالحت میں ایک ہزار روپے کی رقم دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو فریق ثانی نے برضا و رغبت وصول کی ہے اور بطور بینہ سند تحریری سٹامپ پیش کرتا ہے۔

(۴) فریق ثانی کا بیان ہے کہ اس کے باپ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی تھی تاہم اچھی، [illegible] ایک بیٹے کو اچھی زمین کم اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی، فریق اول نے سازباز کر کے خسرہ نمبر آٹھ سو سات (۸۰۷) جعلی طور پر اپنے نام انتقال کرا لیا ہے جو کہ ہمارے رجوع کرنے پر عدالت نے بحال کر دیا ہے۔

(۵) فریق ثانی کا دفاعی بیان یہ ہے کہ اس نے فریق اول کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ فریق ثانی نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کی تھی اور جس جائیداد سے فریق ثانی نے مصالحت کرائی یہ اس کی جائیداد نہیں تھی بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد تھی یہی وجہ ہے کہ فریق ثانی نے ایک ہزار روپیہ فریق اول کو واپس کر کے مصالحت کو کالعدم قرار دیا ہے۔

حقیقت حال:۔ ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین بہنوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں، یہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے، اگر باپ نے دیدہ دانستہ طور پر بیٹوں کے نام جائیداد منتقل کرکے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ناجائز اور حرام حرکت ہے اگرچہ قضاءً ایسے اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عنداللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے واحد ذریعہ یہ ہے کہ ورثاء مورث کی ذمہ داری کی فراغت کیلئے ہر صاحب حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے اس کا گرفتار ہونا یقینی امر ہے تاہم قضاءً والد کے تصرفات نافذ رہیں گے۔

شرعی فیصلہ: جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیئے کہ سرکاری کاغذات میں محض انتقال کا ہونا نہ تو کسی کی ملکیت کی شرعی دلیل ہے اور نہ اس پر ملکیت موقوف ہے اسلئے فریقین کے والد کے مالکانہ تصرفات کے نفاذ کیلئے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں، جو بھی باقاعدہ گواہوں سے ثابت ہوجائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔

قال العلامة سلیم رستم باز ولایعمل بالخط والختم وحدهما الا اذا کان سالماً من شبهة التزویر والتضییع فیعمل به یعنی انه یکون مداراً للحکم ولایحتاج الی الثبوت بوجه اٰخر۔ (مجلة الاحکام، المادة ۱۷۳۶ ص ۱۰۹۰)

لیکن بعد ازاں جہاں تک فریقین کے تنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس میں مصالحت کی صورت ہے تو مصالحت کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہوں کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے اگر فریق ثانی کی رضا و رغبت سے مصالحت ایک دفعہ ثابت ہوجائے تو باقاعدہ ماننے کے بعد نہ خود فریق ثانی اور نہ اس کے ورثاء اس سے انکار کرسکتے ہیں لیکن ایسی مصالحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ فریق ثانی جس جائیداد پر مصالحت کر رہا ہو وہ اس کی ملکیت میں ہو ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں باقاعدہ تقسیم کرکے قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہو کر فریق ثانی کی ملکیت باقی نہیں رہتی اس لیے کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی متنازعہ جائیداد پر مصالحت نہیں کرسکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان یکون مملوکاً للمصالح حتی انه اذا صالح علی مال ثم استحق من ید المدعی لم یصح الصلح لانه تبین انه لیس مملوکاً للمصالح فتبین ان الصلح لم یصح۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۴۸ کتاب الصلح، فصل فی ماشرائط التی المصالح علیه)

تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا فریق ثانی کی ملکیت کے ثبوت کے لیے باقاعدہ

گواہوں کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریقِ ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی۔ اگر فریقِ اول کی ملکیت پر گواہ پیش ہو جائیں تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوگی ورنہ پھر فریقِ اول کے مطالبہ پر فریقِ ثانی کو ملکیت سے انکار کرنے پر قسم دی جائے گی اگر فریقِ ثانی قسم کھالے تو مصالحت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم دعاوی پر ہوگا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسّر نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔[1]

عقدِ بیع میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ **بیانات فریقین**

فریقِ اوّل: میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے فلاں محدودہ ۱۳ جریب زمین فریقِ ثانی سے مبلغ ساٹھ ہزار روپے کے عوض خریدی، بیع کے وقت دو ہزار روپے میں نے ادا کیے باقی رقم دو قسطوں میں ادا کرنی تھی، ایک قسط مبلغ تیس ہزار روپے میں نے ادا کر دیئے اور باقی رقم بھی ادا کرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھ سے رقم لے کر میری خریدی ہوئی زمین مجھے دی جائے۔

فریقِ ثانی:۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ مذکورہ قطعہ اراضی جو کہ میرے اور میرے بھائی کے درمیان مشترک ہے اپنے بھائی کی اجازت سے فریقِ اول پر فروخت کی ہے لیکن فروخت کرتے وقت میں نے یہ شرط لگائی تھی کہ اگر فلاں قطعہ اراضی جو کہ ایک دوسرے شخص کی ملکیت میں ہے مجھ پر فروخت کرے تو میں بھی یہ زمین فروخت کروں گا، اب چونکہ اُس شخص نے مجھ پر اپنی زمین فروخت نہیں کی لہٰذا میں بھی فروخت نہیں کرتا۔

الجواب:۔ دعویٰ متعلقہ ۱۳ جریب قطعہ اراضی ــــ مُدعی مشتری (فریقِ اول) مُدعیٰ علیہ بائع (فریقِ ثانی)
فریقین کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق اگر مُدعیٰ علیہ کا بھائی کے حصہ میں وکیل بالبیع ہونا مدعی کو مسلّم

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: فالحاصل ان المدار علی انتفاء الشبهة ظاهراً وعليه فما يوجد في دفاتر التجار في زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما عليه في دفترہ الذی يقرب من اليقين انه لا يكتب فيه على سبيل التجربة والهزل يعمل به۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۲ ص۲۱ کتاب الدعوی)
وَمِثْلُهٗ فی تقریرات الرافعی ج۲ ص۹۲ کتاب الدعوی۔

[2] لما قال العلامة سليم رستم بازؒ: يشترط ان يكون المصالح عليه مال المصالح وملكه فلو اعطى المصالح مال غيره ليكون بدلاً للصلح فلا يصح صلحه (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۵۴۵ ص۸۳۴ الباب الثانی)
وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج۳ ص۲۴۷ کتاب الصلح۔

ہوتو تمام قطعہ اراضی کی بیع درست ہے اور اگر یہ ولایت ثابت نہ ہو تو پھر بائع کا اپنے حصے میں بیع درست ہو کر بھائی کے حصے کی بیع بیع فضولی کے حکم میں ہو کر اُس کی اجازت پر موقوف ہے، اگر مذکورہ شرط موجود ہو تو تمام زمین کی بیع درست ہو کر بائع بیع توڑنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ بیع میں مذکورہ شرط نہ تو مقتضیاتِ عقد اور نہ مدعاتِ عقد میں سے ہے کہ جس کا ایفاء ضروری ہے اور نہ اس میں بائع مشتری، مبیعہ کو فائدہ ہے کہ جس کی وجہ سے عقد فاسد ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: المراد بالنفع ما شرط من احد العاقدین علی الآخر فلو علی اجنبی لایفسد ویبطل الشرط لما فی الفتح عن الوجیه بعتك الدار بالف علی یقرضنی فلان الاجنبی عشرة دراهم فقبل المشتری لایفسد البیع لانه لایلزم الاجنبی ولا خیار للبائع۔

(رد المحتار ج۵ ص۸۵ باب البیع الفاسد، مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر الخ) [1]

فریقِ اوّل۔ فریقِ ثانی۔ فریقِ ثالث	شفعہ کے دعوٰی میں راستہ کا شریک پڑوسی پر مقدم ہے

تنازعہ: ایک عورت کی طرف سے فریقِ اوّل پر فروخت شدہ مکان محدود بحدودِ اربعہ غرباً جائیداد والدہ فریقِ اوّل، شرقاً راہ خاص فریقِ اوّل وثالث وغیرہ، شمالاً مکان فریقِ ثالث وجنوباً جائیداد والد فریقِ اوّل واقع ہے۔

حقِ تحکیم: مندرجہ بالا فریقین اپنے علاقہ کے معززین کی نگرانی میں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوئے، مذکورہ جملہ فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلے کے لیے سرِ تسلیم خم کر کے تیار ہوئے اور تحریری طور پر حلفیہ بیان دے کر قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلہ ماننے کے لیے تیار ہوئے۔

تنقیحات: جملہ فریقین سے فرداً فرداً بحضور فریقِ آخر بیان لیا گیا اور تحریر میں لاکر ہر ایک سے دستخط لیے گئے، فریقین کے بیانات کی روشنی میں جو تنقیحات سامنے آئیں

---

[1] قال العلامه ابن نجیمؒ: وفی المحتوی قال محمدؒ کل شئ یشترطه المشتری علی البائع یفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو باطل رای فالشرط باطل کما اذا اشتری دابة علی ان یهبه فلان الاجنبی کذا فهو باطل کما اذا شرط علی البائع ان یهبه وکل شئ یشترطه علی البائع لایفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو جائز وهو بالخیار۔ (البحر الرائق ج۶ ص۸۶ باب بیع الفاسد)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة للعلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ تحت المادة ۱۸۹ ص۸۹۔

وہ مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) فریق اوّل جس نے یہ مکان خریدا ہے وہ خریدے ہوئے مکان کے راستہ میں شریک ہے جبکہ فریق ہذا اور ثالثان کے بیان کے مطابق راہ عام سے جو خاص راستہ جدا ہو کر آگے آتا ہے تو فریق ثالث وغیرہ کے مکان سے گذر کر متنازعہ فروخت شدہ مکان اور فریق اوّل کے گھر کی طرف جاتا ہے جس میں فریق ثالث بھی آمد و رفت رکھتا ہے لیکن ثالثان کے بیان کے مطابق یہ صرف تین اشخاص کا مخصوص راستہ ہے، بایں معنیٰ یہ کسی عام شخص کو اس راستہ پر آمد و رفت کا حق حاصل نہیں گویا یہ ایک خاص راستہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان ھٰذا میں کسی قسم کی شرکت کا دعویٰ نہیں رکھتا اور نہ اس مکان کا پڑوسی ہے بلکہ محض اس وجہ سے شفعہ کا دعویٰ کرتا ہے کہ مکان ھٰذا میرے بھائی کی ملکیت تھا جس کا میں وارث ہوں، یہ مکان میرے بھائی کو باپ دادا سے وراثت میں ملا تھا جو کہ فروخت ہوتے وقت صرف اور صرف میرا حق ہے اس لیے میری اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو مکان لینے کا حق حاصل نہیں۔

(۳) فریق ثالث کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان مذکورہ میں شفعہ کا دعویٰ ہمسایہ ہونے کی وجہ سے کرتا ہے جس کے لیے طلبِ مواثبت اور طلبِ اشہاد کے جملہ مراحل کی تکمیل کا دعویدار ہے اگرچہ فریق اوّل موصوف کے مکان اور متنازعہ مکان کے درمیان مسجد کیلئے باقاعدہ وقف راستہ بیان کر کے ہمسایہ ہونے سے انکار کرتا ہے لیکن فریق ثالث اس پر قائم ہے کہ میں نے اس راستہ پر گذرنے کی ان لوگوں کو عارضی اجازت دی تھی لیکن جب انہوں نے مجھ سے باقاعدہ وقف کا مطالبہ کیا اور میں نے انکار کیا تو اس کے بعد اس راستہ کو فریق اوّل یا کسی دوسرے نے استعمال نہیں کیا چنانچہ موصوف اس راستہ کے نہ ہونے پر مُصر ہے اور یوں اپنا مؤقف مضبوط کر رہا ہے کہ فروخت شدہ مکان سے میرے گھر کی دیوار متصل ہے جس سے مجھے ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے زیادہ حق حاصل ہے۔

<u>حقیقتِ حال</u>:۔ مذکورہ تنقیحات کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فروخت شدہ مکان جس کے جنوب میں فریق ثالث کا مکان واقع ہے، اس کے بیان کے مطابق وہ جار ملاحق یعنی جُڑا اور ملا ہوا پڑوسی ہے جبکہ فریق اوّل متنازعہ مکان کے راستہ میں شریک ہے بایں معنیٰ کہ یہ راستہ عام نہیں بلکہ خاص راستہ ہے جس میں صرف اس گلی میں رہنے والے شرکاء کو آمد و رفت کا حق حاصل ہے

کوئی عام شخص اس راستہ کو اُن کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے کا مجاز نہیں۔

فقہی نظائر:۔ حدیث کی رُو سے جہاں کسی کو شفعہ کا حق دیا گیا ہے تو اس میں راستے کی شرکت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ راستہ میں شریک کو دوسرے پڑوسی پر سبقت حاصل ہوگی اسلئے کہ وہ مبیعہ کے حقوق میں شریک ہے لہٰذا جب تک شریک فی حقوق المبیعہ دعویدار ہو تو پڑوسی کو شفعہ کا حق نہیں دیا جاتا۔

کما فی الحدیث: عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجار احق بشفعتہ ینتظر لھا وان کان غائباً اذا کان طریقھما واحداً۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۵۷ باب الشفعۃ)

خاص کر وہ راستہ جو خاص افراد کے لیے مخصوص ہو جس راستہ پر گلی میں رہنے والوں کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے عام اشخاص کو آمدورفت کا حق حاصل نہ ہو تو وہ خاص راستہ کہلاتا ہے۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: الطریق الخاص ھو الزقاق الذی لاینفذ ای کما انہ لوفتح اصحاب الطریق الخاص منفذاً ووصلوہ بالطریق العام کان لھم ان یمنع غیرھم من المرور فیہ۔ (شرح المجلۃ مادۃ ۱۰۷ و ص۵۳۷ کتاب الشفعۃ)

اس حالت میں جو لوگ گلی کے شروع میں رہتے ہوں ان کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے جبکہ گلی کے آخر میں رہائش رکھنے والے کو پوری گلی میں آمدورفت کا حق حاصل ہوتا ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: فان کانت سکۃ غیر نافذۃ ینشعب فیھا سکۃ غیر نافذۃ وھی مستطیلۃ فبیعت داراً فی السفلی فلاھلھا الشفعۃ خاصۃ دون اھل العلیا۔

(الھدایۃ ج۴ ص۳۸۹ کتاب الشفعۃ)

پڑوسی بلاشک وشبہ شفعہ کا حق دار ہے لیکن یہ تب ہے کہ اس میں حق رکھنے والا شریک فی حقوق المبیعہ نہ ہو جیسا کہ شریک فی نفس المبیعہ کو شریک فی حقوق المبیع پر سبقت حاصل ہے۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ:۔ حق الشفعۃ اولاً للمشارک فی نفس المبیع ثانیاً للخلیط فی حق المبیع ثالثاً للجار الملاصق وما دام الاول طالباً لیس للآخرین حق الشفعۃ وما دام الثانی طالباً فلیس للثالث حق الشفعۃ۔ (مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۰۵۹ ص۵۶۲ کتاب الشفعۃ)

شرعی فیصلہ:۔ ان تنقیحات، حقیقت حال اور فقہی نظائر کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فریق اوّل جس نے یہ مکان باقاعدہ بیع قطعی سے خریدا ہے یہ سکۃ غیر نافذہ یعنی خاص راستہ میں اس گھر کی شرکت کا حق رکھتا ہے اور فریق ثالث نے اگرچہ اپنا پڑوس ثابت کرنے میں

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن پڑوسی ثابت ہونے کے باوجود خاص راستہ میں شرکاء کا حق اس سے زیادہ ہے جبکہ فریقِ ثانی کا محض بھائی ہونے کے ناطہ سے شفعہ کا دعوٰی بے بنیاد ہے اس کا کوئی حق نہیں، اس لیے فریقِ اوّل کے معاملہ خرید کو درست تسلیم کر کے مکان اس کے قبضہ میں رکھا جائے یہی فریقِ اوّل اس کا زیادہ حقدار ہے[1]

فریقین میں سے ہر ایک کا زمین پر ملکیت اور قبضہ کے دعوٰی کا جائزہ | دعوٰی بابت اراضی

بیان فریقِ اوّل: میرے والد نے یہ زمین فریقِ ثانی کے والد سے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے اور فی الحال میں نے فریقِ ثانی کو اجارہ پر دی ہے جبکہ اس کا قبضہ میرے پاس ہے۔

بیان فریقِ ثانی: میرے والد نے یہ زمین فریقِ اوّل کے والد پر فروخت نہیں کی پہلے ہی سے اس پر میری ملکیت چلی آرہی ہے اور زمین میرے قبضہ میں ہے، یہاں تک کہ ہائیکورٹ نے بھی میری ملکیت تسلیم کی ہے۔

تنقیحات: دونوں فریق مذکورہ زمین پر ملکیت اور قبضہ کا دعوٰی کرتے ہیں، فریقِ اوّل تو اس وجہ سے ملکیت کا دعوٰی کرتا ہے کہ اس کے والد نے یہ زمین فریقِ ثانی کے والد سے خریدی ہے اور فی الحال محض اجارہ پر دی ہے۔ فریقِ ثانی اس وجہ سے زمین پر ملکیت کا دعوٰی کرتا ہے کہ یہ زمین اس کو اپنے والد سے وراثت میں ملی ہے اور وہ فریقِ اول پر فروخت کرنے سے انکار کرتا ہے، مزید برآں اپنے دعوٰی کے اثبات کے لیے ہائی کورٹ کا فیصلہ بھی پیش کرتا ہے۔

طریقِ فیصلہ: اگر واقعی ہائی کورٹ نے فریقِ ثانی کی ملکیت تسلیم کی ہو تو اس فیصلے پر

---

[1] (۱) قال العلامة المرغینانیؒ: فالطریق الخاص ان لا یکون نافذًا۔ (الهدایة ج۴ ص۳۸۸ کتاب الشفعة)

(۲) قال العلامة ابن نجیمؒ: ولذا لو بیعت دار فی القصوی لم یکن لاهل الاولی شفعة بخلاف اهل القصوی۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۱ باب التحکیم)

(۳) قال العلامة المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار۔ (الهدایة ج۴ ص۳۸۷ کتاب الشفعة علی الصفحة الاولی من المجلد الرابع)

عملدرآمد کیا جائے گا اس لیے اگر قبضہ فریق ثانی کے پاس نہ ہو تو حق قبضہ بھی اس کو دیا جائے گا اور اگر ہائی کورٹ نے فریق ثانی کی ملکیت تسلیم نہ کی ہو تو اگر فریق اوّل کے پاس گواہ موجود ہوں تو اس کے مطابق فیصلہ فریق اوّل کے حق میں کیا جائے گا اور اگر فریق اوّل گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو فریق ثانی چونکہ والد کے شراء سے انکار کرتا ہے اس لیے فریق ثانی کو اس کے علم پر قسم دی جائے گی کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے والد نے یہ زمین فروخت کی ہے یا نہیں، اگر اس نے قسم اٹھائی تو زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور قبضہ بھی اس کو دیا جائے گا اور اگر اس نے قسم اٹھانے سے انکار کیا تو فیصلہ فریق اوّل کے حق میں کیا جائے گا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: والتحلیف علی فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لا یعلم کذلک لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۷۴ کتاب الدعوٰی) [1]

فریقین میں سے ہر ایک کا دوسرے کی مقبوضہ جائیداد میں ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ

دعوٰی بابت الاراضی

بیان مُدعی: میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مذکورہ اراضی محدود بحدود اربعہ جو کہ شرقاً زرد مٹی تک، غرباً سبز درخت تک، جنوباً زیتون کے درخت تک اور شمالاً ندی سے نیچے تک ہے یہ میری ملکیت ہے جس نے اس پر قبضہ کیا ہے یہ ظالمانہ قبضہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ چار اشخاص نے میری زمین کی تحدید کے وقت اس پر قسم کھائی ہے اور خود مجھ سے بھی اس پر قسم لی گئی ہے۔

بیان مُدعیٰ علیہ: میں کہتا ہوں کہ مدعی دعویٰ کا کوئی حق نہیں رکھتا بلکہ اس نے میری زمین کو ظالمانہ طور پر قبضہ میں رکھا ہوا ہے جو شتر کہ پہاڑی تک میرا حق ہے اور میری طرف سے اس پر چار اشخاص نے قسم بھی کھائی ہے اور مجھ سے بھی اس پر قسم لی گئی ہے۔

فریقِ اوّل: مُدعی ——— فریقِ ثانی: مُدعیٰ علیہ

---

[1] قال العلامة قاضی سماوۃؒ: لو وقع الدعوٰی علی فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتی لو ادعی علی وارث ان اباک اتلفہ او سرقہ او غصبہ منی یحلف علی العلم ہذا مذہبنا۔

(جامع الفصولین ج۱ ص۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف وما یتعلق بہ)

ومثلہ فی فتاوی قاضی خان ج۲ ص۴۱۴ کتاب الحدود۔

حق تحکیم :- مندرجہ بالا فریقین نے علاقہ کے معززین کی سرپرستی میں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوکر اپنے فیصلے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دینے کی درخواست کی اور اپنے تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلے کے لیے تیار ہوکر سرتسلیم خم کر کے علماء کی کمیٹی کو موقع دکھلانے کی خاطر اپنے علاقہ میں لے گئے، علماء کی کمیٹی نے موقع پر جاکر متنازعہ اراضی کا معائنہ کیا، چونکہ فریقین نے پہلے ہی سے ایک ثالث کو اپنے بیانات قلم بند کرائے تھے اس لیے اپنے سابقہ بیانات پر اکتفاء کرتے ہوئے مزید نئے بیانات دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کمیٹی نے فریقین سے بیانات کے متعلق کچھ اہم سوالات پوچھے تاکہ فریقین کی طرف سے بیانات سمجھنے میں مدد ومعاون ہوسکے۔

تنقیحات :- دونوں فریقوں کے بیانات سے چند امور معلوم ہوئے :-

(۱) فریق اوّل نے اپنے بیان کی رُو سے جس محدودہ زمین کا دعویٰ کیا ہے اس میں کچھ زمین ایسی ہے جس پر فریق مخالف کا قبضہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان کی رُو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف یہ نہیں کہ مُدعی کے دعوٰی کا رَد کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایسی زمین کا دعویٰ بھی کیا ہے جس پر فریق اوّل یعنی مُدعی قابض ہے، گویا اندریں صورت دونوں فریق ایک دوسرے کے دعوٰوں کے رَد کے علاوہ کچھ زائد ایسی زمین کا دعویٰ کر رہے ہیں جس پر دوسرا فریق قابض ہے، اگرچہ موقع دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ فریقین کے دعاوی میں وسعت سے کام لیا گیا ہے۔

حقیقت حال :- دونوں فریق ایک دوسرے کے قبضہ کو غاصبانہ اور ظالمانہ جیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ فریقین کے درمیان نسبتی قرابت بھی قائم ہے، چونکہ فریقین قریبی نسل میں ایک جد پر ملتے ہیں، قرب وجوار کے حالات، موقع دیکھنے اور دوسرے قرائن پر نظر ڈالتے ہوئے یہ حالات سامنے آتے ہیں کہ فریقین کے درمیان یہ تنازعہ کسی خانگی دشمنی کا نتیجہ ہے ورنہ دونوں فریق کچھ عرصہ قبل تک ایک دوسرے کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہ رہے تھے یہاں تک کہ دونوں فریقوں کے مُردے بھی ایک ہی قبرستان میں دفن ہوتے تھے، غم اور خوشی میں ایک دوسرے سے باہمی مشارکت قائم تھی، فریقین کے دعوٰوں کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے ارث کا دعویٰ کر رہا ہے، گویا ہر ایک فریق اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میرے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہے اور دُوسرے

فریق کا اس میں کوئی حق نہیں۔

فقہی نقطہ نگاہ سے اختلاف کا جائزہ:۔ از روئے شرع ایسی حالت میں جہاں دو فریق کسی جائیداد پر قابض ہو کر ایسی جائیداد پر وراثت کی وجہ سے ملکیت کا دعوٰی کرے کہ وہ مخالف فریق کی ملکیت میں ہو تو اس دعوٰی کو دعوٰی رجلین سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسی حالت میں طرفین سے گواہ طلب کیے جاتے ہیں لیکن مذکورہ تنازعہ میں بظاہر گواہوں کی گواہی مشکل ہے کیونکہ احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کی تمام قوم قولاً یا فعلاً دونوں فریقوں کی طرفداری میں بھٹک گئی ہے، یہاں تک کہ قرب وجوار میں رہنے والے اور حالات سے واقف لوگ حقیقت حال کے اظہار سے چشم پوشی پر مجبور رہیں، اور جو قوم ثالث کی حیثیت سے کردار ادا کر رہی ہے اس کو صحیح حالات کا علم نہیں، علاوہ ازیں اس علاقہ میں کوئی غیر قوم جو کہ دعوٰی میں شریک نہ ہو کسی دوسری قوم کے لیے گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی کیونکہ اس سے آپس میں دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے، خاص کر جب گواہی میں قسم کھا کر بیان دینا ہو تو اس کے لیے عام لوگوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا جبکہ قسم کھا کر بیان دینے کا دوسرا نام گواہی ہے، اس لیے جب گواہ میسر نہ ہو تو پھر دوسرے کے دعوٰی کو دفع کرنے کے لیے مدعی کے مطالبہ پر مدعٰی علیہ کو قسم دی جاتی ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ، وان عجز عن ذٰلك وطلب یمین خصمه استحلف علیها لما روینا ولا بد من طلبه لان الیمین حقهٗ انهٗ کیف اُضیف الیه بحرف اللام فلا بد من طلبه۔ (الهدایة ج۳ ص۲۰۱ کتاب الدعوٰی)

اور خاص کر ایسی صورت میں جب دونوں قابض بھی ہوں اور ایک دوسرے کی مقبوضہ جائیداد کا دعوٰی کر رہے ہوں تو ایسی حالت میں ہر ایک قسم کھانے کے بعد دوسرے کو اپنے اپنے حصہ پر بحال رکھا جاتا ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: ادعیا ملکاً ارثاً من ابیهما والعین فی ایدهما وفیه ایضاً ان لم یوہ خا یقضٰی بینهما او ارخا تاریخاً واحداً یقضٰی بینهما۔

(شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۷۶۱ ص۱۱۲۵ الفصل الثانی)

آخری فیصلہ: ان حالات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ دونوں فریقوں کی قوموں سے پانچ پانچ افراد منتخب کیے جائیں اور طرفین سے منتخب شدہ افراد دوسرے فریق

کے حق نہ ہونے پر قسم اٹھائیں اور جو جائیداد دونوں قوموں کے قبضہ سے باہر ہو تو قسم اٹھانے کے بعد وہ فریقین کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کی جائے گی اور جو نقصانات ہوئے ہوں اس کا جبیرہ کیا جائے گا۔[1]

قدیم راستہ میں تنازعہ کے متعلق فیصلہ

سوال: (بیانِ فریقِ اوّل) ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی کے مشرقی جانب اخیر میں ہمارے کھیتوں اور مکانات کا ایک قدیم راستہ تھا جس پر لوگوں کی آمد ورفت ہوتی تھی، اس کے مغربی جانب ایک بڑی ندی بھی تھی اور اس راستے کے کنارے درختوں کا ایک جھاڑ بھی تھا جو کہ اب بھی موجود ہے۔ یہ راستہ ندی کے ساتھ ساتھ پڑوسی کی زمین سے گذر کر جنوب کی طرف ایک بڑے کنوئیں سے گذرتا تھا، کچھ عرصہ سے لوگوں کی اس راستہ پر آمد ورفت کم ہونے کی وجہ سے پڑوسی نے رفتہ رفتہ اس راستہ کو ختم کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ راستہ بالکل بند ہوگیا، اس پر ہم نے راستے پر آمد ورفت اور اس کی وسعت کا مطالبہ کیا لیکن پڑوسی نے ایسا کرنے سے انکار کردیا، اس لیے ہمیں اپنے قدیم راستے پر گذرنے اور اس کو وسیع کرنے کا حق دیا جائے۔

(بیانِ فریقِ ثانی) میری زمین میں کوئی قدیم راستہ نہیں البتہ کچھ عرصہ قبل میری زمین میں ایک راستہ تھا اور اس پر لوگوں کی آمد ورفت جاری تھی لیکن میں نے بطورِ احسان ان کو یہاں سے گذرنے کی اجازت دی تھی، کیونکہ زمین خریدتے وقت مجھے نہ تو یہاں قدیم راستے کی نشاندہی کی گئی اور نہ اس میں کسی قدیم راستے کے نشانات موجود تھے، لہٰذا میری زمین میں قدیم راستے کا دعویٰ بے جا ہے، اس لیے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زمین میں لوگوں کو

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز: فاذا ظهر المدعی العجز عن اثبات دعواه حلف المدعیٰ علیه بطلبه۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۷۴۲/۱۰۹۳ الفصل الثالث فی التحلیف)

وفی الهندیة: دارٌ فی یدی رجل ادعاها رجلان کل واحد منهما یدعی انها داره ورثها عن ابیه فلانٌ واقام علیٰ ذلك بینةً فان لم یؤرخا او ارخا وتاریخهما علی السواء یقضیٰ بها بینهما۔ (الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۷۷ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملك فی الاعیان)۔

گذرنے سے روک لوں۔

الجواب:۔ مندرجہ بالا فریقین کے بیانات موقعہ اور معززین قوم کی شہادت کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فریق اول جس راستے کا دعویٰ کرتا ہے وہ راستہ چند مہینوں اور سالوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ قدیم مدت سے قائم ہے، بلکہ بعض معمر افراد کے بیانات کے مطابق پچاس ساٹھ سال یہ لوگ اس راستے کو استعمال کرتے رہے بلکہ فریق اول جس راستہ کی نشاندہی کر رہا ہے اس پر درختوں کی باڑ بھی قائم ہے خاص کر ندی سے گذر کر قدیم راستے کی نشاندہی جس مقام سے ہو رہی ہے وہاں درخت کھڑے ہیں اور اس سے آگے گذر کر جس کنوئیں کے قرب دجوار سے راستہ گذرنے کا کہا جا رہا ہے وہاں پر بھی موجودہ وقت میں کسی قدیم راستے کی نشاندہی نہیں ہوتی، اس کے مقابلے میں مطلوبہ راستہ پر آمدورفت کا اقرار خود فریق ثانی کچھ مدت سے کر رہا ہے، اگرچہ یہ لوگ (فریق ثانی) یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمین کے خریدنے کے وقت ہمیں کسی قسم کے راستہ کی نشاندہی نہیں کی گئی، لیکن از روئے شرع جو راستہ پہلے سے قائم ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر رکھا جائے گا اور اس راستے سے منع کرنے کا حق فریق ثانی کو حاصل نہیں جبکہ ابھی تک یہ راستہ آمدورفت کے لیے استعمال ہو رہا ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر چھوڑ کر آئندہ کیلئے بھی آمدورفت کیلئے استعمال کیا جائے گا۔[1]

قال العلامة سليم رستم باز: اذا كان لرجل نهر في ارض رجل او ميزاب في دار رجل فاختلفا في ذلك وانكر صاحب الارض والدار ثبوت حقه فالقول قوله وعلى المدعي البينة ان له حق السبيل الاجراء الماء فيه الا اذا كان الماء جاريا زمان الخصومة فحينئذ القول قول صاحب الماء۔ (شرح المجلة، المادة ۱۷۷۲ ص۱۱۱۵ كتاب الدعوى۔ الفصل الثالث)[1]

تاہم موجودہ راستہ سے مغربی جانب فریق ثانی کی زمین کی طرف تصرف نہیں کیا جائے گا اگر راستہ میں وسعت کی ضرورت پڑے تو مشرقی جانب ندی کو استعمال میں لایا جائے گا۔

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغيناني: اذا كان نهر لرجل يجري في ارض غيره فالاد صاحب الارض ان لا يجري النهر في ارضه تركه على حاله لانه مستعمل له باجراء مائه فعند الاختلاف يكون القول قوله۔ (الهداية ج۴ ص۴۸۶ كتاب احياء الموات۔ فصل في الدعوى والاختلاف)

ومثله في الهندية ج۵ ص۴۰۲ الباب الرابع في الدعوى في الشرب۔

گواہوں پر جرح کے متعلق قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال: (بیانِ مدعی) میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فلاں شخص نے میرے گھاس کے ڈھیر میں عمداً زہریلی دوائی ڈالی جس سے میری ایک بھینس، ایک گائے اور ایک بچھڑا ہلاک ہوگئے، اور اس شخص نے لوگوں کے سامنے اقرار بھی کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے

(بیانِ مدعیٰ علیہ) میں نے مدعی کے گھاس میں نہ زہریلی دوائی ڈالی ہے اور نہ لوگوں کے سامنے اقرار کیا ہے۔

فیصلہ قاضی: مدعی نے اپنے دعویٰ پر دو گواہ پیش کئے اور انہوں نے گواہی دی کہ ہمارے سامنے مدعیٰ علیہ نے اقرار کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے اور مدعی کے مویشی میں نے ہلاک کئے ہیں۔ اس کے بعد مدعیٰ علیہ نے چار گواہ پیش کیے لیکن قاضی صاحب نے یہ کہا کہ جرح کے گواہ شریعت میں منع ہیں، اس لیے فیصلہ مدعی کے گواہوں پر ہوگا۔ تو کیا قاضی صاحب کا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قضاء کا معاملہ چونکہ حساس نوعیت کا حامل ہے اس لیے قاضی کو پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ہر مسئلے کو حل کرنا چاہیئے، چنانچہ ہر فیصلہ کی حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے شریعت نے زرین اصول مرتب کیے ہیں تاکہ اس بارے میں ہر کسی کی تسلی ہو جائے اور کوئی بھی فریق عدمِ اطمینان کا شکار نہ ہونے پائے۔ چونکہ فریقین کے درمیان کسی تنازعہ کے فیصلہ میں مدعی کے گواہوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے اس کے گواہوں کا شریعتِ مطہرہ کی بیان کردہ صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں اگر قاضی کے ہاں مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت ہو چکی ہو اور وہ پُر اعتماد ہوں تو ان گواہوں پر مدعیٰ علیہ کو جرح وغیرہ کا حق نہیں ہے بلکہ قاضی ان گواہوں کی گواہی کے موافق فیصلہ کرے گا، اور اگر پہلے سے مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت نہ ہوئی ہو تو پھر مدعیٰ علیہ کو گواہوں پر جرح کا حق حاصل ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: لا تقبل الشهادة على جرح مجرد من اثبات حق لله تعالى او للعبد بعد التعديل ولو قبله قبلت اي الشهادة

بل الاخبار ولو من واحد على الجرح المجرد۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۲۸ کتاب الشہادات، باب القبول وعدمہ) [1]

نوے سال سے قابض زمین پر ملکیت کے دعوٰی کے متعلق فیصلہ | سوال | دعوٰی بابت اراضی

بیان فریق اوّل:- میں یہ دعوٰی کرتا ہوں کہ فریق ثانی نے ساٹھ ستر سال سے ہماری پدری جائیداد کے ایک قطعہ اراضی پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور اس قطعہ اراضی کا کچھ حصہ کسی اور شخص پر فروخت کر دیا ہے، لہٰذا فروخت شدہ قطعہ اراضی اور فریق ثانی کے زیر تصرف زمین میری ہے۔

بیان فریق ثانی: یہ قطعہ اراضی ہمارے دادا نے فریق اوّل کے دادا سے خریدا تھا جو کہ نوے سال سے ہمارے قبضہ میں ہے اور اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں، چالیس سال قبل اس سے کچھ حصہ ہم نے ایک شخص پر فروخت کیا اور بیع پر خبردار ہونے کے باوجود مدعی نے کوئی دعوٰی نہیں کیا۔

ان بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:- شرعی اصول کے تحت اوّلاً یہ معلوم کیا جانا چاہیئے کہ فریق اوّل نے دعوٰی کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی ہے؟ اگر اس نے دیدہ دانستہ بلا عذر دعوٰی میں اتنی تاخیر کی ہو تو اس کا دعوٰی ناقابلِ سماعت ہے، اور اگر اس نے لاعلمی، خوف یا کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے تاخیر کی ہو تو پھر اس کا دعوٰی صحیح ہے۔ چونکہ فریق ثانی بیع قطعی کا دعوٰی کرتا ہے اسلیئے اس پر لازم ہے کہ اپنے دعوٰی کے اثبات کے لیے سو سالہ دو معتمد گواہ پیش کرے، اگر فریق ثانی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر فریق اوّل کو اس علم پر قسم دی جائے گی کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دادا نے فریق ثانی کے دادا پر زمین فروخت کی تھی؟ اگر

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: لا تقبل الشهادة على الجرح المجرد اذا اقام البینة على العدالة اما اذا لم یقم للبینة علیها فاخبر مخبر ان الشهود فساق او اكلوا الربوا فان الحكم لا یجوز قبل ثبوت العدالة لاسیما اذا اخبر مخبر ان الشهود فساق۔ (البحر الرائق ج۷ ص۱۰۲ كتاب الشهادة)

ومثله فی شرح المجلة للعلامة سلیم رستم باز، المادة ۱۷۲۴ ص۱۰۷۱ الفصل السادس۔

فریق اول قسم اٹھائے تو اس کی قسم پر فیصلہ اس کے حق میں کیا جائے گا اور اگر وہ قسم سے انکار کرے تو پھر فیصلہ فریق ثانی کے حق میں کیا جائے گا۔

قال العلامۃ محمود بن اسماعیل الشھیر بقاضی سماوۃ: ولو وقع الدعوی علی فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتی لو ادعی علی وارث ان اباک اتلفہ اوسرقہ او غصبہ منی یحلف علی العلم ھذا امذھبنا۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص۱۴۱ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقہ) ؎

آباؤ اجداد کی شرکت کی وجہ سے ورثاء کا شریک کی جائیداد میں کچھ حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ

فریقِ اول ـــــ فریقِ ثانی

حقِ تحکیم: فریقین بالا نے برضاء و رغبت اپنے تنازعہ متعلقہ قطعہ اراضی تقریباً ایک سو پچاس جریب مع سرکاری کاغذات شرعی فیصلہ کرانے کیلئے دار العلوم حقانیہ کے دار الافتاء میں پیش ہوئے، ایک معزز شخص کے توسط سے فریقین کو فیصلہ کا پابند رکھنے کے لیے ہر ایک فریق سے تین تین سو روپے بطور ضمانت لئے گئے جو اس معزز شخص کے پاس بطور امانت رکھے گئے اور فیصلہ پر عملدرآمد یقینی ہونے پر طے شدہ تاریخ کے مطابق واپس کر دیئے جائیں گے۔

تنقیحات: فریقین کے بیانات سننے کے بعد مندرجہ ذیل امور سامنے آئے:۔

(۱) فریقِ ثانی زیر تنازعہ قطعہ اراضی کا قابض ہو کر فریق اول اس میں ۴/۱ حصہ کی ملکیت کا دعویدار ہے اور بیان کرتا ہے کہ مدعیٰ علیہ کے آباؤ اجداد سے ہمارے آباؤ اجداد کا مشترکہ کاروبار تھا اور متنازعہ جائیداد مشترکہ کھاتہ سے خریدی گئی ہے جس میں ہمارے باپ مدعیٰ علیہم کے باپ وغیرہ سے ۴/۱ حصہ کا حقدار ہے۔

(۲) فریق اول اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ایک تحریر پیش کر رہا ہے جو مدعیٰ علیہم کے باپ کے نام منسوب ہے جس کے مطابق وہ تسلیم کرتا ہے کہ مدعی کا باپ ہمارے ساتھ اس خریدی ہوئی جائیداد میں برابر کا حصہ دار ہے، اگرچہ سرکاری کاغذات میں نام کا اندراج رہ گیا ہے لیکن وقت مقررہ پر اس کا

؎ قال العلامۃ تمرتاشیؒ: والتحلیف علی فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لا یعلم کذلک لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج ۴ ص۴۲۳ کتاب الدعوی)

ومثلہٗ فی فتاوی قاضی خان ج ۲ ص۴۱۴ کتاب الحدود۔

نام درج کیا جائے گا تاہم تحریر پر موقعہ کی تاریخ ڈالی گئی ہے البتہ بعد میں ۱۹۷۵ء کا سال لکھا ہوا نظر آرہا ہے جبکہ توثیق ۱۹۸۶ء میں کی گئی ہے ۔

(۳) فریق اوّل علاوہ ازیں حاصلات کی وصولی کا بحیثیت مالک ہونے اور اس کی حصہ داری کا دعویٰ کرتا ہے کہ ہم نے مدتِ دراز تک اس کے حاصلات لیے ہیں جبکہ فریق ثانی محض تبرع واحسان اور خریداری کے وقت ایک معاہدہ کے تحت کچھ وقت تک اس کی ادائیگی کے قائل ہیں لیکن مدعیٰ علیہم کے باپ کی موت سے یہ مراعات بھی ختم ہوگئیں، یعنی فریق ثانی کا بیان ہے کہ یہ مراعات ان کو اس معاہدہ کے تحت دی گئی تھیں کہ خریدنے کے بعد زمین کے قبضہ کی وصولی تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ فریق اول کے باپ کے پاس یہ جائیداد اس وقت رہن تھی ۔

فیصلہ : از روئے شرع فریق اوّل مدعی ہے اس لیے دعویٰ کے اثبات کے لیے اس سے گواہ مانگے گئے لیکن وہ اپنے دعویٰ ملکیت کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے سے قاصر رہا کیونکہ تحریری بیان پر جن گواہوں کے نام ثبت ہیں ان میں سے حسب بیان مدعی ایک گواہ مخالف فریق سے تعلقات کی وجہ سے ہمارے لیے گواہی نہیں دیتا جبکہ دوسرا گواہ اکیلے ناکافی ہے اس لیے فریق اوّل یعنی مدعی کے مطالبہ پر فریق ثانی کو قسم دی گئی، چونکہ یہ دوسرے کے فعل پر قسم ہے اس لیے فریق ثانی کو قسم بالعلم دی گئی قسم کھانے کے بعد جائیداد مذکورہ فریق ثانی کے پاس رہ کر فریق اوّل اپنے دعویٰ کے اثبات میں ناکام ہوا ۔

قال العلامة التمرتاشیؒ : والتحلیف علیٰ فعل غیرہ یکون علی العلم ای انه لایعلم انه کذٰلك لعدم علمه بما فعل غیرہ ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۴ ص۴۷۳ کتاب القضاء)

---

[1] لما قال العلامة محمود بن اسماعیل الشهیر بقاضی سماوة رحمه الله :
ولو وقع الدعویٰ علیٰ فعل الغیر من کل وجه یحلف علی العلم حتیٰ لو ادعیٰ علیٰ وارث ان اباك اتلفه او سرقه او غصبه منا یحلف علی العلم وهٰذا مذهبنا ۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقه)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص۴۱۴ باب مایکرہ من الثیاب والحلی والزینة ۔

فیصلہ شرعی درباب شفعہ

دعوٰی

مفتاح الدین ولد عبد المالک سابق سپہ سالار دیر سکنہ مینگلور تحصیل مینگورہ ضلع سوات

بنام

(۱) رحمت اللہ جان ولد نورا جان سکنہ محلہ رحمانیہ نزد رحمانیہ مسجد عیدگاہ میدان مٹھیان کالونی منگھو پیر روڈ کراچی۔

(۲) خان بہادر ولد عبد المالک سابق سپہ سالار دیر سکنہ مینگلور تحصیل مینگورہ ضلع سوات (مُدعا علیہم)

دعوٰی دخلیابی بہ تقاضۂ حقِ شفعہ اراضی زرعی مشتمل بہ پانچ قطعات معروف بہ ۱ کس ۲ شوگکرہ ۳ للمہ ۴ جماعت باڑئی ۵ ناغہ غیر آباد بحدودِ ذیل !

قطعہ ۱ کس: شرقاً، اراضی مدعی۔ غرباً، اراضی گل محمود۔ شمالاً، اراضی عبد الظاہر، جنوباً: اراضی محمد ظاہر شاہ برادر مُدعی۔

قطعہ ۲ شوگکرہ: شرقاً اراضی مفتاح الدین (مُدعی)، غرباً: اراضی محمد ظاہر شاہ، شمالاً: اراضی مدعی۔ جنوباً اراضی مُدعی۔

قطعہ ۳ للمہ: شرقاً: اراضی مدعی۔ غرباً، بارانی ندی نالہ۔ شمالاً، اراضی محمد ظاہر شاہ۔ جنوباً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔

قطعہ ۴ جماعت باڑئی: شرقاً، اراضی نیک محمد۔ غرباً: اراضی گل اعظم خان۔ شمالاً، اراضی محمد ظاہر شاہ۔ جنوباً: اراضی گل اعظم خان۔

قطعہ ۵ ناغہ (غیر آباد) شرقاً، اراضی ومکان مُدعی۔ غرباً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔ شمالاً، راہ عام۔ جنوباً، اراضی عبد الظاہر واقع شگہ مجدد رقبہ بیرانی تحصیل وضلع دیر بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی درست قیمت فاضل عدالت مقرر کرے۔

مالیت دعوٰی بغرض کورٹ فیس و اختیار سماعت مبلغ ۱٫۰۰٫۰۰۰/- روپے

بنائے دعوٰی ۱۸/۹/۹۸ کو بیع کا علم و اعلان بر شفعہ اندر حدود تحصیل دیر پیدا ہوئی۔

جناب عالی! گذارش حسب ذیل ہے :۔

(۱) یہ کہ مدعا علیہ ۱ نے ہر پانچ قطعات اراضیات متدعویہ ازاں مدعا علیہ ۲ بعوض مبلغ ایک لاکھ روپے (۱۰۰۰۰۰) خفیہ طور پر بیع کی ہوئی ہے اور جملہ لین دین کو اخفاء میں رکھ کر حسب قانونِ مروجہ مدعی کو قبل از بیع کوئی نوٹس نہ دیا ہے۔

(۲) یہ کہ مدعا علیہم نے مدعی کے حقوق کو نقصان پہنچانے کے لیے اگر اپنے خانگی بیع نامہ میں زیادہ رقم درج کی ہو تو وہ فرضی ہو گی، حالانکہ بیع اصل میں ایک لاکھ روپے کے عوض ہوئی ہے اور یہی اراضیات متدعویہ کی بازاری قیمت ہے۔

(۳) یہ کہ مدعی کو مذکورہ بیع کا علم مؤرخہ ۱۸/۸/۹۸ کو بوقتِ صبح آٹھ بجے گھر خود بمقام دیر ہو کر اطلاع دہندہ مسمی عبدالظاہر سکنہ شگی کے رُو برو فی الفور اور برموقع اپنے حقِ شفعہ کا اعلان کیا، اور ساتھ ہی اسی روز ہمراہ اطلاع دہندہ اراضیات متدعویہ پر جا کر کاشتکارانِ اراضیات مشفوعہ مسمیان عبدالحمید اور محمد طیب ساکنان شگی کے علاوہ گواہان عباس خان، اجمیر خان وحمیداللہ خان ساکنان سیرائی کی موجودگی میں اپنے حقِ شفعہ کا پھر اعلان کیا۔

(۴) یہ کہ بعد ازاں بروئے تحریر مؤرخہ ۲۲/۸/۹۸ کو مدعا علیہ ۱ بذریعہ رجسٹری اے ڈی نوٹس بھیج کر جملہ طلبات اسلامی پورے کئے۔ (نقل رسید نوٹس کارڈ لف ہیں)

(۵) یہ کہ مدعی کا حقِ شفعہ بمقابل مدعا علیہ ۱ ہر لحاظ سے فائق تر ہے۔

(ا) یہ کہ اراضی متدعویہ خاندانی اراضی ہے۔

(ب) یہ کہ اراضی متدعویہ کے پیوست مدعی کی اراضیات ہیں۔

(ج) یہ کہ اراضیاتِ مشفوعہ کے ساتھ مدعی کے جملہ حقوق آب نالش وراہ ہیں۔

اراضی متدعویہ و مدعی کی اراضیات ایک ہی نالہ سے سیراب ہوتی ہیں۔

(د) یہ کہ مدعا علیہ ۱ علاقہ میں غیر مالک و نیز غیر باشندہ ہے اور اس کا کوئی بھی وصف حقِ شفعہ نہ ہے۔

(ہ) یہ کہ مدعی کے حقوق ہر لحاظ سے فائق و برتر ہیں۔

(۶) یہ کہ ہر چند مدعا علیہم سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ حقوقِ مدعی کو تسلیم کر کے اراضیاتِ متدعویہ سے بحق مدعی بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن دستبردار ہو جائے مگر وہ انکاری ہیں جس کی بناء پر

دعویٰ ہذا کی ضرورت لاحق ہوئی۔

(۷) بنائے دعویٰ و مالیتِ دعویٰ مندرجہ عنوان عرض دعویٰ ہے۔

(۸) یہ کہ اراضیات متدعویہ تحصیل دیر میں واقع ہے اس لیے عدالت ہذا کو اختیارِ سماعت حاصل ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ ڈگری دخلیابی بہ نفاذ حقِ شفعہ بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی قیمت فاضل عدالت ہذا مقرر کرے بہ حق مُدعی بمع خرچہ صادر فرمایا جائے۔

العــــارض

مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار سکنہ دیر (مُدعی)

بیانِ حلفی:۔ حلفاً عرض ہے کہ جملہ مراتب بر عرض دعویٰ درست ہیں۔

جوابِ دعویٰ منجانب مدعا علیہم

جنابِ عالی! جوابِ دعویٰ ذیل عرض ہے:۔

تمہیدی عُذرات:۔

(۱) مدعی کو بہ خلافِ مدعا علیہ کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہ ہے۔

(۲) دعویٰ مُدعی مبہم اور ناقص ہے۔

(۳) دعویٰ مُدعی سازشی ہے اور بدنیتی و ایذاء رسانی پر مبنی ہے۔

(۴) حدودات غلط درج کئے گئے ہیں۔

(۵) اراضی متدعویہ مُدعا علیہ ۲ و برادر خورد (بہادر زیب) جو کہ فالج کا مریض تھا کا حصہ رسدی ملکیت تھا، مُدعی و دُوسرے برادران کے خریدنے سے انکار پر مجبوراً علاج کی غرض سے مسمی متذکرہ پر نزد مدعا علیہ ۱ بعوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار (۳۶۰۰۰۰ روپیہ) فروخت کی تھی اور یہی اُس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔

(۶) دعویٰ مُدعی بوجہ عدم استعمال ضروری فریق ناقابلِ سماعت و قابلِ اخراج ہے۔

(۷) مُدعی کو مبیعہ کا خوب علم تھا اور بروقت حسبِ قانون دعویٰ نہ کیا اور اب دعویٰ ھٰذا بہ ایماء عبدالظاہر سازش اور ایذاء رسانی کی خاطر کیا گیا ہے۔

(۸) مُدعی نے حسبِ قانونِ شفعہ پورے نہیں کئے ہیں۔

(۹) مدعی بوجہ قول وفعل میں تضاد کے خود مانع دعویٰ ھٰذا ہے۔
(۱۰) بوجہ عدم چسپائگی کورٹ فیس بھی دعویٰ مدعی ناقابلِ پیش رفت وقابلِ اخراج ہے۔
(۱۱) دعویٰ مدعی از خود زائد المیعاد ہے۔

واقعاتی عُذرات

(I) فقرہ ۱ جیسا کہ مرتب کردہ ہے غلط اور من گھڑت ہے اور انکار ہے۔ بجواب عرض ہے کہ اراضی متدعویہ مدعا علیہ ۲ و برادر مسمی بہادر زیب کی حصۂ رسدی ملکیت تھی، مسمی بہادر زیب فالج کا مریض تھا، کے علاج معالجہ کے لیے بعد از اطلاع وخرید نے سے مُدعی و دیگر برادران کے انکار پر مجبوراً نزد مدعا علیہ ۱ بعوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ (۳،۶۰،۰۰۰) فروخت کی گئی، نقل بیعنامہ لف ہذا ہے۔
(II) فقرہ ۲ غلط، بلا جواز اور جھوٹ پر مبنی ہے اس لیے انکار ہے، اراضی متدعویہ کی قیمت اُس وقت ۳،۶۰،۰۰۰/- روپے تھی اور یہی اُس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔
(III) فقرہ ۳ بھی غلط، خلافِ قانون و خلافِ شرع ہے، بیانِ حلفی دریں بارہ لف ہے۔
(IV) فقرہ ۴ غلط، خلافِ قانون ہے، مدعی نے حسبِ قانون طلباتِ اسلامی پورے نہیں کیے ہیں۔
(V) فقرہ ۵ کا بہ تفصیل جواب ذیل عرض ہے:۔
(ا) جُز ھٰذا غلط اور بلا جواز ہے۔
(ب) جُز ھٰذا بھی غلط ہے، حدودات غلط درج کیے گئے ہیں۔
(ج) جُز (ج) بھی غلط اور بلا جواز ہے۔
(د) جُز (د) بھی غلط ہے۔
(ہ) جُز (ہ) غلط ہے، مدعی بوجہ تضاد قول وفعل خود مانع عذر ھٰذا ہے۔
(VI) فقرہ ۶ غلط، خلافِ قانون و خلافِ شرع ہے اس لیے انکار ہے اور مدعی کو کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہیں۔
(VII) متدعویہ کی قیمت لاکھوں روپے ہے ـــــــــــ اور کورٹ فیس دعویٰ مُدعی ناقابلِ سماعت وقابلِ اخراج ہے۔
(VIII) فقرہ ۸

فیصلہ

اسلامی قانون میں شفعہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس کی مشروعیت کسی کے ضرر سے بچنے کے لیے کی گئی ہے ۔ اس کا حق صرف تین اشخاص یعنی شریک فی نفس البیع ، شریک فی حق البیع اور پڑوسی کو حاصل ہے ۔

لما قال المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار ۔ (الھدایة ج۴ ص۳۸۷ کتاب الشفعة)

(۱) ان تینوں کو تب حق شفعہ حاصل ہوگا کہ علم ہوتے ہی طلب المواثبہ اور ایسے الفاظ کہے جس سے حق شفعہ کا مطالبہ کرنا ظاہر ہوتا ہو اس طلب پر گواہ بنانا ضروری نہیں تاہم بہتر ضرور ہے ۔

لما فی الھدایة : اذا علم الشفیع اشھد فی مجلسه ذٰلك علی المطالبة واعلم ان الطلب علی ثلاثة اوجه طلب المواثبة وھو ان یطلبھا کما علم حتیٰ لو بلغ الشفیع البیع ولم یطلب شفعته بطلت الشفعة ۔ (الھدایة ج۴ ص۳۹۰ کتاب الشفعة)

آگے لکھتے ہیں : والاشھاد فیه لیس بلازم انما لنفی التجاحد ۔ (الھدایہ ج۴ ص۳۹۱ کتاب الشفعۃ)

قال العلامة البابرتیؒ: والاشھاد فی ذٰلك لیس بشرط ۔ العنایة شرح الھدایة

وفی شرح المجلة : ویلزم الشفیع ان یقول کلاماً یدل علی طلب الشفعة فی المجلس الذی سمع فیه عقد البیع فی الحال کقوله انا شفیع المبیع او اطلبه بالشفعة ویقال لھذا طلب المواثبة ۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۷۸۹ الفصل الثالث)

(۲) طلب المواثبہ کے بعد شفیع پر طلب التقریر والاشہاد کرنا ضروری ہے ، اس کی صورت یہ ہے کہ شفیع بائع یا مشتری یا مشفوعہ زمین وغیرہ کے پاس اپنا طلب شفعہ ظاہر کرے اگرچہ خط کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو ، مگر بلا عذر شرعی زیادہ تاخیر کرنا مبطل الشفعہ ہے ۔

لما فی شرح المجلة ، ومدة ھٰذا الطلب لیس علی الفور کطلب المواثبة بل ھی مقدرة بمدة التمکن من الاشھاد وھٰذا الطلب لابد منه بعد طلب المواثبة حتیٰ لو تمکن ولو بکتاب اور سول ولم یشھد بطلت شفعته ۔ اھ

(شرح المجلة لرستم باز ص۵۹۱ المادة ۱۰۳۰)

اس طلب التقریر پر گواہ بنانا ضروری ہے تاکہ خصم کوئی بات نہ کرسکے ۔

لما فی شرح المجلۃ، ویجب علی الشفیع بعد طلب المواثبۃ ان یطلب التقریر وان یشھد بان یقول فی حضور رجلین عند العقار المبیع۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الحکام ج۲ ص۷۹۵ کتاب الشفعۃ)
ورنہ دراصل دونوں طلبات میں گواہ بنانا کوئی شرط نہیں۔

لانہ قد جرح فی الخانیۃ والبدائع بان الاشھاد لیس شرطاً فی صحۃ الطلب المذکور بل انما یجب الاشھاد للتمکن من الاثبات باقامۃ الشھود فیما اذا انکر الخصم الذی ھو المشتری وقوع طلب التقریر والاشھاد حتی ان الشفیع لواجری طلب التقریر بلا اشھاد واقر بہ المشتری وصدقہ اونکل المشتری عن الیمین المکلف بھا فیثبت ویتحقق طلب التقریر۔
(درر الحکام شرح مجلۃ الحکام ج۲ ص۷۹۵ کتاب الشفعۃ)

(۳) اس سے فراغت کے بعد شفیع پر طلب الخصومۃ ضروری ہے کہ قاضی یا علاقائی مجسٹریٹ کے پاس شفعہ کا دعویٰ دائر کرے، لیکن یہ طلب اس وقت ضروری ہے جب مشتری شفیع کو مشفوعہ زمین دینے سے انکاری ہو، اگر مشتری بغیر عدالتی کاروائی کے شفیع کو مشفوعہ شئے حوالہ کردے تو اس طلب کی کوئی ضرورت نہیں۔

کما فی شرح المجلۃ، ویلزم ان یطلب الشفیع ویدعی فی حضور الحاکم بعد طلب التقریر والاشھاد ویقال لھذا طلب الخصومۃ والتملک یجب علی الشفیع اذا لم یسلمہ المشتری العقار المشفوع بعد طلب التقریر والاشھاد ان یطلب الشفعۃ ویدعی فی حضور الحاکم ----- لو سلم المشتری العقار المشفوع برضائہ للشفیع بناء علی شفعتہ فلا حاجۃ لطلب الخصومۃ بعد۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۹۶)
اس طلب میں ایک ماہ سے کم تک بلا عذر تاخیر کرنا جائز ہے جبکہ ایک ماہ تک بلا عذرِ شرعی تاخیر مبطلِ شفعہ ہے اور عذرِ شرعی کی وجہ سے کوئی تحدید نہیں۔

لما فی شرح المجلۃ: واخر الشفیع طلب الخصومۃ بعد طلب التقریر والاشھاد من دون عذر شرعی لکونہ فی دیار یسقط حق شفعتہ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۸۰۲ م ۱۰۲۴)
قال البابرتی: معناہ اذا ترکھا من غیر عذر لانھم اجمعوا علی انہ اذا ترک بمرض او حبس او غیر ذلک ولم یمکنہ التوکیل بھذا الطلب لا تبطل شفعتہ وان طالت المدۃ۔ (العنایۃ شرح الھدایہ)
لہٰذا مثل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی مفتاح الدین ولد عبد المالک سابق سپہ سالار دیر نے

درباب شفعہ جملہ شرعی تقاضے پورے کئے ہیں۔

(۱) زمین کی بیان کردہ حدودات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمیٰ مفتاح الدین ان اراضی میں حق الشرب والطریق کا اشتراک رکھتا ہے اور ساتھ ہی ان اراضی کا جار یعنی پڑوسی بھی ہے، اور یہ تو مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں حقِ شفعہ کے اسباب ہیں۔

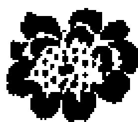
(۲) اور پھر موصوف نے طلب المواثبہ بھی بروقت علم ہوتے ہی کیا ہے اور ساتھ ہی طلب التقریر والاشہاد پر مشفوعہ زمین کے ساتھ کاشتکاران اراضی کے سامنے مسمیٰ اجمیر خان، عباس اور حمید اللہ خان کو گواہ بنا کر حقِ شفعہ کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا اگر مدعا علیہ رحمت اللہ خان ان طلبات کا منکر ہو اور مذکورہ گواہان مسمیٰ مفتاح الدین ولد عبد المالک (مدعی) کی اس طلب التقریر کی گواہی دیں تو دعویٰ قابلِ سماعت ہے۔

(۳) اور طلب الخصومۃ کی دعویٰ میں تاخیر زائد المیعاد نہیں اس لیے کہ ایک ماہ سے کم کی مدت تک بلا عذرِ شرعی تاخیر کرنا بھی مبطلِ شفعہ نہیں جبکہ موصوف نے ایک ماہ سے بھی کم مدت کی تاخیر کی ہے اور باہمی اصلاح وغیرہ کے لیے بھی کی گئی ہے جیسا کہ تحریری نوٹس اور علاقائی جرگہ کے بیانِ تحریری سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) اور ساتھ ہی آپ کا یہ مطالبہ مدعا علیہ مسمیٰ رحمت اللہ جان نے علاقائی جرگہ کے سامنے تسلیم کیا ہے اور جرگہ والوں نے فیصلہ بھی مدعی مفتاح الدین کے حق میں کیا ہے جس پر مرسولہ بیان کی تحریر شاہد ہے۔

لہٰذا ان وجوہات کی بناء پر شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اس اراضی کا حقِ شفعہ مدعی مسمیٰ مفتاح الدین ولد عبد المالک کو حاصل ہے۔

تاہم اگر مدعیٰ علیہ اس بات پر گواہ پیش کردے کہ مدعی مفتاح الدین ولد عبد المالک کو ان اراضی کی بیع کی اطلاع طلب المواثبۃ کی تاریخ سے پہلے ہو چکی تھی اور وہ اس پر خاموش رہا یا انکار کیا تو پھر مفتاح الدین کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی خاموشی یا انکار سے باطل ہو چکا ہے جیسا کہ ماقبل کی تصریحات سے معلوم ہوا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔



راضی نامہ کے بعد دعویٰ کرنا اور مدعا علیہ سے قسم لینا

سوال :۔ غلام رسول، غلام حسین اور بخت رسول تین بھائی ہیں ان کے مابین کاروباری تنازعہ تھا، مؤرخہ ۱۴ اپریل ۲۰۰۲ء کو ان کے درمیان رُوبرو گواہان یہ فیصلہ بطور راضی نامہ طے پایا کہ آئندہ کے لیے ہم تینوں میں سے جس کے پاس نقد رقم، پنشن اور زرخرید اراضی میں سے جس کے نام پر بیع نامہ ہو وہ سب کچھ اسی کا ہوگا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر کسی قسم کا اعتراض یا دعویٰ وغیرہ نہیں کرے گا، راضی نامہ پر تینوں بھائیوں کے علاوہ گواہوں کے دستخط بھی موجود ہیں۔ اب راضی نامہ کے آٹھ ماہ بعد بخت رسول نے راضی نامہ سے اعراض کرتے ہوئے اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف سول جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا ہے کہ غلام حسین کے پاس ہماری مشترکہ رقم اور زرخرید اراضی ہے اگر وہ نہیں مانتا تو قسم اٹھائے کہ میرے پاس مشترکہ رقم اور زرخرید اراضی نہیں ـــــ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بخت رسول کا یہ دعویٰ شرعاً درست ہے؟ اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دعویٰ کر کے اپنے بھائی غلام حسین سے حلف لے لے، جبکہ وہ یہ تمام کاروائی صرف اپنے بھائی کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب :۔ قانونِ شرعی کے مطابق جب کسی نزاع کے فیصلہ کا حل درکار ہو تو البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر (الحدیث) کی رُو سے مُدعی کے ذمہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہوں کا پیش کرنا لازم ہوتا ہے اور اگر مُدعی گواہ پیش کرنے سے قاصر ہو تو مُدعی کے مطالبہ پر مُدعا علیہ سے قسم لی جائے گی۔ یہ کاروائی تب صحیح اور درست ہو گی اور اس طریقے پر فیصلہ تب کیا جائے گا جب دعویٰ قابلِ سماعت ہو۔

صورتِ مسئولہ میں راضی نامہ کے جملہ کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت رسول کا اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف یہ دعویٰ اُس صلح اور راضی نامہ کے بعد کا ہے جو ۱۴ اپریل ۲۰۰۲ء کو گواہوں کے سامنے ہوا تھا اس لیے کہ بخت رسول نے اپنا دعویٰ سول جج کی عدالت میں دائر کیا ہے۔ اس لیے شرعاً اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی مُدعی کے لیے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مُدعیٰ علیہ غلام حسین وغیرہ سے یمین (قسم) لینے کی، بشرطیکہ مذکورہ صلح نامہ

شرعی قوانین کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اس لیے کہ جب کسی نزاع سے متعلق شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق فریقین میں ایک بار صلح ہو جائے تو پھر بدون رضا فریقین کوئی ایک فریق از خود اس کو فسخ (ختم) نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بخت رسول کا راضی نامہ کے بعد غلام حسین پر دعویٰ کرنا شرعاً غیر مسموع اور ناقابل اعتبار ہے اور غلام حسین کو حلف دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: اذا تم الصلح فلیس لواحد من الطرفین فقط الرجوع ویملك المدعی بالصلح بدله ولا یبقی له حق فی الدعوی ولیس للمدعی علیه ایضاً استرداد بدل الصلح۔

(شرح المجلة لخالد اتاسی ج ۴ ص۵۶۹ المادة ۱۵۵۶) لہ

مدعیٰ بہ کی مقدار میں غلطی ہو جانا مسقطِ دعویٰ نہیں

سوال:- ایک صاحب نے علاقہ دیر میں قاضی کے سامنے ایک قطعہ زمین پر دعویٰ کیا جس میں اس نے حدود اربعہ تو صحیح بیان کیا مگر بدقسمتی سے مقدارِ زمین میں غلطی کر گیا، کاغذات میں وہ زمین پانچ ایکڑ ہے اور مدعی نے دعویٰ میں چار ایکڑ کا ذکر کیا، اس پر قاضی نے اُسے جھوٹا قرار دے کر اس کے دعویٰ کو ناقابلِ سماعت قرار دیا ہے، تو کیا واقعی یہ دعویٰ شرعاً ناقابلِ سماعت ہے؟

الجواب:- ایسا دعویٰ کرتے وقت مدعیٰ بہ کا حدود اربعہ صحیح بیان کرنا ضروری ہوتا ہے مقدار کا بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی مُدعی بوقتِ دعویٰ مقدار کے بیان کرنے میں غلطی کر جائے اور حدود اربعہ درست بیان کیا ہو تو دعویٰ قابلِ سماعت ہوتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں قاضی صاحب نے بلا تحقیق و بلا عذرِ شرعی دعویٰ کو ناقابلِ سماعت قرار دیا ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: اذا اصاب المدعی فی بیان الحدود واخطاء فی بیان مقدار ذراع العقار او دونه لا یمنع صحة دعواه۔ (مجلة الاحکام العدلیة۔ المادة ۱۶۲۴)

لہ قال العلامة سلیم رستم بازؒ: تحت هٰذه القاعدة: سواء کان الصلح عن اقرار او انکار او سکوت حتیٰ لو ادعیٰ علیه شیئاً فانکر فصالحه علیٰ شئ ثم اقر المدعیٰ علیه لا یلزمه ما اقر به وکذا لو برهن المدعی بعد صلحه لا یقبل لان الصلح عقد لازم لیس لاحدهما نقضه الخ

(شرح مجلة الاحکام سلیم رستم باز ص۸۲۵ الباب الرابع)

دعویٰ ہبہ کے لیے معتبر شہادت ضروری ہے

سوال :- زید کا ایک قطعۂ اراضی پر قبضہ اور تصرف ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین مجھے بکر نے ہبہ کی تھی، جبکہ بکر کے بیٹے کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین میرے والد کی میراث ہے لہٰذا یہ میرا حق ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ شرعاً یہ زمین کس کا حق ہے ؟

الجواب :- اگر زید اپنا دعویٰ ہبہ معتبر شہادت سے ثابت کر دے تو یہ زمین اس کا حق ہے ورنہ بکر کے بیٹے کو حلف علی العلم دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ : سئلت فی رجل ادعیٰ علیٰ اٰخر عقاراً انه ملکه تلقاه بالارث من ابیه فاجابه المدعیٰ علیه بانی اشتریته من ابیك حال حیاته وانه فی حوزی وتصرفی فی مدة تزید علیٰ خمسین سنة مع حضورك وعلمك وسکوتك بلاعذر شرعی هل یکون جواب المدعیٰ علیه من باب الاقرار بالتلقی من ابیه فیحتاج الیٰ بیّنة تشهد له بالشراء ولا ینفعه وضع الید والتصرف المدة المذکورة ولا تکون الحادثة من قبیل ما مضی علیه خمس عشرة سنة فاجبت نعم جواب المدعیٰ علیه من قبیل دعوی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثه اقرار له بالملك ثم دعواه الانتقال الیه منه تحتاج الیٰ بیّنة لان کل مدع یحتاج الی البینة ولا ینفعه الید المدة المذکورة مع الاقرار المذکور ولیس هٰذا من باب ترك الدعوی بل من باب المواخذة بالاقرار ومن اقر بشیٔ لغیره اخذ باقراره ولوکان فی یده احقاباً کثیرة لا تعد افاده المحقق الرملی فی فتاوی الخیریة۔ والله تعالیٰ اعلم۔ (فتاوٰی کاملیة ص۱۲۳ کتاب الدعوی) لہ

الحق لایسقط بتقادم الزمان کا مطلب

سوال :- ایک شخص نے آج سے ۳۶ سال پہلے کچھ زمین اپنے بیٹوں کے نام منتقل کی اور وہ اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے، اب اس کی وفات کے بعد دیگر ورثاء حقداری کا

لہ قال العلامة سلیم رستم بازؒ : اذا اراد الرجل ان یحلف علیٰ فعل نفسه یحلف علی البتات یعنی یحلف علی القطع بان هٰذا الشیٔ کذا ولیس بکذا اما اذا اراد ان یحلف علیٰ فعل غیره یحلف علیٰ عدم العلم یعنی یحلف علیٰ عدم علمه بذالك الشیٔ۔ (شرح المجلة ص۱۰۱۱ المادة ۱۷۴۸)

دعویٰ کرتے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں ؟ جبکہ فتاویٰ انقرویہ جلد ۲ صفحہ ۵۸ میں ہے کہ :۔
وفی المبسوط رجل ترك الدعوى ثلاثا وثلاثين سنة ولم يكن له مانع من الدعوى ثم ادعى لا تسمع دعواه لان ترك الدعوى مع التمكن عليه يدل على عدم الحق ظاهراً۔ انتہیٰ
جناب مفتی صاحب! مسئلہ ہذا کا شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں ؟

الجواب :۔ شرح المجلہ میں ہے کہ : اذا ترك المورث الدعوى مدة وتركها الوارث ايضاً مدة وبلغ مجموع المدتين حد مرور الزمان فلا تسمع۔ (ج ۵ ص ۱۸۱ المادة ۱۶۷۰)
اس سے معلوم ہوا کہ مورث اور اس کے وارث نے جب اپنا دعویٰ ۳۶ سال تک چھوڑا ہو اور کوئی شرعی عذر بھی نہ ہو تو ایسا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے، البتہ جب مدعیٰ علیہ یہ مانتا ہو کہ مدعی کا حقِ ارث ہمارے ذمہ باقی ہے تو پھر سینکڑوں سال گذرنے کے باوجود بھی دعویٰ مسموع ہوگا اور حق دینا ہوگا، اور یہی معنیٰ ہے فقہاء کے اس قول کا کہ الحق لا یسقط بتقادم الزمان[1] .....

دعویٰ کب تک قابلِ سماعت ہے

سوال :۔ ایک آدمی ایک قطعہ اراضی پر ۵۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ سے قابض اور اس میں مالکانہ تصرفات کرتا چلا آرہا ہے، اب ایک دوسرا شخص اس قطعہ زمین پر ارث کا دعویٰ کرتا ہے، تو کیا شرعاً اس شخص کا یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہے یا نہیں ؟ اور کیا اس تاخیر سے اس شخص کا استحقاق باطل ہو جاتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ سماعِ دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اتنی تاخیر نہ ہوئی جو ۳۶ سال تک پہنچتی ہو، اسی طرح مدعیٰ علیہ کسی طرح مقر بھی نہ ہو اور نہ ہی مدعی اس مدت میں غائب، بچہ اور پاگل بغیر ولی کے ہو۔ اور اگر دعویٰ کرنے میں ۳۶ سال یا اس سے زیادہ مدت گذر جائے اسی طرح دیگر شرائط بھی قبولِ دعویٰ کی مفقود ہوں تو دعویٰ قابلِ سماعت نہ رہے گا۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں بھی اس دوسرے شخص کا ۵۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ کے بعد دعویٰ ارث

---

[1] لما فی مجلة الاحکام ، لا یسقط الحق بتقادم الزمان فاذا اقر المدعیٰ علیه واعترف صراحة فی حضور الحاکم بان حق المدعی عنده فی الحال علی الوجه الذی یدعیه وکان قد مر الزمان علی الدعوی فلا یعتبر مرور الزمان ویحکم بموجب اقرار المدعیٰ علیه۔ (شرح المجلہ ص ۹۹۶ المادة ۱۶۷۴)

قابلِ سماعت نہیں، تاہم مرورِ زمانہ کی وجہ سے استحقاق باطل نہیں ہوتا، کیونکہ الحق لایسقط بتقادم الزمان۔

قال العلامۃ خالد الاتاسی رحمہ اللہ: قال المتاخرون من اھل الفتوٰی لاتسمع الدعوٰی بعد ست وثلٰثین سنۃ الا ان یکون المدعی غائبًا اوصبیًا اومجنونًا ولیس لھما ولی او المدعٰی علیہ امیرا جائرًا۔ (شرح المجلۃ ج۵ ص۲۷ المادۃ ۱۶۶۳)

اذا ترک المورث الدعوٰی مدۃ یترکھا الوارث ایضًا مدۃ وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلا تسمع۔ (شرح المجلۃ ج۵ ص۱۸۷ المادۃ ۱۶۷۰) ؎

پاگل کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک پاگل نے کسی شخص کی شرارت اور ایما پر گاؤں کے ایک معزز اور شریف آدمی پر دس ہزار روپے کا دعویٰ کر دیا جبکہ اس پاگل کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے، توکیا اس کا یہ دعویٰ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قوانینِ شرع کے تحت وہ دعویٰ قابلِ سماعت اور صحیح ہوتا ہے جو عاقل بالغ آدمی کسی پر دائر کرے، اور اگر مدعی عاقل بالغ نہ ہو تو شرعاً اس کا دعویٰ غیر مسموع اور غیر صحیح ہوتا ہے۔ لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال اگر تو اس پاگل شخص نے بلا کسی تحریک کے خود دعویٰ کیا ہو اور اس کا کوئی ولی اس کی ولایت کرکے دعویٰ کی پیروی نہیں کرتا ہو تو شرعاً یہ دعویٰ ناقابلِ سماعت اور صحیح نہیں ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یشترط ان یکون المدعی والمدعٰی علیہ عاقلین فدعوی المجنون والصبی غیر الممیز لیست بصحیحۃ ولٰکن ان یکون اولیاؤھما او اوصیاؤھما مدعین او مدعٰی علیھم فی محلھما۔

[شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص۹
الباب الاول فی شروط الدعوٰی]

؎ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اذا ترک الدعوی ثلاثًا وثلاثین سنۃ ولم یکن مانع من ترک الدعوی الخ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۲ مطلب اذا ترک الدعوی ثلاثۃ وثلاثین سنۃ لاتسمع)

ومثلہ فی فتاوٰی کاملیۃ ص۱۳۱ کتاب الدعوٰی۔

نابالغ بیٹے کی جگہ باپ کو قسم دینے کا حکم

سوال:۔ زید نے بکر پر چوری کا دعویٰ کیا جبکہ بکر چوری سے انکار کرتا ہے اور قسم کھانے کے لیے تیار ہے مگر وہ نابالغ ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا نابالغ پر شرعاً قسم آسکتی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو پھر اس کا والد اس کی جگہ قسم کھاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دونوں پر قسم نہیں آتی تو کیا پھر مدعی قسم کھاسکتا ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں اگر مدعی (زید) کے پاس اثباتِ دعویٰ کے لیے گواہ نہ ہوں تو پھر بکر ہی کو حلف وقسم دیا جائے گا اس کے باپ کو نہیں، اس لیے کہ قسم کھانے کے لیے بلوغ شرط نہیں اور نہ ہی مدعی کا قسم کھانا شرعاً معتبر ہے۔

قال العلامة علی حیدر: (تحلیف الصبی) اذا کان المدعیٰ علیه صبیاً وکان غیر ماذون له یتوجه علیه الیمین فاذا وجه ولکل فلا یحکم علیه بل یجب تحلیفه بعد البلوغ اما اذا کان ماذوناً فیتوجه الیمین علیه عند بعض الفقهاء ویحکم بیمینه وبنکوله عن الیمین وهذا هو المفتی به الخ۔ (دُرر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۴ ص۴۸۹ الباب الثالث فی بیان التحلیف)[1]

مصالحت کے بعد ارث کا دعویٰ کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب نے اپنی عین حیات میں ہی جائیداد کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا تھا کہ میرا آبا د گھر میرے تین بیٹوں یعنی حبیب خان، قادر خان، افضل خان کا ہے اور سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) رقبہ تعدادی ایک کنال ۹ مرلے دوسرے دو بیٹوں (غلام خان، محمد طفیل) کو دے دیا اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی کہ مستی غلام خان اپنے چھوٹے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کا گھر بنا کر دیتے اور اس کی شادی کرنے کے بعد بقیہ ڈاگہ (پلاٹ) کا مالک ہوگا والد صاحب کی وفات کے بعد غلام خان نے اپنے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کی بجائے تین کمروں کا گھر بنا کر دیا اور اس کی شادی بھی کردی، بعد ازاں والدہ صاحبہ اور جملہ بھائیوں نے مشترکہ فیصلہ بھی کر دیا جسے سب نے قبول کیا جس کا اسٹامپ لف ہذا ہے اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں،

---

[1] وفی الهندیة: الصبی الماذون یحلف کالبالغ وبه ناخذ۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۲۵ کتاب الدعوی۔ الباب الثالث فی الیمین وفیه ثلاثة فصول)

مگر اس فیصلہ کے بعد بھائیوں نے انکار کر دیا اور پھر علاقائی جرگہ نے دوبارہ فیصلہ کیا جس پر سب بھائیوں نے رضامندی ظاہر کر دی جس کا تحریری ثبوت بھی لف ہذا ہے اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود تینوں بھائیوں (حبیب خان، قادر خان، افضل خان) نے پھر اس سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) پر دعویٰ ارث کر دیا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیانات مذکورہ کی روشنی میں تینوں بھائیوں کا دعویٰ ارث صحیح ہے یا نہیں؟ شریعتِ اسلامی کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ بالا بیان اور ملفوف اسٹامپ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ نے اپنی زندگی میں بیٹوں میں جائیداد کی تقسیم کا جو فیصلہ کیا تھا اُس وقت سب بھائی اس فیصلہ پر رضامند تھے اور بعد ازاں علاقائی جرگہ کا فیصلہ قبول کر کے آپس میں سب بھائی صلح بھی کر چکے ہیں، لہٰذا مصالحت کے بعد کسی بھی وارث کو اپنی صلح سے رجوع کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں، اس لیے مذکورہ سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) میں محمد طفیل کا گھر بن جانے کے بعد باقی حصہ صرف مسمّی غلام خان کا ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی بھی وارث اس میں شراکت کا دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ یہ قطعہ زمین غلام خان کی ملکیت متصور ہوگا۔

لما فی مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۵۵۶: اذا تم الصلح فلیس لواحد فقط من الفریقین الرجوع عنہ۔ قال الشیخ سلیم رستم باز تحتہ سواء کان الصلح عن اقرار او انکار او سکوت حتی لو ادعی علیہ شیئاً فانکر فصالحہ علی شیٔ ثم اقر المدعی علیہ لایلزمہ ما اقر بہ وکذا لو برھن المدعی بعد صلحہ لایقبل لان الصلح عقد لازم لیس لاحدھما نقضہ۔ (شرح المجلہ ص۸۴۵ الباب الرابع فی احکام الصلح)[۱]

دعویٰ کے ثبوت کے لیے شرعی ضابطہ

سوال: زید سے عمرو نے چوری کی ہے، اب زید عمرو پر دعویٰ (مقدمہ) کرنا چاہتا ہے تو اس

---

[۱] وفی الھندیۃ: فوقوع الملک فی البدل وثبوت الملک فی المصالح عنہ ان کان مما یحتمل التملیک کالمال و وقوع البراءۃ عنہ للمدعیٰ علیہ ان کان لایحتمل التملیک کالقصاص ھذا اذا کان الصلح علی الاقرار الخ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۴ ص۲۲۹ کتاب الصلح)

کے لیے اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ اور اگر زید شرعی تقاضوں کے مطابق عمرو کو چور ثابت کر دے تو جتنا مال اس کا چوری ہوا ہے اس سے زیادہ عمرو سے لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ دعویٰ کے اثبات کے لیے شرعی ضابطہ یہ ہے کہ مدعی (دعویٰ کرنے والا) قاضی کے سامنے معتبر شہادت پیش کرے اور مُدعیٰ علیہ (منکر) کے ذمہ حلف یعنی قسم کھانا لازم ہے، مگر یہ تب ہے جب مُدعی گواہ پیش نہ کر سکے اور وہ مُدعیٰ علیہ سے قسم کا مطالبہ کرے۔ حدیث میں ہے: البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر (صحیح مسلم ج ۲ ص۷۴ کتاب الاقضیۃ) [1] اور فعل الغیر پر قسم کرنے کی صورت میں قسم علی العلم کی جائے گی۔ اور شہادت یا نکول یعنی قسم کھانے سے انکار کی صورت میں مُدعی کے لیے صرف وہ چیز ثابت ہوگی جس کا وہ دعویدار ہے اس سے زائد مال لینا اس کے لیے شرعاً درست نہیں۔

ہبۂ تام کے بعد دعویٰ ارث ناقابلِ سماعت ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہماری والدہ صاحبہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنا جملہ ترکہ اپنے ایک بیٹے کے نام کر دیا تھا جس کے گواہان اور سرکاری اسٹامپ لف ہذا ہے، تو اب ان کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے والدہ کے ترکہ میں اپنے حصہ کے دعویدار ہیں، تو کیا ان کا دعویٰ ارث صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ ہر شخص کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی حینِ حیات میں ہی اپنی جائیداد وغیرہ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو تملیکاً ہبہ کر سکتا ہے، اس کی وفات کے بعد اس تملیک شدہ جائیداد میں کسی بھی وارث کا دعویٰ اِرث قابلِ سماعت نہیں، صورتِ مسئولہ میں جب آپ کی والدہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جملہ جائیداد ایک بیٹے کو تملیکاً دے دی ہے اور اس پر مروجہ قانون کے مطابق تحریر اور گواہ بھی موجود ہیں تو اب ان کی وفات کے بعد دیگر ورثاء کا اس میں کوئی حق باقی نہیں رہا۔

لما فی الھندیۃ: رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جائز

---

[1] عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۶ باب الاقضیۃ والشہادات الفصل الثانی)

فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۴ ص۳۹۱ کتاب الہبۃ) [1]

تنازعہ تقسیم ترکہ میراث الحاج نواب خان مرحوم، پلوسی، پشاور

بیان مُدعی! ہم نے اپنے حق میں ایک عدد وصیت نامہ، ہبہ نامہ منسلک کیا ہے اور اس کے ساتھ پورا بیان بھی دیا ہے، لہٰذا میں اپنے بیان میں مزید یہ شامل کرنا چاہتا ہوں کہ:۔

(۱) یہ زمین خریدتے وقت میرے بھائی عالم زیب کی عمر ۹ سال تھی، زمین ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو خریدی گئی اور عالم زیب کی تاریخ پیدائش ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء ہے، لہٰذا اس سے میرا بڑا بھائی ۴، ۵ سال بڑا ہوگا، دونوں بھائی زمین خریدتے وقت بغیر کمائی کے تھے اور سکول میں پڑھتے تھے جس کا ثبوت بھی منسلک ہے۔

(۲) یہ کہ آکٹاسٹین میری والدہ صاحبہ کی ہے جو کہ والد صاحب نے انہیں حق مہر میں دی تھی، لیکن اس کا ذکر پہلے والے بیان میں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ یہ تنازعہ صرف اور صرف خریدی گئی زمین تک محدود ہے۔

(۳) مزید کوئی ثبوت یا گواہ میرے بیان کے بارے میں درکار ہوں تو آپ کے کہنے پر پیش کردوں گا۔

(۴) کوئی بھی فیصلہ جرگے کے ممبران جناب سعید جان صاحب اور عبدالحمید کاکا صاحب کا دستخط شدہ ہو میں قبول کروں گا۔

میں اپنی والدہ صاحبہ اور چھوٹے بہن بھائیوں اور اپنی طرف سے اقرار کرتا ہوں کہ جو کوئی فیصلہ شریعت کی رُو سے ہوگا مجھے قابلِ قبول ہوگا۔ (عطاء الرحمن ولد حاجی نواب خان ساکن پلوسی، پشاور)

بیان مُدعیٰ علیہ! ہم دونوں بھائی عالم زیب و اورنگزیب پسران حاجی

---

[1] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثماً فیما صنع۔

{الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۲۷۹ فصل فی ھبۃ الوالد لولدہ الخ}

نواب خان مرحوم ساکنان پلوسی ضلع پشاور یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے والد محترم نے ۱۹۶۷ء میں تہکال I نزد تاج آباد میں واقع ۲۲ کنال ۲/۱ ۷ مرلہ زمین اپنے نقد پیسوں سے خریدی تھی۔ والد محترم نے اراضی مذکورہ کا یہ حصہ مساوی انتقال کچھ اس طرح کرایا کہ ۱۔ حاجی نواب خان ولد سربلند کا حصہ ۷ کنال ۲/۱ ۹ مرلے ۲۔ عالم زیب ولد حاجی نواب خان کا حصہ ۷ کنال ۹ مرلے ۳۔ اورنگزیب ولد حاجی نواب خان ۷ کنال ۹ مرلے کے باقبضہ مالکان ہیں۔

زمین کے انتقال کے وقت ہماری دو سگی بہنیں، سوتیلی والدہ اور دو سوتیلی بہنیں موجود تھیں، اس کے بعد ۳۱ سال والد صاحب زندہ رہے اور اس عرصہ میں ہماری سوتیلی والدہ سے سات بھائی اور چار بہنیں پیدا ہوئے۔ (یعنی کل سات بھائی اور چھ بہنیں) بعدازاں ہمارے والد صاحب نے کچھ اور زمین خریدی جس کا انتقال ورجسٹری وغیرہ انہوں نے اپنے نام پر کرایا ہے۔

ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو کچھ زمین دی تھی جس پر والد صاحب نے آبادی کر کے وہاں آٹا پیسنے کی مشین لگائی جو کہ ہم دو بھائیوں اور دو بہنوں کی ملکیت ہے۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہمارے سوتیلے بہن بھائیوں کے حصے کے بارے میں شرعی حکم صادر فرمایا جائے۔

(نوٹ) اس سے پہلے بیان میں ہم اپنے والد صاحب کی جائیداد اور مکانات کے بارے میں تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں۔

اورنگزیب ——————— عالم زیب

فیصلہ شرعیہ

(۱) فریقِ اوّل: عالم زیب خان و اورنگ زیب خان پسران حاجی نواب خان۔

(۲) فریقِ ثانی: عطاء الرحمٰن مع برادران پسران حاجی نواب خان۔

۱۔ فریقین کے بیان کے مطابق حاجی نواب خان مرحوم نے ۱۹۶۷ء میں تاج آباد تہکال (پشاور) میں ۲۲ کنال ۲/۱ ۷ مرلے زمین خریدی، اس میں سے ۷ کنال ۲/۱ ۹ زمین حاجی نواب خان نے اپنے نام انتقال کرالی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر عالم زیب خان ولد حاجی نواب خان کے نام انتقال کرادی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر اورنگ زیب خان ولد حاجی نواب خان کے نام انتقال کرادی۔

چونکہ حاجی نواب خان نے خرید کردہ زمین سے ۴ کنال ۸ امرلے اپنے دونوں بیٹوں کے نام انکی صغرسنی میں مالکانہ حقوق کے ساتھ انتقال کرادی ہے لہٰذا اب اس کے یہ دونوں بیٹے (اورنگزیب خان، عالم زیب خان) اس انتقال شدہ زمین کے باقاعدہ مالکان ہیں اور انتقال شدہ زمین ان کی ملکیت متصور ہوگی، اس لیے کہ صغرسنی میں تنئے موہوب پر صغیر کا قبضہ ضروری نہیں ہے، باپ کے قبضہ ہی سے ہبہ تام ہوجاتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل عطاء الرحمٰن و برادران نے اپنے باپ حاجی نواب خان کا جو خط پیش کیا ہے شریعت کی رُو سے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۱) لما فی الفتاوی الخیریة علی هامش العقود الدریة ج۲ ص۱۰۔

(۲) اس لیے کہ اس خط کے ثبوت میں گواہان نہیں ہیں۔

(۳) یہ پیش کردہ خط وصیت نامہ ہے، اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد میری جائیداد مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم ہو، اور شرعی اعتبار سے اپنے وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں، دلائل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قال العلامة قاضی خانؒ: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون اٰثما فیما صنع، رجل قال جعلت هٰذا لولدی فلان کانت هبة، رجل وهب لابنه الصغیر دارًا وهی مشغولة بمتاع الاب۔ قال ابونصرؒ جاز ولا یحتاج الی التفریغ لانها مشغولة بمتاع القابض وهو الاب ۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ کتاب الهبة۔ فصل فی هبة الوالد لولده والهبة للصغیر)

(۲) قال العلامة الزیلعیؒ: وهبة الاب لطفله تتم بالعقد لانهٗ فی قبض الاب فینوب عن قبض الصغیر لانه ولیه۔ (تبیین الحقائق ج۵ ص۹۵ کتاب الهبة)

(۳) لما فی الهندیة: رجل اتخذ لولده اولتلمیذه ثیاباً ثم اراد ان یدفع الی ولده الاٰخر اوتلمیذه الاٰخر لیس لهٗ ذٰلك الّا اذا بین وقت الاتخاذ انها عاریة ۔
(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۹۲ کتاب الهبة الباب السادس فی الهبة للصغیر)

(۴) قال العلامة الزیلعیؒ: قال وانما یصح الرجوع بتراضیهما اوبحکم الحاکم لأن مِلك الموهوب لهٗ ثابت فی العین فلایخرج عن مِلکه الا بالرضاء او بالقضاء ۔
(تبیین الحقائق ج۵ ص۱۰۱ کتاب الهبة)

(۵) قال العلامة ابن نجیمؒ : وکتبنا فی القضاء من الفوائد انهٗ یعمل بدفتر البیاع والسمسار والصیاف فالخط فیه حجة. (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۱۲۵)

(۶) قال العلامة قاضی خانؒ : رجل کتب صك وصیة وقال للشهود اشهدوا بما فیه ولم یقرأ وصیته علیهم قال علماؤنا لا یجوز للشهود ان یشهدوا بما فیه وقال بعضهم وسعهم ان یشهدوا والصحیح انه لایسعهم ان یشهدوا۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۲ ص۴۸۲ کتاب الشهادات، فصل فی الشاهد یشهد بعد ما اخبر بزوال الحق)

(۷) قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ : واما الثالث فلقوله علیه الصلوٰة والسلام : ان اللہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقهٗ فلا وصیة لوارث۔

(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۸۲ کتاب الوصایا)

(۸) قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ : ولا تجوز لوارثه لقوله علیه السلام ان اللہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقهٗ الا ولا وصیة لوارث۔

(الهدایة ج۴ ص۶۵۷ کتاب الوصایا، باب فی صفة الوصیة الخ)

(۲) حق مہر (۳) آٹا مشین

جناب الحاج نواب خان مرحوم نے مسماۃ حسن آرا دختر اوّل خان سے عقد نکاح کرتے وقت حق مہر میں جو ایک عدد رہائشی مکان اور ایک آٹا مشین مسمی کیا ہے اس کی ادائیگی نواب خان مرحوم پر لازم ہے، اگر انہوں نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا ہو تو اب اس کے جملہ ترکہ سے ادا کیا جائے گا، حق مہر ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ تاہم عالم زیب اور اورنگ زیب جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آٹا مشین کی زمین ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو دی ہے، اس پر آبادی اور آٹا مشین ہمارے والد صاحب نے بنائی ہے، اگر انہوں نے اس دعویٰ کا صحیح ثبوت شرکاء جرگہ کے سامنے پیش کیا ہو تو شرکاء جرگہ صرف اس زمین کی قیمت طے کریں، پھر اگر اورنگزیب و عالم زیب اس زمین کی قیمت لینے پر راضی ہوں تو نواب خان مرحوم کے کل ترکہ سے زمین کی قیمت منہا کر کے ان کے حوالہ کر دیں اور آٹا مشین مع زمین حاجی نواب خان کو حق مہر میں دے دیں، اور اگر عالم زیب اور اورنگزیب زمین کی قیمت لینے پر راضی نہ ہوں تو اس زمین کو خالی کر دیں، کیونکہ یہ انکی

سوتیلی والدہ کا حق ہے، اور کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کا حق اس کی اجازت کے بغیر کسی اور کے حوالے کر دے۔ لیکن جب اورنگزیب، عالم زیب کی والدہ اپنے شوہر سے پہلے فوت ہوئی ہے تو اس کی ملکیت میں چاہے آٹا مشین کی زمین ہو یا دیگر اشیاء ان میں ۴/۱ حصہ اس کے شوہر نواب خان کو بھی میراث میں ملے گا اور باقی ۴/۳ حصے اس کی اولاد (عالم زیب وغیرہ) کو میراث میں ملیں گے، اب چونکہ شوہر بھی فوت ہو چکا ہے اس لیے اس ۴/۱ حصہ میں بھی (جو کہ بیوی کی طرف سے اس کو میراث میں ملا ہے) نواب خان کے جملہ ورثاء (عالم زیب اور اس کے سگے بہن بھائی مع سوتیلی والدہ و سوتیلے بہن بھائی) شریک ہونگے، اور اگر مدعی معتبر شہادت سے اپنا دعویٰ ثابت نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ (منکر) کو حلف و قسم دیا جائے گا۔ البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیه۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۶ باب الاقضیة والشہادات)

حوالہ حسب ذیل ہے:۔

لما فی الهندیة: واذا تزوجها علی هذا العبد وهو ملك الغیر أو علی هذه الدار وهی ملك الغیر فالنکاح جائز والتسمیة صحیحة فبعد ذلك ینظر أن أجاز صاحب الدار وصاحب العبد ذلك فلها عین المسمیٰ وان لم یجز المستحق لایبطل النکاح ولا التسمیة حتی لایجب مهر المثل وانما تجب قیمة المسمیٰ کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۳۰۳ کتاب النکاح۔ الباب السابع فی المهر)

وقال ایضًا: ولو تزوجها علی شیٔ بعینه وهلك قبل التسلیم أو استحق فان کان ذلك من ذوات الامثال رجعت علی الزوج بالمثل والا فبالقیمة کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۳۱۶ الباب السابع فی المهر۔ الفصل التاسع)

(۴) تقسیم ترکہ میراث

صورت مسئولہ میں عالم زیب و اورنگزیب کے تمام مالکانہ طور پر انتقال شدہ زمین اور نواب خان مرحوم کی بیوی کے حق مہر کے علاوہ نواب خان مرحوم کی ملکیت میں جتنا اثاثہ ہو، منقولہ ہو یا غیر منقولہ جائیداد، سب ورثاء اس میں شریک ہوں گے اور تقسیم میراث اس طرح ہو گی کہ سارے ترکہ میراث میں ۸/۱ حصہ اس کی بیوہ کو ملے گا اور باقی سات حصے نواب خان مرحوم کی دونوں بیویوں کی تمام اولاد میں بایں طور تقسیم ہو گی کہ ہر ایک بھائی کو دو دو حصے اور ہر ایک بہن کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

ارشادِ ربانی ہے ۔ یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ۔
(سورۃ النساء آیت ۱۲)

وفی الهندیة: واذا اختلط البنون والبنات عصب البنون والبنات فیکون للابن مثل حظ الانثیین۔ (الفتاوی الہندیہ ص ۴۴۸ ج ۶ کتاب الفرائض، الباب الثانی)

فیصلہ شرعی مابین سید یوسف شاہ و سلطان شاہ پسران حیات شاہ

فریقِ اوّل: سید یوسف شاہ ولد حیات شاہ ساکن بلند کوٹ، بٹگرام، مانسہرہ
فریقِ ثانی: سید سلطان شاہ ولد حیات شاہ ساکن بلند کوٹ، بٹگرام، مانسہرہ
نمائندہ فریقِ اوّل: گل علی شاہ ولد سید یوسف شاہ
نمائندہ فریقِ ثانی: سید فرمان شاہ ولد سید سلطان شاہ

مندرجہ بالا فریقین کا بیان ان کے نمائندوں کے واسطے سے سنا گیا، دونوں نمائندوں کے بیانات سے چند امور سامنے آئے :-

(۱) فریقین کے بیانات سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ حیات شاہ کی بیٹیوں کو اس کی جائیداد سے محروم رکھا گیا ہے، جائیداد کی تقسیم صرف اسکے بیٹوں تک محدود رکھی گئی، والد کے اپنے تصرفات یا بعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے بیٹیوں کا کوئی تذکرہ فریقین نہیں کرتے بلکہ اس سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

(۲) فریقِ اوّل سید یوسف شاہ اس کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے حینِ حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی اس میں دیگر حصص کے علاوہ خسرہ نمبر ۸۰۰ جو کہ "ارتل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا رقبہ اسّی کنال آٹھ مرلہ ہے، یہ سید یوسف شاہ کو دی گئی ہے جو کہ ۱۹۶۶ء/۱۹۶۷ء کی بندوبست اراضی میں بحال رکھی گئی ہے۔ فریق مذکورہ کے بیان کی رُو سے سلطان شاہ نے یہ زمین اپنے نام منتقل کرالی ہے جس کے خلاف یوسف شاہ نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران شاد علی خان نے دونوں میں مصالحت کرادی۔

(۳) فریقِ اوّل مصالحت میں ایک ہزار روپے نقد دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو کہ فریقِ ثانی نے برضا و رغبت وصول کیے ہیں اور بطور سند تحریری سٹامپ پیش کرتے ہیں۔

(۴) فریقِ ثانی سلطان شاہ کا بیان ہے کہ حیات شاہ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے

درمیان تقسیم کی تھی، تاہم اس میں اچھی اور کمزور زمین کی رعایت کرتے ہوئے ایک بیٹے کو اچھی زمین کم اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی۔ فریقِ اول سید یوسف شاہ نے ساز باز کر کے خسرہ ۴۰۷ کا بوگس طریقے سے اپنے نام انتقال کرا لیا ہے جو کہ عدالت نے میری درخواست پر میرے حق میں بحال کر دیا ہے۔

(۵) فریقِ ثانی کا دفاعی بیان ہے کہ سلطان شاہ نے سید یوسف شاہ کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ سلطان شاہ نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور جس جائیداد سے سلطان شاہ نے مصالحت کی ہے یہ اس کی اپنی نہیں بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد ہے، یہی وجہ ہے کہ سلطان شاہ نے ایک ہزار روپے فریقِ اوّل کو واپس کر کے مصالحت کالعدم کر دی ہے۔

نتیجہ بیانات

ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین کسی نہ کسی طریقے سے بیٹیوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں جو کہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے، اگر والد نے دیدہ دانستہ طور پر اپنی جائیداد بیٹوں کے نام منتقل کر کے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ایک ناجائز اور حرام حرکت ہے، اگرچہ قضاءً یہ اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عند اللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے یہ ضروری ہے کہ ورثاء مورث کے فراغتِ ذمہ کے لیے ہر صاحبِ حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے انسان کا عذابِ الٰہی میں گرفتار رہنا یقینی امر ہے۔ تاہم والد کے تصرفات قضاءً نافذ رہیں گے۔ (الفتاویٰ الہندیہ ج ۴ ص ۱۴۹)

اصل دعویٰ کے بارے میں شرعی فیصلہ

جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیے کہ سرکاری کاغذات میں اس کا محض انتقال و رجسٹری ہونا شرعاً نہ کسی کے ملکیت کی دلیل ہے اور نہ اس پر حقِ ملکیت موقوف ہے، اس لیے حیات شاہ کے اپنی جائیداد میں مالکانہ تصرفات کے نفاذ کے لیے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں کہ جو باقاعدہ گواہان سے ثابت ہو جائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔ لیکن جہاں تک بعدازاں یوسف شاہ اور سلطان شاہ میں تنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس میں مصالحت بھی ہوتی ہے تو اس کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہان کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے اگر سلطان شاہ کی رضا و رغبت سے

مصالحت ایک دفعہ ثابت ہو جائے تو باقاعدہ تسلیم کر لینے کے بعد خود سلطان شاہ اور نہ اس کے ورثاء اس سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن اس مصالحت کے نفاذ کے لیے یہ ضروری ہے کہ سلطان شاہ جس جائیداد پر مصالحت کر رہا ہے یہ اس کی اپنی ملکیت میں ہو، ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے باقاعدہ قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہو کر اس جائیداد پر سلطان شاہ کی ملکیت باقی نہیں رہتی، اس لیے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جائیداد پر مصالحت نہیں کر سکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہوں۔ تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا سلطان شاہ کی ملکیت میں ہونے کے ثبوت کے لیے باقاعدہ گواہان کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریق ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریق اوّل سلطان شاہ کی ملکیت پر گواہ قائم کرے تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوگی ورنہ پھر ان کے مطالبہ پر فریق ثانی پر ملکیت سے انکار کر کے اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریق ثانی قسم کھائے تو مصالحت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم دعاوی پر ہوگا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسر نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔

اس لیے متعلقہ حاکم فریقین سے گواہان کا مطالبہ کرے یا ان کی قسم پر فیصلہ کرے۔

مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے قسم کس پر ہے؟

سوال:۔ خالد نے واجد پر دعویٰ کیا ہے کہ تم نے مجھ سے گیارہ ہزار روپے قرض لیے ہیں جبکہ واجد اس کا انکار کرتا ہے اور مدعی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے، لہٰذا اب قسم مدعی کو دی جائے گی یا مدعیٰ علیہ کو؟

الجواب:۔ قسم شرعاً مدعیٰ علیہ کے ذمے ہوتی ہے اور مدعی کے اختیار میں دعوٰی کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنا لازم ہوتا ہے، صورت مسئولہ میں اس تنازع کے حل کے لیے مدعی سے گواہ طلب کیے جائیں اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے بشرطیکہ مدعی اس کا طالب بھی ہو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ وفی روایة والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (جامع الترمذی ص۱۶۱ ابواب الاحکام۔ باب ما جاء فی ان البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ)[1]

---

[1] عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواھم ادعی ناس دماء رجال واموالھم ولکن الیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (سنن ابن ماجہ ص۱۶۸ ابواب الاحکام۔ باب البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ) ومثلہٗ فی صحیح المسلم ج۲ ص۷۴ کتاب الاقضیة، باب الیمین علی المدعیٰ علیہ

زمین کے تنازعہ پر فریقین میں شرعی فیصلہ

سوال:۔کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام کہ زمین کا ایک ٹکڑا دو فریقوں کے مابین متنازعہ ہے۔
فریقِ اوّل امیر حمزہ وغیرہ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ متنازعہ زمین ہماری ہے، جبکہ فریقِ ثانی دلبر و دین محمد وغیرہ نے فریقِ اول کے دعویٰ کے ردّ میں یہ کہا ہے کہ یہ زمین تمہارے باپ نے ہمارے باپ کو اس مشترکہ مال کے حق کے بدلے میں جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا، دیدی ہے یعنی ہمارے والد پر بیچدی ہے۔
لہٰذا آپ حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ فریقین کے درمیان قرآن وسنت کی روشنی میں اس تنازعہ کا فیصلہ فرمایا جائے؟

الجواب:۔صورتِ مسئولہ میں فریقِ اول امیر حمزہ وغیرہ مدعی ہے، اور فریقِ ثانی دلبر و دین محمد مدعیٰ علیہ ہے، فریقِ ثانی نے فریقِ اوّل کے دعویٰ کے رَدّ میں یہ کہا ہے کہ زمین کا یہ متنازعہ ٹکڑا تمہارے مورث (والد) نے ہمارے والد کے حق کے بدلے میں (یعنی ہمارے والد کے اُس مال کے بدلے جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا اور جسے تمہارے مورث (والد) نے خرچ کرلیا تھا) دیدیا ہے (یعنی بیچدیا ہے)۔ تو اب شرعی ضابطہ کے مطابق فیصلہ کی صورت یہ ہوگی کہ دافع اپنے دفع کو معتبر شہادت سے ثابت کرے گا، اثباتِ دفع کی صورت میں فیصلہ مدعیٰ علیہ کے حق میں کیا جائے گا، بصورت دیگر مدعی (فریقِ اوّل) کو حلف علی العلم دیا جاوے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت فی رجل ادعی علیٰ اٰخر عقاراً انہٗ تلقاہ بالارث من ابیہ فاجابہ المدعیٰ علیہ بانّی اشتریتہٗ من ابیک حال حیاتہ بکذا وکذا من القروش وانہ فی حوزتی وتصرفی فی مدۃ تزید علیٰ خمسین سنۃ مع حضورك وعلمك وسکوتك بلاعذر شرعی ھل یکون جواب المدعیٰ علیہ من باب الاقرار بالتلقی من ابیہ فیحتاج إلیٰ بینۃ تشھد لہٗ بالشراء ولا ینفعہ وضع الید والتصرف المدۃ المذکورۃ ولا تکون الحادثۃ من قبیل ما مضی علیہ خمس عشرۃ سنۃ، فاجبت نعم جواب المدعیٰ علیہ من قبیل دعوی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثہ اقرار لہٗ بالملك ثم دعواہ الانتقال الیہ منہ تحتاج الیٰ بینۃ لان کل مدع یحتاج الی البینۃ ولاینفعہ وضع الید المدۃ المذکورۃ مع الاقرار

المذکور ولیس ھذا من باب ترک الدعوٰی بل من باب المواخذۃ بالاقرار ومن اقر لشیٔ لغیرہ اخذ باقرارہ ولوکان فی یدہ احقابا کثیرًا لا تعد الخ
(الفتاوٰی الکاملیۃ ص۱۲۳ کتاب الدعوٰی)

وفی مجلۃ الاحکام : اذا ثبت من ادعی دفع الدعوٰی دفعہ تندفع دعوی المدعی ولا یحلف المدعی الاصلی بطلب صاحب الدفع۔ فان نکل المدعیٰ عن الیمین یثبت دفع المدعیٰ علیہ وان حلف تعود دعواہ الاصلیۃ۔
(المجلۃ الاحکام العدلیۃ المادۃ ۱۶۳۲ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی فی دفع الدعوٰی)

قال العلامۃ خالد اتاسیؒ : وان کان فعل غیرہ۔ کما اذا کان بقولہ اودعنیہ الغائب او آجرنیہ الیٰ قولہ یحلفہ علی العلم ای علیٰ انہ لایعلم ان المدعی بہ ودیعۃ اورھن اومستاجر ۔۔۔ وھوھذا الثانی ھو المعنی بقول صاحب ردالمحتار ویحلفہ علی العلم لانہ علیٰ فعل الغیر (شرح المجلۃ ج ۵ ص۷۵ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی فی دفع الدعوٰی)

قال العلامۃ علی حیدرؒ : واذا حلف المدعی تعود دعواہ الاصلیۃ وفی ھذہ الحال یکون فی اصل الدعوٰی احتمالان۔ الاحتمال الاول، ان تثبت دعوی المدعی نظرًا لکون دفع المدعیٰ علیہ یتضمن الاقرار وفی ھذا الحال یحکم باصل الدعوٰی کما ھو فی المثال المذکور آنفًا حیث ان دفع المدعی علیہ بقولہ انی ادیت المبلغ المدعی بہ ھو اقرار بالمبلغ المذکور فاذا لم یثبت المدعیٰ علیہ الاداء وحلف المدعی الیمین علیٰ عدم الاداء یحکم علی المدعیٰ علیہ باداء المبلغ المدعی بہ للمدعیٰ۔
(دررالحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۴ ص۲۲۴ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی)

دررالحکام کی عبارت مسطورہ سے معلوم ہوا کہ مُدعی فریق کے حلف اٹھانے کی صورت میں جبکہ مُدعیٰ علیہ اپنے دفع کے اثبات سے عاجز آجائے تو جیت مُدعی فریق کی ہوگی یعنی اس صورت میں فیصلہ اس کے حق میں کیا جاوے گا۔

مُدعی مُدعیٰ علیہ کو قسم دینے کے بعد گواہ پیش کرے | سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو آدمیوں کے درمیان ایک قطعہ زمین تھی، مدعی گواہوں کو کسی وجہ سے حاضر نہ کر سکا تو مدعیٰ علیہ کو قسم دینے کے بعد فیصلہ کر دیا گیا، بعدازاں مدعی کو گواہ مل گئے، تو کیا مدعی اب گواہ پیش کر سکتا ہے یا نہیں اور ان کی شہادت قبول ہو گی یا نہیں؟

الجواب:- نزاع کے حل کے لیے گواہ اصل اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اگر مدعی کسی وجہ سے مقدمہ میں گواہ پیش نہ کر سکے اور قاضی مدعیٰ علیہ کو قسم دے کر فیصلہ کر جائے اور بعدازاں مدعی کو گواہ مل جائیں اور وہ ان کو پیش کرنا چاہے تو کر سکتا ہے شرعاً ان کی گواہی قبول ہو گی اور گذشتہ فیصلہ کالعدم ہو گا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (سوال) هل تقبل البيّنة لو اقامها المدّعى بعد يمين المدعىٰ عليه؟

(الجواب) تسمع البيّنة وتقبل على ماهو الصواب كما صرح به فى شرح الملتقىٰ والتنوير وغيرهما من الدعوىٰ۔

قال فى التنوير: وتقبل البيّنةُ لو اقامها المدعى بعد يمين المدعىٰ عليه عند العامة وهو الصحيح۔ (العقود الدرية فى تنقيح الفتاوىٰ الحامدية ج۲ ص۲۱/۲۲ كتاب الدعوىٰ) [1]

مدعیٰ علیہ کے تصرفات پر اظہارِ رضامندی کے بعد دعویٰ کرنا | سوال:- ایک آدمی کا مسجد سے متصل ایک

---

[1] قال العلامة الحصكفیؒ: وتقبل البيّنة لو اقامها المدعى وان قال قبل اليمين لا بيّنة لى بعد يمين المدعىٰ عليه كما تقبل البيّنة بعد القضاء بالنكول عند العامة وهو الصحيح...... ولان اليمين كالخلف عن البيّنة فاذا جاءَ الاصل انتهىٰ حكم الخلف كانهٗ لم يوجد اصلاً۔ (الدرالمختار على هامش ردّ المحتار ج۴ ص۴۷۲ كتاب الدعوىٰ)

ومثلهٗ فى البحر الرائق ج۷ ص۲۰۶ كتاب الدعوىٰ۔

کمرہ ہے، اہلِ محلہ نے اس سے کہا کہ یہ کمرہ ہم کو دے دو ہم آپ کو اس کی قیمت دے دیں گے اور اس کمرے کو مسجد میں شامل کر دیں گے اس میں لوگ نمازیں پڑھیں گے، اس پر کمرے کے مالک نے کہا کہ میں روپے نہیں لیتا بلکہ اس کمرے کو مسجد کے لیے بنام خدا وقف کرتا ہوں، اس پر اہلِ محلہ نے اس کمرے کو مسجد میں شامل کر لیا، تقریباً دو سال تک محلہ کے لوگوں نے، خود اس کمرے کے مالک اور اس کے دوسرے بھائیوں نے اس میں نمازیں ادا کیں، مسجد میں باقاعدہ امام بھی مقرر کیا گیا، اب دو سال کے بعد کمرے کے مالک کے دوسرے بھائی نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کمرہ جو مسجد میں شامل کیا گیا ہے میرا ہے اور اپنے بھائی سے بھی اور اہلِ محلہ سے بھی جھگڑتا ہے اور لوگوں کو مسجد میں نماز بھی نہیں پڑھنے دیتا، حالانکہ اس آدمی نے خود بھی تقریباً دو سال تک اس مسجد میں نمازیں پڑھی ہیں اور اپنے بھائی کے فیصلے پر راضی تھا اور اس پر کسی قسم کا اعتراض بھی نہیں کیا۔ تو اب اس آدمی کا دو سال کے بعد مقدمہ چلانا کیسا ہے؟ کیا شرعاً اس کا یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جب اہلِ محلہ نے کمرے کو مسجد میں شامل کر لیا اور مالک نے اس کو بنام خدا مسجد کے لیے وقف کر دیا جس پر اس کے سب بھائی بھی راضی تھے اور دو سال تک کسی نے کوئی اعتراض نہیں بھی نہیں کیا تو اس رضامندگی کی وجہ سے ان کا حقِ دعویٰ ختم ہو گیا ہے اسلئے اب اگر ان میں سے کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت فیمن باع عقاراً وسلمه للمشتری وتصرف فیه زماناً وجارہ اوغیرہ حاضر یری البیع والتسلیم والتصرف وهو ساکتٌ بلامانع ثم یقوم ویدعی انه کله اوبعضه هل لاتسمع دعواه هذه؟ ــــ فالجواب: لاتسمع لما تقرر ان من یری غیره یبیع ارضاً او داراً فتصرف فیه المشتری زماناً والرائی ساکتٌ تسقط دعواه۔ (الفتاوی الکاملیة ص۱۱۴ کتاب الدعوی۔ مطلب لاتسمع دعوی من رأی البیع والتصرف)[1]

[1] قال العلامة خیرالدین الرملیؒ: (سئل) فیما لو باع شیئاً وبعض اقاربه یطلع علی بیعه وقبضه وتصرف المشتری فیه زماناً ثم ادعی فیه ملکاً هل تسمع دعواه ام لا ــــ (اجاب) قال کثیر من علمائنا اذا باع شخص عقاراً اوحیواناً اوثوباً اونحو ذلك وقبضه المشتری وتصرف فیه تصرف الملاك وبعض اقاربه مطلع علی ذلك ثم ادعاه او ادعی بعضه انه ملکه لاتسمع دعواه لان ذلك اقرار منه بانه ملك البائع قطعاً للاطماع الفاسدة وسد اباب التزویر والتلبیس الخ۔ (الفتاوی الخیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۷۲ کتاب الدعوی ومطالبه۔ مطلب باع شیئاً الخ) ومثله فی فتاوی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۵ کتاب الدعوی۔ باع داراً وقریبه حاضر تترك الدلیل ..... الخ

کاغذی ثبوت پیش کرنے کے بعد مدعیٰ علیہ کا انکار کرنا

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اِس مسئلہ کے بارے میں کہ فریقین (فریقِ اوّل محمد خان وغیرہ اور فریقِ ثانی اجمل خان وغیرہ) نے تحریری طور پر لکھ کر دیا کہ ہم متفقہ طور پر شرعی فیصلہ کروائیں گے، پھر ایک دینی مدرسہ میں آکر علماء کو یہ تحریر کرکے دے دیا کہ فریقِ اوّل محمد خان وغیرہ چھ ماہ تک اپنے حق کے ثبوت میں کاغذات پیش کرے گا اور اگر کاغذی طور پر اپنا حق ثابت نہ کرسکا تو اپنا قبضہ چھوڑ دے گا۔ فریقِ ثانی (اجمل خان وغیرہ) نے بھی اس بات پر رضامندی کا اظہار کردیا کہ ٹھیک ہے اگر اس (فریقِ اوّل) نے ثبوت پیش کردیا تو ہم اس کو یہ حق چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد فریقِ اوّل (محمد خان وغیرہ) نے چھ ماہ تک کاغذی طور پر اپنا حقِ ثبوت پیش کیا تو اس کے مخالف فریق اجمل خان وغیرہ نے کہا کہ اب ہم بھی اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے، یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا اور اپنے تحریری وعدہ سے منحرف ہوگیا، اب آنجناب شریعتِ مطہرہ کی رُو سے مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ اس شخص کا حکم یہ ہے کہ حاکم اس کو مقدمہ چلانے پر مجبور کرے گا، پھر دیکھا جائے گا کہ فیصلہ کس فریق کے حق میں کیا جاتا ہے۔

قال العلامۃ خالد اتاسی رحمہ اللہ : اذا اصر المدعیٰ علیہ علی سکوتہ الخ فیحبس حتی یقرا ویتکر ۔ (شرح المجلۃ تحت المادۃ ۱۸۲۲ ج ۶ ص۱۱۹ باب فی بیان احکام کتاب القاضی) [۱]

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ : واذا قال المدعیٰ علیہ لا اقر ولا انکر لا یستحلف بل یحبس لیقرا وینکر الخ۔ (الدر المختار ج۴ ص۱۴۲ کتاب الدعوٰی)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۰۳ کتاب الدعوٰی۔

سوال :۔ امارت اسلامی افغانستان کے صوبہ خوست میں ایک متنازعہ | **مدعیٰ بہ کے سامنے ہونے کی صورت میں اشارہ ہی کافی ہے**

زمین پر دو فریقین کے مابین دعویٰ ہے۔ فریق اول (مدعی) محمد قاسم ہے اور فریق ثانی (مدعی علیہ) محمد قیوم ہے، اس دعویٰ کے تصفیہ کے لیے دونوں نے مشترکہ طور پر دو محکمین مقرر کیے، ایک محکم مولانا انوار الحق صاحب اور دوسرے محکم مولانا سید گلزار صاحب ہیں۔ مدعی اور مدعی علیہ دونوں نے محکمین علماء کو متنازعہ زمین پر لے جاکر اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرکے دکھائی اور محکمین حضرات نے خود مشاہدہ کرکے دیکھ لی۔ اس کے بعد موقعہ پر ہی مدعی محمد قاسم نے اپنا دعویٰ لکھا اور اسی جگہ پر محکمین حضرات کو دے دیا تاکہ وہ اس کو پڑھ کر کوئی فیصلہ کرسکیں۔ تحریری دعویٰ دیکھ کر محکمین میں سے مولانا سید گلزار صاحب نے کہا کہ یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں زمین مدعیٰ بہا کا حدود اربعہ نہیں لکھا گیا، حدود اربعہ کا لکھنا ضروری ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ:

معلوم منہ المدعی بہ ان کان عقاراً تعیین ببیان حدودہ۔ (شرح المجلۃ لخالد الاتاسی ج ۵ ص ۱۴)

اس پر دوسرے محکم مولانا انوار الحق صاحب نے کہا کہ صورتِ دعویٰ درست ہے، اس لیے کہ اس متنازعہ زمین پر ہم کھڑے اور حاضر ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لہٰذا حدود لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، دلیل اس کی یہ ہے: والتعریف بالاشارۃ یکون صحیحاً فی کل نوع من المدعی به الموجود منقولاً اوکان عقاراً والوصف والتعریف یکون فی المدعی بہ الغائب وغیر الموجود۔ (درر الحکام ج ۴ ص ۱۶۱)

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ (۱) اگر کسی متنازعہ زمین کو قاضی یا محکم خود حاضر ہوکر مشاہدہ کرلے تو پھر حدود لکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) اوپر دی گئی صورت میں کون سا محکم فقہ حنفی کے موافق ہے؟ اور جو صورتِ دعویٰ اوپر دی گئی ہے وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ کوئی متنازعہ چیز جب مجلسِ قضاء میں برائے تصفیہ حاضر ہو تو اس کے تعین کے لیے صرف اشارہ ہی کافی ہوتا ہے، اس کے دیگر صفات اور حدود اربعہ وغیرہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، صرف اشارہ کردینے سے مدعیٰ بہ کا تعین ہوجاتا ہے، تاہم اگر متنازعہ چیز مجلسِ قضاء میں حاضر نہ ہو تو محکمین یا عدالت میں قاضی یا جج کے سامنے اس چیز کی تعریف بالاوصاف اور حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہوگا تاکہ نزاع ختم کرنے کے لیے

مدعیٰ بہ سب پر واضح ہو جائے۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ تکمین مدعی بہ زمین کے پاس کھڑے ہیں اور اشارہ کے ساتھ اس کی تعیین ممکن ہے، اس کے بعد کوئی جہالت وغیرہ باقی نہیں رہتی اس لیے حَکم مولانا نورالحق صاحب کی بات درست ہے۔

لما فی شرح المجلۃ: معلومیۃ المدعی بہ تکون بالاشارۃ اوبالوصف والتعریف هو اذا کان عیناً منقولاً وکان حاضراً فی مجلس المحاکمۃ فالاشارۃ کافیۃ۔ (المادۃ ۱۶۲۰۔ درالحکام ج۴ ص۱۸۵ کتاب الدعوی)

وفیہ ایضاً: کذلک لایشترط بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشہرتہ۔ (المادۃ ۱۶۲۳۔ درالحکام ج۴ ص۱۹۶ کتاب الدعوی)

وفیہ المسئلۃ الثانیۃ لایشترط عند الامامین بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشہرتہ لان الشہرۃ مغنیۃ عن التحدید وقد حصل المقصود بلاتحدید۔ (درالحکام ج۴ ص۱۹۹ کتاب الدعوی)

مقدار مدعیٰ بہ میں غلطی ہو جانا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! زمین کے ایک تنازعہ میں فریقین نے بندہ کو حَکم بنایا ہے۔ اب مدعی نے جس زمین پر دعویٰ کیا ہے اس میں اس نے حدود اربعہ تو صحیح بیان کیا ہے مگر مقدارِ زمین کے بیان میں غلطی کر گیا ہے اس زمین کی اصل مقدار ۲۰ کنال ہے جبکہ مدعی نے ۱۶ کنال کا ذکر کیا ہے۔ مدعیٰ علیہ کے وکیل ایک مولوی صاحب ہیں، ان کا کہنا ہے کہ متنازعہ زمین کی مقدار ۲۰ کنال ہے اور مدعی نے ۱۶ کنال ذکر کی ہے اس لیے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ تو کیا واقعی یہ دعویٰ صحیح نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

الجواب:۔ شرعاً دعویٰ کی صحت کے لیے مدعی کا مدعیٰ بہ صحیح اور درست حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ اگر مدعی سے مقدارِ رقبہ بتانے میں غلطی ہو جائے تو اس سے دعویٰ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، دعویٰ درست ہوگا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مدعی کا دعویٰ صحیح ہے اور مدعیٰ علیہ کے وکیل کا دعویٰ کو رد کرنا صحیح نہیں۔

لما فی مجلۃ الاحکام: اذا اصاب المدعی فی بیان الحدود واخطأ فی بیان مقدار ذراع العقار او دونہ لا یمنع صحۃ دعواہ۔

(مجلۃ الاحکام المادۃ ۱۶۲۴)

فیصلہ شرعی بین الفریقین

فریق اوّل : فاروق شاہ ولد احمد شاہ
فریق ثانی : عرب خان ولد شیر علی خان
ساکنان پانئی متنی

فقہاء اسلام کے تعریف مدعی اور مدعی علیہ : المدعی من یلتمس خلاف الظاھر و المدعی علیہ من یلتمس بظاھر (شرح المجلۃ لخالد اتاسی - ۵/۵)

وفی الھدایۃ المدعی من یتمسک بغیر الظاھر والمدعی علیہ من یتمسک بظاھر الی آخرہ (۳/۳۰۰)

وقال محمد المدعی علیہ ھو المنکر (الھدایۃ ۳/۳۰۰)

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تنازع میں دونوں فریقین مدعیان ہیں۔ لہٰذا ہم اولاد دونوں کے دعاوی کا جائزہ لیں گے کہ کونسا دعویٰ اصول شرع کے موافق اور براہین کے ساتھ اپنے مقصد کو ثابت کرتا ہے۔

فاروق شاہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نعیم شاہ نے اپنے جملہ جائیداد کو میرے والد احمد شاہ ولد ابنالی اپنے بھائی کے نام کئی سال پہلے کر دیا تھا اور اس کا سٹام میرے پاس موجود ہے۔

جائزہ یہ دعویٰ کئی وجوہات کی بنا پر اپنے مقصد کو ثابت کرنے میں ناقص ہے۔

(۱) جس اسٹام کا حوالہ مدعی دعویٰ میں دے چکا ہے اور بیان کے ساتھ وہ اسٹام منسلک ہے اس میں گواہ درج نہیں، جب کہ صرف اسٹام اثبات دعویٰ کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ فقہاء کرام کا فیصلہ ہے کہ صرف تحریر پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

کما قال ابن عابدین : لا یعتمد علی الخط ولا یعمل بمکتوب الوقف الذی علیہ خطوط القضاۃ الماضین - (رد المختار - ۵/۴۳۵) وہ اس لیے کہ الخط یشبہ الخط کی وجہ سے تحریر خبر واحد کے حکم میں ہو کر ناقابل احتجاج ہے۔

۲۔ مدعی فاروق شاہ اپنے دعویٰ ارث کے اثبات کے لیے گواہان بھی پیش نہ کر سکا جب کہ مدعی کے ذمہ قانون شرعی کے مطابق اثبات دعویٰ کے لیے گواہان کا پیش کرنا لازمی ہے۔ لقولہ علیہ السلام : البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر - (الحدیث)

(۳) اگر نعیم شاہ نے اپنا جملہ جائداد اپنے بھائی احمد شاہ کو ہبہ بھی کیا ہو لیکن انہوں نے بھائی کو موہوبہ اراضی قبضے میں نہیں دیا تھا جب کہ ہبہ تام ہونے کے لیے قبضہ شرعی کا ہونا ضروری ہے

بدون اس کے ہبہ صحیح نہیں ہوتا۔ چوں کہ مدعی بھی قبضہ نہ دینے کا مُقر ہے لہٰذا ہبہ تام نہ ہوا۔ اس لیے مدعا علیہ کو حلف دینے کی حاجت نہ رہی۔

کما قال ابراهیم حلبی: الهبة هی تملیك عین بلا عوض وتصح بایجاب و قبول وتتم بالقبض الکامل۔ فان قبض فی المجلس بلا اذن صح وبعده لابد من الاذن۔ (ملتقی الابحر علی صدر مجمع الانهر ۳/ ۴۸۹ تا ۴۹۲ کتاب الهبة)

قال المرغینانی: الهبة عقد مشروع وتصح بالایجاب والقبول والقبض۔ اما الایجاب والقبول فلانه عقد والعقد ینعقد بالایجاب والقبول۔ والقبض لا بد منه لثبوت الملك...... ولنا قوله علیه السلام: لا یجوز الهبة الا مقبوضة ..... فان قبضها الموهوب له فی المجلس بغیر اذن الواهب جاز استحساناً وان قبض بعد الافتراق لم یجز۔ (الهدایة ۔۳/ ۲۸۱ کتاب الهبة)

وفی مجلة الاحکام: تنعقد الهبة بالایجاب والقبول وتتم بالقبض قال سلیم رستم باز تحتها: الکامل لانها من التبرعات والتبرع لا یتم الا بالقبض۔ (شرح المجلة ۔ ۴۶۲)

۴۔ مکتوب (اسٹام) میں ذکر ہے کہ احمد شاہ ولد انبالی نعیم شاہ ولد انبالی کا اکیلا وارث ہے۔ جب کہ احمد شاہ ولد انبالی نعیم شاہ سے قبل فوت ہو چکا ہے اور وراثت کا تعلق موت کے بعد سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب احمد شاہ نعیم شاہ کا خود وارث نہ بن سکا تو اس کی اولاد بدرجہ اولی وارث نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ نعیم شاہ کا بھائی شیر علی ولد انبالی زندہ ہے۔ لہٰذا نعیم شاہ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد شیر علی کے نام ہوگی۔

دعویٰ عرب خان ولد شیر علی: موصوف کا دعویٰ ہے کہ نعیم شاہ ولد انبالی نے اپنے ہوش وحواس کی سالمیت کے ہوتے ہوئے ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو بارہ دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی مع پانی کے قیمتاً میرے ہاتھ فروخت کی ہے اور میرے پاس گواہ اسٹام پیپر سرکاری انتقالات کی فوٹو کاپیاں اور نعیم شاہ کی اپنی آواز کی کیسٹ موجود ہے۔

جائزہ۔ قانون شرعی کے مطابق کسی تنازع کے حل کے لیے اصول یہ ہے کہ مدعی خلاف ظاہر کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرے گا اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہو تو پھر مدعی کے مطالبہ پر مدعی علیہ سے قسم لی جائے گی۔ لما قال علیه الصلاة والسلام: البینة علی المدعی

والیمین علی من انکر (الحدیث)

اس لیے عرب شاہ ولد شیر علی کے ذمہ اثبات دعویٰ کے لیے گواہ پیش کرنا ہے جو کہ انہوں نے پیش کیے۔

(۱) چمن خان (۲) عبدالرحمٰن۔ پسران قدرت اللہ ساکنان بانڈی۔

نے کلمہ پڑھ کر گواہی دی کہ نعیم شاہ (مرحوم) نے ۵ مرلے مارکیٹ اور تین کنال اراضی مسمی عرب خان ولد شیر علی کے ہاتھ فروخت کی ہے ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

ان دونوں گواہوں کے علاوہ واحد شاہ، راحت شاہ اور گل نبی نے بھی گواہی دی۔ کہ نعیم شاہ نے اپنی مارکیٹ اور تین کنال اراضی کا عرب خان کو مالک بنایا ہے۔ اور نعیم شاہ نے ہمیں گواہ بنایا تھا۔ ہم بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ نعیم شاہ اپنی زندگی میں اس مذکورہ جائیداد کا مالک عرب خان کو ٹھہرایا ہے۔ اس کے ساتھ اقرارنامہ نمبر ۱۶۷۲۶ تحریر کردہ ۹۸/۴/۳۔ گواہان کے امضائات کے ساتھ پیش کیا جس میں تحریر ہے۔ من مسمی نعیم شاہ ولد اقبال خان عمر ۷۵ سال ..... بذریعہ تحریر ہذا مقر ہوں کہ میری ذاتی ملکیتی مارکیٹ واقع چوک بانڈی ۵ مرلہ جس میں ۱۲ دکان بعوض ۲۵۰۰۰ ہزار روپے فی دکان جن کی کل قیمت تین لاکھ ہوتی ہے اور علاوہ ازیں ایک کھیت تعدادی تین کنال آبی و فصلی بعوض ڈھائی ہزار فی مرلہ جس کی کل قیمت ڈیڑھ لاکھ ہوتی ہے اور ۴۰ منٹ پانی از ٹیوب ویل نمبر ۱۱ پانی برائے سرابی اراضی جس کی قیمت مبلغ ۷۰۰۰۰ ہزار روپے ہوتی ہے بطریقہ قطعی فروخت کرتا ہوں یہ کل رقم ۵۷۰۰۰۰ ۴ لاکھ نقد بوقت سپردگی مارکیٹ و کھیت و پانی وصول کر چکا ہوں مندرجہ بالا مملوکا جائیداد بدست مسمی عرب خان ولد شیر علی سکنہ بانڈی فروخت کردی ہے۔ تحریر ہذا من مقر نے بہ عقل سلیم اپنی مرضی سے حوالہ کرتا ہوں یہ ملکیت بلاشرکت غیرے میری ذاتی ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرے تو میں ہر قسم سے اس کا ذمہ دار ہوں گا۔

العبد نعیم شاہ ولد اقبال۔ راقم الحروف ملک سردار احمد نمبردار۔ گواہ مسلم علی، امیر زیب ولد ظہور علی، چمن خان ولد قدرت اللہ، عبدالرحمٰن ولد قدرت اللہ۔

اس کے علاوہ سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں بھی پیش کیے۔

اور اس کے ساتھ وہ کیسٹ بھی پیش کی جس میں نعیم شاہ ولد اقبال نے اپنی مارکیٹ، تین کنال اراضی مع پانی نمبر عرب خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا اقرار کیا ہے اور کئی لوگوں کو مخاطب کر کے گواہ بنایا ہے۔

قانون شرعی یہ ہے کہ جب کوئی مدعی اپنا دعویٰ پر بینہ پیش کرنے تو شرعاً قاضی پر لازم ہے کہ اس کے حق میں فیصلہ کرے کما فی مجلۃ الاحکام۔ (المادۃ ۱۸۱۸) ان أثبت المدعی دعواہ بالبینۃ حکم القاضی لہ بذلک۔ قال علی حیدر تحت ھذہ المادۃ ان اثبت المدعی دعواہ بالبینۃ ای: اذا شھد شھود وجرت تزکیتھم سراً وعلانیۃ فظھر انھم عدول ومقبولۃ الشھادۃ حکم القاضی بذلک۔ (درر الحکام۔ ۴/۶۴۵)

لہٰذا گواہان کی گواہی اور بطور تائید اسٹام میں تحریر شدہ اقرار نامہ جس پر گواہوں کے دستخط موجود ہے۔ سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ فوٹو کاپیاں اور ٹیپ شدہ بیان سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ نعیم شاہ ولد انبالی سکنہ پانی نے بقائمی ہوش و حواس اپنی ذاتی ملکیت ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو ۱۲ عدد دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی مع پانی نمبر کے عرب خان ولد شیر علی سکنہ پانی کے ہاتھوں فروخت کی ہے اور اس کو اپنی حیات ہی میں قبضہ دیا ہے جو آج تک عرب خان کے قبضہ میں ہے۔ شریعت مقدسہ میں جب دو فریق کے باہمی رضامندی سے ایک بار ایجاب قبول ہو کر عقد بیع ہو جائے تو پھر کسی کو بھی شرعاً اس عقد کے فسخ کا اختیار نہیں ہے۔

کما فی الھدایۃ: واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منھما الخ (۳/۲۵)

وفی ملتقی الابحر واذا وجد الایجاب والقبول لزم البیع بلا خیار (بحوالہ مجمع الأنھر۔ ۳/۱۰)

وھکذا فی الھندیۃ (۳/۸) وکذافی فتح القدیر (۵/۴۶۲)

اس لیے جملہ مدعی بہ (تین کنال اراضی مع پانی نمبر اور پندرہ مرلہ مارکیٹ) عرب خان ولد شیر علی کی زرخرید املکیت ہے۔ کسی کا اس پر دعویٰ ارث وغیرہ کرنا شرعاً صحیح نہیں۔

فیصلہ شرعی

فریق اول: فاروق شاہ بن احمد شاہ مدعی۔

فریق ثانی: شیر علی، نعیم شاہ، وغیرہ پسران انبالی۔

فریق اول: فاروق شاہ ولد احمد شاہ کا دعویٰ ہے کہ انبالی (جو شیر علی، نعیم شاہ وغیرہ کا باپ ہے) اور اس کے بھائی میر علی نے آج سے تقریباً ۵۰، ۶۰ سال قبل میرے والد احمد شاہ ولد انبالی کی زوجہ اول امرو بی بی (مرحومہ) جو ۵۰، ۶۰ سال قبل فوت ہو چکی ہے کے جائیداد کو باہمی تقسیم کیا ہے، جب کہ اس جائیداد کا حقدار میرا والد صاحب ہے اس لیے وہ مجھے واپس دیا جائے۔ جبکہ

مدعا علیہان مدعی کے اس دعویٰ ارث کے منکر ہیں۔

جائزہ : قانونی شرعی کے اندر ارث، وقف وغیرہ کے دعویٰ کے سماع کے لیے ضروری ہے کہ ۳۶ سال کے اندر اندر کیا جائے اگر بلاضرورت شرعی ۳۶ سال تک تاخیر کیا جائے تو شرعاً وہ دعویٰ قابل سماعت نہیں۔ اتنی مدت کی تاخیر سے سمجھا جائے گا کہ مدعی بہ مدعی کا حق نہیں ورنہ وہ اتنی تاخیر نہ کرتا۔

كما قال ابن عابدين : عن المبسوط اذا ترك الدعوى ثلاثا وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوى ثم ادعى لا تسمع دعواه لان ترك الدعوى مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهرا وفي الجامع الفتوى لا تسمع الدعوى بعد سته وثلاثين سنة الا ان يكون المدعى غائبا او صبيا او مجنونا وليس لهما ولي او المدعى عليه اميرا جائرا الى اخره (رد المختار ۶/۴۲۲)

وقال العلامة سليم رستم باز : اذا مضى على الدعوى ثلاثون سنة بلا عذر فلا تسمع وان امر السلطان بسماعها۔ (شرح المجلة ۹۸۳)

وقال علي حيدر، لذلك فالدعوى التي تترك سنه وثلاثين سنة بلا عذر لا تسمع مطلقاً حيث ان ترك الدعوى تلك المدة مع الاقتدار عليها وفقدان العذر يدل على عدم الحق۔

(درر الحكام شرح المجلة ۴/ ۲۹۵)

• وقال العلامة الخالد اتاسي ، عن جامع الفتاوى ان المتاخرين من اهل الفتوى قالوا لا تسمع بعد ستة وثلاثين سنة الا ان يكون المدعى غائبا او صبيا او مجنوناً وليس لهما ولي او المدعى عليه اميرا جائرا يخاف منه وعللوا ذلك بأن ترك الدعوى جميع هذه المدة مع تمكن منها دليل على عدم الحق ظاهراً۔ (شرح المجلة-۵/۱۶۷)

لہٰذا ان دلائل کے پیش نظر فاروق شاہ ولد احمد شاہ کا دعویٰ ارث چوں کہ ۶۰ سال گذر جانے کے بعد ہو رہا ہے۔ جب کہ اس دوران کوئی عذر شرعی جو دعویٰ سے مانع ہو موجود نہیں تھا۔ اس لیے شرعاً ان کا یہ دعویٰ قابل سماعت نہیں ہے۔ مدعی بہ انبالی اور اس کے بھائی میر علی کا منصور ہے اور ان کے بعد ان کے ورثاء کا حق ہے۔

باب التحکیم

(ثالثی کے احکام و مسائل)

ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کسی تنازع کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ ہر مستحق کو اس کا حق دلانا شریعت میں مطلوب و مقصود ہے اور حق دار کو جہاں کہیں سے بھی اپنے حق کے حصول کا اطمینان حاصل ہو جائے چاہے قاضی کے ذریعے سے ہو یا کسی اور کے ذریعے سے ہو تو اس میں شریعت نے فریقین کو اختیار دیا ہے کہ جس طرح ہر شخص کو دوسرے معاملات میں اپنے اوپر ولایت حاصل ہے اسی طرح تنازعات میں بھی اگر وہ اپنی ولایت کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے کسی شخص کو حَکَم مقرر کرے تو یہ جائز ہے لیکن اس میں فریقین کی باہمی رضامندی اور اتفاق رائے ضروری ہے، اگر کوئی بھی فریق ثالث مقرر کرنے سے انکار کرے تو صرف ایک فریق کی رائے سے ثالث مقرر کرنا جائز نہیں۔

کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا۔ (سورۃ النساء آیت ۳۵) [1]

کسی فاسق کو ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ شرعی امور میں غفلت کے مرتکب شخص کو کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی شخص سے اس وقت صحیح انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے جب وہ زہد و تقویٰ کی زینت سے آراستہ ہو کہ اس کے ہوتے ہوئے لوگوں کے تصفیہ طلب معاملات بہت احتیاط سے کام لے گا اور کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا، اور جو شخص زہد و تقویٰ سے خالی ہو اس سے

---

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: اذا حَکَّمَ رَجُلَانِ رجلاً فحَکَمَ بینھما ورضیا بحکمہ جاز۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم۔ کتاب آداب القاضی)

وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۸۴۱ ص۱۱۹۳ الباب الرابع فی المسائل المتعلقۃ بالتحکیم۔

صحیح انصاف کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے ثالث تب صحیح فیصلہ کرسکے گا جب وہ شرعی امور کا پابند ہو اور احکامات شرعیہ کی بجاآوری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا ہو لہٰذا ابتداءً فاسق کو ثالث مقرر کرنا درست نہیں لیکن اگر فریقین نے باہمی رضامندی سے مقرر کرلیا ہو اور اس کا فیصلہ شرعی قواعد و ضوابط کے موافق ہو تو وہ شرعاً نافذ العمل ہوگا، چونکہ فریقین میں سے ہر ایک کو فیصلے سے قبل رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے کوئی بھی فریق فیصلے سے قبل اس کو زائل کرسکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وافاد بقولہ لو صلح قاضیاً جواز تحکیم المرأۃ والفاسق لصلاحیتهما للقضاء والاولی ان لا یحکما فاسقاً۔
(البحر الرائق ج ۷ ص۲۶ باب التحکیم) [۱]

دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: دراصل فریقین کے تنازعہ کا حل نکالنا اور ہر ایک کو اپنا حق دلانا ثالث کی اہم ذمہ داری ہے اور ثالث یہ ذمہ داری اس وقت صحیح طریقے سے نبھا سکتا ہے جب وہ دینی امور سے واقف ہو کیونکہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے واقفیت کے بغیر ان حقوق کے تحفظ کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے دینی امور سے واقف عالم کے ہوتے ہوئے کسی غیر عالم کو ثالث مقرر کرنا مناسب نہیں، البتہ اگر غیر عالم کو ثالث مقرر کیا گیا تو جائز ہے لیکن اس پر لازم ہے کہ تنازعات کے تصفیہ میں ذاتی رائے قائم کرنے سے گریز کرے اور مسائل میں علماء سے رجوع کرے اس لیے کہ اگر اس کا فیصلہ شرعی اصول و ضوابط کے موافق ہو تو نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: انہ یمکنہ ان یقضی بفتوی غیرہ ومقصود القضاء

---

[۱] قال العلامة المرغینانیؒ:۔ والفاسق اذا حکم یجب ان یجوز عندنا کما مر فی المولی۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم، کتاب آداب القاضی)
ومثلہ فی ردالمحتار ج۴ ص۳۸۶ کتاب القضاء، باب التحکیم۔

يحصل به وهو ايصال الحق الى مستحقه - (الهداية ج ۳ ص ۱۳۲ ادب القاضي) [۱]

ثالث کا شرعی اصول کے خلاف فیصلہ کرنے کا حکم

سوال: دو بھائیوں نے مشترک مال سے ۵۰۰ کنال زمین خریدی ان میں سے ایک بھائی کا انتقال ہوگیا، اس کے وارثوں میں ایک نابالغ بیٹا موجود ہے، بھائی کے انتقال کے بعد دوسرا بھائی اس کی زمین میں تصرف کرتا رہا، جب متوفی کا بیٹا بالغ ہوا تو اس نے اپنے حصے کی زمین کا مطالبہ کیا، دونوں نے فیصلے کے لیے ایک ثالث مقرر کیا، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۵ کنال زمین متوفی بھائی کے بیٹے کو دی جائے گی اور باقی زمین دوسرے بھائی کی ملک میں رہے گی، اس وقت اس فیصلے پر دونوں راضی تھے لیکن متوفی کے بیٹے نے بعد میں انکار کیا، تو کیا شریعت کی رُو سے ثالث کا یہ فیصلہ شرعاً نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے اگر ثالث کو کسی متنازعہ معاملہ میں فریقین میں فیصلے کا اختیار دیا ہے تو اس میں یہ شرط لازمی قرار دی ہے کہ اس کا فیصلہ قرآن و سنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو، اگر اس کا فیصلہ ان امور میں سے کسی کے بھی خلاف ہو تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، تاہم فریقین میں سے کوئی ایک فریق اپنا حق معاف کر کے ثالث کے فیصلہ کو دوام بخش سکتا ہے، اس لیے حسبِ بیان مذکورہ بالا ثالث کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی ہے کیونکہ اگر متوفی اور زندہ موجود بھائی نے مشترکہ مساوی مال سے زمین خریدی ہو تو اس زمین میں متوفی نصف حصے کا حقدار ہے اور اس کا یہ نصف حصہ اس کے وارثوں میں وراثت کے شرعی اصول کے تحت تقسیم کیا جائے گا، صورتِ مسئولہ میں ثالث کا فیصلہ چونکہ قرآنِ کریم اور سُنت کے اصول کے منافی ہے اس لیے شرعاً نافذ نہیں، جب نافذ ہی نہیں تو فریقین میں سے ہر کوئی اس کو رد کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابو بكر بن مسعود الكاسانيؒ: فان وقع فی فصل فيه نص مفسر من الكتٰب او الخبر المتواتر او الاجماع فان وافق قضاءه ذلك نفذ ولا يحل له النقض

---

[۱] قال العلامة الكاسانيؒ: لانه يمكنه ان يقضى بعلم غيره بالرجوع الى فتوىٰ غيره من العلماء - (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳ فصل التحكيم، كتاب آداب القاضي)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۳ كتاب القضاء -

لانہ وقع صحیحاً قطعاً وان خالف شیئاً من ذٰلك یردہ لانہٗ وقع باطلاً قطعاً۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۴ کتاب آداب القاضی ۔فصل واما بیان ماینفذ من القضایا ... منہا) لہ

قاضی اور حَکَم کا فرق

سوال :۔ بعض علاقوں میں لوگ باپ دادا کے قانون کے موافق اپنے فیصلے عدالتوں سے کراتے ہیں، اس میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی نہیں ہوتا، اور بعض لوگوں نے شریعت کے مطابق فیصلے کے لیے باقاعدہ ایک عالم مقرر کیا ہوتا ہے جو اُن کو جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی پڑھاتا ہے، تو کیا شرعاً اس کو قاضی تصور کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب :۔ قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فیصلوں کے بارے میں بااختیار ہو اور ہر خاص وعام پر اس کو یکساں ولایت حاصل ہو کیونکہ اختیارات میں معمولی سی کمی بیشی کے باعث لوگوں میں صحیح فیصلے کرنے سے قاصر رہے گا جس کی وجہ سے قضاء کا مقصد پورا نہیں ہوسکے گا، اور قاضی کو یہ مکمل اختیارات تب حاصل ہوں گے جب اس کو حکومتِ وقت نامزد کرے کیونکہ قاضی حکومت کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور فریقین اپنی مرضی سے جس کو فیصلوں کے لیے مقرر کریں اس کو تو صرف ان لوگوں پر اختیارات حاصل ہوں گے جنہوں نے اس کو مقرر کیا ہو، ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو اختیارات حاصل نہیں، اس لیے اگر لوگ اپنے فیصلوں کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ حَکَم ہوگا قاضی نہیں؟

لما قال العلامۃ اکمل الدین محمد بن محمود البابرتیؒ: ان المحکم ادنیٰ مرتبۃ من القاضی لاقتصار حکمہ علیٰ من رضی بحکمہ وعموم ولایۃ القاضی۔ (العنایۃ علیٰ ہامش فتح القدیر ج۶ ص۳۶۰ باب التحکیم ۔کتاب آداب القاضی) ۲ہ

لہ قال العلامۃ ابن قاضی سماوۃؒ: قضایا القضاۃ ثلاثۃ اقسام (۱) حکم بخلاف نص او اجماع وھٰذا باطل فلکل من القضاۃ نقضہ اذا رفع الیہ ولیس لاحد ان یجیزہ۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۳۳ الفصل الثانی فی القضاء فی المجتہد فیہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج ۷ ص۱۱ کتاب ادب القضاء ۔ باب التحکیم۔

۲ہ لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: عرفاً تولیۃ الخصمین حاکماً یحکم بینہما ورکنہ علیہ مع قبول الآخر۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج ۴ ص۳۸۶ ۔ باب التحکیم ۔کتاب القضاء)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۷ ص۲۴ کتاب آداب القاضی۔ باب التحکیم۔

معزول ثالث کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

سوال:۔ فریقین نے دو آدمیوں کو زمین کے تنازعہ میں ثالث مقرر کیا، بعد میں کسی وجہ سے ایک فریق کا دونوں ثالثوں پر اعتماد باقی نہ رہا اور اس نے فیصلے سے پہلے ان دونوں کو معزول کرنے کا باقاعدہ اظہار کیا لیکن اس کے باوجود ثالثوں نے فیصلہ کر دیا، تو کیا ثالثوں کا فیصلہ نافذ العمل ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ان دونوں آدمیوں کو فریقین نے چونکہ اپنی طرف سے ثالث مقرر کیا ہے لہٰذا فریقین میں سے اگر کوئی بھی ان کو معزول کرنا چاہے تو فیصلے سے قبل ان کو یہ اختیار حاصل ہے، جب ایک فریق نے دونوں ثالثوں پر عدم اعتماد یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو معزول کر دیا تو اب ان کی تحکیم کالعدم ہوگی اور ان کا فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: لو عزل احد الخصمین قبل الحکم لم ینفذ حکمه علیه۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۹ الفصل الخامس فی التحکیم۔ کتاب القضاء)[1]

فریقین کا تحکیم سے رجوع کے بعد حَکَم کیلئے اُجرت لینا جائز نہیں

سوال: فریقین فیصلہ کے لیے ایک قاضی کے پاس گئے، اُس نے فیصلے پر پندرہ (۱۵) روپے اُجرت پیشگی وصول کی، فریقین کی سستی کی وجہ سے ابھی تک فیصلہ نہیں ہوسکا، اب فریقین قاضی سے اُجرت واپس کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن قاضی اُجرت واپس کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سستی تمہاری طرف سے ہوئی ہے اس لیے میں پیشگی لی ہوئی اُجرت واپس نہیں کروں گا، تو کیا قاضی کے لیے فیصلے سے قبل اُجرت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ قاضی شرعی قاضی نہیں کیونکہ قاضی تو حکومت کی طرف سے مقرر

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: وقال انه یخرج عن الحکومة باحد اسباب ثلاثة بالعزل او بانتهاء الحکومة نهایتها بان کان موقتاً فمضی الوقت او بخروجه من ان یکون اهلاً للشهادة۔

(البحر الرائق ج ۷ ص۲۸ باب التحکیم)

و مثله فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص۳۸۶ کتاب القضاء۔ باب التحکیم۔

ہوتا ہے، جب فریقین فیصلے کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ محکَّم ہوتا ہے اور تحکیم میں چونکہ فیصلے سے قبل فریقین کو رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے ان میں سے اگر ایک فریق یا دونوں رجوع کر لیں تو یہ تحکیم فسخ ہو جائے گی، جب تحکیم فسخ ہو جائے تو محکم اجرت کا مستحق نہیں رہتا، ان کے مابین اجارہ تحکیم پر ہوتا ہے، جب فریقین رجوع کرلیں تو اجارہ بھی فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ اجارہ محض عقد سے لازم نہیں آتا بلکہ جو شرط اس میں لگائی گئی ہو اس کا پورا ہونا ضروری ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں حَکَم کو یہ رقم لینا جائز نہیں۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: والاجرۃ لا یلزم بالعقد فلا یجب تسلیمه بل بتعجیله او شرطه فی الاجارۃ۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۷ کتاب الاجارۃ) [1]

علاقائی اصلاحی کمیٹی کی شرعی حیثیت

سوال: مروجہ اصلاحی کمیٹیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کے کسی فیصلے سے انکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: علاقائی اصلاحی کمیٹیاں جو کہ اکثر علاقہ کے معززین پر مشتمل ہوتی ہیں جو کہ لوگوں کے تنازعات ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن فیصلوں کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر نہیں ہوتیں بلکہ فریقین جب ان سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں تو اپنی طرف سے فیصلے کا اختیار دیتے ہیں اور جس فیصلے میں بھی اختیار حکومت کی بجائے عوام کی طرف سے ملتا ہے تو ان اختیارات کے تحت فیصلے کرنے والے کی شرعی حیثیت مثل حَکَم کے ہوتی ہے، تو جس طرح فریقین کو حَکَم کے فیصلے سے پہلے رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح جب حَکَم فیصلہ کردے تو پھر فریقین کے لیے اس کا تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے، اسلئے اگر کسی اصلاحی کمیٹی کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار جائز نہیں۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: اذا حکم لزمهما لصدور حکمه عن ولایة علیهما۔

{الهدایة ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم، کتاب آداب القاضی} [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: لا تلزم الاجرۃ بالعقد المطلق یعنی لا یلزم تسلیم بدل الاجارۃ حالاً بمجرد انعقادها۔ (شرح مجلة الاحکام، المادۃ ۴۶۶ ص۲۶۱ الفصل الثانی فی المسائل المتعلقة الخ)
ومثله فی الهدایة ج۳ ص۲۹۲ کتاب الاجارۃ، باب الاجر متی یستحق۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: اذا حکم صار لازماً۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب آداب القاضی)
ومثله فی شرح مجلة الاحکام۔ المادۃ ۱۸۴۸ ص۱۱۹۸ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بالتحکیم۔

کسی فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کے فیصلے کا حکم

سوال:۔ فریقین میں سے ایک فریق غائب ہے اور ثالثوں نے اس کی عدم موجودگی میں فیصلہ دوسرے فریق کے حق میں کر دیا، تو کیا ثالثوں کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر فریقین نے ثالثوں کو باقاعدہ فیصلے کا اختیار دیا ہو اور فیصلے سے قبل کسی ایک فریق نے بھی ان سے رجوع نہ کیا ہو تو ثالثوں کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کے بیانات وغیرہ حاصل کریں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں، اگر ثالثوں نے طرفین سے بیانات وغیرہ حاصل نہ کیے ہوں اور محض ایک فریق کے بیانات پر فیصلہ کیا ہو تو وہ فیصلہ جائز نہیں، کیونکہ جس طرح قضاء میں یہ ضروری ہے کہ مدعیٰ علیہ قضاء کے وقت عدالت میں حاضر ہو، اگر وہ خود حاضر نہیں ہوتا اور اپنی طرف سے وکیل وغیرہ مقرر کیا ہو تو اس کا حاضر ہونا ضروری ہے کیونکہ مدعیٰ علیہ یا اس کی طرف سے مقرر شدہ خصم کی عدم موجودگی میں مقدمہ کی صورتحال کی پوری وضاحت مشکل ہے تو جب قضاء میں مدعیٰ علیہ کا موجود ہونا ضروری ہے تو تحکیم جو کہ اس سے کم درجہ رکھتی ہے اس میں بطریق اولیٰ اس کی موجودگی ضروری ہے لہٰذا ایک فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کا یکطرفہ فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: ولا يقضي القاضي على غائب الا ان يحضر من يقوم مقامه۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۴۲ باب كتاب القاضي الى القاضي) [1]

ثالث کے فیصلے سے انکار کا حکم

سوال:۔ دو اشخاص کے درمیان زمین کی حدود پر تنازعہ ہوا، ان دونوں کے درمیان جرگہ نے فیصلہ کیا اور دونوں اس فیصلے پر راضی ہوئے، ان میں سے ایک نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ مجھے یہ فیصلہ منظور ہے اور اس کی حدود نہیں توڑوں گا لیکن تین چار ماہ گذرنے کے بعد وہ اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا اور فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور حدود بھی توڑ دیئے، تو کیا جرگہ کے فیصلہ کے بعد اس سے انکار کرنا

---

[1] قال العلامة الكاساني رحمه الله: اما الذي يرجع الى المقضي عليه فحضرته حتى لا يجوز القضاء على الغائب اذا لم يكن عنه خصم حاضر وهذا عندنا۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۸ كتاب آداب القاضي۔ فصل واما شرائط القضاء فانواع الخ)
ومثله في البحر الرائق ج ۷ ص ۱۷ باب كتاب القاضي الى القاضي۔

درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگران دونوں نے اپنی مرضی سے ثالث مقرر کئے ہوں اور مدتِ تحکیم کے اندر ان ثالثوں نے فیصلہ کیا ہو اور ان کا فیصلہ شریعت کے موافق ہو تو وہ نافذ العمل ہے، کیونکہ تحکیم کی وجہ سے ثالثوں کو ان دونوں پر مکمل اختیار حاصل ہے اس لیے ان کا فیصلہ دونوں فریقوں پر تسلیم کرنا لازم ہے، لہٰذا فیصلہ کے بعد کسی بھی فریق کا اس سے انکار کرنا درست نہیں، اسی قسم توڑنے کے بدلے اس پر کفارہ لازم آئے گا ۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: اذا حکم لزمهما لصدور حکمه عن ولایة علیهما ۔
(الهدایة ج ۳ ص۱۴۳ باب کتاب القاضی الی القاضی)[1]

ثالث معزول کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر فریقین کسی کو ثالث مقرر کریں تو ان میں سے کوئی فریق اس کو معزول کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب فریقین اپنی مرضی سے کسی کو ثالث مقرر کریں اور اس کو فیصلے کا اختیار دیدیں تو ثالث کو چونکہ فیصلے کا اختیار ان دونوں کی وجہ سے ملا ہے، اس لیے اگر ثالث کے فیصلے سے قبل کسی بھی فریق کو اس پر اعتماد باقی نہ رہے یا کسی اور وجہ سے اس کو معزول کرنا چاہے تو جیسا کہ قاضی کو فیصلوں کا اختیار حکومت سے مل جاتا ہے اور حکومت کو ہر وقت اس کے معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے اسی طرح فریقین میں سے ہر ایک کو ثالث معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے ۔

قال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لکل من الخصمین عزل الحکم قبل الحکم لانه مقلد من جهتهما فکان لکل منهم عزله وهو من الامور الجائزة فینفرد احدهما بنقضه کما ینفرد احد العاقدین فی مضاربة وشرکة ووکالة ۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۷ ص۱۱۹۳ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بالتحکیم)[2]

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: واذا حکم صار لازماً ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب ادب القاضی)
ومِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۸ ص۱۱۹۸ کتاب الدعوی ۔

[2] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: (وینفرد احدهما بنقضه) ای التحکیم بعد وقوعه (کما) ینفرد احد العاقدین (فی مضاربة وشرکة ووکالة) بلا التماس طالب ۔
(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۳۸۲ باب التحکیم)
ومِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۹ کتاب القضاء ۔

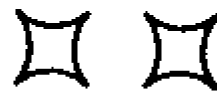
فیصلے کے لیے مقرر کردہ کمیٹی کے ارکان کے باہمی اختلاف کا حکم

سوال :۔ فریقین نے تنازعہ کے فیصلے کا اختیار چند افراد پر مشتمل کمیٹی کو دیا، فیصلے کے بارے میں کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوگیا، بعض ارکان نے مخالفت کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے ایک فریق کے حق میں فیصلہ سُنا دیا، تو کیا ان کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب :۔ چونکہ تنازعہ کے بارے میں کمیٹی کو فیصلے کا اختیار فریقین کی طرف سے ملا ہے اس لیے اس کمیٹی کی حیثیت حَکَم کی طرح ہے اور فریقین فیصلہ کا اختیار دیتے وقت ثالث پر جو بھی شرائط عائد کریں ثالث پران کی پابندی کرنا لازمی ہے، اگر ثالث ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی کرے تو کوئی بھی فریق اس کے فیصلے کو رد کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اسی طرح مذکورہ صورت میں جب فریقین نے اپنے فیصلے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین نے کمیٹی کے تمام ارکان کو فیصلے کا اختیار دیا اور فیصلے میں کمیٹی کے تمام افراد کے اتفاق رائے کو شرط قرار دیا اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر متعدد ثالثوں میں سے ایک بھی فیصلہ کی مخالفت کرے تو فیصلہ نافذ نہیں ہوگا ــــــــ لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال جب کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوا تو اختلاف کے ہوتے ہوئے بعض ارکان کا اپنے طور پر فیصلہ کرنا جائز نہیں اس لیے فیصلہ نافذ العمل نہیں۔

لما قال العلامة سليم رستم بازاللبنانيؒ : اذا تعدد المحكمون على ما ذكر آنفاً يلزم اتفاق رأى كلهم وليس لواحد منهم ان يحكم وحده۔

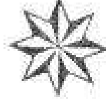
لہ { شرح مجلة الاحكام، المادة ١٨٤٤ ص١١٩٦ الباب الرابع فى المسائل المتعلقة بالتحكيم }



لہ قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله : ولو حكما رجلين فحكم احدهما لم يجز ولا بد من اتفاقهما على المحكوم به فلو اختلفا لم يجز ۔

(البحر الرائق ج۷ ص۲۶ باب التحكيم)

اسلامی قوانین ٥ جامعیت واہمیت



دنیا کے اندر ملکی نظام کو چلانے ، شاندار حکومت کرنے اور ملک وملت میں امن وامان پیدا کرنے کے لیے مختلف نظریات کے تحت قوانین بنائے گئے اور ان کے اجراء ونفاذ کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے گئے لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا بلکہ بدامنی اور لاقانونیت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوا۔ کسی کی جان ، مال اور عزت وآبرو نہ پہلے محفوظ تھی نہ اب ہے۔ اس بارے میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ قوانین انسانی ذہن کی اختراع ہیں اس لئے آئے دن ان میں کوئی نہ کوئی تبدیلی سامنے آتی رہتی ہیں جس سے امن ومسائل مزید پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔

اسلامی قوانین چونکہ منزل من اللہ ہیں اس لئے انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور ان پر عمل کرکے ہی امن وامان دہشت گردی جیسے بین الاقوامی مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر جامعہ حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مقالہ بعنوان "اسلامی قوانین ، جامعیت واہمیت" لکھا جسے شائع کرنے کا اعزاز بھی ماہنامہ الحق نے حاصل کیا۔ اب اس مقالہ کو فقہ اور فتاویٰ کی مناسبت سے افادۂ عوام وخواص کے لیے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

اسلامی قوانین / جامعیت و اہمیت

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہٗ

انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے معاشرہ سے اس کا تعلق لازمی ہے۔ تجرد، انفرادیت اور رہبانیت شرعاً اور عقلاً ہر لحاظ سے قبیح سمجھی جاتی ہے۔ انسان کائنات عالم کی خوبصورتی اور زینت ہے، یہ خوبصورتی ایک اچھے معاشرہ کی صورت میں باقی رہے گی، انسان کی ضروریات اور حوائج کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی جملہ ضروریات بذات خود پورا نہیں کر سکتا بلکہ معاشرہ میں رہ کر ایک دوسرے سے فائدہ اور استفادہ کی ضرورت ہوگی۔

قانون کی حقیقت فائدہ اور استفادہ میں اگر انسان کو کھلے طور پر اجازت دی جائے اور اس پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے تو اس سے انسان کی زندگی تباہ ہوگی۔ ایسی صورت میں جبر و تشدد، حرص و لالچ، ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگا۔ انسانی زندگی گذارنے کے لیے، انسانی معاشرہ کے لیے ضابطۂ حیات ضروری امر ہے کہ جس میں معاشرہ بربادی سے محفوظ ہو، انسان کی زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں جس میں اس کو کسی قانون کی ضرورت نہ ہو، مثلاً اگر انسان کی ابتدائی زندگی یعنی بچپن میں اس کا تحفظ قانونی ذریعہ سے نہ ہو تو اس سے اس کی تربیت و تعلیم کا پیارا مرحلہ ضائع ہو سکتا ہے۔ اگر جوانی میں کسی ضابطۂ حیات کی پابندی کا احساس نہ ہو تو اس سے انسان شباب کے وقت ایسی راہ پر چل سکتا ہے جس سے اس کے تباہ ہونے کا خطرہ ہے، اگر بڑھاپے اور ناتوانی کی حالت میں انسان کو مکمل تحفظ میسر نہ ہو تو اس سے خودکشی جیسے قبیح امور کے ارتکاب کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، غرضیکہ انسان زندگی کے ہر مرحلہ میں کسی نہ کسی ضابطۂ حیات کا محتاج ہے۔

انسانی زندگی کے سنوارنے کے لیے اس ضابطۂ حیات کا دوسرا نام "قانون" اور "آئین" ہے۔ علماء قانون کی نظر میں اس کی جامع تعریف یوں کی گئی ہے:

"قانون ایسے مجموعہ کا نام ہے جس میں مروجہ مسلمہ سماجی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی قدروں کا تحفظ کیا جائے۔"

قانون کی ضرورت اسلام کی نظر میں تو مکلف انسان قانون اور ضابطہ کا پابند ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الدنیا سجن المؤمن"۔ دنیا مسلمان کے لیے ایک جیلخانہ ہے جہاں اس کی ہر ایک حرکت قانون اور ضابطہ کے تحت ہو گی۔ مذہب کے لحاظ سے یہ پابندی لازمی امر ہے۔ آج کے نام نہاد جمہوریت پسند اور حریت پسند لوگ بھی قانون کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے، ان کے ہاں بھی قانون کی پابندی لازمی امر ہے، اگرچہ زبان پر آزادی کا خوشنما نعرہ ہر وقت دھوکہ دینے کے لیے جاری رہتا ہے لیکن ان کی آزادی کی حقیقت صرف اور صرف مذہب اور عقیدہ سے آزادی سے عبارت ہے۔ آج اگر یورپی ممالک کی مثال لی جائے تو وہاں پر قانون کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً لاکھوں لوگ مغربی ممالک میں رہائش چاہتے ہیں لیکن قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہاں رہائش نہیں رکھ سکتے، اس لیے کہ قانون ہی ان لاکھوں افراد کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر انسانی خواہشات کو پابند رکھنا جرم ہو تو پھر سب سے بڑے مجرم آج ترقی یافتہ ممالک ہیں جنہوں نے غریب ممالک کے لوگوں پر اپنے ملک کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ان ممالک میں تاجر و مالک، کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان تعلقات بنانے کا واحد ذریعہ قانون سمجھا جاتا ہے، جب ترقی یافتہ ممالک کی کشتی قانون کے بغیر نہیں چل سکتی تو ترقی پذیر ممالک میں قانون کی ضرورت اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔

قانون کی ابتداء اسلامی نقطہ نظر سے قانون کی ابتداء ہبوطِ آدم سے شروع ہوئی ہے۔ گویا جب انسان کو خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا گیا تو خلافت کے نظم و نسق کے لیے قانون کی ضرورت خود بخود محسوس ہوئی۔ موجودہ دور کے قانونی ماہرین کی رائے یہ ہے کہ خاندان اور قبیلہ کے وجود کے ساتھ ہی دنیا میں قانون کا ظہور ہوا۔

انسان نے حرص اور لالچ سے جب ہم نوع کے حقوق پر دست درازی شروع کی تو حقوق کی حفاظت کے فطری جذبہ نے لوگوں میں قانون کی ضرورت کا احساس ابھارا۔ چنانچہ غیر اختیاری طور پر خاندانوں اور قبیلوں میں عرف، رواج یا دوسرے ایسے قواعد و ضوابط پیدا ہوئے جن کے تحت زندگی گذارنی ضروری ہوئی۔ جُوں جُوں خاندان اور قبیلہ میں وسعت پیدا ہوتی گئی تو قانون کی ضرورت میں بھی شدت ہوتی رہی اور قانون کو معاشرہ کے تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ کرنے کیلئے جدت اور تبدیلی لازم قرار پائی، یہ قانون کے لیے اگرچہ طفولیت کے ادوار تھے، لیکن پھر ایک خاندان اور قبیلہ میں قانون لازمی امر رہا۔ خاندان اور قبیلہ سے انسانی معاشرہ جب ریاست کی شکل میں تبدیل ہوا تو قانون نے دوسرا قدم اٹھایا، اور جب ریاست سے سلطنت اور حکومت کی صورتیں سامنے آئیں تو اس سے

قانون میں اور بھی جدت پیدا ہوئی۔ گویا انسانی زندگی کے اول روز سے ہی قانون کو اہم حیثیت حاصل رہی ہے۔

قانون کی قسمیں تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی اصلاح کے لیے دو قسم کے قوانین وضع ہوئے۔ پہلی قسم کا قانون وہ ہے جو انسان نے خود اپنے لیے بنایا، مقنن خود بھی اس کا پابند رہا، اس قانون میں عموماً وقت اور حالات کی رعایت ہوتی رہی اور مقنن معاشرہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر قانون مرتب کرتا رہا، جب حالات کی تبدیلی ایک لازمی امر تھا تو اس قانون میں بھی ترمیم و اضافے روزمرہ کا ایک معمول بن گیا۔ قانون کی اس قسم کو ہم "انسانی قانون" سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ اس کا بنانے والا خود انسان ہوتا ہے اور یہ انسانی دماغ کا اثر ہے۔

دوسری قسم کا قانون وہ ہے جس کا بنانے والا بالائی طاقت رہی، یعنی مقنن نے اپنی ضروریات کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی ضروریات کے لیے قانون وضع کیا، اس میں وقتی مصلحت یا حالات کی ضرورت کی رعایت نہیں رکھی گئی بلکہ ابدی ضرورت کو مدنظر رکھ کر قانون بنایا تھا اس لیے وقت اور ضرورت کی تبدیلی سے اس کی قانونی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، یہ عمر بھر کے لیے قابلِ عمل رہا، اس قانون کو "رحمانی قانون" کہا جاتا ہے۔

انسانی قانون کی حقیقت آج قانون کا لفظ بول کر معاشرہ میں اس سے اول الذکر قانون مراد لیا جاتا ہے، بلکہ بعض لوگ جو ذہنی جمود کا شکار ہوتے ہیں ان کے نزدیک قانون صرف انسانی قانون سے عبارت ہے، مذہب یا عقیدہ کا قانون سے کوئی رشتہ نہیں، ان لوگوں کے نزدیک قانون اجتماعی زندگی کا محافظ ہے جبکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قانون ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات کا تعین کرتا ہے جبکہ مذہب خدا اور انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے۔ یہ رائے حقیقت اور واقعات سے صریح مخالف ہے لہٰذا ایسی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ انسانی قانون نے کچھ اچھے ثمرات بھی دکھائے لیکن "واثمھما اکبر من نفعھما"، یعنی ثمرات سے مضرات زیادہ ہیں۔ قانون کی یہ شکل ہر دور میں مختلف رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں قانون امیر یا خاندانی سربراہ کی زبان سے نکلی ہوئی بات ہوتی، خاندانی سربراہ جو قاعدہ یا ضابطہ مقرر کرتا اُسے قانون کا درجہ حاصل ہوتا، کسی کو اس سے مخالفت کی جرأت نہ ہوتی اور خلاف ورزی کی صورت میں بڑی شدت سے اس کا محاسبہ کیا جاتا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب انسانی حقوق کے تحفظ کا نیا نعرہ لگا کر جمہوریت کی آواز بلند ہوئی تو اس سے قانون بنانے کے طریقہ کار میں کافی تبدیلی آئی موجودہ وقت کے قانونی ذخائر اور حالات و واقعات خاص کر جمہوری اصول کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں انسانی قانون کے بنانے والے تین شعبے ہیں۔

مقننہ کے مختلف شعبے انسانی قانون بنانے میں تین شعبوں کا بڑا دخل ہے، گویا یہ تینوں شعبے انسانی قانون کے ماخذ اور مراجع ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) سربراہِ مملکت (۲) آئین ساز ادارے (۳) عدالتی نظائر

سربراہِ مملکت یہ شعبہ قدیم دور کے خاندانی سربراہ کی ایک جدید شکل ہے، البتہ قدیم دور میں خاندانی سربراہ مختارِ کل ہوتا تھا جبکہ عصرِ حاضر میں اس شعبہ کو محدود اختیارات حاصل ہیں۔ سربراہِ مملکت مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ہنگامی حالات میں نظریۂ ضرورت کے تحت کوئی نہ کوئی قانون "آرڈیننس" کی صورت میں نافذ کر سکتا ہے اگرچہ اس کی منظوری کے لیے کسی پارلیمنٹ کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے لیکن پھر بھی قانون بنانے میں سربراہ مملکت کافی دخل رکھتا ہے۔

آئین ساز ادارے قانون بنانے والوں کا دوسرا اہم شعبہ "آئین ساز" ادارہ ہے اور جمہوری ممالک میں اس ادارہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ایسے ادارہ کی محنت اور سعی سے بنا ہوا قانون جدید ذہن والے صحیفہ آسمانی کے برابر سمجھتے ہیں، اس میں ترمیم و منسوخی کا حق بھی اسی ادارہ کو حاصل رہتا ہے، آجکل قومی اور صوبائی اسمبلیاں اور سینٹ کے ادارے اس کے نمونے ہیں، ان اداروں میں کثرتِ رائے سے جو بات سامنے آتی ہے اسی کو ملک کا قانون سمجھا جاتا ہے، اس میں ووٹوں کی کثرت کا اعتبار رہتا ہے، جس بات کی حمایت میں زیادہ ووٹ نکل آئیں تو وہ قانون بن جاتی ہے، گویا کہ اس میں تمام تر فیصلے کثرتِ رائے پر ہوتے ہیں، اگرچہ اس کے قانونی شکل میں نفاذ کیلئے (Bill) وغیرہ کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے لیکن حتمی منظوری کے بعد اس کو قانونی قالب میں ڈھال کر ملک کے قانون کا مستقل حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

عدالتی نظائر انسانی قانون کا تیسرا ماخذ عدالتی نظائر ہوتے ہیں، کسی جمہوری ملک کی عدالتِ عالیہ اپنی صوابدید کے مطابق قانون کی تشریح کرتے ہوئے جو فیصلہ کرتی ہے تو ماتحت عدالتیں بھی اس کی روشنی میں فیصلے کرتی ہیں۔ مثلاً ہمارے ملکِ عزیز پاکستان کی اعلیٰ عدالت "سپریم کورٹ" نے جب کوئی فیصلہ کیا تو "ہائیکورٹ" یا ماتحت عدالتیں اس فیصلہ سے متاثر ہوتی ہیں اور وہ اپنے فیصلوں

اس کا لحاظ رکھتی ہیں تو یہ فیصلے مستقل قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

عہدِ حاضر میں انسانی قانون یا قانون سازی کو انسان کے بنیادی حقوق کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

رحمانی قانون کی حقیقت

قانون کی دوسری قسم یعنی "رحمانی قانون" کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو جنت سے اتار کر زمین پر بھیجا تو اس وقت حضرت آدمؑ سے فرمایا: "فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۳۸) یعنی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت نامہ اور ضابطۂ حیات آئے گا، تیری اولاد کے لیے اس کی تابعداری ضروری ہو گی۔"

انسانی ہدایت کی یہ حقیقت دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے "يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِىْ۔ (سورۃ الاعراف آیت ۳۵) اے اولادِ آدم تمہارے پاس میرے رسول آئیں گے جو میری آیتیں بیان کریں گے۔"

ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے لیے ضابطۂ حیات کی تقرری اور تعین کے لیے دو راہیں متعین کیں۔ ایک راہ "هُدًى" یعنی ہدایت اور دوسری راہ "رسول" ہے۔ گویا رحمانی قانون کے ماخذ اور مراجع اصولی طور پر یہ دونوں ٹھہرائے گئے۔

رحمانی قانون کے ماخذ

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے کتنی کتابیں نازل کیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک سو چار کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں، دس صحائف حضرت آدمؑ پر، پچاس صحائف حضرت شیثؑ پر، تیس صحائف حضرت ادریسؑ پر اور دس صحائف حضرت ابراہیمؑ پر اتارے اور چار بڑی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید نازل کیں۔

یہ ایک سو چار کتابیں حقیقت میں رحمانی قانون کے مختلف ایڈیشن اور نسخے ہیں، پھر قانون کا یہ اہم کام ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ سے لیا گیا، گویا ماضی میں یہ دو راہ یعنی ھُدیٰ اور رسول متعین تھیں، لیکن جب رحمانی قانون کا آخری کامل اور مکمل نسخہ قرآن کی شکل میں خاتم الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور آئندہ کے لیے سلسلۂ نبوت ختم کر کے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طریقوں کے ساتھ دوسرے دو طریقے اور بھی شامل کیے، جن کو "اجماعِ امت" اور "قیاس" کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۹)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ؐ کی تابعداری کرو اور اولی الامر کی تابعداری کرو اور اگر کسی چیز میں جھگڑا پڑے تو اللہ اور رسول ؐ کے احکام کی طرف رجوع کرو۔"

اس آیت میں رحمانی ہدایت کے ماخذِ اربعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلامی قانون اور رحمانی ہدایت کے چار ماخذ ہیں۔ اطیعوا اللہ سے کتاب اللہ، اطیعوا الرسول ؐ سے سنت الرسول، اولی الامر سے اجماع اور فردوہ الی اللہ والرسول ؐ سے قیاس کی طرف اشارہ ہے۔

گویا اسلامی قانون کبھی آدمؑ اور صحفِ آدم کی شکل میں آیا، کبھی شیثؑ کے پچاس صحیفوں میں آیا، کبھی ادریسؑ اور صحفِ ادریسؑ کی شکل میں، کبھی ابراہیمؑ اور صحفِ ابراہیمؑ کی شکل میں وضع ہوا، کبھی داؤدؑ اور زبور، کبھی موسیٰؑ اور توریت اور کبھی عیسیٰؑ اور انجیل کی شکل میں آیا، اور آخری ناقابلِ ترمیم مسودہ "قرآن" کی شکل میں اترا جس کی تفصیل سنتِ رسول ؐ، اجماعِ اُمت اور قیاس سے کرائی گئی۔

اسلامی قانون کے بارے میں غیر مسلموں کے تاثرات

اسلامی قانون کی خصوصیات اور امتیازات یا تقابلی مطالعہ کے بغیر ہمارے مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسانی قانون کے مقابلے میں "رحمانی قانون" انسانی معاشرہ کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ اور یہ صرف ہم نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کوئی دوسرا قانون وقت اور حالات کیلئے مناسب نہیں۔

(۱) ڈاکٹر سیموئیل لکھتے ہیں کہ قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر اور ہر زمانے کے لیے موزوں ہیں کہ تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرتی ہیں اور محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنت میں گونجتے ہیں۔

(۲) مسٹر ولف کہتا ہے کہ وسیع جمہوریت، رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، فوجی تنظیم و مالیات اور غرباء کی حمایت اور ترقی کے اعلیٰ آئین قرآن میں موجود ہیں۔

(۳) ڈاکٹر مولیس فرانسیسی لکھتا ہے کہ قدرت کی عنایتوں نے جو کتابیں انسان کو دیں قرآن ان سب سے افضل ہے۔ (علوم القرآن ص ۴۳)

اِسلامی قانون کے اہم شُعبے

اگرچہ قانون کے شعبہ "دستوری قانو (Constitutional Law) "انتظامی قانون" (Administrative Law) "وخارجہ پالیسی" کا پورا تذکرہ قرآن و حدیث میں موجود ہے اور عملی تجربہ خلفائے راشدین کے دور خلافت میں نمایاں ہے۔ دستوری قانون اور انتظامی قانون اظہر من الشمس ہیں کہ ہمارا دستور قرآن و سنت ہے اور اس میں ہر ایک کے اختیارات محدود ہیں' اور خارجہ پالیسی بھی واضح ہو کر تعلقات جوڑنے اور توڑنے کے لیے اسلام ہی بنیادی سبب قرار دیا گیا ہے تاہم غیر مسلم ممالک سے معاملات اور تعلقات رکھنے میں رخصت دے کر تمام دنیا سے خارجی پالیسی بنانے کی اجازت دی ہے لیکن دوستی کا ہاتھ صرف اسلامی ممالک کے ساتھ بڑھایا جائے گا۔

موجودہ وقت میں بین الاقوامی یا ملکی قوانین کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قانون کے دو شعبے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ رعیت کی خوشحالی و ترقی اور امن و امان کا مسئلہ ان دونوں شعبوں سے تعلق رکھتا ہے جس میں پہلا شعبہ شخصی قانون (Personal Law) اور دوسرا شعبہ ملکی قوانین (Public Law) ہے۔ ہم پوری تفصیل بیان کیے بغیر ان دونوں شعبوں کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ انسانی معاشرہ کی خوشحالی کا راز صرف اسلامی قانون میں مضمر ہے۔

اِسلام کا شخصی قانون

شخصی قانون کا تعلق عموماً فرد اور خاندان سے ہوتا ہے۔ اسلام میں فرد کی اصلاح کیلئے تین چیزیں خصوصی طور پر بیان کی گئی ہیں جو نماز' روزہ' اور حج ہیں' ان تینوں عبادات سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے' مفسرین ان تینوں کو امور مصلحہ للنفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان تینوں عبادات میں باقاعدگی سے انسان میں اتباع قانون' ایثار اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' یہی وجہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ان کا تذکرہ ابتداء میں ہوتا رہتا ہے۔

ان تینوں امور کے بعد گھرانے اور خاندان کے جوڑنے کے لیے نکاح، مہر، نفقہ، حضانت' طلاق کی دفعات کتاب النکاح میں بیان ہوتی ہیں تاکہ اس سے انسان ایک خوشحال گھرانہ میں زندگی بسر کر سکے اور طلاق کے قانون پر سہولت دی گئی کہ بصورت ناچاقی خلاصی ممکن ہو۔ گذر اوقات کیلئے اسباب ملک میں بیع و شراء (خرید و فروخت) وصیت' ہبہ، شفعہ، وراثت وغیرہ قوانین معاملات میں بیان ہوئے ہیں تاکہ ملکیت کے اسباب متعین ہوں اور کسی کو دوسرے کی جائیداد پر ناجائز قبضہ جمانے کا موقع نہ مل سکے، وفات کی صورت میں میت کی جائیداد میں زور آزمائی، ظلم و ستم

اور زیادتی سے بچنے کے لیے وراثت کا عظیم قانون موجود ہے ۔

اسلام کا ملکی قانون (Public Law) میں چند چیزوں کی رعایت ضروری سمجھی جاتی ہے اور ان چیزوں کی حفاظت کو قانون میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں : (۱) حفاظتِ نفس (۲) حفاظتِ نسب (۳) حفاظتِ مذہب (۴) حفاظتِ مال (۵) حفاظتِ عقل (۶) حفاظتِ عزت ـــــ اسلامی قانون میں بحمداللہ ان چھ چیزوں کو جو تحفظ حاصل ہے وہ کسی دوسرے نظام میں میسّر نہیں ۔

حفاظتِ نفس حفاظتِ نفس کے لیے قرآنِ کریم نے دوٹوک اعلان کیا "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی" اس سے قصاص کا منصفانہ قانون نافذ ہُوا تاکہ کسی شخص کا خون رائیگاں نہ جانے پائے۔ یہاں تک کہ دوسرے امور میں خطا کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا، یعنی حقوق اللہ میں اگر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دیتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے "رفع عن اُمتی الخطاء والنسیان ۔ یعنی میری اُمت کی خطا اور بھُول معاف ہے"

لیکن انسانی قتل میں خطا کی صورت میں کفارہ اور دیت واجب قرار دی، پھر بھی اگر قاتل کا علم نہ ہو سکے تو پھر محلہ والوں کے لیے "قسامت" کا قانون نافذ کرکے دیت کی وصولی کے لیے عام اہلِ محلہ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ انسانی نفس تو کیا انسان کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ایک ایک پور کی حفاظت کی گئی کہ ایک پور کے بدلہ میں ۳/۱ حصہ دیت واجب ہوگی ۔

حفاظتِ نسب آج آپ ترقی یافتہ ممالک کی حالت دیکھیں کہ وہ جنسی خواہشات کے غلام بن گئے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کا نسب محفوظ نہیں ہے، اسلام نے نسب کی حفاظت اس انداز میں کی کہ چند سال قبل ہندوستان کی اعلیٰ عدالت نے یہ فیصلہ سنایا کہ "چادر اور چار دیواری کی حفاظت اگر مقصود ہے تو مسلمانوں کے قانونِ رجم اور حد پر عمل کرنا پڑے گا"۔ ـــــ زنا اور حرام کاری کی ممانعت کے علاوہ فسادِ نسب سے بچنے کے لیے نظر کی حفاظت لازمی قرار دی گئی کہ مسلمان مرد اور عورت کو چاہیئے کہ اپنی نظر نیچی رکھیں ۔ پردہ کو لازمی قرار دیکر غیر محرم عورتوں سے خلوت اور ناجائز اختلاط ممنوع قرار دے کر فحش کاری کی بیخ کنی کی گئی، زنا کا جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں شادی شدہ (مرد اور عورت) کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو سو کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا، ارشادِ ربّانی ہے ۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِی فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ۔ (سورۃ النور آیت ۲)
(ترجمہ) ’’زناکار مرد اور عورت کو سو سو کوڑے لگا دیئے جائیں‘‘۔

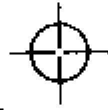
حفاظتِ مذہب ۳ انسان کو عقیدہ اور مذہب سے بڑا پیار ہوتا ہے، اسلام میں ’’ذمی‘‘ کی حیثیت تسلیم کرنے کے بعد اس کے مذہبی اور اعتقادی مسائل میں دخل اندازی ممنوع قرار دی گئی لیکن اسلام جو کہ ابدی اور ازلی مذہب ہے اس کی مخالفت حدِ ارتداد سے کی گئی کہ:۔
من بدل دینہ فاقتلوہ۔ (جس نے دین تبدیل کیا اس کو قتل کر دو۔)

حفاظتِ مال ۴ مال و دولت کی حفاظت عصرِ حاضر کا بڑا اہم مسئلہ ہے آج دولت ہماری حفاظت نہیں کر سکتی بلکہ ہمیں دولت کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اسلام میں پہلے انسان کو حلال خوری کی ترغیب دے کر اس کے حلال مال کی حفاظت یوں کی گئی کہ کسی مسلمان کا مال غیر شرعی طریقے سے کھانا حرام ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکہ زنی، چوری اور دھوکہ دہی کو جرم قرار دیا گیا، اگر کوئی شخص کسی کے حلال مال پر دست درازی کرے تو اس پر حدِ سرقہ جاری کی جانے کی مستقل حکم دیا گیا:۔
’’اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا۔ (سورۃ النور آیت ۵) چور مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

حفاظتِ عقل ۵ عقل انسان کا وہ جوہر ہے جس کو محفوظ رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ عصرِ حاضر میں منشیات کی وبا، عالمی سطح پر حکومتوں کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے، امریکہ سمیت پوری دنیا حیران ہے کہ لاکھوں کروڑوں نوجوان اس مکروہ نشہ کا شکار ہو کر بالآخر خودکشی پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مسلمان میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر حدِ شربِ خمر کا مطالعہ کر کے صرف ’’کتاب الاشربۃ‘‘ کے باب کا قانون نافذ کر کے حدِ شربِ خمر کا اجراء کر دیا جائے تو پورے ملک میں ہیروئن کا نشہ کرنے والا ایک آدمی بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور عقل کی یہ حفاظت حدِ شرب الخمر کے اجراء کی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔

حفاظتِ عزت ۶ انسان کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عزت ہے، دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ہتکِ عزت کا قانون ہے لیکن اسلام کی یہ دفعہ سب سے اہم اور نرالی ہے اس میں ایک شخص کسی دوسرے کو زانی یا چور جیسے قبیح الفاظ سے نہیں پکار سکتا ورنہ حدِ قذف کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہر وہ کلمہ جس سے ایک مسلمان کی عزت و وقار پر حرف آتا ہو قابلِ مواخذہ جرم قرار دیا گیا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقۂ کار



غیر اسلامی ممالک اپنی عدالتوں اور ان کے طریقۂ قضاء پر بہت نازاں ہیں اور اپنے طریقۂ قضاء کے لیے ہر کسی کو دعوت دیتے ہیں مگر یہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ اخبارات، رسائل و جرائد اور دیگر ذرائع ابلاغ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے طریقۂ قضاء میں صاحب ثروت اور اثر و رسوخ والے شخص کو ہر قسم کا تحفظ حاصل ہے جبکہ غریب، نادار، کمزور اور بے بس آدمی کو ذلت و رسوائی کے سواء کچھ نہیں ملتا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کا طریقۂ قضاء فطرت کے عین مطابق ہے، جس میں ہر ایک کو پورے عدل و انصاف کے ساتھ اس کا حق اس کی دہلیز پر دیا جاتا ہے۔ غیر اسلامی ممالک کے اس پروپیگنڈے کے جواب میں دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مضمون بعنوان "غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقۂ کار" لکھا جسے ماہنامہ الحق نے شائع بھی کیا تھا۔ اب افادۂ عام اور فقہ و فتاویٰ کی مناسبت سے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

غیر اسلامی ممالک میں قضا کا طریقہ کار

قضا اسلامی تشخص کی تکمیل کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بغیر اسلامی زندگی ناقص اور ادھوری ہے۔ نظام قضا کے ذریعہ محاسبہ اور مواخذہ کی اس اہم دفعہ کی آبیاری ہوتی ہے جس پر اسلامی زندگی کی بنیاد قائم ہے۔ اگر انسان کے انفرادی یا اجتماعی افعال پر اپنی یا کسی قابل تعظیم شخصیت کی نظر نہ ہو یا اس کو آزاد چھوڑ کر اس کے کئے ہوئے افعال پر کوئی باز پرس نہ ہو تو اس سے قوت بہیمی کو حوصلہ افزائی کا ایسا موقع مل سکتا ہے جس سے انسانی اقدار مجروح ہوں۔

اسلام کے نظام قضاء و قانون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قضا صرف ایک معاشرتی ضرورت نہیں کہ جس کی حاجت اجتماعی معاشرہ میں محسوس ہو بلکہ یہ مسلمانوں کا ایسا دینی اور مذہبی فریضہ ہے جس کی ضرورت قدم بقدم محسوس ہوتی ہے۔ قضا دیگر عبادات کی طرح ایک مستقل عبادت ہے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھنا مجھے ستر سال کی عبادت سے زیادہ پسند ہے ۔ چنانچہ علماء کرام اسے تقرب الٰہی کا ایک ذریعہ متصور کرتے ہیں۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلیؒ: قال بعضھم القضاء امر من امور الدین ومصلحۃ من مصالح المسلمین تجب العنایۃ بہ لان بالناس الیہ حاجۃ عظیمۃ وھو من انواع القربات الی اللہ عزوجل ولذا تولاہ الانبیاء علیھم السلام۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۴۸۲ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "بعض علماء فرماتے ہیں کہ قضاء دین کے امور میں سے (ایک اہم) امر ہے اور مسلمانوں کی بہتری کا ایک شعبہ ہے' اس کا اہتمام ہونا چاہیئے کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ذرائع میں سے ہے' یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی یہ ذمہ داری قبول کی"

اس لیے اسلامی معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی رعایت ضروری ہے اس کی ادائیگی کے بغیر مسلمان مسئولیت کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا ہے۔

نظام قضاء کیلئے قوت تنفیذی کی ضرورت ایسی صورت میں نظام قضاء کا نفاذ اور اجراء کسی ولایت عامہ یا قوت تنفیذی کے وجود پر موقوف نہیں یہی وجہ ہے کہ تحکیم (پنچایت) یعنی کسی ثالث کو فیصلہ کرنے کا اختیار دینا نظام قضاء کا ایک شعبہ ہے اس میں

اگرچہ حَکَم یعنی ثالث کی ولایت ناقص ہوکر صرف طرفین تک محدود رہتی ہے، اس میں بھی طرفین فیصلہ کرنے سے قبل بغیر کوئی وجہ بتائے رجوع کا حق قضاءً محفوظ رکھتے ہیں، لیکن جب ایک دفعہ ثالث کا فیصلہ صادر ہو جائے تو یہ مستقل قضاء بن کر کسی دوسرے اعلیٰ قاضی کی عدالت میں مرافعہ کے وقت کسی خاص ضرورت کے بغیر اس کو فسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، طرفین حسب معاہدہ اس فیصلہ کے پابند رہیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نظام قضاء جزوی طور پر کسی طاقت اور قوت کے استعمال پر موقوف نہیں، یہ الگ بات ہے کہ شر القرون کے ان ادوار میں انسان طبعی حرص ولالچ کی وجہ سے کسی دوسرے کے حق کی ادائیگی کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا اور اپنا حق منوانے کے لیے جملہ وسائل بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اس لیے نظام قضاء کے مثبت نتائج کے مشاہدہ کیلئے قوت تنفیذ کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ کی برکت سے شرعی فیصلہ کا تقدس اور عظمت بحال رہ سکے۔

غیر اسلامی علاقوں میں نظام قضاء کے چند نظائر

مسلمان ممالک کی طرح غیر اسلامی ممالک میں بھی جہاں پر کفار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں مسلمان اپنا مذہبی تشخص قائم رکھنے کے پابند ہیں، جیسا کہ عبادات سے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے ایسا ہی حسب طاقت مسلمان اپنے مسائل اسلامی طرز حیات میں طے کرنے کے پابند ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۶۵) ــــ ترجمہ "پس تیرے رب کی قسم وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپؐ کو منصف نہ جانیں اس جھگڑے میں جو اُن میں اُٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔"

مکی زندگی کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل مسلمانوں کو یہاں پر غلبہ حاصل نہیں تھا بلکہ اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے تھے لیکن اس کے باوجود مسلمان اپنے فیصلے اپنے درمیان کرتے تھے، کسی غیر اسلامی فیصلہ کرنے والے کے پاس جانے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

ایسا ہی مدنی زندگی میں اگرچہ خاص علاقوں پر مسلمانوں کا غلبہ تھا لیکن جو علاقے مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھے وہاں کے کچھ باشندے جب اسلام کی نعمت عظمیٰ سے مشرف ہو جاتے تو اپنے فیصلے باہمی مشورہ سے طے کرتے۔

فقہی جزئیات کی تائید | فقہاء کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جہاں کہیں کفار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں تو وہ اپنے باہمی منازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی مسلمان قاضی کی تقرری کے پابند رہیں گے، علامہ کمال ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :-

هٰذا اذا لم یکن سلطان ولا من یجوز منه کما فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبه فی المغرب الان وبنسیه وبلاد الجشه واقروا المسلمین عندهم علیٰ مال یؤخذ منهم یجب علیهم ان یتفقوا علیٰ واحدٍ منهم یجعلونه والیا فیولی قاضیاً ویکون هو الذی یقضی بینهم وکذا ینصبوا لهم اماماً یصلی بهم الجمعة ۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۳۶۵ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "یہ حکم اس وقت ہے جہاں کہیں حاکم نہ ہو یا کسی کافر سے قضاء قبول کرنے کی کوئی صورت نہ ہو جیسا کہ بعض مغربی اور حبشہ کے ممالک میں ہے، تو جب مسلمان باقاعدہ مال کی ادائیگی کے معاہدہ پر رہ رہے ہوں اُن پر ضروری ہے کہ اپنے درمیان کسی ایک پر اتفاق کر کے اُسے قاضی مقرر کریں جو اُن کے درمیان فیصلے کرے اور ان کے لیے امام مقرر کرے تاکہ وہ ان کو جمعہ (اور عیدین) کی نماز پڑھائے"

مسلمانوں کے اتفاق سے قاضی کی تقرری | ایسی حالت میں اگر مسلمان باہمی اتفاق سے کسی ایک معتمد شخص کو اپنا فیصل مقرر کریں تو اس کی حیثیت قاضی کی ہو گی، مسلمان اس کے فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ چنانچہ رؤیتِ ہلال سے صوم و افطار میں اُس کا فیصلہ نافذ ہوگا اور جمعہ و عیدین دیگر شرائط کی رعایت کے بعد اس کی موجودگی میں ادا ہوں گے ـــــ شیخ بدرالدین محمود بن اسماعیل الشہیر بابن قاضی سماوہؒ فرماتے ہیں:-

واما فی بلاد علیها ولاة کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمع والاعیاد ویصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین ۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۴ الفصل الاول فی القضاء)

(ترجمہ) "وہ علاقے جہاں پر کفار کا غلبہ ہو تو مسلمانوں کے لیے جمعہ و عیدین کا پڑھنا جائز ہے اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی باقاعدہ قاضی ہو گا"

علامہ علاؤ الدین الحصکفیؒ، اس کی مزید اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

ولو فقد وال لغلبة الکفار وجب علی المسلمین تعیین وال ۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۴ ص ۳۰۸ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "اگر کفار غلبہ سے کہیں مسلمان ولایت عامہ سے محروم رہیں پھر بھی اپنے لیے والی کی تقرری ان پر ضروری ہے"۔

عصرِ حاضر میں غیر اسلامی ممالک میں قضاء کی چند صورتیں

آجکل دنیا مذہب وعقیدہ، رنگ ونسل اور سوچ وفکر کے حوالہ سے منقسم ہے، عام محاورہ میں جسے جمہوری دور کہا جاتا ہے، اس میں جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں ہیں اور حکومت کر رہے ہیں تو اپنے جملہ وسائل بروئے کار لاکر اس ملک میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ اس ملک کے ہر مسلمان باشندہ کی ذمہ داری ہے، لیکن جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں بلکہ کسی غیر اسلامی نظام حیات کے تابع ہوں تو ان ممالک میں بھی بقدر استطاعت مسلمان اپنی مذہبی اقدار کی رعایت کرنے کے پابند ہوں گے، عقائد واعمال کی درستگی اور اسلامی طرز حیات کے مطابق زندگی بسر کرنا تو انفرادی معاملہ ہے جس میں ان کا کوئی عذر قابلِ سماع نہیں، خاص کر جن ممالک میں مذہبی آزادی ہو، لیکن باہمی جھگڑے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طے کرنے کی بظاہر دو صورتیں نظر آتی ہیں:

پہلی صورت پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان اگر کہیں اجتماعی طور پر اس نظام کے قیام سے عاجز ہوں تو خود مذہبی جذبہ کی روشنی میں انفرادی طور پر اپنے معاملات قرآن وحدیث کی روشنی میں طے کریں، ایسی صورت میں کسی غیر اسلامی حکومت کے لیے کسی قسم کی قانونی پیچیدگی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کسی مروجہ قوانین تک نوبت پہنچنے سے قبل ہی مسلمان اپنے معاملات کسی ایسے عالم کے ذریعہ طے کریں جس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق متنازعہ معاملات طے کرنے کی اہلیت ہو، اس سلسلہ میں کسی فعال اسلامی تنظیم کو بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے کہ وہ تنظیم خود مسلمانوں کے معاملات طے کرانے کا انتظام کرے یا کسی اور کے ذریعہ کرانے کا بندوبست کرے۔

انفرادی طریقۂ کار کی کمزوریاں اس طریقہ کار سے اچھے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی اس کا دائرہ بہت محدود ہوگا کیونکہ اس کی حیثیت "تحکیم" کے سوا اور کچھ نہیں اور "تحکیم" کا دائرہ بہت محدود ہے۔ علاوہ ازیں ایسی صورت میں سیاسی طور پر مسلمانوں کے لیے کئی مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اوّلاً یہ کہ مسلمانوں کے پاس ایسے نظام کی تنفیذ کے لیے جب تک کسی مروجہ قانون کا سہارا نہ ہو تو محض دینی جذبہ سے اس کے تابع رہنے کے نتائج بہت کم سامنے آئیں گے۔ انسان طبعی طور پر نقصان برداشت کرنے یا کسی معاملہ میں ہار ماننے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، عین ممکن ہے کہ کسی مسلمان کو اگر شرعی فیصلہ میں اپنا نقصان نظر آئے تو وہ کسی مسلمان فیصلہ کنندہ کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کریگا۔

بلکہ متبادل ذرائع تلاش کر کے رائج الوقت قانون میں اپنا سہارا ڈھونڈے گا۔ علاوہ ازیں شرعی طور پر بھی "محکم" کا اختیار چند مسائل تک محدود ہے، قصاص و دیت اور حدود جیسے مسائل نمٹانے کی اہلیت "محکم" میں نہیں۔ اور اگر کہیں کسی فعال اسلامی تنظیم یا دینی درد رکھنے والے مسلمانوں کی مساعی سے یہ نظام کامیابی سے ہمکنار ہوا اور اس کے اچھے نتائج محسوس ہوں تو یہ مسلمانوں کے سیاسی استحکام کی دلیل ہوگی اور اس سے رائج الوقت حکومت اپنے لیے مستقبل میں خطرہ محسوس کرے گی ممکن ہے کہ اس باہمی تعاون کی وجہ سے مسلمان بعض علاقوں میں اس درجہ میں منظم ہوں کہ ان کے پاس معاشرتی میدان میں عملی طور پر قوتِ تنفیذی حاصل ہو اور مسلمان جبری طور پر اسلامی فیصلہ ماننے کیلئے تیار ہوں۔ یہ صورت اگرچہ بذاتِ خود بہت اچھے نتائج کی حامل ہے لیکن سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی سرگرمیاں اس سے متاثر ہوسکتی ہیں جس سے غیر اسلامی اقتدار اعلیٰ ایسی کامیابی میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرے گا۔

دوسری صورت | ایسے غیر اسلامی ممالک میں مسلمان اپنی ذمہ داری ایک دوسرے طریقے سے نباہ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی نظام قضاء کے تحفظ کے لیے رائج الوقت قوانین کا سہارا لیں، اور یہ موجودہ وقت میں شخصی قوانین کے تحت قابلِ عمل بھی ہے۔ اس لیے اگر مسلمان محنت کر کے سیاسی میدان میں اتنا مقام پیدا کرلیں کہ حکومت وقت سے اپنے حقوق منوا سکیں، مسلمان ایسے قوانین کے بنانے پر زور دیں کہ رائج الوقت قوانین میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے، یعنی جو مسلمان ہوگا وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے گا، ممکن ہے کہ اقتدار اعلیٰ ہر مسئلہ میں ایسے فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دے لیکن بعض امور میں یہ حق ملنا بھی مسلمانوں کے لیے موقع غنیمت سے کم نہیں کیونکہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے قاعدہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو کچھ بھی ہوسکے اس سے روگردانی اور اعراض نہ کیا جائے، ایسی صورت میں علاقائی تحدید کی طرح اگر بعض مسائل تک قاضی کا دائرہ اختیار محدود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نظام قضا میں اس کی گنجائش ہے کہ کسی قاضی کا دائرہ اختیار ایام یا احکام کے اعتبار سے محدود ہو۔ چنانچہ علامہ الماوردیؒ فرماتے ہیں :-

ویجوز ان تکون ولایۃ القاضی مقصورۃ علی حکومۃ بینھما بین خصمین ولا یجوز ان ینفذ النظر الی غیرھما من الخصوم وتکون ولایۃ علی النظر بینھما باقیۃ ما کان التشاجر بینھما باقیا فاذا بت الحکم بینھما زالت ولایتہ .... فلو لم یعین الخصوم وجعل مقصورا علی الایام وقال قلدتک النظر بین الخصوم فی یوم السبت وحدہ جاز نظرہ فیہ بین الخصوم فی جمیع الدعاوی۔ (الاحکام السلطانیہ والولایات ص۷۳) ـــ (ترجمہ) "یہ جائز ہے کہ کسی

قاضی کا دائرہ اختیار کسی خاص افراد کے فیصلہ تک محدود ہو تو ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں، ان مخصوص افراد کے درمیان جب تک یہ معاملہ باقی ہو تو قاضی کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے جب ان کا فیصلہ ہو جائے تو اس کا اختیار ختم ہو گا.... اگر طرفین کا تعین نہ ہو بلکہ خاص ایام میں اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، مثلاً یہ کہ تجھے ہفتہ کے دن فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے، تو ہفتہ کے دن جملہ فیصلوں کا اختیار اس کو حاصل ہو گا۔"

غیر اسلامی حکومت سے عہدۂ قضاء قبول کرنے کی شرعی حیثیت

اس پر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت سے قضاء کا عہدہ قبول کرنا کہاں تک جائز ہے، کیونکہ اس میں غیر اسلامی حکومت کو دوام بخشنے اور اس سے تعاون کی ایک صورت ہے جو تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کسی مذہبی عقیدہ اور تشخص کے مجروح ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر ایسا عہدہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جہاں کہیں (غیر اسلامی) حکومت میں مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو اپنے حالات کے مطابق فیصلہ کر کے شرکت کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی غیر اسلامی قانون کے ذریعہ جب اسلامی قضاء کو دوام بخشا جائے تو ایسے قاضی کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں واجب العمل ہو گا۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:۔

ولكن اذا ولى الكافر عليهم قاضيا ورضيه المسلمون صحت توليته بلا شبه۔

(رد المحتار على الدر المختار ج ۴ ص ۳۰۸ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "اگر کسی کافر نے مسلمانوں کے لیے ان کی مرضی کے مطابق قاضی مقرر کیا تو اس کی یہ تولیت بلا شبہ جائز ہے۔"

ایسا قاضی مسلمانوں کے لیے وہ تمام امور جاری کر سکتا ہے جو دار الاسلام میں ایک قاضی کے دائرہ اختیار میں ہو۔ چنانچہ شیخ بدر الدینؒ فرماتے ہیں:۔

وكل مصر فيه وال مسلم من جهة الكفار تجوز فيه اقامة الجمع والاعياد واخذ الخراج وتقليد القضاء وتزويج الايامى لاستيلاء المسلم عليهم۔ (جامع الفصولين ج ۱ ص ۱۴ الفصل الاول في القضاء)

(ترجمہ) "وہ علاقہ جس میں کسی کافر بادشاہ کی طرف سے مسلمان گورنر ہو تو اس میں جمعہ وعیدین کی اقامت، خراج، قضاء کی تقرری اور یتیم بچیوں کی شادی کرانے کا حق حاصل ہے کیونکہ ان پر مقامی طور پر مسلمان کی حکومت ہے۔"

بہرحال کفار کے غلبہ کے وقت ان کی قوت تسلیم کرنا شریعت میں ناجائز نہیں لیکن اگر مسلمانوں کے ترکِ موالات سے کہیں کافرانہ نظام حکومت متزلزل ہو کر اپنی زندگی پوری کرنے کی حالت میں ہو تو پھر کفر کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دینا تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے، ایسی حالت میں یہ کشتی کسی سنجیدہ اور باوفا ملاح کے حوالے کرنی چاہیئے تاکہ وہ ان کی بہتری کے بارے میں سوچ سکے۔

انصاف کی رعایت نہ ہونے کے وقت عہدۂ قضاء قبول کرنا جائز نہیں | لیکن یہ طریقہ کسی ایسے غیر اسلامی ملک میں اپنانا

اُس وقت مرخص ہے جب تک حکومتِ وقت ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کرتی ہو، اگر کہیں ایسی حالت میں مسلمان انصاف قائم نہ رکھ سکتے ہوں تو پھر ظلم وستم کے لیے آلۂ کار نہیں بننا چاہیئے ورنہ اپنا مذہبی تشخص ضائع کرنے کے سوا اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:۔

ما ذکر المصنف من جواز التقلید من الجائر مقید بما اذا کان یمکنه من القضاء بالحق اما اذا لم یمکنه فلا کما فی الهدایة لان المقصود لا یحصل به۔

(البحر الرائق ج ۶ ص ۲۷۴ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "مصنفؒ نے ظالم سے قضاء قبول کرنے کا جو مسئلہ بیان کیا ہے، یہ اُس وقت ہے جب قاضی انصاف کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہو، جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر قضاء قبول کرنا جائز نہیں جیساکہ ھدایہ میں ہے کیونکہ ایسی صورت میں مقصود حاصل نہیں ہوتا۔"

اسلام کا نظامِ عدل وانصاف

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہٗ

ہر دور میں دنیا کے ہر ملک کے حکمرانوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ ہم ہر ایک کو انصاف فراہم کریں گے اور ہمارے فیصلے عدل وانصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوں گے، اس آواز میں مسلم اور غیر مسلم ممالک سب شامل ہیں لیکن آج تک کسی نے بھی عدل وانصاف کے جملہ تقاضے پورے نہیں کیے بلکہ الٹا نظامِ عدل وانصاف سے تمسخر کیا۔ دنیا بھر کے تمام نظامہائے قوانین میں ایک اسلام کا واحد نظامِ قانون ہے جس میں امیر وفقیر، آقا وغلام، بادشاہ ورعایا، چھوٹے بڑے اثر ورسوخ والے کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے، اسلامی قانون کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں تمام فیصلے عدل وانصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اسلامی اور غیر اسلامی نظامِ عدل وانصاف کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے سابق نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ نے ایک جامع اور پر مغز مضمون تحریر فرمایا جسے دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق نے شائع کیا، اب اس مضمون کو اسلامی قانون وفقہ سے مناسبت کی بناء پر عمومی فائدہ کے لیے "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)

لفظ عدل قرآن و حدیث میں مختلف مقامات پر مستعمل ہوا ہے جس کے مقابلہ میں ظلم آتا ہے، اہلِ لغت کے ہاں ظلم "گذشتن چیزے درغیر محل آں"[1] کو کہتے ہیں۔ ظلم کے اس مفہوم کے اعتبار سے اس میں بہت وسعت موجود ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ گناہ سے لے کر کبائر اور شرک تک کو شامل ہے، مثلاً خداوندِ عالم نے جس مقصد کے لیے انسان کو زبان اور قوتِ گویائی دی ہے اگر زبان کا استعمال اس میں نہ ہو تو یہ ظلم ہے، تو ظلم کے مفہومی اعتبار سے اس کے مقابلہ میں بھی اسی جیسی وسعت موجود ہے۔

---

[1] غیاث اللغات ص۲۷۸ ۔

عدل کی ہمہ گیری اعضاءِ انسانی اور انعاماتِ خداوندی کو اپنے محل میں استعمال کرنا عدل ہے۔ قرآن مجید میں جہاں قیامِ عدل کا مطالبہ بنی آدم سے ہوا ہے وہاں عدل سے یہی عمومی معنیٰ مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف عدالت اور حکومت کا فریضہ نہیں ہے بلکہ ہر انسان اس کا مکلف اور مخاطب ہے کہ وہ خود بھی انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کیلئے کوشش کرے، ہاں انصاف کا ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے، وہ یہ کہ شریر اور سرکش انسان جب انصاف کے خلاف اڑ جائیں، نہ خود انصاف پر قائم رہیں اور نہ دوسروں کو انصاف کرنے دیں تو حاکمانہ سزا اور تعزیر کی ضرورت ہے، یہ اقامتِ عدل و انصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کر سکتی ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ آج کی دنیا میں جاہل عوام کو چھوڑ یئے لکھے پڑھے تعلیمیافتہ حضرات بھی سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ ہے عوام اسکے ذمہ دار نہیں ہیں، اور یہ وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک اور سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے۔" (معارف القرآن ج ۲ ص۵۷۱، ۵۷۲)

قیامِ عدل کے مطالبہ کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ایک شعبہ سے ہے اور انسان کے اخلاق و کردار (Character) ظاہر و باطن، عبادات و معاملات، سیاست و مذہب، غرض ہر ایک شعبہ میں عدل کا ہونا ضروری ہے۔ اس تعلقِ عامہ کے پیشِ نظر خداوندِ عالم نے جب انبیاء و رسل کو دنیا میں بھیج کر ان کی وجہ سے رُشد و ہدایت کا درس نوعِ انسان کو دینا چاہا تو انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے قیامِ عدل کا مطالبہ بھی کیا جس کی تکمیل کتبِ سماویہ سے کی گئی ہے قرآنِ حکیم میں ارشادِ ربانی ہے :۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورۃ الحدید آیت ۲۵)

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف سے۔

شیخ الاسلام والمسلمین مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں :۔

"یعنی کتاب اس لیے اتاری کہ لوگ عقائد اور اخلاق و اعمال میں سیدھے انصاف

کی راہ پر چلیں، افراط اور تفریط کے راستہ پر قدم نہ ڈالیں"۔ (تفسیر عثمانی ص۱۰۰)
الغرض بعثتِ انبیاء کے دیگر مقاصد کے علاوہ ایک اہم مقصد قیام عدل بھی رہا ہے۔

مروجہ بین الاقوامی قوانین اور ان کے نتائج

آج دنیا کی جس قوم پر بھی آپ نظر ڈالیں تو قیام عدل کا یہ مطالبہ مختلف نعروں اور مختلف انداز سے سنیں گے۔ کہیں مساوات اور برابری، کہیں انصاف اور حقوق کی بحالی کے عنوان سے عوام و خواص رطب اللسان ہیں مگر عملاً یہ عنقا کے مترادف ہے بلکہ دن بدن جرائم اور مظالم میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے قانون عملاً معطل ہے۔ آج ہر ملک میں قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ اور اسمبلیاں قائم ہیں، جرائم کے انسداد کے لیے مختلف قوانین وضع کیے جا رہے ہیں لیکن جرائم میں بجائے کمی کے زیادتی ہی ہو رہی ہے ۔

نگاہِ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
میری نظروں میں پھیکا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

آپ حضرات دو منٹ کے لیے خالی الذہن ہو کر عالمی سطح پر جرائم کے معیار کو دیکھیں تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ ۱۹۸۰ء میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق بین الاقوامی سطح پر گذشتہ چھ سالوں میں راہزنی میں ۷۹ فیصد، چوری میں ۴۶ فیصد اور قتل میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ (روزنامہ جنگ ۱۵ نومبر ۱۹۸۰ء)

اگر ایک طرف سائنسی دور میں انسدادِ جرائم کے لیے سائنسی آلات استعمال کیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف مجرم بھی نت نئے طریقے اختیار کر کے بڑی صفائی سے جرم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے امور ضرور ہونے چاہئیں جو جرائم کی بیخ کنی کرتے ہوئے امن کا معاشرہ (Peaceful Society) مہیا کریں، آپ اقوام عالم کے مذاہب اور عقائد کو بھی دیکھ لیں، نام نہاد ترقی یافتہ اقوام کے قوانین کا مطالعہ کریں، مگر یقین کیجئے کہ اس کا واحد علاج آپ کو آج سے چودہ سو سال پہلے کوہِ صفا پر یَآ اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا کے داعی کے دیئے ہوئے نسخہ کیمیا میں ملے گا جہاں مجرم جرم کرنے کے بعد خود اپنے جرم کا اعتراف اور اعلان کر کے قانون اور انصاف کا مطالبہ کرتا نظر آئے گا۔

نظامِ عدل کا مرکزی نکتہ

اسلام میں قیام عدل کا بنیادی نکتہ (Basic Point) خوفِ خداوندی ہے جس کا تعلق فرد سے لے کر معاشرہ تک

اور رعیت سے لیکر بادشاہ تک ہے، اگر دل و دماغ میں خوفِ خدا موجود ہو اور نظریہ یہ ہو کہ آج میں جو کام کر رہا ہوں کل قیامت کے روز دربارِ خداوندی میں مجھ سے اس کی بازپرس ہو گی اور مجھے ضرور حساب دینا ہو گا۔ تو اس عقیدہ کے بعد ہر انسان قدم بقدم خیال رکھے گا کہ کہیں مجھ سے ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو قیامت میں خسارہ اور ذلت و رسوائی کا باعث ہو۔

عدالت میں عدل کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حاکم اور مجسٹریٹ کا اگر یہ عقیدہ ہو اور سامنے ندامت اور پشیمانی کے عالم میں کھڑے ہوئے مجرم بھی خوفِ خداوندی کے ہتھیار سے مسلح ہوں تو یقین کیجئے کہ ظلم و ناانصافی کا نام ہی عالم سے فنا ہو جائے گا۔ مگر یاد رہے کہ یہ صرف خیالی یا فرضی تصوّر نہیں ہے بلکہ اسلام اور ہمارے اسلاف کی تاریخی زندگیوں میں اس کے واضح ثبوت موجود ہیں۔

حضرت ماعزؓ کا واقعہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے دور کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ماعزؓ بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے، آپؐ نے فرمایا اے ماعز لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ و استغفار کر، راوی کہتا ہے کہ ماعزؓ قدرے دُور گئے تھے کہ پھر لوٹ آئے اور پھر عرض کی کہ اے اللہ کے رسول مجھے پاک کیجئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا، تین بار ایسا ہی ہوا، چوتھی مرتبہ آپؐ نے فرمایا میں تجھے کس چیز سے پاک کروں؟ عرض کی زنا سے، حضور نبی کریمؐ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آپؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ اس پر ایک شخص نے اٹھ کر ماعزؓ کے منہ کو سونگھا تو اسے اس سے شراب کی بُو نہ آئی۔ آپؐ نے ماعزؓ سے پھر پوچھا کیا واقعی تم نے زنا کیا ہے؟ ماعزؓ نے عرض کی ہاں مجھ سے زنا ہوا ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابھی تین ہی دن گذرے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا ماعز بن مالکؓ کے لیے مغفرت کی دعا کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو سب کیلئے کافی ہے۔ (ترجمۃ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام صفحہ ۲۸۸، ۲۸۹)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور میں ہی قبیلہ ازد کے بطن غامد کی ایک عورت نے بھی اقرارِ جرم کیا تھا جس کے باعث آپؐ کے حکم سے اُسے بھی سنگسار کر دیا گیا۔

رات کی تاریکی میں خوفِ خدا کا اثر

خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت کرتے ہوئے جب ایک ایسے مکان کے قریب سے گذرے

جہاں والدہ اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ میں دودھ میں پانی ملاؤں گی لیکن بیٹی انکار کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ حضرت عمرؓ کا حکم ہے کہ دودھ میں ملاوٹ نہ کرو، والدہ کہتی ہے کہ عمرؓ اس وقت کون سا یہاں ہے؟ بیٹی جواب دیتی ہے کہ اگر چہ عمرؓ اس وقت یہاں موجود نہیں ہے لیکن اس کا خدا جو کہ علیم و خبیر ہے وہ تو موجود ہے۔

اسلامی تاریخ نے خوفِ خداوندی کے اس جذبہ سے شدتِ احساس کے اتنے نمونے اکھٹے کر رکھے ہیں کہ ان کا بالاستیعاب احصاء کرنا انسانی بس کی بات نہیں ہے۔

عرض کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ قیامِ عدل کے لیے خوفِ خداوندی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر رات کی تاریکی میں گھر کی چاردیواری کے اندر اس خدا ترس لڑکی کو دودھ میں ملاوٹ کرنے سے باز رکھنا، ماعز بن مالکؓ کا اپنے کیے ہوئے پر پشیمان ہو کر بارگاہِ نبوت سے بار بار واپس کرنے کے باوجود لوٹ لوٹ کر اپنے جرم کا اقرار کرنا، آخر کون سے جذبہ سے یہ لوگ سرشار تھے؟ یہ وہی جذبہ ہے جسے ہم خوفِ خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

موانعِ عدل | عدل کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے واضح طور پر ان امور کی نشاندہی کر دی ہے جو قیامِ عدل کے لیے سب سے بڑے موانع اور رکاوٹیں ہیں، خاص کر شہادت اور قضا میں یہ امور انسان کو انصاف سے ہٹا کر ظلم پر آمادہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، اور وہ درج ذیل ہیں،

(۱) قرابت Relation (۲) عداوت ENMITY (۳) مال و دولت Wealth

قرابت: بسا اوقات ایک انسانی تعلقات، قرابت اور رشتہ داری کے ماحول سے متاثر ہو کر درست اور صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً گواہ اپنی شہادت میں ان تعلقات کی بنا پر جھوٹ بول کر ناجائز اور غیر مشروع امور کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، افسر مجاز اپنے بالا افسران کے رعب سے غلط کام پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس طرح عدل کو چھوڑ کر ظلم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

قرآن مجید میں اس امر کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ۔ (سورۃ ــــ)	اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا۔

شہادتِ حق اور قرابتیں

خداوند عالم نے ایمان والوں کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"اے ایمان والو! تمام معاملات میں ادائے حق کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی دینے والے رہو اگرچہ وہ گواہی اور اظہار اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابل ہو"۔ (بیان القرآن)

گویا قانون اور انصاف کے سامنے رشتہ داری اور قرابت کوئی روک نہیں، والدیت اور ولدیت کے محبوب رشتوں کو بھی قربان کرنا ہوگا، خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اس کے راہنما اصول اور عملی نشانِ راہ موجود ہیں۔

حضرت اُسامہؓ کی سفارش پر دربارِ نبوت کا ردِّ عمل

ام المومنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کے قبیلہ مخزومی کی ایک عورت سے چوری سرزد ہوگئی، قریش نے باہمی مشورہ کیا کہ اس عورت کو ہاتھ کاٹنے کی سزا سے بچانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں سفارش کر دینی چاہیئے، اس کام کے لیے سب نے حضرت اسامہؓ کو منتخب کیا (کیونکہ وہ رسول اللہ کے محبوب رفیق تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس نظرِ شفقت سے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھتے تھے حضرت اسامہؓ بھی اسی طرح آپؐ کے منظورِ نظر تھے) حضرت اسامہؓ نے جب سفارش کی تو بارگاہِ نبوت سے جلال آمیز ارشاد صادر ہوا۔

اتشفع فی حد من حدود اللہ ثم قام فاختطب فقال یاایھا الناس انما ھلک الذین قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد وایم اللہ لوان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔

(دعوات حق جلد اول ص ۹۵)

کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو پھر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! بیشک تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں سے کوئی شریف چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی نادار چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے، خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی (معاذ اللہ) چوری کرتی تو میں ضرور اس کے ہاتھ کاٹتا۔

ایک انسان جب کسی اعلیٰ عہدہ اور مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کے تعلقات اور رشتہ داری بڑھ جاتی ہے، اجانب اقارب بن جاتے ہیں، مدتوں سے ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جڑ جاتے ہیں، لیکن

مسلمان سے مذہب اسلام کا یہی مطالبہ ہے کہ قانونِ شریعت کے مقابلہ میں کسی کو بھی ترجیح نہ دی جائے۔

عدل فاروقی کی ایک جھلک

خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ کے مبارک دور میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ حکمرانوں کے اعزا اور اقربا کو رعیت کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں امتیازی مقام حاصل ہو۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمنؓ نے جب شراب پی لی تو اس پر بھی حد جاری کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ (العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام ص ۲۴۴) نیز حضرت عمرؓ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار قدامہ بن مظعون (جو آپ کے سالے اور معزز صحابی تھے) کو بھی شراب نوشی کے جرم میں اسی کوڑے لگوائے۔ (تاریخ اسلام ص ۲۰۷)

ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی سے گھوڑے کا سودا طے کیا، پھر آزما کر دیکھنے کی خاطر اس پر سوار ہونے لگے تو گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہوگیا، حضرت عمرؓ نے چاہا کہ گھوڑا اس کے مالک کو واپس کر دیں، لیکن مالک نے واپس لینے سے انکار کر دیا، دونوں مقدمہ لیکر قاضی شریح کی عدالت میں گئے، قاضی نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد فرمایا:۔

"امیرالمؤمنین! جو چیز آپ نے خریدی ہے اُسے لے لیجئے ورنہ جس حال میں خریدی تھی اُسی حال میں واپس کیجئے۔"

یہ سنکر حضرت عمرؓ بول اٹھے "اسے کہتے ہیں فیصلہ کرنا" پھر آپ نے شریح کو عدل وانصاف سے فیصلہ کرنے کے بدلے کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ (تاریخ اسلام ص ۳۴۴)

امیرالمؤمنین قاضی کی عدالت میں

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مقدمہ میں فریق بن کر عدالت میں حاضر ہوئے، فیصلہ امیرالمؤمنین کے خلاف ہوا اور آپ اسے محسوس نہیں کرتے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ:۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ کی زرہ گر گئی جو ایک نصرانی کے ہاتھ لگ گئی، حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، نصرانی کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کی اپنی زرہ ہے، قاضی شریح نے حسبِ قاعدہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ ہے؟ تو حضرت علیؓ نے دو گواہ ایک اپنا بیٹا اور دوسرا اپنا آزاد کردہ غلام قنبر کو حاضر کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں بیٹے کی گواہی والد کے لیے درست تھی، لیکن قاضی شریح

نے فرمایا کہ آپ کے بیٹے کی گواہی آپ کے لیے درست نہیں ہے اور دوسرا گواہ جو کہ آزاد کردہ غلام ہے اور اس ایک گواہ کی گواہی سے آپ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

چنانچہ زرہ کا فیصلہ نصرانی کے حق میں ہوا، اس فیصلے کا نصرانی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور زرہ حضرت علیؓ کو واپس کر دی، لیکن حضرت علیؓ نے دوبارہ زرہ اسے دیدی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی اسے عنایت فرمایا۔ (نور الانوار ص۲۲۲)

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نظام عدل کے قیام میں انسان کو کسی سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ آقا اور غلام، امیر اور غریب، حاکم اور محکوم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے گا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آج اگر کوئی افسر یا ماتحت افسر کے خلاف فیصلہ صادر کرے تو معلوم نہیں اس انصاف کی وجہ سے اس فیصلہ کرنے والے کو کیا کیا سزائیں ملیں گی۔ اگر کسی خوف کی وجہ سے معزول نہ کرے لیکن انتقام کی آگ ہر وقت محکوم علیہ کے ذہن میں سُلگتی رہے گی اور فیصلہ کرنے والا انتظار کی گھڑیاں شمار کرتا رہے گا۔

انصاف کی نظر میں عمر فاروق اور ایک عام آدمی برابر ہیں

لیکن اسلام کے شیدائیوں کو جہاں حق بات نظر آئی وہاں اپنے خلاف فیصلہ پر بھی راضی اور خوش رہے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا حضرت ابی بن کعبؓ سے کچھ نزاع ہو گیا، حضرت ابی بن کعبؓ نے زید بن ثابتؓ کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا، حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے تو حضرت زیدؓ نے آپ کی تعظیم کی، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، یہ کہہ کر اپنے فریق ابی بن کعبؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور حضرت عمرؓ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ ابی بن کعبؓ نے قاعدہ کے موافق حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہی تو زید بن ثابتؓ نے آپ کا لحاظ کرتے ہوئے ابی بن کعبؓ سے کہا کہ امیر المؤمنین کو قسم سے معاف رکھو۔ حضرت عمرؓ اس ترجیحی سلوک پر آزردہ خاطر ہوئے اور فرمایا کہ جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمرؓ دونوں برابر نہ ہوں اُس وقت تک تم منصب قضا کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (کنز الاعمال جلد ۳ ص۱۷۴)

اسلامی نظام عدل نے شاہانِ وقت کو بھی معاف نہیں کیا

ان مثالوں اور واقعات کا تعلق صرف خلفائے راشدینؓ کے مبارک دور سے خاص نہیں ہے بلکہ حقانیت اور حق گوئی کا یہ جذبہ ہمیشہ اسلاف اور بزرگانِ دین

کا شیوہ رہا ہے، جہاں حق بات نظر آئی وہاں بادشاہِ وقت کو بھی معاف نہیں کیا۔

قاضی ابو یوسفؒ عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں، ایک شخص ان کے سامنے مقدمہ پیش کرتا ہے کہ عباسی بادشاہ ہادی سے ایک باغ کے بارے میں میرا جھگڑا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ رائے قائم کرتے ہیں کہ حق اسی شخص کے ساتھ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ گواہ بادشاہ کے پاس ہیں، انہوں نے کہا مدعی کا مطالبہ ہے کہ ہادی قسم کھائے کہ اس کے گواہ سچے ہیں، ہادی نے قسم کھاتے کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس سے انکار کیا اور باغ اپنے مالک کو واپس کر دیا۔

<u>عداوت</u>: دوسری چیز جو نفاذِ عدل کے لیے مانع ہے اور انسان کو ظلم اور ناانصافی کی طرف لے جاتی ہے وہ عداوت اور آپس میں دشمنی ہے، قرآن مجید نے اس امر کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ آیت ۸)	کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو اور عدل کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اہلِ اسلام کا طرۂ امتیاز

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:۔

”عدل کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے، عدل اور انصاف کا ترازو ایسا صحیح اور برابر ہونا چاہیئے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو جھکا نہ سکے“۔ (تفسیر عثمانی ص)

اور یہی وہ رسم ہے جس کو اہلِ اسلام نے ہمیشہ کے لیے قائم رکھا، مفتوحہ علاقوں میں اسلام کا برتاؤ ہمیشہ کے لیے انسانیت پر مبنی رہا، معاملات اور دیگر حقوق میں غیر مسلموں کو پورا پورا حق دیا گیا ہے۔

اہلِ مغرب کا سفاکانہ کردار

ہم جب اقوامِ عالم اور ایامِ ماضیہ کے تاریخی واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ دیگر مذاہب اور ادیان والے غیر مذہب والوں سے چوپایوں جیسا سلوک بھی روا نہیں رکھتے، اور صرف یہ نہیں

بلکہ اسلام کا مقابلہ اگر دورِ حاضر کی مغربی تہذیب سے کیا جائے تو یقیناً اسلام اپنی تاریخ کے ہر دور میں زیادہ وسیع اور بلند و پاکیزہ نظر آئے گا۔

اہلِ مغرب آج جس مذہبی آزادی کا دم بھرتے ہیں اس سے پہلے ان کے یہاں وہ دور بھی گذر چکا ہے جس میں اندلس کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی بہیمانہ سزائیں اور مشرق میں صلیبی جنگوں کی سفاکیاں ملتی ہیں۔

اہلِ مغرب نے اپنے نظریات سے اختلاف کرنے والوں کو آگ میں جلانے تک کی سزا کو جائز رکھا، اور یہی وجہ تھی کہ مذہبی دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں جنہوں نے دشمنوں کو بلا وجہ وہ سزائیں دیں جس کی نظیر رہتی دنیا تک نہیں مل سکے گی۔

ان عدالتوں اور احتساب کے محکموں نے ایک اندازے کے مطابق ۳۲ ہزار انسانوں کو زندہ جلایا جن میں ہیئت اور طبیعات کے مشہور عالم برونو (Brunoe) اور گلیلو (Galilio) کو بھی یہی سزا دی گئی۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص۲۶۴، ص۲۶۵)

اہلِ مغرب نے کسی مفتوحہ علاقہ میں مخالفین کے وجود کو دیکھنا بھی برداشت نہیں کیا جس علاقہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوتے وہاں اعلان کرتے کہ جو ہمارے خیالات اور نظریات سے متفق نہیں وہ ہمارے ملک سے نکل جائے۔ جیسا کہ فرانسیسی جنرل کاسترو نے ۱۹۴۰ء میں دمشق کے گذشتہ انقلاب کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ "ہم صلیبی مجاہدین کے پوتے ہیں جس کو ہماری حکومت پسند نہ ہو وہ یہاں سے نکل جائے"

اور اسی سے ملتی جلتی بات جنرل کاسترو کے ایک ہم مشرب نے ۱۹۴۵ء میں الجزائر میں کہی تھی۔ (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص۲۲۵)

روسی کمیونسٹوں کا مسلم اقلیت سے ظالمانہ سلوک

موجودہ دور میں دوسری عظیم طاقت روس کا کمیونسٹ بلاک تو غیر کمیونسٹوں کے وجود کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے، مذہبی رسوم اور عبادت خانوں کو ختم کرنے کا خواہاں ہے، اقلیت کے ساتھ نازیبا سلوک کا اندازہ آپ روسی مسلمانوں کی مساجد اور مدارس سے کیے ہوئے حشر سے لگا سکتے ہیں۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب سے قبل ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کے ۲۵ ہزار مدارس تھے لیکن کمیونسٹ انقلاب کے بعد یہ مدارس بند کر دیئے گئے اور اساتذہ کو گرفتار کر لیا گیا، مدارس کی وہ عمارتیں جن میں قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں بعض کو مسمار اور بعض کو ضبط کر کے اصطبلوں میں تبدیل کر دیا گیا، اور پچیس سال کے عرصہ میں ایک بھی مذہبی مدرسہ نہ رہا۔

یہی حال مساجد کا تھا، ۳۱ ہزار مساجد آباد تھیں لیکن ۱۹۴۲ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اب پورے روس میں صرف ۱۳۱۲ مساجد رہ گئی ہیں باقی سب کو شہید کر دیا گیا۔ (تاریخ میں مسلمان قومیں ص ۔)

برطانوی دور کے مظالم

روس اور یورپ تو درکنار خود اس پاک و ہند کی تاریخ کو دیکھئے برطانوی گورنمنٹ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟

کراچی کے مقدمہ میں رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین کا آخر جرم کیا تھا؟ صرف اس قدر کہ مذہب اسلام کے مطابق مسلمان سپاہیوں کو ترکی کی مسلمان افواج کے مقابلہ میں استعمال نہ کیا جائے۔

ان واقعات اور حالات کو پیش کرنے سے میرا واحد مقصد یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب نے اقلیت اور دشمنوں سے وہ کون سا ناروا سلوک ہے جو روا نہ رکھا ہو، عداوت اور دشمنی کی بناء پر وہ کونسی بے انصافی ہے جو استعمال نہ کی گئی ہو۔

دشمنوں سے اسلام کا روادارانہ سلوک

مگر اسلام نے اپنے مخالفوں اور اقلیت سے جو حُسنِ سلوک کیا اس کا اندازہ آپ خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل اور کردار سے کر سکتے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت تک غیر مسلموں اور ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی، ذمیوں کے لیے باقاعدہ حقوق مقرر کئے گئے اور خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی اسی اصول کو اپنایا گیا، یہاں تک کہ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو وہ حقوق دیئے جو ان کیلئے تاجدارِ حرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیے تھے۔

حقوق کی اقسام

کسی قوم کے حقوق صرف تین چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ جانؔ، مالؔ اور مذہبؔ۔ ان کے سوا اور جتنے بھی حقوق ہیں وہ سب ان ہی کے تحت آ جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے عادلانہ دور میں بیت المقدس کے عیسائیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدہ میں انہیں جو حقوق دیئے گئے تھے وہ یہ ہیں:-

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمرؓ نے اہلِ ایلیا کو دی۔ یہ امان جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذہب کے لیے ہے، نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کے احاطہ کو نقصان

پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔"

(طبری، فتح بیت المقدس، بحوالہ تاریخ اسلام ص ۲۲۲)

اور یہ حقوق صرف ایلیا والوں سے مخصوص نہیں تھے بلکہ پوری دنیا میں مسلمان جہاں بھی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے تو وہاں کے رہنے والوں کو یہ حقوق دیئے۔ اہل جرجان کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ان کی جان، مال، مذہب و شریعت سب کو امان ہے ان میں سے کسی شے میں کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص ۲۲۲)

آذربائیجان کے معاہدہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ تھے:۔

"انکی جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص ۲۲۲)

دورِ صدیقیؓ کے عہد نامے

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی حیرہ کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ یہ حقوق دیئے گئے:۔

"ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ منہدم کیے جائیں اور نہ ان کا کوئی قصر گرایا جائے گا جن میں وہ ضرورت کے وقت دشمن کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہیں، ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی اور نہ مذہبی تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص ۲۲۲)

اور یہ بات صرف کاغذی کارروائی تک محدود نہ تھی بلکہ خلفائے راشدین ہمیشہ کیلئے ماتحت گورنروں کو اس کے متعلق ہدایات جاری فرمایا کرتے تھے، غیر مسلموں سے وہی سلوک برتا جاتا تھا جو سلوک مسلمانوں سے روا رکھا جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے سفر میں ایک مقام پر دیکھا کہ ذمیوں پر سختی کی جا رہی ہے، جب سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جزیہ ادا نہیں کیا گیا، پوچھا گیا کیوں؟ جواب ملا سبب ناداری ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو، جو لوگ دنیا میں دوسروں کو عذاب دیتے ہیں خدا انہیں قیامت

کے دن عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسفؒ)

نادار، مفلس اور معذور ذمی جزیہ سے مستثنیٰ تھے بلکہ بیت المال سے ان کی کفالت کی جاتی تھی، چنانچہ حیرہ کے معاہدہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

"اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے سے معذور ہو جائے یا کوئی آفت آئے یا دولتمندی کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کی اولاد کو بیت المال سے خرچ دیا جائے گا"۔

(کتاب الخراج للقاضی ابویوسفؒ)

حضرت عمرؓ کا ایک لطیف استدلال

یہ معاہدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا اور عہد فاروقی میں اس پر باقاعدہ عمل جاری رہا بلکہ حضرت عمرؓ نے تو قرآنی استدلال سے اس کو اور زیادہ مؤکد کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک ضعیف ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور میں ادا نہیں کر سکتا، یہ سنکر حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقد رقم دیکر داروغہ کو پیغام بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اور فرمایا کہ کلام اللہ کی یہ آیت إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ میں فقراء سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہیں، اور فرمایا خدا کی قسم یہ انصاف نہیں ہے کہ ان کی جوانی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو نکال دیں۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسف)

حفاظتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت عمرؓ باقاعدہ اس سے قصاص لینے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ ایک دفعہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا تو آپ نے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر کے اس سے قصاص لیا۔ (الدرایۃ بحوالہ تاریخ اسلام)

حفاظتِ مال کے بارے میں اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی کسی جائیداد یا مال کو نقصان پہنچاتا تو حضرت عمرؓ اس کا معاوضہ بیت المال سے دلاتے۔ جیسا کہ ایک دفعہ اسلامی لشکر نے شام کے ایک ذمی کی زراعت کو پامال کیا تو حضرت عمرؓ نے اس ذمی کو بیت المال سے دس ہزار درہم کا معاوضہ دلایا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسف)

ذمیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی خصوصی ہدایت

حضرت عمرؓ جس طرح خود ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت کرتے تھے ایسے ہی ماتحت گورنروں سے بھی کرواتے، چنانچہ فاتح شام حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو لکھا کہ:

"مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان پہنچانے اور بے وجہ ان کے مال کھانے سے روکو اور ان سے جو شرطیں طے کی گئی ہیں انہیں پورا کرو۔"

(کتاب الخراج للقاضی ابو یوسف)

بلکہ حضرت عمرؓ دنیا سے جاتے وقت آئندہ خلیفہ کے لیے جو ہدایات لکھتے ہیں ان میں ذمیوں کے حقوق اور ان کی نگہداشت کا خصوصی تذکرہ موجود ہے۔

"میں ان لوگوں کے حق میں جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کیا جائے، اس کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ انہیں تکلیف نہ دی جائے۔" (تاریخ اسلام صـ۲۲۶)

یہی وہ اسلامی عدل وانصاف ہے جس میں دوست اور دشمن کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا ہے وہ دشمن جو بدترین دشمن تھے، جو مذہب اور عقیدہ کے دشمن تھے اُن سے جب اس قدر انصاف قائم رکھا گیا تو اور کون ہو سکتا ہے جس کے ساتھ اسلام نے ظلم کی گنجائش رکھی ہو؟ ان واقعات سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ نے اس فرمانِ خداوندی پر "کسی قوم کی دشمنی تم کو ظلم پر آمادہ نہ کرے۔" کما حقہ، عمل کیا ہے اور امت محمدیہ کے لیے قیامت تک ایک عملی نمونہ چھوڑا ہے۔

وہ دشمن جو اپنے کیے ہوئے افعال و کردار کی وجہ سے بڑی بڑی سزاؤں کے مستحق و منتظر تھے، ندامت اور پشیمانی کی وجہ سے ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنی جانیں خطرے میں دیکھتے تھے۔ لیکن اسلام نے اس کے برعکس ان کی جان کی حفاظت کے علاوہ مال و مذہب کو بھی محفوظ رکھا اور معاشرہ میں ان کو انسانیت کی نظر سے دیکھا گیا۔

مال و دولت: تیسری چیز جو قیام عدل وانصاف میں مانع ہے وہ مال و دولت کی فراوانی یا فقدان ہے۔ مثلاً ایک انسان بسا اوقات کسی غریب کی غربت کو دیکھ کر اس پر ترس کھا کر اس کیلئے جھوٹی گواہی دیتا ہے یا پھر غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ اس کے حق میں کر جاتا ہے جس میں ظلم اور زیادتی کا ارتکاب ہوتا ہے، جبکہ آجکل ہمارے معاشرہ میں یہ بہت کم ہوا ہے کہ لوگ غریب

کی غربت سے متاثر ہوئے ہوں۔ دوسری صورت میں انسان بعض اوقات مالدار کی مالداری کی وجہ سے ظلم پر آمادہ ہو جاتا ہے، مالدار سے کچھ طمع اور امید کی خاطر گواہ جھوٹی گواہی دے کر حاکم سے غلط فیصلے کا حکم صادر کراتا ہے جو یقیناً ظلم اور ناانصافی ہے، قرآن مجید نے اس کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا (سورۃ النساء آیت ۱۳۵)	اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیر خواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو خواہش کی انصاف کرنے میں۔

شہادت کے اصول

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:۔

"یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ بیٹھو جو حق ہو، سو کہو اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ اور ان کے مصالح واقف ہے اور اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔"

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچانا چاہیئے تاکہ اس سے بے مروتی نہ ہو، یا یہ غریب ہے اس کا کیسے نقصان کر دیں۔ تم گواہی دینے میں کسی کی امیری، غریبی یا نفع ونقصان نہ دیکھو کیونکہ وہ شخص جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔ اگر امیر ہے تو، غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اس میں رکھی ہے کہ گواہی میں حق بات کہی جائے، تو تم ضعیف تعلق کے باوجود اپنی شہادت میں ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو۔" (بیان القرآن)

چونکہ شہادت اور فیصلہ دونوں میں تسلط علی الغیر موجود ہے، جب گواہی دیتے وقت گواہ ان امور کو مدنظر رکھے گا تو قاضی اور فیصلہ کرنے والا حاکم بطریق اولیٰ ان امور کا پابند رہے گا۔

قاضی اور حاکم فیصلہ کرتے وقت جیب بھرنے کی انتظار میں نہیں بیٹھے گا بلکہ جو حق ہوگا اس کا امضاء کرے گا۔ اسلامی قوانین انصاف کی راہ میں حائل اس مانع اور رکاوٹ کا سخت نوٹس لیا گیا ہے جب صاحب عہدہ کسی عہدہ اور منصب پر فائز ہو تو اپنے اس منصب سے غلط فائدے نہیں اٹھائے گا، ایسی پارٹیوں (دعوتوں) میں شمولیت سے اجتناب کرے گا جو پارٹیاں صرف اس کے عہدہ کی وجہ سے اس کو دی جاتی ہوں۔

رشوت کی اقسام اور ان کے احکام

یہی وجہ ہے کہ رشوت کی تمام اقسام کو لینے والے کے لیے حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اور رشوت کا مال قبض کرنے سے بھی ملکیت میں نہیں آسکتا بلکہ رشوت میں لیا ہوا مال صاحب مال کو واپس کرنا واجب ہے۔ اس ضمن میں یہ ضروری ہے کہ رشوت کی جملہ اقسام اور ان کے احکام کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔

فقہاء کرام کے فرمان کے مطابق رشوت کی چار قسمیں ہیں:۔

(۱) رشوت کی پہلی قسم جس کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، یہ ہے کہ کسی ایسے منصب پر فائز ہونے کے لیے رشوت دے جس منصب کا یہ اہل نہ ہو، چونکہ غیر اہل کا کسی منصب پر فائز کرنا اور فائز ہونا دونوں ناجائز ہیں لہٰذا اس ناجائز کام کے لیے رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں۔

(۲) دوسری قسم رشوت کی یہ ہے کہ کسی فیصلہ کرنے والے حاکم، قاضی، جج یا مجسٹریٹ کو کچھ رقم یا کوئی اور چیز اس لیے دی جائے کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرے، یہ بھی طرفین کے لیے حرام ہے۔

(۳) رشوت کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم یا کوئی چیز اس لیے دی جائے کہ اس سے اپنا جائز کام کرایا جائے، لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ یہ کام جائز ہونے کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے شخص کی حق تلفی کا سبب اور ذریعہ نہ ہو، لہٰذا ان شروط کے بعد رشوت دینے کی تو اجازت ہے لیکن رشوت لینا اس صورت میں بھی ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) رشوت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم اس لیے دی جائے تاکہ اس کے شر اور فساد سے محفوظ رہا جا سکے۔ اپنی جان سے ظلم اور فساد کے دفع کرنے کے لیے کسی کو کچھ دینا تو جائز ہے لیکن لینا اس صورت میں بھی حرام ہے۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱م ص ۳۵۳، ۳۵۴)

جب ایک گواہ اور ایک حاکم یہ نظریہ قائم کرے کہ مجھے کسی بھی مالدار سے کوئی سروکار نہیں، نہ وہ چائے پانی کے انتظار میں ہو اور نہ بخشش کی طمع اور لالچ ہیں، تو یہ ممکن ہی نہیں

کہ وہ کسی مالدار شخص کی وجہ سے اس سے کسی قسم کی رعایت کرے۔ اسلام میں تو آقا اور غلام، امیر اور غریب سب برابر ہیں۔

شرعی عدالت میں شاہ و گدا برابر ہیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہاں کہیں امیر اور غریب کے اس امتیازی سلوک کو دیکھتے تو اس سے منع فرماتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان تمام بے جا امتیازات کو مٹا کر شاہ و گدا، بلند و پست کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا تھا جس کی ایک جھلک اس واقعہ میں موجود ہے کہ:۔

شام کا ایک نامور بادشاہ جبلہ غسانی مسلمان ہو گیا تھا، ایک دفعہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چادر کا ایک کونہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا، جبلہ نے غصہ میں آکر اس شخص کو تھپڑ مارا، اس شخص نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے جیسا کیا ویسا پالیا۔

جبلہ نے جواب میں کہا کہ ہم تو وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے گستاخی سے پیش آئے تو وہ قتل کا سزاوار ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔

جبلہ نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے تو میں اس سے باز آتا ہوں لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ (تاریخ اسلام)

آج دنیا میں یہ نظارہ موجود ہے، معاشرہ مختلف قسم کی بے ضابطگیوں کا شکار ہے، امیر اور غریب ایک دوسرے کے مدمقابل بنے ہوئے ہیں۔ امیر اپنے آپ کو مال کی کثرت کی وجہ سے مختلف جرائم کا ارتکاب کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہے، جرم کو معیوب نہیں سمجھتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر غور کیا جائے تو یقیناً یہ بات معلوم ہوگی کہ اُمراء کو صرف مال کی بہتات کی وجہ سے بے جا رعائتیں دی گئی ہیں، یہ اس کے نتائج اور اثرات ہیں جو معاشرہ کی تباہی کا سبب ہیں۔

قاضی عدالتوں کو کتاب و سُنّت کا پابند کرانا ہوگا

۹ر فروری ۱۹۸۳ء کو مجوزہ قاضی عدالتوں کے مسودہ پر عام بحث میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا:۔

مولانا سمیع الحق | نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، اما بعد!

جناب چیئرمین | جہاں تک قاضی کورٹس کے قیام کے سلسلہ میں حکومت کے اور جناب صدر پاکستان کے ارادوں اور عزائم کا تعلق ہے تو اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ ایک اسلامی مملکت کا سب سے بڑا اور پہلا فریضہ اس ملک کے شہریوں کو عدل و انصاف آسانی سے مہیا کرنا ہوتا ہے، یہ مسلمانوں کی مدتوں سے ایک آرزو ہے، خاص کر ملکِ عزیز پاکستان کے شہریوں کی کہ یہاں انصاف سستا ہو جائے، اس سلسلہ میں جو اصل مسودہ قانون ہے اور جو ہمارے سامنے ہے ایک تو اس کے بارے میں کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ شاید پہلے سے علماء اور اسلامی علوم پر عبور رکھنے والے حضرات کی نگاہ سے گذرا ہے، حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل کو نہیں بھیجا گیا تھا اور نہ ہی اس پر اسلامی نظریاتی کونسل جو کہ ملک کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے جید علماء پر مشتمل ادارہ ہے جس میں وکلاء بھی شامل ہیں، اُن سے کوئی استصواب رائے اس بارہ میں نہیں کیا گیا، دوسرا مرحلہ جو اصل مسودۂ قانون پر بنیادی توجہ کا تھا وہ یہ تھا کہ ہم قاضی کورٹس تو قائم کرتے ہیں جو بلاشبہ ایک نہایت مستحسن اقدام ہے لیکن اصل مسودے میں یہ کہیں بھی واضح نہیں کیا گیا کہ یہ عدالتیں کن قوانین کے تحت فیصلے کریں گی؟ یہی مروجہ قوانین' یہ فوجداری اور دیوانی ضابطے اور یہی پروسیجر اگر قائم رکھنا ہے تو اگر ہم قاضی کا نام جج رکھ دیں اور جج کا نام قاضی رکھ دیں اس سے تو عدالت اسلامی عدل و انصاف مہیا نہ کر سکے گی اور نہ ہی عوام کو عدل و انصاف مل سکے گا، ہم اگر قاضی کو قاضی محمد احمد کہیں یا قاضی نکلسن کہیں یا قاضی ہر بند رائے کہیں' اس سے انصاف نہیں ملتا، یہاں اصل مسودۂ قانون میں یہ وضاحت ہونی چاہیئے تھی کہ......

اخوندزادہ بہرور سعید | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! یہ قاضی کی توہین ہے ان کو کہیں کہ اپنے الفاظ واپس لیں۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا یہ قاضی کی توہین نہیں ہے۔

اخوندزادہ بہرہ ورسعید جناب والا! یہ قاضی محمد احمد، یا قاضی نکلسن یا قاضی ہر بندرائے، یہ قاضی کی توہین ہے، ان کو کہیں کہ یہ اپنے الفاظ واپس لیں، یہ قاضی کی توہین ہے۔

مولانا سمیع الحق کون سی توہین میں نے کی ہے؟

اخوندزادہ بہرہ ورسعید یہ قاضی نکلسن کیا ہوتا ہے؟

مولانا سمیع الحق آپ جسٹس نکلسن کہیں یا قاضی نکلسن کہیں بات ایک ہی ہے۔ اگر اس کے پاس قانون وہی ہوں جو موجودہ دیوانی یا فوجداری عدالتوں کے ہوتے ہیں یعنی انگریزی قانون ہو اور آپ اس کو علامہ نکلسن کہیں یا مولانا نکلسن کہیں یا جسٹس نکلسن کہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں بنیادی بات سب سے پہلے یہی تھی کہ اصل مسودہ قانون میں یہ واضح ہونا چاہیے تھا کہ یہ تمام عدالتیں قرآن کے مطابق فیصلے کریں گی۔ یہاں متفرقات کے ضمن میں جو تعبیر کے عنوان سے کہا گیا ہے کہ اس سے آرڈیننس کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے قاضی عدالتیں قرآن پاک اور سنت رسول میں مقرر کردہ اسلام کے احکام سے راہنمائی حاصل کریں گی۔ یہ قرآن اور سنت کے ساتھ ایک صریح مذاق ہے، راہنمائی کے لفظ سے قاضی عدالتوں کے قیام کے مقاصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

سید معین الدین پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! THIS IS A MIS STATEMENT OF CLEARLY، اس میں سیکشن نمبر ۵۲ اور ۴۶ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی بات قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہو سکتی، دو سیکشن میں ایک نہیں دو سیکشن ہیں ۴۶ × ۵۲۔

اطلاق قوانین کے لیے راہنمائی نہیں پابندی لازمی ہے

مولانا سمیع الحق ایک یاد دہانی دے رہا ہوں، اسی کے متعلق کچھ عرض کر رہا ہوں۔ اس میں ایسی بات نہیں ہے۔ ابتداء میں یعنی مسودے کے آغاز میں جس قسم کے الفاظ ہیں اس میں یہی درج ہے اور یہاں بھی یہی ہے کہ عدالتیں راہنمائی حاصل کریں گی۔ اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے، آپ قانون دان ہیں، وکلاء حضرات کو بھی پتہ ہے کہ اس سے کوئی قانون اسلامی قانون نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہم تمام آئینوں میں ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد قرار داد مقاصد لکھ دیتے ہیں اسی طرح قرار داد مقاصد کی طرح یہ بھی ایک ابتدائیہ ہے، تو یہ ایک لازمی اور ضروری شرط ہے کہ تمام قوانین کا اطلاق جو ہے وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو گا، اور کوئی طریقۂ کار دیوانی اور فوجداری ضوابط ہوں کہیں بھی قرآن وسنت کی مخالفت بالکل نہیں کی جائے گی۔ اصل قانون جس کو کہتے ہیں جب تک اسے قرآن وسنت کے مطابق نہیں بنایا جائے گا اس وقت تک

شرعی عدالتیں حق اور انصاف کے طریقہ پر نہیں بنائی جاسکتیں ۔

اس لیے دوسری عرض یہ ہے کہ اصل مسودۂ قانون جس پر ہمارے وکلاء حضرات اور دوسرے دوستوں کے جو خدشات تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہ خدشات بالکل بے جا ہیں یہاں اسلامی نظام عدل کا نام لینے والوں نے کبھی سوچا بھی نہیں اور نہ ان کا یہ ارادہ ہے کہ یہاں عدالتوں میں وکلاء کی جگہ پر، مجسٹریٹوں کی جگہ پر علماء قبضہ کرلیں، مقصد ہمارا صرف یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام اور اسلامی عدل وانصاف کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو اسلامی قوانین جاری کرنا ہوں گے اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی اور اس کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد لاء کمیشن کے سامنے مسودہ قانون آیا اور لاء کمیشن کے بعد ہماری فاضل سلیکٹ کمیٹی نے جناب منٹو صاحب کی سرکردگی میں اس رپورٹ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں۔

تو اس پر میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، غالباً مولانا روم نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے جسم پر بھی شیر کا نقشہ یا تصویر ہونی چاہیئے، تو وہ اس قسم کی چیزیں جسم پر بنانے والے ایک شخص کے پاس گیا اور اسے کہا کہ میرے جسم پر شیر کی شکل بنا دو، تو گودنے والے نے شیر کی شکل بنانے کی غرض سے جب اسے سوئی چبھوئی تو اس شخص کو تکلیف ہوئی، وہ چیخا کہ یہ کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ شیر کی تصویر بنا رہا ہوں، اس نے کہا کہ اس وقت کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ مثال کے طور پر اس کے سینگ بنا رہا ہوں، مثال کے طور پر اس نے کہا کہ ارے بھائی شیر بغیر سینگ کے بھی ہو سکتا ہے اس سینگ کو چھوڑ دیجیے۔

جناب زید اے سلہری | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! شیر کے تو سینگ نہیں ہوتے یہ مثال ہی غلط دے رہے ہیں تو ان کی بات کو کیسے صحیح مان سکتے ہیں وہ بھی غلط ہی ہوگی، دیکھئے کہتے ہیں کہ شیر کے سینگ بنا رہا تھا۔

مولانا سمیع الحق | شیر یا کوئی دوسرا جانور، میں نے کہا ہے کہ مثال کے طور پر۔ بہر حال میں نے گدھے کا نام تو نہیں لیا، کیا تکلیف ہوگئی ان لوگوں کو، جیسے مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ "گدھے کے سر سے سینگ غائب ہونا"، تو کیا واقعی گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ بہر حال جب اس نے دوبارہ سوئی چبھونی شروع کی تو اس شخص نے کہا کہ بھائی اب کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ دم بنا رہا ہوں، اس نے کہا رہنے دو دم کو، دم کے بغیر بھی تو شیر ہو سکتا ہے۔ اور پھر جب اس نے تیسری بار سوئی چبھوئی تو اسے پھر تکلیف ہوئی، کہنے لگا کہ اب کیا بنا رہے ہو؟ اس نے

کہا کہ شیر کا سر بنا رہا ہوں، کہنے لگا کر سر کو بھی چھوڑ دو، تو اُس نے سوئی وغیرہ پھینک دی اور کہا بھئی ایسا شیر تو ہم نے دنیا میں کہیں بھی نہیں دیکھا کہ جس کی نہ دُم ہو، نہ سر ہو، نہ پیر ہوں ۔

تو ہماری سلیکٹ کمیٹی نے بھی اس مسودہ کی ایک ایک دفعہ کو ایسا ہی مجروح اور فسخ کر کے پیش کیا ہے

جناب وائس چیئرمین | مولانا صرف ایک منٹ باقی ہے ۔

مولانا سمیع الحق | اور آج یہ بوڑھے پڑھ کر سلیکٹ کمیٹی کی تعریف کر رہے ہیں اور اس کی تائید کر رہے ہیں یہ بالکل شیر تو نہیں ایک ڈھانچہ ہے جس پر شیر کا صرف ٹھپہ لگے گا لیکن اس میں توانائی اور شجاعت نہیں ہو گی، تو یہاں ہر اس دفعہ میں ایسی ترامیم کی گئی ہیں جس سے عدل و انصاف مہیا کرنا اور بھی طویل ہو جائے گا ۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید | جب وہ شیر کا صرف ڈھانچہ ہے تو یہ اس شیر سے ڈرتے کیوں ہیں؟

مولانا سمیع الحق | جناب ہم ڈرتے نہیں ہم اس شیر کو مکمل شیر انشاء اللہ بنا کر چھوڑیں گے ۔

جناب وائس چیئرمین | تشریف رکھئے ۔

جناب گرداری لال بھاٹیہ | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! کیا انسانوں کے معاملہ میں جانوروں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں ؟

جناب وائس چیئرمین | آپ تشریف رکھیں ۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا! موجودہ جو مسودۂ قانون پیش کیا گیا ہے وہ اور بھی اسلامی عدل و انصاف کو دُور کر دے گا، ہمارے معزز رکن جناب عبید الرحمٰن صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کی بالادستی کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ تو اصل چکر وہی ہے کہ ایک عدالت کے بعد دوسری عدالت اور پھر اس کے بعد تیسری عدالت کے پاس جائے، جیسا کہ صدر صاحب نے ذکر کیا تھا کہ وہ کہیں پندرہویں صدی میں جا کر فیصلہ ہو گا ۔ اس لیے خدا کے واسطے اس کے راستے میں رکاوٹیں نہ ڈالیے اور جو لوگ اس کے منتظر ہیں خدارا ان کے ساتھ تعاون کیجئے تاکہ ان کو عدل و انصاف مل سکے ۔

جناب وائس چیئرمین | آپ مسودے کو اچھی طرح سے پڑھیئے پھر سمجھ آ جائے گی ۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا ! ہم پڑھ چکے ہیں انشاء اللہ اس کی ایک ایک دفعہ کا کامیاب اپریشن کریں گے ۔


كتاب
الشهادة

ومن اظلم ممن كتم

شهادة عنده من الله وما

الله بغافل عما تعملون.

کتاب الشھادۃ

(گواہی کے احکام و مسائل)

سگے بھائی کے لیے گواہی دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص کی گواہی اپنے سگے بھائی کے حق میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائیوں کی املاک چونکہ آپس میں مختلف ہوتی ہیں اس لیے ایک دوسرے کے لیے گواہی دینے میں تہمت لازم نہیں آتی، لہٰذا ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول ہو سکتی ہے۔

وتقبل شھادۃ الرجل لاخیہ وعمہ لانعدام التھمۃ لان الاملاک ومنافعھما متباینۃ ولا بسوطۃ لبعضھم فی مال البعض۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۶۱ کتاب الشھادۃ باب من یقبل شھادتہ الخ)

تاہم اگر ان کی املاک ایک ہوں تو پھر جس طرح شریک کی گواہی دوسرے شریک کے حق میں قبول نہیں ہوتی اسی طرح ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں یہ گواہی بعض وجوہ سے اپنی ذات کے لیے ہوگی۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا شھادۃ الشریک لشریکہ فیما ھو من شرکتھما لانہ شھادۃ لنفسہ من وجہ لاشتراکھما۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۶۱ کتاب الشھادۃ۔ باب من یقبل شھادتہ الخ) [1]

نابینا کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ نابینا شخص کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کن امور میں اس کی شہادت قبول ہوگی؟

الجواب:۔ چونکہ شہادت (گواہی) کے اکثر امور کا تعلق معائنہ اور مشاہدہ سے ہوتا ہے

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ویقبل شھادۃ الاخ لاخیہ من النسب وان کان ابوھما حیًا۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۵۹ الفصل الثانی فی الشھادات۔ کتاب الشھادات)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۳ ص۴۶۵ الباب الرابع، الفصل الثالث فیمن لا تقبل شھادتہ

اور معائنہ کئے بغیر اس کا بیان کرنا ناممکن ہے مثلاً اداءِ شہادت کے وقت اشارہ سے اس کی تمیز ہوتی ہو تو قوتِ بینائی کے بغیر ان میں تمیز ناممکن ہے اور بعض امور کا تعلق سماع سے ہوتا ہے لیکن مسموعات میں آپس میں خلط ملط اور ہم شکل ہونے کی وجہ سے اشتباہ لازم آتا ہے اور شہادت میں اشتباہ سے تحرز ضروری ہے لہٰذا نابینا آدمی کی گواہی کسی حال میں درست نہیں۔ تاہم جس شہادت کا تعلق صرف سماع سے ہو مثلاً نکاح، تو وہاں نابینا آدمی کی شہادت قابلِ قبول ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ان الاداء یفتقر الی التمییز بالاشارة بین المشهود لہ والمشهود علیہ ولا یمیز الاعمیٰ الا بالنغمة وفیہ شبهة یمکن التحرز عنها بجنس الشهود والنسبة لتمییز الغائب دون الحاضر وصار کالحدود والقصاص۔

(رد المحتار ج۵ ص۴۷۲ کتاب الشهادة۔باب القبول وعدمه) لہ

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ وعدہ معاف گواہ کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وعدہ معاف گواہ کی گواہی شرعاً درست نہیں، کیونکہ وعدہ معافی کی وجہ سے گواہی دینے والا الخصم بن جاتا ہے اور اس گواہی سے اُسے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور جس گواہی سے گواہی دینے والے کو فائدہ حاصل ہوتا ہو تو وہ گواہی قابلِ قبول نہیں۔

لما قال الشیخ سلیم رستم بازؒ: یشترط ان لا یکون فی الشهادة دفع مغرم او جر مغنم یعنی ان لا تکون داعیة لدفع المضرة او جلب المنفعة۔ (مجلة الاحکام۔ مادة ۱۷۰۰ ص۱۰۲۳ شروط فصل فی الشهادة الاساسیة) لہ

لہ قال العلامة مرغینانیؒ: ان الاداء یفتقر الی التمییز بالاشارة بین المشهود لہ والمشهود علیہ ولا یمیز الاعمیٰ الا بالنغمة وفیہ شبهة یمکن التحرز عنها بجنس الشهود۔

(الهدایة ج۳ ص۱۵۹ کتاب الشهادة۔باب من یقبل شهادته الخ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۶۸ کتاب الشهادة، فصل فی الشرائط فی الاصل۔

لہ قال العلامة الحصکفیؒ: ومن الشرائط عدم قرابة ولاد او زوجیة او عداوة دنیویة او دفع مغرم او جر مغنم۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۴۱۱ کتاب الشهادة)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیة علی هامش الهندایة ج۵ ص۲۴۸ نوع فی الرجل متی تحل لہ الشهادة۔

اُجرتی قاتل کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال :۔ ایسا شخص جو کہ اجرتی قاتل ہو اور اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کر چکا ہو تو کیا اس کی گواہی کسی معاملہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ کسی کو بے گناہ قتل کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے اس لیے اس حرام فعل کا مرتکب فاسق و فاجر ہے، خصوصاً جبکہ خود اس کا اعتراف بھی کر چکا ہو اور فاسق و فاجر کی گواہی شرعاً درست نہیں لہٰذا اجرتی قاتل کی گواہی شرعی لحاظ سے درست نہیں۔

لما قال العلامة الشیخ سلیم رستم باز : یشترط ان یکون الشاھد عدلاً۔

(شرح مجلة الاحکام۔ مادة ۱۷۰۵ ص ۱۰۳۹ فصل فی الشهادة الاساسیة شروط) لہ

داڑھی منڈانے والے کی شہادت کا حکم

سوال :۔ داڑھی منڈانے یا ایک قبضہ سے کم داڑھی رکھنے والے کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب :۔ داڑھی منڈانا یا کترانا حرام ہے جو کہ موجب فسق ہے کیونکہ اس کی مشروعیت احادیث اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں وجوب کے درجہ کو پہنچ چکی ہے اس لیے اس فعلِ حرام کا مرتکب فاسق و فاجر ہے اور فاسق کی گواہی شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ : ومنها العدالة لقبول الشهادة علی الاطلاق فانها لا تقبل علی الاطلاق دونها لقوله تعالیٰ : مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ وَالشَّاهِدَ المرضی هُوَ الشَّاهِدُ العدل۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب الشهادات، فصل فی الشرائط فی الاصل)

لیکن موجودہ معاشرہ کے انحطاط کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر داڑھی والا گواہ موجود نہ ہو اور حق تلفی کا اندیشہ ہو اور گواہی دینے والا داڑھی منڈا معتبر شخص ہو جس کے صدق پر قاضی کو اعتماد حاصل ہو تو پھر داڑھی منڈوانے کے باوجود اس کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : قال فی جامع الفتاویٰ واما شهادة الفاسق فان تحری القاضی

لہ قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ : ومنها العدالة لقبول الشهادة علی الاطلاق فانها لا تقبل علی الاطلاق دونها۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب الشهادة، فصل فی الشرائط فی الاصل)

وَمِثْلُہٗ فی الهداية ج ۳ ص ۱۵۵ کتاب الشهادة۔

الصدق فی شہادتہ تقبل والا فلا ـــــ قال فی الفتاوی القاعدۃ ھذا اذا غلب علی ظنہ صدقہ وھو مما یحفظ درر اول کتاب القضاء وظاھر قولہ وھو مما یحفظ اعتمادہ۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۱۲ کتاب الشہادۃ) [1]

قتل میں عورت کی گواہی کا حکم

سوال:- کیا قتل کے معاملہ میں عورت کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں، اور اس کی گواہی سے قاتل کو سزائے موت دینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- حدود کا نفاذ چونکہ یقینی امور پر ہوتا ہے جو کہ معمولی شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں، عورتوں کی گواہی میں بدلیت کے شبہ کا احتمال ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی گواہی حدود کے نفاذ میں معتبر نہیں، لہٰذا عورت کی گواہی کی بنیاد پر قاتل کو قصاص میں سزائے موت دینا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یقبل فیھا شہادۃ النساء لحدیث الزھریؓ مضت السنۃ من لدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلیفتین من بعدہ ان لا شہادۃ النساء فی الحدود والقصاص ولان فیھا شبھۃ البدلیۃ لقیامھا مقام شہادۃ الرجال فلا تقبل فیما یندرئ بالشبہات۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۵۳ کتاب الشہادۃ) [2]

دشمن کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:- کیا ایک دشمن کی گواہی دوسرے دشمن کے خلاف قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- دشمنی عموماً باہمی ضرر رسانی اور ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ رویہ اپنانے کا سبب بنتی ہے، اس لیے ایک دشمن اگر اپنے مخالف پر گواہی دے تو اس میں ضرر رسانی

---

[1] قال العلامۃ الشیخ سلیم رستم بازؒ: ویشترط ان یکون الشاھد عدلاً۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۱۷۰۵ ص۱۰۳۹ فصل فی شروط الشہادۃ الاسلامیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۱۵۵ کتاب الشہادۃ۔

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: ومنھا الذکورۃ فی الشہادۃ بالحدود والقصاص فلا تقبل فیھا شہادۃ النساء۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ کتاب الشہادۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم باز اللبنانیؒ تحت المادۃ ۱۶۸۵ ص۱۰۰۳۔

کا احتمال موجود ہو کر شریعت کی رُو سے اس کی گواہی قبول نہیں کی جاسکتی اگرچہ یہ گواہ عادل ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: ان شہادۃ العدو علی عدوہ لا تقبل وان کان عدلاً۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۴۸۱ کتاب الشہادات. باب القبول وعدمہ)[1]

گواہی کے لیے آمدورفت کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں گواہی دینے کے لیے عدلت میں حاضر ہو اور حکومت اپنی طرف سے اس کو آمدورفت کا خرچہ دینا چاہے تو کیا اس کے لیے خرچہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی معاملہ میں گواہی دینا دراصل لوگوں کے حقوق کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ ہے اور ہر شخص کے حقوق کا تحفظ دوسرے پر فرض ہے تو شہادۃ دینا گویا اپنا فریضہ سرانجام دینا ہے، اس لیے اس پر اجرت کا مطالبہ کرنا اپنی ایک شرعی ذمہ داری پوری کرنے پر اجرت حاصل کرنا ہے لہٰذا اگر گواہان شہادت پر اجرت کا مطالبہ کریں تو اس صورت میں گواہی پر ذاتی منفعت کے حصول کا شائبہ لازم آتا ہے اور جس گواہی میں ذاتی منفعت کا شبہ ہو وہ شرعاً قبول نہیں لیکن شریعت نے اگر ایک طرف گواہوں کو اجرت لینے سے روکا ہے تو دوسری طرف مشہود لہ کو گواہوں کے اعزاز و اکرام کا درس بھی دیا ہے اس لیے اگر گواہوں کو آمدورفت وغیرہ کا مسئلہ درپیش ہو اور مشہود لہٗ ان کو آمدورفت کا خرچہ دینا چاہے یا ان کے لیے اپنی خوشی سے کھانے پینے کا بندوبست کرے تو گواہوں کو خرچہ وغیرہ لینا جائز ہے، اس لیے اگر حکومت قانون کے موافق خرچہ دینا چاہے تو اس کا لینا جائز ہے لیکن جو پیسے خرچہ سے زائد ہوں وہ حکومت کو واپس کرے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: لو وضع للشھود طعاماً فاکلوا ان کان مھیئاً من قبل ذٰلك تقبل وان صنعه لاجلھم لا تقبل وعن محمد لا تقبل فیھما وعن ابی یوسف تقبل فیھما

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: ولا یجوز شھادۃ علی الرجل اذا کان بینھما عداوۃ یعنی من امور الدنیا فان کان من امور الدین لا تقبل۔
(خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص ۷۰ الفصل الثانی فی الشھادات۔
ومثلهٗ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم باز، مادۃ ۱۷۰۲ ص ۱۰۳۴۔

عادۃ الجاریۃ باطعام من حل محل الانسان ممن یعز علیہ شاھدا ۱ اکلا.......... وجزم فی الملتقی بالقبول مطلقا وفی شرح منظومۃ ابن وھبان للمصنف الفتوٰی علی قول ابی یوسف

(البحرالرائق ج ۷ ص۶۵ کتاب الشھادۃ) ؎

قبضہ اور ملکیت میں شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی زمین سے نہر گذرتی ہے اور دوسرا شخص اس نہر سے اپنی زمین کو مدتوں تک سیراب کرتا رہا، اب دونوں نے اس نہر پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، مالکِ زمین کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ نہر میری زمین سے گذرتی ہے اس لیے یہ میری ملک ہے جبکہ دوسرا شخص اس نہر سے استفادہ کی وجہ سے ملکیت کا دعویدار ہے، اگر دونوں گواہ پیش کریں تو کس کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا؟

الجواب:۔ متنازع فیہ مقدار اگر معروف ومشہور نہ ہو تو اس کی حدود بیان کرنا ضروری ہے اور اگر معروف ومشہور ہو تو پھر حدود بیان کرنا ضروری نہیں۔ فقہاء کرام کی صریح عبارات کے مطابق صحتِ دعویٰ کے بعد طلب بیّنہ وغیرہ ہوگا۔ صورتِ مسئولہ میں بظاہر دونوں ملک اور ید کا دعویٰ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے دونوں ید کو ثابت کریں اگر دونوں کا ید ثابت ہو جائے تو پھر ملک پر گواہ طلب کیے جائیں گے، تو ان دونوں میں سے جو بھی اپنے ملک پر گواہ قائم کرے تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا اور اگر دونوں گواہ قائم کریں تو پھر مدعیٰ دونوں میں تقسیم کیا جائے گا اور نہر دونوں کے درمیان مشترک رہے گی کوئی ایک فریق کسی دوسرے کو انتفاع سے منع نہیں کر سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: واذا ادعی الرجلان ارضا یعنی یدعی کل واحد منھما انھا فی یدہ لم یقض انھا فی ید واحد منھما حتی یقیما البینۃ انھا فی ایدیھما لان الید فیھا

؎ قال العلامۃ خیر الدین الرملیؒ:۔ (سئل) فیما اذا طلبت الشھود الشھادۃ فی مکان بعید مسافۃ یومین احتیج الی الرکوب فادی المدعی للشاھدین اجرۃ دابتھما ھل تسقط شھادتھما بذلک ام لا، اجاب لا تسقط شھادتھما بذلک کما جزم بہ فی الملتقط۔

(الفتاوی الخیریۃ علی ہامش تنقیح الحامدیۃ جلد ۲ ص ۴۱ کتاب الشھادۃ)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۴۹ کتاب الشھادۃ۔

غیرمشاهدۃ لتعذر احضارها وما غاب عن علم القاضی فالبینۃ تثبتہ وان اقام احدھما البینۃ جعلت فی یدہ لقیام الحجۃ لان الید حق مقصود وان اقام البینۃ جعلت فی ایدیھما لما بینا فلا تستحق لاحدھما من غیر حجۃ ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۲۴ کتاب الدعوٰی فصل فی التنازع بالایدی) ؎

شہادت غیر قابض کی قبول ہوگی

سوال: کسی شخص کے زیر تصرف زمین پر دوسرے شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان دونوں میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میراث میں ملی ہے جبکہ دونوں کے پاس گواہ بھی موجود ہیں، از روئے شریعت ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے؟

الجواب: زمین جس شخص کے قبضہ میں ہے وہ ذوالید ہے اور دوسرا شخص جو ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے خارج ہے لہٰذا صورتِ مذکورہ میں اگر دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو تو عام معاملات کی طرح خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوں گے، ذوالید کے گواہوں کو اس وقت ترجیح دی جائے گی جب دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا ثبوت موجود ہو، اور اگر ذوالید کی تاریخ خارج کی تاریخ سے اسبق ہو تو اس وقت ذوالید کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی، اور اگر دونوں میں سے صرف ایک کے پاس تاریخ کا ثبوت موجود ہو تو اس صورت میں بالاجماع خارج کے گواہوں کو ذوالید پر ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو کان فی ید احدھما فھو للخارج الا اذا کان تاریخ ذی الید اسبق فھو اولیٰ عند ابی حنیفۃؒ وابی یوسفؒ وعند محمدؒ یقضی بہ للخارج لانہ لا عبرۃ للوقت فی المیراث عندہ وان ارخ

؎ قال العلامۃ فخر الدین القاضی خانؒ: فان اقام احدھما البینۃ انھا فی یدیہ یقضی لہٗ بالید ویصیر ھو مدعیٰ علیہ والآخر مدعیا وان قامت البینۃ لکل واحد منھما فان القاضی یجعل الدار فی یدھما لانھما تساویا فی اثبات الید ۔

(الفتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۲ ص۳۹۱ فصل فی دعوی الدور والاراضی)

ومثلہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم باز، المادۃ ۱۷۵۵ ص۱۱۱۱ ۔

احدھما ولم یورخ الآخر فھو للخارج بالاجماع۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۱۱۳ کتاب الدعوی الفصل الثالث عشر فی العین یتنازع فیھا اثنان) [1]

زیرِ کاشت زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنے میں گواہ خارج کے مقدم ہوں گے

سوال:۔ ایک شخص ایک زمین بطور کاشت کھاتا رہا، ایک دوسرے شخص نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے، اس نے جواب میں کہا کہ یہ تو پٹھانوں کا دفتر ہے، یہ کہنے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ زمین نہ میری ہے نہ تیری، تو اس صورت میں گواہ کس کے معتبر ہوں گے؟

الجواب:۔ اگر کاشتکار کے اس کہنے سے کہ "یہ زمین پٹھانوں کا دفتر ہے" مطلب یہ ہو کہ زمین مجھے پٹھانوں نے دی ہے اور میری ملکیت ہے تو اس صورت میں دوسرے شخص کا دعویٰ صحیح ہے اور گواہ اس کے معتبر ہوں گے کیونکہ یہ خارج ہے اور ملک مطلق کا دعویٰ کرتا ہے اور فقہاء کی تصریح کے مطابق ملک مطلق کے مطالبہ میں گواہ خارج کے مقدم ہوں گے اور اگر اس کے کہنے کا مطلب یہ ہو کہ یہ زمین پٹھانوں نے مجھے صرف کاشت کے لیے دی ہے اور میری ملکیت نہیں تو اس صورت میں کاشتکار خصم نہیں بن سکتا اور مدعی ان لوگوں پر گواہ پیش کرے جس کی اصل ملکیت ہو اور گواہ بہرحال اس کے معتبر ہوں گے کیونکہ خارج ہے۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز: بینۃ الخارج اولیٰ فی دعوی الملک المطلق الذی لم یبین فیھا تاریخ۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۷۵۷، ص۱۱۱۶ فصل فی ترجیح البینات) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن قاضی سماوۃ: واذا کان العین فی ید احدھما ولم یورخا او ارخا سواء یقضی للخارج وان ارخا واحدھما اسبق فھو لاسبقھما وعند محمد للخارج لانہ لا عبرۃ للتاریخ ھنا وان ارخ احدھما لا الآخر فھو للخارج لاجماعاً۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۷۷ الفصل الثامن فی دعوی الخارج مع ذی الید)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۴ ص۴۸۶ باب دعوی الرجلین۔

[2] قال العلامۃ التمرتاشی: تقدم حجۃ خارج فی ملک الخارج۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۸۶ باب دعوی الرجلین)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۳۲ کتاب الدعوی۔ فصل حکم تعارض الدعوتین مع تعارض البینتین۔

نکاح کی مجلس میں بغیر حاضر ہوئے نکاح کی گواہی دینا جائز ہے

سوال :- جو لوگ نکاح کی مجلس میں حاضر نہ ہوں اور ان کو محض خبر سے نکاح کا پتہ چلا ہو اور وہ عقدِ نکاح کے بارے میں گواہی دینا چاہیں تو کیا ان کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- بعض احکامات کا دارومدار چونکہ گواہی پر ہے اس میں ذرہ برابر بھی ردوبدل آنے سے احکامات میں تبدیلی آجاتی ہے، اس لیے شریعت میں شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شریعت نے اس کی حفاظت کے لیے بڑی احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں اور اس کو قبول کرنے کے لیے بہت سے شرائط عائد کیے ہیں، ان شرائط میں ایک یہ بھی ہے کہ گواہ جس معاملہ میں گواہی دینا چاہے اس کی پوری نوعیت اس کے سامنے ہو اور یہ نوعیت تب پوری طرح واضح ہوتی ہے جب گواہ خود موجود ہو، اس لیے شہادت میں شریعت نے دیکھنے اور حاضر ہونے کو شرط قرار دیا ہے لیکن بعض ایسے امور جو کہ شہرت سے متعلق ہو کر چشم دید گواہی دینا اس میں مشکل ہو اصل شرط سے مستثنیٰ قرار دیئے ہیں، اگر ان امور کی اطلاع معتمد ذرائع سے حاصل ہو تو ان میں گواہی دینا جائز ہے، ان ہی امور میں سے ایک نکاح بھی ہے لہٰذا اگر کوئی عقدِ نکاح کے وقت مجلس میں موجود نہ ہو اور اس کو معتمد ذرائع سے اس کا علم ہو جائے تو وہ شخص اگر اس پر گواہی دینا چاہے تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغيناني ؒ: ولا يجوز للشاهد ان يشهد بشئ لم يعاينه الا النسب والموت والنكاح والدخول - (الهداية ج۳ ص۱۵۸ كتاب الشهادة ـ فصل من يقبل شهادته الخ) [۱]

اثباتِ زیادتی کی وجہ سے خارج کے گواہوں کا حکم

سوال :- ایک شخص عرصۂ دراز تک زمین کے ایک ٹکڑے کی پیداوار

---

[۱] قال العلامة ابن قاضي سماوة ؒ : شهدا بنسب او نكاح وقالا سمعناه من قوم لا يتصور اجتماعهم على الكذب لا تقبل وقيل تقبل وفي (عده) اشارة الى ان القبول اصح على ما يأتي ـ (جامع الفصولين ج۱ ص۱۲۷ الفصل الثاني عشرة فيما تسمع فيه الشهادة بلا فصل)

ومثلهٗ في شرح المجلة للعلامة سليم رستم باز تحت المادة ۱۶۸۸ ص۱۰۲۷ ـ

کھاتا رہا، اس پر تعمیر بھی کرائی اور درخت بھی لگوائے، اب ایک دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ زمین میں نے اس کو بطور امانت دی تھی اور اس نے مجھے ۹۰۰ روپے قرض اس شرط پر دیئے تھے کہ جب وہ اس زمین سے ۹۰۰ روپے کے برابر پیداوار حاصل کرلے گا تو یہ زمین مجھے واپس کردے گا، لیکن کاشتکار اب اس سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ زمین اس نے مجھے بیع قطعی پر دی تھی، تو اس صورت میں گواہ کس کے مقدم ہوں گے؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں کاشتکار جو کہ ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اور ذوالید اگر ملک مطلق کے دعویٰ کی صورت میں شراء کا دعویٰ کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وان اقام الخارج البینة علی الملك المطلق وصاحب الید البینة علی الشراء منه کان صاحب الید اولیٰ۔ (الهدایة ج۳ ص۲۲۱ کتاب الدعویٰ باب ما یدعیه الرجلان)

لیکن دوسرا شخص چونکہ خارج ہے فعل زائد یعنی ودیعت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے ہاں اصل ملکیت خارج کے لیے[1] مسلّم ہے اور خارج چونکہ اثباتِ زیادتی کا دعویٰ کرتا ہے، لہٰذا اگر یہ دوسرا شخص ودیعت پر گواہ قائم کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: اذ لوادعی الخارج الفعل علی ذی الید کالغصب والاجارة والعاریة فبینة الخارج اولیٰ۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۴۴ باب دعوی الرجلین)

زیادت کا دعویٰ کرنے والے کے گواہ مقدم ہوں گے

سوال:۔ دو آدمیوں نے ایک قومی مشترک زمین پر قبضہ کیا ہوا ہے اور دونوں اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے ہیں، اب ایک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ساری زمین میری ہے، مجھے وراثت میں ملی ہے، جبکہ دوسرے فریق کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: الا اذا ادعی الخارج علیه فعلا کغصب او ودیعة او اجارة ونحوها فی روایة دُرر او کان سببا یتکرر کبناء وغرس ونسج خز وزرع بر ونحوه او اشکل علی اهل الخبرة فهو للخارج لانه الاصل وانما عدلنا عنه بحدیث النتاج۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۴۹۰ باب دعوی الرجلین)

ومِثْلُهُ فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۸ ص۱۱۱۸ کتاب الدعویٰ۔

میرے اور تمہارے درمیان مشترکہ ہے کیونکہ دونوں کا اس پر قبضہ ہے، ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں جو شخص محض زمین آباد کرنے کی وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے تو زمین آباد کرنا چونکہ سببِ ملک نہیں اس لیے اس کا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے تاہم اگر یہ زمین موات ثابت ہو جائے جس میں آباد کرنے سے ملکیت ثابت ہو سکتی ہے تو پھر دونوں کا دعویٰ قابلِ سماع ہے لیکن صورتِ مسئولہ میں دونوں فریقین کے تصرفات اور دعویٰ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مدعی بعض نے زمین کے اس حصہ سے کوئی سروکار نہیں رکھا جس میں اس کا خصم تصرف کر رہا ہے بلکہ مدعی کل تصرفات کے ہوتے ہوئے مدعی بعض کے حصہ سے تصرفات میں خارج اور اجنبی ہے، اس لیے اگر دونوں گواہ پیش کریں تو تمام جائیداد کا فیصلہ مدعی کل کے حق میں ہوگا کیونکہ آدھی جائیداد اس کو کسی کے دعویٰ نہ کرنے سے رہ گئی اور بقیہ جائیداد میں مُدعی کل خارج متصور ہو کر ذوالید کے مقابلہ میں خارج کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز: اذا ادعی اثنان مالاً احدھما بالاستقلال والآخر بالاشتراک وکل منھما متصرف فیہ ای ذو ید علیہ فبینۃ الاستقلال اولیٰ یعنی اذا اذا کلاھما اقامۃ البینۃ ترجح بینۃ الذی ادعی الاشتراک۔ [1]
(شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۷۵۶ ص ۱۱۱۳ فصل فی ترجیح البینات)

گواہوں کی عدم موجودگی میں محض شک کی وجہ سے سزائے موت دینے کا حکم

سوال:۔ کیا حدود کے جاری کرنے کیلئے گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا محض شک کی وجہ سے کسی مجرم کو سزائے موت دینا درست ہے؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ نے لوگوں کے مال وجان اور عزت وآبرو کے تحفظ

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ:۔ فالاصل فیہ ان البینۃ المظھرۃ للزیادۃ اولیٰ۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۴۱ کتاب الدعوی۔ فصل حکم تعارض الدعوتین۔ الخ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۲۰۸ باب التحالف۔

کا تہیہ کر رکھا ہے اور ہر حال میں ان کی عزت وآبرو اور مال وجان کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے کیونکہ ان چیزوں کے تحفظ کے بغیر سکون وراحت کی زندگی کا تصور بھی محال ہے، ان امور کے تحفظ اور حقوق اللہ کے احیاء کے لیے حدود وقصاص وغیرہ کا اجراء عدیم المثال نظام ہے اس لیے اگر کسی کے وجود یا افعالِ بد سے دوسروں کے مال وجان وغیرہ کو خطرہ ہو تو جرم کے ثابت ہو جانے پر مجرم کو حدود وقصاص کے تحت سزا دی جا سکتی ہے لیکن اگر جرم کے اثبات میں معمولی سی غفلت بھی برتی جائے تو اس میں کسی بے گناہ کی جان یا اس کی عزت وآبرو کے ضیاع کا خطرہ ہے اس لیے جرم کے اثبات کے لیے شریعت نے شہادت میں سختی سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ شبہ کے احتمال کی وجہ سے عورتوں کی گواہی غیر معتبر قرار دی ہے اس لیے صحیح گواہوں کے بغیر محض شک وشبہ کی بناء پر کسی کو سزائے موت دینا ناجائز ہے۔

کما فی الحدیث: عن عائشة قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام ان یخطئ فی العفو خیر من ان یخطئ فی العقوبة۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۱۱ کتاب الحدود۔ الفصل الثانی) [1]

شرکاءِ کاروبار کا ایک دوسرے کیلئے گواہی دینا

سوال:- دو آدمی ایک کاروبار میں شریک ہیں کیا وہ کاروبار کے معاملہ میں ایک دوسرے کے لیے گواہ بن سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: اسلامی قانونِ شہادت کی رو سے ایک شریک دوسرے شریک کیلئے طرفداری کی تہمت کی وجہ سے گواہی نہیں دے سکتا اور نہ ان کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں مقبول ہوگی۔

لما فی مجلة الحکام، وکذلك لا تقبل شهادة الشرکاء لبعضهم فی مال الشرکة ولا تقبل شهادة الکفیل بالمال للاصیل علی کون المکفول به۔ الخ (درر الحکام علی مجلة الاحکام ج۴ ص۳۹۳ کتاب الشهادة) [2]

---

[1] قال العلامة الکاسانی رحمه الله: لان الحدود والقصاص مبناها علی الدرء والاسقاط بالشبهات۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ کتاب الشهادات۔ فصل واما الشرائط فی الاصل الخ)

ومثله فی الهدایة ج۲ ص۵۰۷ کتاب الحدود۔

[2] قال العلامة علی حیدر: لا تقبل شهادة الشرکاء لبعضهم فی مال الشرکة۔ (درر الحکام علی مجلة الاحکام ج۴ ص۳۹۵)

باپ کا بیٹے کے لیے گواہی دینا

سوال :- جناب مفتی صاحب! اگر باپ عدالت میں جج کے سامنے بیٹے کے حق میں یہ گواہی دے کہ میرے بیٹے نے فلاں شخص سے دعویٰ میں درج شدہ اراضی قطعی بیع سے خریدی ہے، تو کیا باپ کی یہ گواہی بیٹے کے حق میں مقبول ہوگی یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب :- اسلامی قانونِ شہادت کی رُو سے باپ بیٹے یا بیٹا باپ کیلئے گواہی نہیں دے سکتا اس لیے کہ اس میں طرفداری اور قرابتداری کی تہمت ہے کہ ہوسکتا ہے باپ بیٹے کے حق میں بلاجواز جھوٹی گواہی دے رہا ہو، تو اس تہمت کی وجہ سے اسلام اصول و فروع کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں کرتا اسلئے عدالت باپ کی گواہی کی بنیاد پر بیٹے کے حق میں فیصلہ دینے کی شرعاً مجاز نہیں۔

لما قال العلامة المرغيناني: ولا شهادة الوالد لولده وولد ولده ولا شهادة الولد لابويه واجداده والاصل فيه قوله عليه السلام لا يقبل شهادة الولد لوالده ولا الوالد لولده ولا المرأة لزوجها ولا الزوج لامرأته الخ (الهداية ج ۳ ص ۱۶۰ كتاب الشهادة) ؎

ہیجڑے کی گواہی کا حکم

سوال :- کیا ہیجڑے کی گواہی شرعاً قبول کی جائے گی یا نہیں؟ جبکہ وہ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ناچ گانے کا کام بھی کرتا ہو، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب :- جو ہیجڑا عورتوں کے ساتھ مشابہت رکھتا ہو، شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ناچتا گاتا بھی ہو تو اس کی گواہی اس کے فسق کی وجہ سے شرعاً مقبول نہیں۔ تاہم جس کے اعضاء اور اداؤ انداز میں نرمی ہو اور وہ فسق و فجور کا ارتکاب نہیں کرتا ہو تو وہ صرف نرمی کی بناء پر مردود الشہادت نہیں ہوتا بلکہ شرعاً اس کی گواہی کو قبول کیا جائے گا۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: وقال فقهاء الحنفية لا تقبل شهادة مخنث لفسقه وهو الذي يفعل الردى ويؤتى كالنساء اما الذي في كلامه

؎ وفي مجلة الاحكام: لا تقبل شهادة الاصل للفرع والفرع للاصل يعني لا تقبل شهادة الاباء والاجداد والامهات والجدات لاولادهم واحفادهم وبالعكس اي شهادة الاولاد والاحفاد للاباء والاجداد والامهات والجدات. الخ (درر الحكام على مجلة الاحكام ج ۴ ص ۳۹۳ كتاب الشهادة. المادة ۱۷۰۰)۔

وفی اعضائه تکسر فهو مقبول الشهادة ۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہٗ ج۶ ص۵۶۶ المطلب الثالث، شروط اداء الشہادة)[1]

تائب فاسق کی گواہی کا حکم

سوال :۔ ایک آدمی پہلے جُوا، چوری، زنا وغیرہ قبیح افعال کا ارتکاب کرتا تھا لیکن اب اس نے تمام تمام برائیوں سے توبہ کر لی ہے، تبلیغ میں بھی وقت لگانا شروع کر دیا ہے، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ اب اگر وہ کسی مجرم پر گواہی دے تو کیا شرعاً اس شخص کی گواہی قبول کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب :۔ فقہاءِ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فاسق وفاجر جب اپنے فسق وفجور سے توبہ کرکے صراطِ مستقیم پر آجائے تو وہ شہادت دینے کا شرعاً اہل ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں موصوف کسی بھی مجرم پر گواہی دینے کا اہل ہے اس کو سابقہ جرائم کی وجہ سے گواہی دینے سے نااہل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي : واتفق الفقهاء على أن الفاسق اذا تاب من فسقه تقبل شهادته واستثنى الحنفية المحدود في القذف فانه لا تقبل شهادته عندهم وان تاب۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۶ ص۵۶۲ المطلب الثالث فی شروط اداء الشہادة)[2]

بینائی سے محروم شخص کی گواہی کا حکم

سوال :۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا تھا اور دو آدمیوں نے اسے عین قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا، جب قاتل کے خلاف تھانے میں ایف آئی آر درج کرائی گئی تو اُس نے موقعہ کے ان گواہوں میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو اغوا کرکے اس پر اتنا تشدد کیا کہ اُس کی بینائی ختم ہوگئی

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله : (ولا تقبل شهادة) مخنث بالفتح من يفعل الردى ويؤتى وأما بالكسر فالمتكسر المتلين في اعضائه وكلامه خلقة فتقبل ۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار جلد۵ ص۴۷۹ کتاب الشہادة۔ باب قبول الشہادة وعدمہ)

[2] قال العلامة الحصكفي رحمه الله : الفاسق اذا تاب تقبل شهادته الا المحدود بقذف ۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار جلد۵ ص۴۷۷ کتاب الشہادة ۔ باب قبول الشہادة وعدمہ)

اب وہ قاتل گرفتار ہوگیا ہے اور عدالت میں اس پر مقدمہ چل رہا ہے تو دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ قاتل کے تشدد سے بینائی سے محروم ہوجانے والا شخص عدالت میں اُس قاتل کے خلاف گواہ بن سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس نے خود قاتل کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟

الجواب:۔ حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے ہاں اداءِ شہادت کے لیے چند شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے اور بدون ان شرائط کے گواہ اداءِ شہادت کا اہل نہیں ہوسکتا۔ ان شرائط میں عقل، بلوغ اور اسلام وغیرہ کے ساتھ ساتھ گواہ کا بینا ہونا بھی ضروری ہے، صورتِ مسئولہ کے مطابق گواہ اداءِ شہادت کے وقت چونکہ بینائی کی نعمت سے محروم ہے اس لیے وہ حنفیہ کے نزدیک اداءِ شہادت کا اہل نہیں۔

لما قال العلامة الشیخ وهبة الزحیلی: البصر: یشترط عند ابی حنیفةؒ و محمدؒ والشافعیة ان یکون الشاهد مبصراً فلا تقبل شهادة الاعمٰی لانه لا بد من معرفة المشهود له والاشارة الیه عند الشهادة ولا یمیز الاعمٰی بین الناس الا بنغمة الصوت وفیه شبهة لان الاصوات تتشابه وتشدد الحنفیة فمنعوا قبول شهادة الاعمٰی وان کان بصیراً عند تحمل الشهادة۔ (الفقه الاسلامی وادلته، جلد ۶ ص۵۶۲ المطلب الثالث شروط اداء الشهادة) [1]

قوتِ گویائی سے محروم شخص (گونگے) کی شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی جو کہ بات چیت کرنے کی نعمت سے محروم (گونگا) ہے، اگر وہ خود کسی شخص کو کوئی جرم کرتے ہوئے دیکھے اور اس کی آواز کو پہچانتا بھی ہو، تو کیا یہ شخص اس مجرم کے خلاف عدالت میں اشارہ کے ساتھ گواہی دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کے مطابق مجرم کو سزا وغیرہ دینے کی شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانونِ شہادت کے مطابق گواہ میں چند شرائط کا ہونا ضروری

---

[1] لما قال العلامة الحصکفی رحمه الله: لا تقبل من اعمٰی مطلقاً۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: ولنا ان الاداء یفتقر الی التمییز بالاشارة بین المشهود له والمشهود علیه ولا یمیز الاعمٰی الا بالنغمة وفیه شبهة۔ (رد المحتار والدر المختار ج۵ ص۴۷۶ کتاب الشهادة۔ باب قبول الشهادة وعدمه)

ضروری ہے مثلاً مسلمان ہونا، آزاد ہونا، عاقل بالغ اور بصیر ہونا وغیرہ، ان شرائط میں ایک شرط قوتِ گویائی کی بھی ہے، اگر کوئی شخص شہادت کی دیگر شرائط تو پوری کرتا ہو مگر وہ قوتِ گویائی سے محروم ہے تو وہ شہادت کا شرعاً اہل نہیں اور عدالت اُس کی دی ہوئی گواہی پر فیصلہ صادر کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: النطق: اشترط الحنفية والشافعية والحنابلة ان يكون الشاهد ناطقاً فلا تقبل شهادة الاخرس وان فهمت اشارته لان الاشارة لاتعتبر في الشهادات لانها تتطلب اليقين وانما المطلوب التلفظ بالشهادة۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج ٦ ص ٥٦٤ المطلب الثالث، شروط اداء الشهادة)

گواہ کی خفیہ تحقیقات کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک مسئلے کا حل مطلوب ہے وہ یہ کہ آجکل بعض لوگ سفید لباس پہن کر خود ساختہ معزز بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں لیکن پسِ پردہ وہ جرائم پیشہ افراد کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر عدالت میں جج کے سامنے کسی مجرم کے خلاف شہادت دینے کے لیے آئیں اور خود مجرم یا اس کا وکیل ان پر جرح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ موصوف تو خود فلاں فلاں جرم کا مرتکب ہے۔ تو کیا جج حقیقت جاننے کے لیے خفیہ طور پر ان کی عدالت کی تحقیق کر سکتا ہے یا صرف ان کی ظاہری عدالت پر اعتماد کر کے فیصلے کر سکتا ہے؟ فقہاء کرام کی اس بارہ میں کیا رائے ہے؟

الجواب:۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گواہ کی ظاہری عدالت پر اکتفاء کر کے جج یا قاضی کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے، گواہ کی خفیہ طور پر تحقیقات کرنا ضروری نہیں ہے البتہ حدود اور قصاص کے معاملے میں اس احتیاط کو بروئے کار لانا ان کے ہاں بھی ضروری ہے، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک جملہ معاملات اور مقدمات میں گواہ کی خفیہ طور پر عدالتی تحقیق ضروری ہے، متأخرین علماء احناف نے اسی کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی گواہ کی عدالتی خفیہ تحقیق ضروری ہے، اس لیے کہ خصم (مجرم) یا اس کے وکیل نے گواہ پر اعتراض کیا ہے،

اس لیے جج یا قاضی ایسے گواہ کی خفیہ عدالتی تحقیقات کی روشنی میں فیصلہ صادر کرے صرف گواہ کی سفید پوشی پر اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں ۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي : واكتفى ابوحنيفة بظاهر العدالة في المسلم ولا يسأل عن الشهود حتى يطعن الخصم بهم الا في الحدود والقصاص فانه يسأل عن الشهود وان لم يطعن فيهم الخصوم ودليله على الاكتفاء بظاهر العدالة قوله عليه السلام: المسلمون عدول بعضهم على بعض الا محدوداً في قذف - ومثله مروي عن عمر .... وقال الصاحبان والفتوى على قولهما لا بد من ان يسأل القاضي عن الشهود في السر والعلانية في سائر الحقوق لان القضاء قائم على الحجة وهي شهادة الرجال فلا بد من التعريف على العدالة و في ذلك صيانة للحكم القضائي عن النقض والابطال بسبب الطعن في عدالة الشهود ـ

(الفقه الاسلامي وادلته ج ۶ ص۵۶۵ ، ص۵۶۶ المطلب الثالث في شروط اداء الشهادة)

علت زائل ہونے کے بعد اسی مقدمے میں شہادت کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کے لیے قاضی کے سامنے یہ شہادت دی کہ میری بیوی کا اپنے بھائی زید پر ایک لاکھ روپیہ (جو کہ اُسے اپنے والد کے ترکہ سے نقدی کی صورت میں ملے تھے) قرضہ ہے لیکن قاضی نے اس کی شہادت کو ازدواجی رشتے کی بناء پر رد کر دیا ۔ اب جبکہ اس شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ بائن دے کر رخصت کر دیا ہے تو کیا یہ شخص اسی مقدمہ میں شہادت دے سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ عورت اب اس کے لیے اجنبیہ بن گئی ہے ؟

الجواب :۔ اسلامی قانونِ شہادت کے تحت جب ایک بار کسی شخص کی گواہی کسی علت کی بناء پر رد کر دی جائے تو اسی مقدمے میں اس شخص کی شہادت علت زائل ہونے کے بعد بھی قبول نہیں ہو گی ۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں طلاق دینے کے بعد بھی اثباتِ دعویٰ کے لیے اس شخص کی شہادت کارآمد نہیں ۔

لما قال العلامة سليم رستم باز : متى ردت الشهادة لعلة ثم زالت العلة فتشهد في تلك الحادثة لا تقبل فلو شهد الزوج لزوجته بدعوى فردت

ثمّ ابانها وتزوجت غيره ثمّ شهد لها بتلك الدعوىٰ لم تقبل۔

(شرح المجلہ رستم باز ص۱۰۲ المادۃ ۵۵۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی)

شہادۃ میں مشہود لہ یا علیہ کا نام مع ولدیت لینا

سوال:۔ ایک آدمی جب کسی کیلئے گواہی دے تو اس کا نام مع ولدیت لے گا یا نہیں؟ اسی طرح جس کے خلاف گواہی دے رہا ہو تو اس کا نام بھی مع ولدیت کے لے گا یا نہیں؟ شریعت اسلامی میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ گواہی دیتے وقت اگر مشہود لہٗ (جس کے لیے گواہی دیتا ہو) اور مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہو) عدالت میں موجود ہوں تو گواہ کے لیے ان کے نام مع ولدیت کے لینا ضروری نہیں، صرف اشارہ کرنے سے بھی تعیین ہو جائے گا۔ البتہ اگر دونوں موجود نہ ہوں یا کوئی ایک غیر حاضر ہو تو اس کا نام مع ولدیت کے لے کر گواہی دینا ضروری ہے صرف نام پر اکتفاء کرنے سے بات نہیں بنے گی، تاہم اگر وہ مشہور و معروف ہو تو شہرت کی وجہ سے صرف نام لینا بھی کفایت کر جاتا ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یجب ان یشیر الشاهد عند الشهادة الی کل من المشهود لهٗ والمشهود علیه والمشهود به اذا کانوا حاضرین فان فعل ذٰلك کفیٰ ولا یلزمه ان یذکر اسم ابی المشهود لهٗ والمشهود علیه ولا احدهما اما فی الشهادة المتعلقة بالمؤکل الغائب او بالمیّت فیلزم الشاهد ذکر ابیهما وجدهما ولکن اذا کان کل منهما مشهوراً ومعروفاً فحسب الشاهد ان یذکر اسمه وشهرته لان المقصود الاصلی تعریفه بوجه یمیزه من غیره۔[1] (شرح المجلۃ الاحکام رستم باز ص۱۰۱۱ م ۱۶۹۰)

شہادت کیلئے خود مشاہدہ کرنا ضروری ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص گواہی دیتے وقت قاضی کے سامنے یہ کہے کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے یا

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: وهی ان علیٰ حاضر یحتاج الشاهد الی الاشارة الی ثلاثة الی الخصمین والمشهود به لو عینا ولادینا وان علیٰ غائب کما فی نقل الشهادة او میت فلا بد لقبولها من نسبته الی جده فلا یکفی ذکر اسمه واسم ابیه وصناعته الا اذ کان یعرف بها ای بالصناعة لا محالة بان لا یشارکه فی المصر وغیره فلو قضی بلا ذکر الجد نفذ فالمعتبر التعریف لا تکثیر الحروف حتی لو عرف باسمه فقط او بلقبه وحده کفیٰ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۴۶۶ کتاب الشهادة)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة لخالد اتاسی ج۵ ص۲۰ الباب الاول فی الشهادة۔

لوگوں میں مشہور ہے کہ فلاں شخص نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے، جبکہ گواہی دینے والا شخص صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اور تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت بھی لگاتا ہو۔ تو کیا اس شخص کی یہ گواہی اثباتِ جرم کے لیے شرعاً کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گواہی دینے والے کیلئے اگرچہ عادل، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا بھی ضروری ہے مگر قبولِ شہادت کے لیے اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ شاہد نے مجرم کو جرم کے ارتکاب کے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، صرف لوگوں سے سُنکر گواہی دینا قابلِ قبول نہیں۔ لہٰذا اس قسم کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہوگا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بات لوگوں میں غلط مشہور ہوچکی ہو۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یلزم ان یکون الشھود قد عاینوا بالذات المشھود بہ وان یشھدوا علیٰ ذٰلک الوجہ ولا یجوز ان یشھدوا بالسماع یعنی ان یشھد الشاھد بقولہ سمعت من الناس۔ (مجلۃ الاحکام العدلیۃ المادۃ ۱۶۸۸) [1]

صرف عورتوں کی گواہی کا حکم

سوال:۔ شہادت کے معاملہ میں صرف مرد گواہ کا ہونا ضروری ہے یا یہ کہ کہیں صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ قبول ہوسکتی ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ لوگوں کے مابین پیدا ہونے والے تنازعات کے حل کے لیے شرعاً دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا بطور گواہ ہونا ضروری ہے لیکن جہاں کہیں مرد گواہوں کی رسائی ممکن نہ ہو یا وہ ان حالات پر مطلع نہ ہوسکتے ہوں تو اس مجبوری کے تحت صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ اثباتِ دعویٰ ہے اور شرعاً ان کی شہادت کو قبول کیا جائے گا۔

لما فی مجلۃ الاحکام: نصاب الشھادۃ فی حقوق العباد رجلان او رجل وامرأتان ولکن تقبل شھادۃ النساء وحدھن بحق المال فقط فی الحال التی لا یمکن اطلاع الرجال علیھا۔

(شرح مجلۃ الاحکام لرستم باز، المادۃ ۱۶۸۵ ص۱۰۰۳ الباب الاول فی الشھادۃ) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ محمد بن الحسین الحنفیؒ: لو قالوا اشھد انا لانی سمعنا من الناس فلا تقبل شھادتہ۔ (الفتاویٰ الانقرویۃ ج ۱ ص۳۹۰ کتاب الشھادۃ۔ الباب السادس فی الشھادۃ بالتسامع)

[2] لما قال العلامۃ خالد آتاسیؒ: کالولادۃ فان شھادۃ المرأۃ الواحدۃ فی حق الارث تقبل عندھما خلافاً لابی حنیفۃ ویقولھما قال الشافعیؒ واحمد وھو ارجح کما فی الفتح واما فی حق ثبوت النسب فتقبل اجماعاً۔۔۔ حاصلہ ان شھادۃ النساء بانفرادھن فیما لا یطلع علیہ الرجال حجۃ۔ (شرح مجلۃ الاحکام ج ۵ ص۲۰۲ الباب الاول فی الشھادۃ)

اثباتِ جرم کے لیے ریکارڈ شدہ شہادت کافی نہیں

سوال:۔ عصرِ حاضر کی سائنسی ایجاد ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ریکارڈ شدہ بیان کی بنیاد پہ چوری، زنا، قتل وغیرہ کا جرم ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی کیسٹ کا بیان مثبت للحکم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً گواہوں کا عدالت میں حاضر ہو کر قاضی کے سامنے گواہی دینا ضروری ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں ٹیپ ریکارڈ یا دیگر جدید آلات سے گواہ کا بیان مثبت للحکم نہیں اور نہ قاضی کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ صرف ٹیپ ریکارڈ یا دوسرے آلات سے کسی کا بیان سنکر کوئی فیصلہ کرے، اس لیے کہ ایک آدمی کی آواز دوسرے کی آواز کے مشابہ ہو سکتی ہے۔

کما فی مجلۃ الاحکام: الشھادۃ ھی الاخبار بلفظ الشھادۃ یعنی یقول اشھد باثبات حق احد ھو فی ذمۃ الآخر فی حضور الحاکم ومواجھۃ الخصمین فیقال للمخبر شاھد وللمخبَر لہٗ مشھود لہٗ وللمخبر علیہ مشھود علیہ وللحق مشھود بہٖ۔

قال الشیخ خالد اتاسیؒ: وقولہ فی حضور الحاکم المراد منہ أن یکون الاخبار فی مجلس الحکم فاخبار الحاکم فی غیر مجلس الحکم لا یعتبر شھادۃ۔

(شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج ۵ ص ۱۹۹، ۲۰۰ الباب الاول فی الشھادۃ)

اثباتِ جرم کے لیے تصویر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا ہو یا زنا کر رہا ہو اور کوئی دوسرا شخص اچانک اس کی تصویر اتار لے تو کیا وہ تصویر اثباتِ جرم کے لیے قاضی کی عدالت میں پیش کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تصویر اور اس سلسلے کے دیگر جدید آلات کو فی زمانہ یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ ذرائع اثباتِ جرائم کے لیے کافی حد تک کارآمد بھی ہیں بشرطیکہ دیگر ذرائع وقرائن انکی تائید کرتے ہوں، اس لیے کہ آجکل کے تکنیکی دور میں تصاویر کے اندر جعلسازی کا قوی امکان موجود ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اتاری گئی تصویر اگرچہ کلی طور پہ اثباتِ جرم کے لیے کافی نہیں لیکن اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اگر دیگر ذرائع اس کی تائید میں نہ بھی ہوں اور قاضی کو مجرم پہ قوی یقین ہو تو وہ اس پر کم از کم تعزیر جاری کر سکتا ہے۔

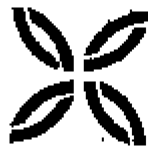
لما فی مجلۃ الاحکام: القرینۃ القاطعۃ ھی الامارۃ البالغۃ حد الیقین

مثلاً اذا خرج احد من دار خالیة مدھوشاً وفی یدہٖ سکین ملوثة بالدم ودخلت الدار ورؤی فیہا شخص مذبوح فی ذٰلک الوقت فلا یشتبہ فی کونہ قاتل ذٰلک الشخص ولا یلتفت الی الاحتمالات الوھمیة الصرفة کالذھاب الی کون شخص المذکور بما قتل نفسہ۔ (مجلۃ الاحکام، المادہ ۱۷۴۱) لہ

قاتل کے جسم یا کپڑوں پر مقتول کا خون لگا ہو تو

سوال: اگر قتل کی کسی واردات میں عین موقع پر کوئی شخص پکڑا جائے کہ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر ہو اور اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی ہوں۔ ڈاکٹری تحقیق سے مقتول کا خون اور خنجر و کپڑوں پر لگا ہوا خون ایک ہی ہو تو کیا شرعاً اس شخص پر جرم ثابت ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مقتول کے خون اور قاتل کے جسم پر لگے ہوئے خون کا ایک ہونا قتل کے اثبات کا قرینہ ہے۔ صورت مسئولہ کے مطابق اگر مقتول اور قاتل کے کپڑوں اور خنجر پر لگا ہوا خون ایک ثابت ہو جائے تو شرعاً یہ شخص مجرم متصور ہوگا، اور اگر دیگر شواہد بھی تائید کرتے ہوں تو قاتل پر حد جاری کی جائے گی ورنہ قاضی اس پر تعزیر جاری کر سکتا ہے۔



لہ لما قال العلامة خالد اتاسیؒ: وفی معین الحکام قال بعض العلماء علی الناظر ان یلحظ الامارات والعلامات اذا تعارضت فما ترجح منہا قضی بجانب الترجیح وھو قوة التھمة ولا خلاف فی الحکم بہا وتبصرة الحکام، قال اللہ تعالیٰ: تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ دل علی السیما المراد بہا حال یظھر علی الشخص والامارات ما نحوذة من الشریعة قال اللہ: (وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ) قال عبد المنعم بن الفرس روی ان اخوة یوسف علیہ السلام لما اتوا بقمیص یوسف الی ابیہم یعقوب علیہ تاملہ فلم یجد فیہ خرقاً ولا اثر ناب فاستدل بذٰلک علی کذبہم وقال متی کان الذئب حلیما یاکل یوسف ولا یخرق قمیصہ۔

(شرح المجلة ج ۵ ص ۳۹۱ فی بیان القرینة القاطعة۔ المادہ ۱۷۴۱)

مسودۂ قانونِ شہادت میں
مولانا سمیع الحق کی بعض دیگر ترامیم اور تقاریر

اِقرار اور اقبالِ جرم | مسودہ قانونِ شہادت میں دفعہ ۴۵ کا تعلق اقبالِ جرم اور اقرار سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ :۔

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں، اقبالِ جرم تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر عارض ہو سکتا ہے"۔

اس دفعہ کے متعلق مولانا سمیع الحق کی ترمیم (جو کہ فہرستِ ترامیم میں نمبر ۳۰ پر تھی) یہ تھی کہ اس دفعہ کو یوں بدل دیا جائے :۔

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں اقبال تصفیہ کن ثبوت بھی ہے اور مانع تقریر مخالف (ESTOPPIL) بھی، اگر کوئی شخص اقبال (اقرار) کرے تو کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال (اقرار) کو اہمیت دے کر فیصلہ کیا جائے"۔

جناب چیئرمین نے یہ ترمیم پڑھ کر ایوان کے سامنے رکھی تو اس کے بارے میں میاں نعیم الرحمٰن صاحب نے نقطۂ اعتراض اٹھایا کہ یہ ترمیم تقاضوں کے مطابق نہیں تو مسودۂ قانون میں کیسے آسکتی ہے، جناب چیئرمین نے اس ترمیم کی اصل عبارت جو کہ اردو میں تھی کی طرف ان کی توجہ دلائی اور خود بھی پڑھی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی درست کیا اور پھر محرک کو اس پر بحث کی اجازت دے دی، مولانا نے کہا :۔

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین صاحب! یہ بالکل واضح ہے، ہمارے سامنے جو اصل دفعہ ہے اس میں یہ ہے کہ اقبال تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر عارض ہو سکتا ہے۔ تو میرا مقصد یہ ہے کہ اقبال کو ثبوتِ قطعی اس شہادت کی رُو سے نہیں کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے انگریزی شہادت ایکٹ کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کا تو یہی تقاضا تھا، لیکن اسلامی قانون میں اقرار کو جس

مفہوم میں لیا گیا ہے وہ نتائج کے اعتبار سے قطعی ثبوت بھی نہیں یعنی اس سے انکار نہیں کیا (۱۰۱۹۹ ص)
بھی ہے، واضح اصول یؤخذ باقرارہ آدمی اس کے اقرار سے پکڑا جاتا ہے۔

اس مرحلہ پر جناب ملک محمد رمضان صاحب آف بلوچستان نے چیئرمین سے کہا کہ مولانا کی ترمیم کے الفاظ اور معانی کے چکروں میں پڑنے کی بجائے جذبے کو بھی دیکھنا چاہیے اگر یہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہے تو اسے اور الفاظ کا جامہ پہنا کر قبول کر لیا جائے تو بہتر ہو گا۔

اس کے بعد چیئرمین نے جناب سید معین الدین شاہ کو اس پر اظہار خیال کی دعوت دی انہوں نے کہا کہ قوانین آپس میں مربوط ہوا کرتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ہم نے قاضی کورٹس پاس کیا ہے، یہاں حقوق کی بات نہیں ہے، یہاں یہ ترمیم زائد ہے قانون میں آ ہی نہیں سکتی۔ اور بھی کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ یہاں جو چیز لانا نہ چاہتے تو یہ حضرات قاضی کورٹس کا حوالہ دے دیتے، اقرار کے متعلق بھی انداز اختیار کیا گیا کہ قاضی کورٹ کا قانون یہی ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا سمیع الحق نے جواب بحث دیتے ہوئے کہا کہ:

مولانا سمیع الحق | جناب والا! میں نے ابھی ایک حصہ بیان کیا تھا، یہاں بار بار ہمیں قاضی کورٹس کا حوالہ دیا جاتا ہے، یہ بڑا عجیب سا نظام ہے کہ اس مسئلے کو دوسری کتاب سے مربوط کیا جائے اور اس کو تیسری سے۔ قانون شہادت تو یہ ہے کہ شہادت کے سارے امور گواہوں کے متعلق ہوں یا حلف کے متعلق ہوں یا اقرار کے متعلق ہوں تو اسے یکجا رکھا جائے اس طرح آسانی رہے گی۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ایک صحیح اور مؤثر ڈھانچہ تیار ہو جائے تو یہاں اگر تفصیلات نہ بھی ذکر کی جائیں۔ تو میں نے ترمیم میں کہا ہے کہ "کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق" یہ اس لیے ضروری ہے کہ اقبال اور اقرار کو بھی شریعت نے کئی شرائط سے مشروط کر دیا ہے۔ مثلاً اقرار کرنے والا عاقل بالغ ہو گا، اگر نابالغ ہے اور ولی یا سرپرست نے اس کو کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے تو وہ بھی بالغ کے حکم میں متصور ہو گا۔ اسی طرح اور کئی شرائط ہیں، تو میں یہ چاہتا ہوں کہ جب مقر اقرار کرے، اقبال کرے (بغیر کسی جبر و اکراہ کے) تو اس میں شریعت کے واضح احکامات کو ملحوظ رکھا جائے، جبکہ یہاں معاملہ بالکل مبہم ہے۔ اور دوسرا مانع امر مخالف کا مسئلہ ہے کہ اسلام اقرار کو ثبوت قطعی بھی قرار دیتا ہے، اگر یہاں ہم نے اسے ثبوت قطعی قرار نہ دیا تو شریعت کا ایک اصول اس سے متاثر ہو جائے گا ــــ اقرار ایک مستقل عظیم الشان باب ہے اسلامی قانون شہادت کا اس کے تقاضوں کو بھی ہر جگہ ملحوظ

رکھنا ہوگا۔ یہ عام مسلمہ اصول ہے کہ المرء یوخذ باقرارہ ــــ اب ایک شخص نے اگر اقرار کرلیا تو یہاں تو اس کو مانع تقریر مخالف قرار دیا گیا، یعنی ایک شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں شخص میرا بھائی ہے تو وہ اس کا بھائی تو ہوگیا مگر یہ ضروری نہیں کہ اس اقرار سے وہ اس کے باپ کا بیٹا بھی ہو جائے، خلاصہ تو یہی ہے۔ مگر یہاں تو اس کو ثبوت قطعی قرار ہی نہیں دیا گیا، اگر ایسا ہی ہو تو پھر اقرار کی کوئی بنیاد اور حیثیت ہی نہ ہوئی۔

اقرار کے شرائط

دوسری گذارش میں نے یہ کی کہ اقرار کو شریعت نے کئی چیزوں سے پابند کر دیا ہے، جیسا کہ ہم نے شاہد کے لیے بھی اہلیت اور شرائط کو ملحوظ رکھا ہے، تو یہاں بھی اگر ہم تفصیلات میں نہیں جاتے تو شہادت کے بعد ایک درجہ تو اقرار کرنے کا ہے، اس کی بھی شرائط ہیں اور کچھ مستثنیات ہیں، وضاحتیں ہیں، تو ان کو میرے اس مختصر جملے میں ملحوظ رکھ دیا جائے کہ شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال کو اہمیت دیں گے، اگر وہ شریعت کے احکام پر پورا نہیں اترتا تو جج کو اختیار ہو کہ وہ اس شخص کے اقرار کو اہمیت نہیں دے گا۔ صرف اتنا معاملہ ہے کہ اس دفعہ کو بھی کسی طرح اسلامی اصولوں کے قریب لایا جائے۔

اس کے بعد جناب چوہدری فقیر اللہ صاحب اور جناب چوہدری الطاف حسین صاحب اور بعض دیگر ارکان نے ترمیم کی مخالفت کی اور مولانا قاضی عبداللطیف صاحب نے ترمیم کی پُرزور تائید کی، اس پر رائے شماری کے بعد جناب چیئرمین نے اسے ساقط قرار دیدیا۔

شادی وغیرہ کا ثبوت

دفعہ ۱۲۴ کا تعلق شادی وغیرہ کی رشتہ داری کے ثبوت سے ہے اس میں مولانا کی ترمیم یہ تھی کہ اس کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیئے جائیں کہ "یا قوانین حدود کی متعلقہ دفعات کے تحت ہو" تاکہ زناکاری کے انسداد کے سلسلہ میں یہ دفعہ بعض صورتوں میں رکاوٹ بن سکے۔ یہاں اصل دفعہ میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۴۹۷ اور ۴۹۸ کا ذکر تھا جبکہ وہ کالعدم ہو چکی تھیں مگر حدود سے متعلقہ دفعات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔
جناب حکیم محمد سردار خان صاحب، جناب چوہدری محمد الطاف حسین صاحب، وزیر قانون جناب پیرزادہ صاحب نے بحث میں حصہ لیا اور کہا کہ اس ترمیم کے جملہ تقاضے حدود آرڈی ننس سے پورے ہو رہے ہیں البتہ ۴۹۷ اور ۴۹۸ دفعات کا ذکر یہاں زائد ہے اسلئے کہ یہ ریپل ہو چکی ہیں۔
جناب چیئرمین نے اس کے بعد محرک مولانا سمیع الحق کی رائے معلوم کی تو انہوں نے کہا کہ جناب چیئرمین

ہم نے یہ بات مسودہ کو ترتیب دیتے وقت مفاہمتی مجلس میں بھی کہی تھی کہ اگر حدود آرڈی ننس کے ذکر کی ضرورت نہیں تو پھر تعزیراتِ پاکستان کی ان منسوخ شدہ دفعات (۹۷م اور ۹۸م) کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ تو میں حیران تھا کہ جو دفعات منسوخ ہیں ان کا تو ذکر ہے لیکن جو رائج الوقت ہے (یعنی حدود آرڈی ننس) اس کا ذکر تک نہیں۔ اس پہ جناب چیئرمین نے منسوخ شدہ دفعات کا ذکر ہٹا دیا اور مولانا نے ترمیم واپس لینے کی اجازت شرطیہ طور پہ لینی چاہی تو چیئرمین نے کہا شرطیہ اجازت نہیں لی جا سکتی، اس کے بعد ترمیم پہ رائے شماری ہوئی اور گر گئی۔

دورانِ ازدواج بچے کی پیدائش

دفعہ ۱۲۸ کا تعلق دورانِ ازدواج بچے کی پیدائش سے ہے کہ ایسی پیدائش بچے کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہوگا۔

مجوزہ ایکٹ ۱۸۷۲ء میں اسے بالکل مبہم چھوڑ دیا گیا تھا، صرف یہ کہ جائز شادی کے دوران بچہ پیدا ہونا اس کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔ گویا اگر عقدِ نکاح کے چند دن بعد بھی بچہ پیدا ہو جائے تو اسے حلالی سمجھا جائے گا، جبکہ اسلامی شریعت کی رُو سے عقدِ نکاح کے کم از کم ۶ ماہ گذرنے کے بعد پیدا ہونے والا بچہ جائز سمجھا جائے گا۔ اسی طرح یہ ایکٹ انفساخِ نکاح کی صورت میں دو سو اسّی یوم کے اندر بعد انفساخ ازدواج تولّد کو جائز ثبوت قرار دے رہا تھا جبکہ فقہاء کرام کے نزدیک کم از کم مدت دو سال ہے۔ یعنی فسخ نکاح (طلاق یا وفات) کے بعد دو سال تک پیدا ہونے والا بچہ بھی حلالی سمجھا جائے گا، سوائے استثنائی صورتوں کے ۔۔۔ (جو کہ نیچے دفعہ میں آرہی ہیں) ۔۔۔

علماء کا اصرار تھا کہ اس دفعہ کو ہر حالت میں شریعت کے مطابق بنانا ہوگا، جبکہ مخالف گروپ وکلاء وغیرہ اس پر آمادہ نہیں تھے مگر بعد میں مفاہمتی مجالس میں اس پر جناب وزیر قانون وغیرہ کی سعی سے وکلاء حضرات نے اتفاق کر لیا اور اس دفعہ کو علماء کرام نے از سرِ نو مرتب کر کے مسودے میں شامل کرایا۔

مدتِ حمل

دفعہ ۱۲۸ دورانِ ازدواج پیدائش پختہ ثبوت جائز ہونے کا ہے: یہ واقعہ کہ کوئی شخص اپنی والدہ کے کسی مرد کے ازدواجِ جائز میں رہنے کے چھ ماہ یا اس کے بعد یا اس نکاح کے ختم ہونے سے دو سال کے اندر پیدا ہوا ہو اور اس اثناء میں اس کی ماں بے زوج رہی ہو تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہوگا کہ وہ صحیح النسب بیٹا ہوگا، اِلّا یہ کہ عورت عدت گذر جانے کا اقرار کر چکی ہے اور بچہ کی پیدائش تاریخِ اقرار سے ۶ ماہ بعد ہوئی یا شوہر انکاری ہو۔

ایوان میں یہ دفعہ جب سامنے آئی تو حکیم محمد سردار خان اور بعض وکلاء نے پھر اسے ترمیم کے ذریعہ

بدلنا چاہا اور نکاح ختم ہونے کے بعد کی مدت کو ۲۹۵ دن تک محدود کرنا چاہا۔ یہ مسئلہ مدت حمل کی اکثر حد پر مبنی ہے۔ بعض ائمہ کے ہاں یہ مدت تین سال اور اس سے بھی زائد ہے، امام ابوحنیفہؒ کی رائے کم از کم میعاد پر مبنی ہے، مخالفت کرنے والوں کو یہ میعاد ناممکن اور مضحکہ خیز نظر آرہی تھی جبکہ انگریزی ایکٹ میں عقدِ نکاح کے دو دن بعد بچے کی ولادت کو قانوناً جائز قرار دیئے جانے پر حیرت اور اچنبھا نہ تھا۔

علماء کرام نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ اس میعاد کی حکمتوں پر روشنی ڈالی اور پیش کردہ ترمیم کی مخالفت کی، وکلاء حضرات نے اپنے مؤقف پر تقریریں کیں اور الحمدللہ کہ رائے شماری کے بعد مخالفانہ ترامیم ساقط ہوگئیں اور اکثریت سے علماء کی پیش کردہ دفعہ منظور ہوگئی۔

اس مسئلہ پر مولانا سمیع الحق نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ:

جناب چیئرمین | مولانا سمیع الحق صاحب!

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! یہاں زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہے کہ بظاہر یہ ناممکن نظر آتا ہے اور اس جدید دور میں اگر ہم دس مہینے سے زیادہ دو سال فرض کرلیں تو لوگ ہنسیں گے، گویا اس کے ناممکن ہونے کی وجہ سے ۲۹۵ دن پر زور دیا گیا ہے۔ میں مختصراً دو تین نکات بیان کرتا ہوں۔ ایک تو حکیم محمد سردار خان صاحب کی ترمیم میں بظاہر تعارض ہے، ابتداء میں تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ ۲۹۵ دن میں تبدیل کیا جائے، اور سب مقررین اسی پر زور دے رہے ہیں کہ چونکہ یہ ناممکن ہے اس لیے ایسا ہونا چاہیئے، پھر یہ خود ہی آخر میں بارِ ثبوت والدہ پر ڈالتے ہیں تو وہاں کہتے ہیں کہ ۲۹۵ دن کے بعد اور دو سال کے اندر۔ میں کہتا ہوں کہ جو چیز ترمیم کی ابتداء میں واقعی ناممکن تھی تو پھر آخر میں وہ ممکن کیسے سمجھ لی گئی؟ اگر یہ بات بالکل ناممکن تھی تو پھر ایک ناممکن چیز کے لیے کسی دعویٰ کا بارِ ثبوت والدہ پر ڈالنا کتنے تعجب کی بات ہے، میں ابھی وضاحت سے بات کروں گا۔

چوہدری محمد ادریس تاج | پوائنٹ آف آرڈر! جناب چیئرمین! اگر میں قیاس سے یہ کہوں کہ کسی خاتون کے پیٹ میں بچہ ہے تو آخر وہ میڈیکل چیک اپ کروائیں گے تو پتہ چلے گا، اس طرح تو پتہ نہیں چلے گا۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھئے یہ پوائنٹ آف آرڈر نہیں ہے۔

اکثر مدتِ حمل میں اقوال اور حکمتِ خداوندی

مولانا سمیع الحق | تو اگر ایک چیز ترمیم کے آغاز میں مضحکہ خیز تھی تو وہ ترمیم کے آخر میں کیوں مضحکہ خیز نہیں بنتی؟ میری دوسری گذارش یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی بچے دو دو سال

ماں کے پیٹ میں نہیں رہتے تھے، اور عام حالات جو ہمیں ملتے ہیں اس میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں اس کے باوجود بھی تمام ائمہ نے جو رائے اختیار کی تو یہ نہیں تھا کہ ان میں عقل، تدبر اور یہ ساری باتیں نہیں تھیں اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے نعوذ باللہ ایسی جاہلانہ بات کہہ دی حالانکہ سب ائمہ بنیادی طور پر متفق ہیں کہ ایک سال نہیں ہے اور چاروں ائمہ میں اگر اکثر مدت حمل کے بارے میں اختلاف ہے بھی تو وہ دو سال سے زائد میں ہے، دو سال پر تو سب متفق ہیں، امام شافعیؒ تو تین سال کہتے ہیں، اور امام مالکؒ سے تو چار سے چھ سال تک کے اقوال ملتے ہیں (اس مرحلہ پر کئی ارکان نے مضحکہ خیز انداز میں ان اقوال کا مذاق اڑایا) اب آپ مذاق اڑائیں یا ہنسی کریں بہرحال یہ آپ کا دین ہے پھر سرے سے اس دین سے ہی دستبردار ہو جائیں، خواہ آپ جو بھی کریں آپ کو ان مسائل میں جرأتِ ایمانی کی بات کرنی چاہیئے دین کی باتوں پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے کہ دنیا کیا کہے گی، ایمانداری سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہہ دیں آپ تو پھر آپ کو کتاب وسنت پر مبنی ہر رائے کو ماننا پڑے گا۔

الغرض اس کو اجماع مرکب کہتے ہیں، اب وجہ کیا تھی کہ میں نے ایسا کہا؟ وجہ یہ تھی کہ یہ کچھ مخصوص حالات ہیں، مثلاً ایک شوہر بیوی کو طلاق دیدیتا ہے یا کوئی خاتون بیچاری بیوہ ہو جاتی ہے تو وہ ہزاروں مصائب اور مشکلات سے دوچار ہو جاتی ہے، اگر اس نے عدت پوری ہونے کا اقرار نہ کیا اور کسی اور سے شادی بھی نہ کی یا شوہر زندہ ہے اور انکار نہیں کرتا، تو ان مخصوص حالات میں اللہ نے ہر جگہ اپنے نظام میں یہ گنجائش رکھی ہے اور احکام میں اسے ملحوظ رکھا کہ کسی انسان کو ناجائز اور حرامی نہ کہا جائے کیونکہ کسی کو ایک دفعہ ناجائز اور حرامی کہہ دینا اس کو زندہ مار دینے کے برابر ہے۔ اسی طرح ایک پاکدامن اور عفیفہ عورت کو اسلام حتی الوسع اس الزام و تہمت اور بدنامی سے بچانا چاہتا ہے، اب جو دو سال کی گنجائش رکھی گئی ہے تو ایک بیچاری پاکباز عورت جب تک اس کے خلاف ثبوت ثابت نہ ہو تو شریعت اس کو اپنے حال پر رکھتی ہے۔

تیسری گذارش میری یہ ہے کہ یہ امت جو ہے یہ صرف سائنس کے زمانے کے لیے نہیں ہے وہ چودہ سو سال سے ہے اور قیامت تک رہے گی اور ساری بنی نوع انسان کے لیے اسلامی تعلیمات ہیں، ہر جگہ نہ تو سائنس تھی نہ ایکسرے ہیں نہ لیبارٹریاں ہیں نہ اس قسم کے ٹیسٹ ہر جگہ ہو سکتے ہیں، آج بھی ہماری آبادی کا ۸۵ فیصد علاقہ دیہاتی ہے، جنگلات بھی ہیں، اُمتِ اُمّی کا معنیٰ یہ ہے کہ اسے دینِ فطرت میں تکلفات کا پابند نہ کیا جائے۔ شکریہ

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت

مروجہ شہادت ایکٹ میں وعدہ معاف گواہ موجود ہے یعنی

کسی شریک جرم کا اقرار اور اس کے اپنے کسی دوسرے شریک کار مجرم کے خلاف بطور شہادت استعمال ہو سکتا ہے جس کی شرعی نقطۂ نظر سے کوئی گنجائش نہیں، باہمی مفاہمت کی مجلس میں نئے مسودہ سے یہ شق حذف کرائی گئی تھی مگر ریٹائرڈ چیف جسٹس بشیر الدین خان صاحب اپنی ترمیم کے ذریعے اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے، اس ترمیم پر بڑی زور دار تقریریں ہوئیں، ترمیم کی تائید کو کثرت سمجھا گیا اور وہ منظور ہو گئی۔ اس موقع پر مولانا سمیع الحق صاحب نے اپنی تقریر میں کہا :۔

جناب چیئرمین | بہت شکریہ، مولانا سمیع الحق صاحب۔

جناب مولانا سمیع الحق | حضور والا! یہ واضح مسئلہ ہے کہ وہ خود ایک فریق مقدمہ بن گیا ہے اور اس کے بارے میں المغنی نے تصریحات نقل کی ہیں کہ کُلُّ مَنْ خَاصَمَ فِیْ حَقٍّ لَا تُقْبَلُ شَہَادَتُہٗ فِیْہِ۔ (المغنی ج ا ص ۱۶۷) ایک اور روایت میں ہے: قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تقبل شہادۃ لخصم۔ (المغنی ج ا ص ۱۶۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فریق مقدمہ کی گواہی فریق مخالف کے لیے قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ ایک فریق مقدمہ ہے اور اس فریق کے مخالف کو استعمال کرنا ہے جو اس فریق پر بڑی زیادتی ہے، دوسری روایت الدرالمختار کی ہے: کل من صار خصماً فی حادثۃ لا تقبل شہادتہ فیہا۔ (الدر المختار ج ص کتاب الشہادات)

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ "ہر وہ شخص جو کسی شہادت میں فریق مخالف ہو تو اس میں اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی"۔ تیسرا یہ کہ وہ گناہ کا اعتراف کرنے کے بعد عادل نہیں رہا۔ اور شہادت کے لیے صریحاً اصول ہیں کہ وہ عادل ہو، جب خود اس نے یہ اعتراف کیا کہ میں نے قتل کیا ہے، چوری کی ہے، زنا کیا ہے تو اس کے بعد اس کی شہادت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اُس کو معاف کر دے، کیونکہ اس سے تو حقوق العباد کی حق تلفی ہوگی، حکومت کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ملزم کو معاف کر دے کہ چلو تم نے چوری کی ہے، قتل کیا ہے تو کوئی بات نہیں تجھے معافی دی جاتی ہے، حقوق العباد کو تو حکومت بھی معاف یا ضائع نہیں کر سکتی جب تک کہ متاثرہ شخص اپنا حق خود معاف نہ کر دے۔ یہاں ریاست اور اسٹیٹ کی حفاظت کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے تو اسلام کہتا ہے کہ اس کیلئے سخت سے سخت قوانین بنائے جائیں اور غدار کو سخت سزا دی جائے، مگر.....

جناب چیئرمین | شکریہ (یعنی وقت ختم ہو گیا ہے)

اسلام اور خواتین کی شہادت

مجلسِ شوریٰ (وفاقی کونسل) میں مسودہ قانونِ شہادت پر مولانا سمیع الحق صاحب کی تقریر جسے وفاقی کونسل سیکرٹریٹ نے ضبط کیا، فقہ اور قانونِ شہادت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے نذرِ قارئین ہے۔ (مرتب)

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم ط بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط
واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون
وان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعنین ہ افی قلوبھم مرضٌ ام ارتابوا ام
یخافون ان یحیف اللہ علیھم ورسولہ۔ (سورۃ النور)

جنابِ مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! قانون سے متعلق مسائل بہت گہرے اور ہمہ گیر ہیں، ان حالات میں دس منٹ کی جو پابندی رکھی گئی ہے اور یہ جو تلوار سر پر لٹک رہی ہے تو حیران ہوں کہ میں کس کس مسئلہ پر عرض کروں، بہرحال اگر آپ دس منٹ مزید دیدیں تو یہ آپ کی عنایت ہوگی۔

جنابِ چیئرمین | نہیں! اگر آپ ۹ منٹ میں ختم کردیں تو میں شکریہ ادا کروں گا۔

جنابِ مولانا سمیع الحق | جو مسودہ ہمارے سامنے لایا گیا ہے اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر تمام معزز ارکان کو بلا کسی اختلاف کے گہری نظر ڈالنی چاہیئے تھی اور اسکی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے تھی، لیکن بدقسمتی سے سارے مسودہ میں صرف یہ ایک مسئلہ ایسا اہم بن گیا ہے کہ سارے ایوان کی توجہات اس طرف ہی لگ گئی ہیں، یعنی ع

آ گئے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور ہمارے مبصرین، وکلاء بھی قرآنِ کریم کی آیات اور مصحف الٰہی کی تفسیر اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں "مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب" کی روشنی میں کرنے لگ گئے ہیں، اکبر نے کہا تھا ؎

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب
شیخ صاحب بھی ہوئے ہیں نئی تفسیر کے ساتھ

شیعہ مسلک اور خواتین کی شہادت

تو ہمارے یہ شیوخ حاضر بھی ہوئے تو نئی تفسیر کے ساتھ۔ پیر اشرف صاحب جو اس وقت موجود نہیں ہیں اور ہمارے علامہ[1] رضی صاحب (شیعہ مجتہد) بھی، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے اپنے اجتہادات ہیں، یہ ان کا حق ہے کہ جیسے چاہیں انہیں ظاہر کریں، لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ یہ شیعہ مسلک بھی نہیں ہے، اہلِ سنت اور اہلِ تشیع اللہ کے فضل وکرم سے قانونِ شہادت میں خواتین کے مسئلہ پر متفق ہیں بلکہ شیعہ تو ہم سے بھی چند قدم آگے ہیں، میں یہاں صرف ایک حوالہ پیش کرتا ہوں کہ اس بارے میں شیعہ مسلک کیا ہے؟

اسلامی نظریاتی کونسل نے قانونِ شہادت کا جو مسودہ ہمیں بھیجا ہے اس کے صفحہ ۵۹ ضمیمہ (الف) کے ماتحت کونسل کے شیعہ رکن علامہ طالب جوہری صاحب کے اختلافی نوٹ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں صرف حدود میں خواتین کی شہادت مسترد کی گئی ہے اور مقبول نہیں ہے لیکن علامہ طالب جوہری کے نزدیک حدود کے علاوہ طلاق، خلع، وصیت اور نسب میں بھی عورتوں کی گواہی کسی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہے، عورتوں کے متعلق مخصوص امور میں ہمارے ہاں صرف ایک عورت کی شہادت کافی ہے، مگر انہوں نے ان امور میں بھی چار عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دیا ہے۔ (مسودہ قانونِ شہادت مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل ص۵۹)

ایک رکن: پوائنٹ آف آرڈر! جنابِ والا! یہاں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ تو زیرِ بحث نہیں۔

جناب چیئرمین: تشریف رکھیے، مولانا اس رپورٹ سے حوالہ پیش کرسکتے ہیں۔

مولانا! آپ کی مراد یہ ہے کہ یہ علامہ جوہری کا مسلک ہے؟

مولانا سمیع الحق: نہیں جناب انہوں نے تو لکھا ہے کہ یہ ہماری فقہ جعفریہ میں ہے۔

---

[1] ممبر مجلس شوریٰ اور مشہور شیعہ عالم دین علامہ سید محمد رضی آف کراچی نے مولانا سے قبل پُرجوش انداز میں ایک عورت کی گواہی کافی ہونے پر زور دیا اور کہا کہ عورت امامت کرسکتی ہے اور حکومت بھی، اور میں اپنے اجتہاد کی روشنی میں جرأت سے کہتا ہوں کہ گواہی میں ایک عورت کو کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے اور بھول جانے سے متعلق آیت کو علت قرار دیا کہ اب نہیں بھولتی تو دو کی بجائے ایک کافی ہے۔ لاہور کے پیر محمد اشرف صاحب نے بھی اپنی تقریر میں ایسا ہی مؤقف اختیار کیا تھا۔ (مرتب)

عورت کی امامت اور حکمرانی تو عرض یہ ہے کہ شیعہ مسلک خواتین کو معلوم نہیں ہے جس میں ہر حلم پر ان کی شہادت کو قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ علامہ رضی صاحب نے عورتوں کی امامت کے بارے میں کہا ہے جو کہ ہمارے ہاں بھی جائز ہے یعنی آپس میں خواتین اگر ایک کمرے میں جمع ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اکٹھی نماز پڑھیں اور ایک عورت ان کی امامت کروا سکتی ہے لیکن عورت مردوں کی امامت نہیں کر سکتی۔ پھر عورت کی حکومت کی مثال دی ہے، تو یہ ملکہ سبا کا واقعہ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو پچھلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ تو ہمارے نزدیک عورت کی حکومت کے جواز میں پیش کی گئی اس دلیل کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ لن یفلح قوم ولوا امورھم نساءھم (او کما قال علیہ السلام) یعنی اس قوم نے کبھی فلاح نہ پائی جس نے اختیار اور نظامِ اقتدار عورتوں کے سپرد کر دیا۔

حکمت اور علتِ حکم میں فرق پھر علامہ رضی صاحب نے سورۂ بقرہ کی آیت فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ کے بعد ارشاد ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخریٰ (کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے) کو حکم کی علت قرار دیا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ علامہ صاحب کو اس بارہ میں غلط مبحث ہوا ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ ایک علت ہوتی ہے اور ایک حکمت۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یاد دلانے کے مسئلہ کو بطورِ علت بیان نہیں کیا ہے بلکہ بطورِ حکمت بیان کیا ہے علت تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ یہ چیز اس لیے لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قانون بنایا ہے۔ اب کسی قانون کی آپ حکمتیں بیان کریں تو اس حکمت کے ساتھ وہ چیز وابستہ نہیں ہوتی۔ اگر حکمت بیان کی گئی ہے تو بہتر، نہیں ہے تو پھر بھی وہی حکم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے بارہ میں فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (الآیۃ) کہ روزے سے تقویٰ حاصل ہوگا، تو روزے کی فرضیت کے لیے تقویٰ علت نہیں ہے، یہ حکمت ہے کہ شاید تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔

نماز کے بارے میں فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (الآیۃ) کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے، تو یہ اس کی حکمت ہے علت نہیں، تو اگر ایک شخص کبیرہ گناہ کرتا

ہے تو کیا اُسے اب یہ کہا جائے کہ تم نماز مت پڑھو کیونکہ علت حاصل نہیں ہو رہی ہے، یا اگر تقویٰ آ گیا ہے تو تم نماز ہی چھوڑ دو کہ مقصد حاصل ہو گیا تو اب نماز کی کیا ضرورت ہے؟ ایک شخص کے اندر تقویٰ نہیں ہے تو اس کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم روزہ ہی نہ رکھو۔ تو اللہ تعالےٰ نے بطور حکمت اسے بیان کیا، اور علامہ آلوسیؒ نے بھی اپنی تفسیر روح المعانی کی دوسری جلد میں ایسی ہی وضاحت ڈالی ہے اور سارے مفسرین اسے حکمت قرار دیتے ہیں... (یہاں مولانا نے کتاب سے اقتباس سنایا......) تو یہ حکمت اللہ تعالیٰ نے ایک مصلحت کے تحت بیان فرمائی ہے، یہ اللہ کی رحمت ہے اگر نہ بھی بیان فرماتے تو بغیر حکمت کے بھی مسلمان اللہ کے احکام ماننے کا پابند ہوتا ہے۔

بہر حال یہ گذارشات ضمناً آ گئیں اور میرے دس منٹ کا اہم حصہ نوان کی نذر ہو گیا، اب اصل موضوع کا کیا کیا جائے؟ علامہ رضی صاحب تو اللہ کے فضل سے بہت وسیع الظرف انسان ہیں، ہماری آپس میں بات چیت ہوتی رہتی ہے، کھلے دل کے انسان ہیں ـــــ لیکن میرے لیے یہ ضروری تھا کہ اہل سنت کے مسلک کی رو سے اس کی بروقت تردید کروں، وہ اپنے مسلک کی وضاحت جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں، ان پر کوئی قدغن نہیں ہے، یہ ان کا اپنا اجتہاد ہو تو ہو مسلک نہیں ـــــ

جناب چیئرمین صاحب | یہاں خواتین کو بار بار یہ مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اگر ہم فرائض اور حقوق کو ملحوظ رکھیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

شہادت فرض ہے حق نہیں

اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں ہمارے لیے فرض قرار دی ہیں مثلاً عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ اسی طرح شہادت بھی ایک فرض ہے جو کہ فقہ کا مسئلہ ہے اور سارے فقہاء اور علماء ابواب الشہادت کی کتابوں میں اس کی تصریح کرتے ہیں۔ یہ میرے پاس فقہ کی معتبر ترین کتاب ھدایہ ہے اس کے آغاز میں ہی ہے کہ الشهادة فرض...... الخ شہادت ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر عائد کیا گیا ہے ـــ یہ حق نہیں ہے کہ کسی کو دیدیا اور کسی کو نہیں دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کو اختیار حاصل ہے کہ کسی کے لیے کوئی عبادت لازم کرے کسی کے ذمہ نہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خواتین کی نازک ذمہ داریوں اور خلقی کمزوریوں کی وجہ سے ان کو تمام عبادات میں رعایت بھی دی ہے۔

فرائض اور احکام میں عورتوں سے رعایت

یہ شہادت کا مسئلہ بھی اگر وہ سوچیں تو اس میں بھی ان کے لیے رعایت ہے

مثلاً نماز فرض ہے حق نہیں ہے ، اب نماز کے لیے بھی یہ کہا گیا ہے کہ دس دن مہینے میں تمہیں (عذر ہونے کی وجہ سے) چھٹی ہے کہ جب حضور اکرمؐ سے عورتوں کے نقصانِ دین کے بارہ میں پوچھا گیا تو حضور نے یہی بات دلیل کے طور پر پیش کی ۔ اسی طرح روزہ ایک فرض ہے خدا نے روزے میں بھی ان کو رعایت دی ہے کہ جن دنوں میں ان کو عذر ہو وہ دس دن روزہ نہیں رکھیں گی سخت گرمی کے دن ہوں گے مگر انہیں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے بعد میں اعادہ کریں گی۔ اسی طرح حج کا مسئلہ ہے، اس میں ہر مرد پہ پابندی ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتا ہے تو لازمی طور پر حج پہ جائے، مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۔ (الآیۃ) اس کے ساتھی ہوں یا نہ ہوں مگر جائے گا ضرور، ہزاروں خطرات مرد کے لیے بھی راستے میں ہوتے ہیں لیکن عورت کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہاری نگہداشت کرنے والا محرم مرد ہو تو تب تم پر حج فرض ہے ورنہ نہیں، تو یہ کتنی بڑی رعایت ہوتی ۔ اور زکوٰۃ وعشر میں بھی میرا خیال ہے کہ اس میں بھی عورت سے رعایت ہے، مثلاً ڈھائی فیصد مرد پہ بھی ہے اور ڈھائی فیصد عورت پر بھی ہے ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس میں رعایت نہ ہوتی تو عورت پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہوتی چاہیئے تھی کیونکہ مرد کے ذمے خدا نے خارجی ذمہ داریاں اور گھر کے تمام اخراجات لگائے ہیں، عورت کا نان ونفقہ اور رہن سہن سب کچھ مرد کے ذمہ ہے، مرد کے پاس اگر ہزار روپے ہیں تو اس پر دوگنی چوگنی ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں اس کے برعکس اگر عورت کے پاس ہزار روپے ہیں اور کوئی ذمہ داری نہیں، نہ مرد کی کفالت کا فکر ہے اس کو نہ بچوں کی اس پر ذمہ داری ہے، اس کے اپنے اخراجات بھی مرد پر ہیں، گھر کا نوکر چاکر بھی مرد کے ذمہ ہے، تو گویا پھر تو اس پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہوتی چاہیئے تھی لیکن خدا نے اس میں بھی انہیں ایسی کنسیشن (CONCESSION) دی کہ ان پر بھی مردوں کے برابر ڈھائی فیصد ہی ہے ۔

کسی غیر مکلف کو نصوص میں مخاطب نہیں بنائیں

اب آگے بات آتی ہے شہادت کی اور کہا جاتا ہے کہ جب اللہ نے شہادت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے تو عورتوں کو اس میں کیوں روکا جاتا ہے؟ تو عرض ہے کہ شہادت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جب اسے مکلف ہی نہیں بنایا اور آیات شہادت متوجہ ہی نہیں ہوئیں ان کو، مثلاً وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم ہے، تو اب اگر ایک شخص نابالغ ہے اس کو اقیموا الصلوٰۃ متوجہ ہی نہیں ہے، غیر مسلم ہو تب بھی متوجہ نہیں ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت اسی طرح

اٰتوا الزکوٰۃ ہے۔ ایک شخص فقیر ہے اور صاحب نصاب ہی نہیں ہے تو وہ مرد ہو یا عورت، سو اس کو یہ آیت متوجہ ہی نہیں ہوتی، اللہ نے جب عورت کو مکلف نہیں بنایا اس فریضے کا، تو یہ آیات (۱) وَلَا یَاْبَ الشُّھَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا۔ الآیۃ۔ (۲) وَلَا تَکْتُمُوا الشَّھَادَۃَ وَمَنْ یَّکْتُمْھَا فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ۔ الآیۃ۔ (۳) کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ۔ الآیۃ۔

یہ ساری آیات ان کو متوجہ ہی نہیں ہیں کہ وہ کہیں کہ ہمیں بھی اس میں مخاطب بنایا گیا ہے۔ جب کسی طبقہ کو مکلف ہی نہیں بنایا گیا ہو تو اس سے وہ آیت مطالبہ ہی نہیں کرتی۔ اور میں تو سوچتا ہوں کہ یہ تضادات خدا کے کلام میں کیسے ممکن تھے، جبکہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ عورتوں کو یہ فرماتے ہیں کہ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی۔ الآیۃ کہ گھروں میں بیٹھی رہو، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں: وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ۔ (الآیۃ) کہ کوئی بھی چیز ان سے مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ ایک طرف تو خداوند تعالیٰ ان کو (عورتوں کو) پابند بناتا ہے گھر کا، پھر دوسری طرف ان پر فرض کیسے کرتا ہے کہ وہ عدالتوں میں جا کر گواہیاں دیتی رہیں اور پھرتی رہیں، اللہ کے کلام میں ایسا تضاد تو ہو نہیں سکتا۔ ان آیات کا سارا مضمون یہی ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھی رہیں یعنی پردہ کا حکم دیا ہے، اور دوسری طرف وہ تمام آیاتِ شہادت پیش کی جا رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ عدالتوں میں گھومتی رہو۔ تو یہ کوئی انسانی قانون اور انسانی لائر (LAWYER) اور انسانی قانون دان تو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے۔ تو ایسی تمام آیات کا مخاطب اللہ تعالیٰ نے صرف مرد کو بنایا ہے نہ کہ عورتوں کو۔

جناب چیئرمین | مولانا تشریف رکھیں آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔


كتاب
القسمة
والأكراه

کتاب القسمۃ

(جائیداد کی تقسیم کے احکام و مسائل)

کسی ایک شریک کے مطالبہ پر جائیداد کی دوبارہ تقسیم کا حکم

سوال: چند ورثاء والد کی جائیداد میں اجتماعی طور پر حق رکھتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ تمام جائیداد کی تقسیم کی ضرورت نہیں اُس کا صرف منافع اور آمدنی لے کر آپس میں تقسیم کرتے رہیں گے، لیکن اب ایک وارث اصرار کر رہا ہے کہ میرا حصہ الگ کر دیں اس لیے کہ میں مشترکہ طور پر جائیداد سے منافع لینے کے حق میں نہیں ہوں، کیا اس وارث کے مطالبہ پر جائیداد تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مورث کی وفات کے بعد متروکہ جائیداد میں ورثاء کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، حقوقِ متقدمہ کی ادائیگی کے بعد ہر ایک وارث اپنے حصہ کے مطالبہ کا حقدار ہے، ایسی حالت میں جب تقسیم سے متروکہ جائیداد کے منافع ختم نہیں ہوتے ہوں تو ہر ایک وارث اپنے حصہ سے استفادہ کر سکتا ہے، لہٰذا کسی ایک شریک کے مطالبہ پر عمل ہو کر جائیداد تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ: وسببہا طلب الشرکاء او بعضہم الانتفاع بملکہ علیٰ وجہ الخلوص وقال شرطہا عدم فوت المنفعۃ بالقسمۃ۔

وقال ابن عابدینؒ تحت قولہ المنفعۃ ای المعہودۃ وہی ما کانت قبل القسمۃ۔

(ردالمحتار ج ۵ ص۱۶۸ کتاب القسمۃ)۔[۱]

---

[۱] قال العلامۃ اکمل الدین البابرتیؒ: سببہا طلب احد الشرکاء الانتفاع بنصیبہ علی الخلوص ورکنہا ما یحصل بہ الافراز والتمیز النصیبین وشرطہا ان لا تفوت منفعۃ بالقسمۃ۔ (العنایۃ علیٰ ہامش فتح القدیر ج ۸ ص۳۴۸ کتاب القسمۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۵ ص۲۱۴ الباب الثالث فی بیان ما یقسم وما لا یقسم وما یجوز من ذلک وما لا یجوز۔

نابالغ کے حصّہ کی تقسیم کا حکم

سوال:- چند ورثاء نے مشترکہ جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کیا اُن میں سے ایک شریک نابالغ تھا، حاکمِ وقت نے نابالغ کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے دیگر شرکاء کے مطالبہ پران کی جائیداد تقسیم کر دی، شرکاء نے اپنے اپنے حصہ کی جائیداد لے کر مدت دراز تک اُس میں تصرفات کئے لیکن اب نابالغ لڑکا بالغ ہونے کے بعد دوبارہ تقسیم کا مطالبہ کر رہا ہے، تو کیا یہ تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- ورثاء کسی نابالغ وارث کے حصہ میں تقسیم کرنے کا حق نہیں رکھتے اور نہ نابالغ کسی کو وکیل مقرر کر سکتا ہے، تاہم اگر حاکمِ وقت نابالغ کی نمائندگی کر کے ورثاء سے جائیداد تقسیم کرے تو ایسی تقسیم نافذ ہے اسے توڑنا جائز نہیں، حاکمِ وقت نابالغ کی طرف سے نمائندہ متصور ہوگا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وصحت برضاء الشرکاء الا اذا کان فیهم صغیر لا نائب عنه۔ وقال العلامة الحصکفیؒ: بعد هذا القول او غائب لا وکیل عنه لعدم لزومها حینئذٍ الا باجازة القاضی او الغائب او الصبی اذا بلغ۔ (تنویر الابصار والدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۱۸۱ کتاب القسمة) [1]

کسی ایک شریک کی غائبانہ حالت میں جائیداد تقسیم کرنا

سوال:- چند ورثاء میں سے ایک وارث عرصہ دراز سے غائب ہے، اب اگر حاضر ورثاء مورث کی جائیداد تقسیم کرنا چاہیں تو اس غائب وارث کے حصہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ جبکہ حاضر ورثاء کو جائیداد تقسیم کیے بغیر نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے اور غائب شریک تک رسائی کا کوئی قابلِ عمل ذریعہ بھی نہیں ہے؟

---

[1] قال العلامة فخر الدین الشهیر بقاضی خانؒ: اذا قسم الورثة الترکة فیما بینهم بغیر امر القاضی وفی الورثة صغیر او غائب او شریك المیت لاتصح القسمة الا باجازة الغائب او ولی الصغیر او باجازة الصبی بعد البلوغ او باجازة القاضی قبل البلوغ۔

(فتاوٰی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۱۵۶ کتاب القسمة)

ومثله فی فتح القدیر ج۸ ص۳۵۱ کتاب القسمة۔

الجواب:۔ اگر غائب وارث تک رسائی ممکن ہو تو تقسیمِ جائیداد کیلئے اس کی ذاتی طور پر حاضری ضروری ہے، تاہم اگر وہ ذاتی طور پر حاضری سے قاصر ہو تو کسی کو اپنی طرف سے نمائندہ مقرر کرے اور اگر وہ حاضری سے بلا وجہ پہلوتہی کر رہا ہو تو حاضر ورثاء کے لیے حاکمِ وقت کا سہارا لینا ضروری ہے کیونکہ حاکمِ وقت غائب وارث کی طرف سے نیابت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وفیھم صغیر او غائب قسم بینھم ونصب قابض لھما۔ وقال الحصکفیؒ: تحت قول المذکور نظراً الغائب والصغیر ولابد من البینة علیٰ اصل المیراث عندہٗ خلافاً لھما کما مر۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۵ ص۱۸۲ کتاب القسمة) [1]

قرعہ اندازی کے بغیر جائیداد تقسیم کرنا

سوال:۔ ایک وسیع رقبہ اراضی ایک قوم کی مشترکہ جائیداد تھی، رؤسائے قوم نے باہمی رضامندی سے یہ زمین تقسیم کی لیکن قرعہ اندازی سے کام نہیں لیا گیا، شرکاء میں سے بعض نے اپنے حصہ کی زمین آباد کر لی ہے اور بعض کی زمین تاحال غیر آباد پڑی ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا قرعہ اندازی کے بغیر یہ تقسیم جائز ہے یا دوبارہ تقسیم کی جائے گی؟

الجواب: تقسیم کرنے کے لیے قرعہ اندازی صرف ایک اصح صورت ہے شرط کے درجہ میں نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر قوم نے اپنے سرکردہ افراد کو باقاعدہ تقسیم کرنے کی اجازت دی ہو تو یہ تقسیم نافذ ہے، ہر ایک حصہ دار کو اپنے اپنے حصہ پر قائم رہ کر دوبارہ تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: والقرعة لتطیب القلوب وازاحة تھمة المیل

---

[1] قال العلامة قاضیخانؒ: وذکر الخصاف اذا کان فی الورثة صغیر او غائب لم یکن فی ید الغائب ولافی ید الصغیر شئ من الترکة بل کان الکل فی ید الحضور الکبار فطلبوا القسمة من القاضی فان القاضی یجعل للصغیر وصیاً یقوم بالقسمة ویقبض حقه ویجعل للغائب وکیلاً ویأمرھم بالقسمة ۔ (الفتاوٰی قاضیخان علیٰ ھامش الھندیة ج۳ ص۱۵۶ فصل فی قسمة الوصی والاب)

حتیٰ لو عین لکل منهم نصیباً من غیر اقتراع جاز لانہ فی معنی القضاء فیملک الالزام۔
(الھدایۃ ج ۴ ص۴۱۶ کتاب القسمۃ۔ فصل فی کیفیۃ القسمۃ)[1]

غبن کی صورت میں تقسیم جائیداد کے اعادہ کا حکم

سوال:۔ چند شرکاء کے درمیان ایک مشترکہ جائیداد تقسیم ہوئی ہر ایک شریک اپنے اپنے حصہ میں مدت دراز تک مالکانہ تصرفات کرتا رہا، اب شرکاء اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ تقسیم کرنے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کی وجہ سے شرکاء کے زیر قبضہ جائیداد میں تفاوت ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں جب ایک دفعہ شرکاء کی باہمی رضامندی سے تقسیم ہونے کے بعد جب ہر ایک نے اپنے اپنے حصہ میں مالکانہ تصرفات کرنے شروع کئے تو اب معمولی شبہات کی وجہ سے سابقہ تقسیم کو توڑ کر دوبارہ تقسیم کرنا بے سود سعی ہے، تاہم اگر غبن فاحش ہو تو شرکاء کے مطالبہ پر سابقہ تقسیم کالعدم قرار دے کر دوبارہ تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولو ظھر غبن فاحش فی القسمۃ بطلت ولو وقعت بالتراضی فی الاصح۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۱۸۷ کتاب القسمۃ)[2]

غلطی کی صورت میں تقسیم کا اعادہ

سوال:۔ ایک مشترکہ جائیداد تقسیم کرکے مالکان اس پر تصرف کرتے رہے، بعد میں

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ تطییب القلوب) اشار الی ان القرعۃ غیر واجبۃ حتیٰ ان القاضی لو عین لکل واحد نصیباً من غیر اقراع جاز لانہ فی معنی القضاء فملک الالزام۔ (رد المحتار ج ۵ ص۱۸۴ کتاب القسمۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۱۵۲ کتاب القسمۃ۔

[2] وقال العلامۃ المرغینانیؒ: ولو اختلفا فی التقویم لم یلتفت الیہ لانہ دعوی الغبن ولا معتبر بہ فی البیع فکذا فی القسمۃ لوجود التراضی الا اذا کانت القسمۃ بقضاء القاضی والغبن الفاحش لان تصرفہ مقید بالعدل۔ (الھدایۃ ج ۴ ص۴۲۰ کتاب القسمۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۱۵۶ کتاب القسمۃ۔

معلوم ہوا کہ تقسیم میں غلطی ہوئی ہے، کیا اس غلطی کے ازالہ کے لیے دوبارہ تقسیم کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اگر تقسیم میں غلطی مبرہن یا مسلم ہو اور تقسیم توڑنے کے بغیر غلطی کا ازالہ ممکن نہ ہو تو اس کے ازالہ کے لیے تقسیم دوبارہ کی جا سکتی ہے۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: واما صفات القسمۃ فانواع منہا ان تکون القسمۃ عادلۃ غیر جائرۃ الی ان قال فاذ اوقعت جائرۃ لم یوجد التراضی ولا افراز نصیبہ بکمالہ لبقاء الشرکۃ فی البعض فلم تجز وتعاد وعلی ھذا اذا ظہر الغلط فی القسمۃ المبادلۃ بالبینۃ او بالاقرار تستأنف لانہ ظہر انہ لم یستوف حقہ فظہران معنی القسمۃ لم یتحقق بکمالہ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۶ فصل فی صفات القسمۃ۔ کتاب القسمۃ)[1]

مشترکہ منافع کو تقسیم کرنے کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! ہم دو بھائیوں نے مشترکہ طور پر ایک پلازہ بنایا اور اس کو کرایہ پر دیدیا، اب ہم اس کے کرایہ کو ہر ماہ بقدر حصہ آپس میں تقسیم کریں یا ایک ماہ کا کرایہ میں لے لوں اور دوسرے ماہ کا میرا بھائی لے، ان دونوں میں کون سی صورت جائز ہے؟

الجواب :۔ جس طرح عین مال مشترک ہوتا ہے اسی طرح اس کے منافع بھی مشترک ہوتے ہیں، اس منافع کو بھی بقدر حصہ تقسیم کیا جائے گا۔ صورتِ مسئولہ میں کرایہ کی تقسیم شرکاء کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ جس طرح چاہے کر سکتے ہیں، چاہے تو ہر ماہ کا کرایہ برابر تقسیم کرلیں یا ایک ماہ کا کرایہ ایک بھائی وصول کرے اور دوسرے ماہ کا دوسرا بھائی، دونوں طرح درست ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ کذلک) ای یأخذ ھذا شہرا والآخر شہرا او یاخذ ھذا غلۃ ھذہ والآخر غلۃ الاخری۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۲۶۹ کتاب القسمۃ، مطلب فی الرجوع عن القرعۃ)

---

[1] وفی الھندیۃ: عن محمد قاسم قسم داربین رجلین اعطی احدھما اکثر من الآخر غلطاً وبنی احدھما فی نصیبہ قال محمدؒ یستقبلون القسمۃ فمن وقع بناءہ فی قسم غیرہ رفع بناءہ ولا یرجعان علی القاسم بقیمۃ البناء ولکنھما یرجعان علیہ بالاجر الذی اخذہ کذا فی الظہیریۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۲۲۸ الباب الحادی عشر فی دعوی الغلط فی القسمۃ)

ومثلہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۴۱۰ کتاب القسمۃ۔

ایک فریق کی عدم موجودگی میں جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:۔ دو بھائیوں مسمی محمد حنیف اور محمد صدیق نے کچھ زمین مشترکہ طور پر خریدی جس میں نو ہزار روپے (۹۰۰۰/-) محمد صدیق کے تھے اور تین ہزار روپے محمد حنیف کے تھے، بارہ ہزار روپے (۱۲۰۰۰/-) روپے کی ۲۴ کنال زمین آج سے تقریباً ۳۲ سال پہلے خریدی گئی اور یہ زمین دونوں بھائیوں کے نام انتقال بھی ہوگئی اور کافی عرصہ تک یہ زمین دونوں بھائیوں کے والد صاحب کے تصرف میں رہی، والد صاحب کی وفات کے بعد آج تک ۱۳ سال سے مذکورہ زمین محمد صدیق کے قبضہ اور تصرف میں ہے، انتقالِ زمین کے وقت بڑے بھائی محمد حنیف نے تمام اندراجات محمد صدیق سے پوشیدہ رکھے۔

آج سے ۱۳ سال پہلے جب والد صاحب فوت ہوئے تو وفات کے تیسرے دن بڑے بھائی محمد حنیف نے مذکورہ زمین کی تقسیم کی بات کی جبکہ محمد صدیق نے اس تقسیم کی مخالفت کی اور کہا کہ والد صاحب کے چالیسویں کے بعد زمین کے تمام معاملات طے کرکے تقسیم کریں گے، اس کے بعد محمد صدیق کی موجودگی میں پانچ دن تک محمد حنیف نے پھر زمین تقسیم کرنے کی بات نہیں کی، تو محمد صدیق کسی کام کے سلسلہ میں پنڈی اور چلا گیا، اس کی غیر موجودگی میں محمد حنیف نے چند اشخاص کو جمع کرکے زمین مذکورہ نصف نصف یعنی بارہ بارہ کنال تقسیم کر دی جبکہ نہ تو مروجہ طریقہ کار اختیار کیا گیا اور نہ ہی اس تقسیم کی کوئی نشاندہی یا حد بندی کی گئی، صرف زبانی معاملہ تھا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن بعد جب محمد صدیق گھر آیا اور اسے اس تقسیم کا علم ہوا تو اس نے اس تقسیم اور طریقہ کار کو فراڈ اور دھوکہ دہی قرار دے کر مسترد کر دیا اور کہا کہ میں نے اس زمین کی خرید میں تین حصے قیمت ادا کی ہے لہٰذا میرا حق تین چوتھائی بنتا ہے اور محمد حنیف نے ایک ربع قیمت ادا کی ہے لہٰذا اس کا حق ایک چوتھائی بنتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:۔

(۱) آیا زمین کی تقسیم فریقین میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں اس کی رضامندی کے بغیر ہو سکتی ہے؟

(۲) کیا ایک فریق اپنی مرضی کے چند اشخاص کو جمع کرکے گواہ بنا کر زمین تقسیم کر سکتا ہے؟ جبکہ تحریری اور مروجہ طریقہ کار کا کوئی ثبوت نہ ہو؟

(۳) محمد صدیق کا دعویٰ اس زمین میں تین چوتھائی کا ہے اور محمد حنیف نصف کا دعویدار ہے تو کیا زمین خریدتے وقت دی گئی رقم کی بنیاد پر اس دعوے کا استحقاق رکھا جا سکتا ہے؟

(۴) کیا اتنا عرصہ گذرنے کے بعد محمد صدیق اپنے دعوے کا استحقاق رکھتا ہے یا نہیں؟
شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں جواب دے کر ممنونِ احسان فرمائیں۔

الجواب:۔ شراکتی کاروبار ابتداء ہی سے چلا آرہا ہے اور یہ ناگزیر ہے، مگر جملہ شرکاءؔ کے لیے ایک دوسرے کا خیال رکھنا بھی فرض ہے، یہ اس لیے کہ اس مشترکہ مال کے ہر ہر جزء میں سب شریک ہوتے ہیں، کوئی بھی حصہ دار یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کا مال ہے یا اتنا حصہ ہے، جس کی وجہ سے تقسیم کے وقت سب شرکاء کا حاضر ہونا یا سب کی اجازت ہونا شرعاً ضروری ہے، بدون اجازت یا کسی ایک شریک کے غائب ہونے کی صورت میں دیگر شرکاء مشترکہ مال تقسیم نہیں کرسکتے۔

لما فی الھندیۃ: ولو کانوا مشترین لم یقسم مع غیبۃ احدھم وان اقاموا البینۃ علی الشراء حتیٰ یحضر الغائب۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۲۱ الباب الثالث فی بیان ما یقسم وما لا یقسم)

اسی طرح شرح المجلۃ میں ہے: قسمۃ الفضولی موقوفۃ علی الاجازۃ قولاً و فعلاً فاذا قسم واحد المال المشترک بنفسہ لا تکون القسمۃ جائزۃ ولکن اذا اجاز اصحابہ قولاً۔ (شرح المجلۃ لرستم باز ص۶۲۳ الفصل الثانی فی شرائط القسمۃ)

فتاویٰ حامدیہ میں مرقوم ہے: اذا قسم الورثۃ الترکۃ بینھم بغیر امر القاضی وفی الورثۃ صغیر او غائب او شریک للمیت لا تصح الا باجازۃ الغائب او ولی الصغیر او اجازۃ الصبی بعد البلوغ۔ (بحوالہ شرح المجلۃ لرستم باز ص۶۲۴ الفصل الثانی فی شرائط القسمۃ)

صاحبِ درر الحکام نے بھی اس قسم کی تقسیم کو لا تجوز القسمۃ ولا تنفذ کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ اس قسم کی تقسیم ناجائز ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو تقسیم ہوچکی ہے وہ کالعدم ہے اور نافذ العمل نہیں ہے۔

جو اشیاء مشترکہ طور پر خریدی جائیں اور ابتداءً کسی قسم کا معاہدہ نصف یا ثلث وغیرہ کا نہ ہوا ہو مگر رأس المال کی ادائیگی کے وقت ایک شریک کے حصہ کی رقم زیادہ ہو اور دوسرے شریک کے حصہ کی رقم کم ہو تو پھر اس شے میں حصہ داری رأس المال کے اعتبار سے ہوگی، جس کی رقم زیادہ ہو تو وہ زیادہ حصے کا حقدار ہوگا، اس لیے کہ اگرچہ زبان و قال سے انہوں نے حصہ داری کا تعین نہیں کیا مگر زبانِ حال اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے رقم کی وجہ سے حصہ داری مقرر کی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں محمد صدیق کا رأس المال ۹۰۰۰ روپے ہے

جو کل رأس المال کا تین چوتھائی ہے اس لیے محمد صدیق تین چوتھائی کا حقدار ہے اور محمد حنیف کا ایک چوتھائی رأس المال ہے اس لیے اس کا حصہ زمین بھی ایک چوتھائی ہے، اگرچہ مطلقاً شراکت تنصیف کی صورت اختیار کرتی ہے۔

نظیرہ فی درر الحکام : اذا اختلط دینار احد بدینارین لآخر من جنسہ بصورۃ لاتقبل التمیز ثم ضاع اثنان منہما فیکون الدینار الباقی بینہما مشترکا اثلاثاً ثلثاہ لصاحب الدینارین وثلثہ لصاحب الدینار۔

(درر الحکام ج۳ ص۷ المادۃ ۱۰۶۱ الباب الاول فی بیان شرکۃ الملک)

کسی کے حق کے اسقاط میں طویل زمانے کا گذر جانا اسے متاثر نہیں کرتی بلکہ حق کسی صورت میں اور عرصہ دراز کے بعد بھی ساقط نہیں ہوتا لہٰذا محمد صدیق کا دعویٰ استحقاق اتنی مدت کے بعد بھی برقرار ہے اور اس کو دعویداری کا حق حاصل ہے۔

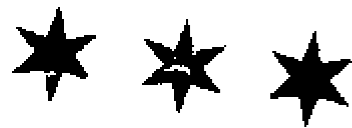
لما فی شرح المجلۃ : لایسقط الحق بتقادم الزمان ۔ (شرح المجلۃ لرستم باز ص۱۶۷۴ المادۃ)

(ھٰذا ما ظھرلی واللہ اعلم)

مشترکہ اراضی کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:۔ ہماری کچھ مشترکہ زمین ہے، اب اس کی تقسیم کا مسئلہ ہے کیونکہ یہ زمین فروع پر تقسیم کرنا ہے جبکہ فروع میں بہت اختلاف ہے اس لیے آسانی کے ساتھ ان پر تقسیم صحیح طریقے سے نہیں ہو سکتی، لہٰذا شریعت مقدسہ کی روشنی میں اس زمین کی تقسیم کا طریقہ مطلوب ہے؟

الجواب:۔ میرے نزدیک یہ مشترکہ اراضی اصل مالکان پر وراثت کے قاعدے کے مطابق تقسیم کی جانی چاہیئے اور پھر ان اصل مالکان سے ان کے فروع کو میراث کے ضابطہ کے مطابق منتقل کی جائے گی اگرچہ فروع کثرت و قلت میں مختلف کیوں نہ ہو۔



کتاب الاکراہ

(مجبوری کے احکام و مسائل)

حکومت کا رعایا کی کسی چیز پر جبراً قبضہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے آج سے پانچ سال قبل دس کنال زمین ایک لاکھ روپے کی بیع قطعی سے خریدی جس کا ثبوت حکومت کے متعلقہ دفتر میں موجود ہے، موصوف نے مذکورہ زمین پر پولٹری فارم کھولا، بعد میں حکومت نے مذکورہ زمین دس ہزار روپے کے عوض لینا چاہی لیکن مالکِ زمین نے انکار کر دیا، حکومت نے جبراً اس کی زمین پر قبضہ کر لیا، تو کیا حکومت کا اس طرح کسی کی ذاتی زمین پر قبضہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر حکومت کا یہ قبضہ کسی معاہدہ کے تحت نہ ہو تو حکومت کا اس طرح کرنا اکراہ کے حکم میں ہے اسلئے یہ بیع المکرہ ہے نافذ نہیں لہٰذا زوالِ اکراہ کے وقت خود مالکِ زمین یا اس کے ورثاء زمین کو واپس لے سکتے ہیں، تاہم جہاں کہیں حکومت اپنے کسی قرض کی وصولی کے لیے ایسا اقدام کرے تو اس میں اکراہ کی صورت باقی نہیں رہتی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: امر السلطان اكراه وان لم يتوعده وامر غيره لا الا ان يعلم المامور بدلالة الحال انه لو لم يمتثل امره يقتله او يقطع يده او يضربه ضربا يخاف على نفسه او تلف عضوه۔

(رد المحتار ج۶ ص۱۳۲ مطلب بيع المكره فاسد وزوائده مضمونة بالتعدى)[1]

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: لا يعتبر البيع الذى وقع بالاكراه المعتبر ولا الشراء ولا الايجار ولا الهبة ولا الفراغ ولا الصلح عن مال والاقرار والابراء وتاجيل الدين واسقاط الشفعة ملجئا كان الاكراه او غير ملجئ۔ (شرح مجلة الاحكام مادة ۱۰۰۶ ص۵۵۹ الباب الثانى فى بيان المسائل التى يتعلق بالاكراه)

ومثله فى الهداية ج۳ ص۱۱۳ كتاب الكفالة۔

جبراً نکاح کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی لڑکی کو زبردستی اغوا کر کے لے جائے اور پھر بزورِ شمشیر اس کے ساتھ نکاح کرے اور وہ لڑکی جان جانے کے خوف سے مجبوراً اس کو قبول کرے، تو کیا شرعاً یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب :- چونکہ اس قبول کرنے میں عورت کے اختیار کا بھی کچھ دخل ہے اسلئے یہ نکاح صحیح ہے اور یہ عورت مکرہ کی بیوی شمار ہوگی، اگرچہ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں۔

لما فی الهندیة : المرأة اذا اکرهت علی النکاح ففعلت صح النکاح۔

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۵۳ کتاب الاکراه۔ الباب الرابع فی المتفرقات)[۱]

جبراً زنا میں عورت گنہگار نہ ہوگی

سوال :- جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی عورت کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر جبراً اس سے زنا کرے اور وہ اس پر ہرگز راضی نہ ہو اور حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہو جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوئی ہو تو کیا یہ عورت گنہگار ہوگی یا نہیں؟

الجواب :- اگر عورت باوجود کوشش کے اپنی جان نہ بچا سکی اور نہ اس نے زانی کو تمکین (جگہ) دی ہو لیکن پھر بھی جبراً اس کے ساتھ زنا کیا گیا تو یہ عورت گنہگار نہ ہوگی۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ :- واما المرأة هل تأثم ذکر شیخ الاسلام ان اکرهت علی ان تمکن من نفسها فمکنت تأثم وان لم تمکن وزنی بها فلا وهذا لو بملجئ والافعلیه الحد بلا خلاف لا علیها ولکنها تأثم۔ (رد المحتار ج ۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراه)[۲]

---

[۱] لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : ولو اکره علی عقد من العقود ان کان عقداً لا یبطله الهزل کالنکاح والطلاق والعتاق جاز العقد۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۳۰۶ کتاب الاکراه)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۷۲ کتاب الاکراه۔

[۲] لما فی الهندیة : اما المرأة اذا کانت مکرهة علی الزنا هل تأثم ذکر شیخ الاسلام فی شرحه فی باب الاکراه علی الزنا انها ان اکرهت علی ان تمکن من نفسها فمکنت فانها تأثم وان لم تمکن هی من الزنا وزنی بها لا اثم علیها وذکر ایضاً فی الاکراه اذا اکرهت علی الزنا فمکنت من نفسها فلا اثم علیها وهذا کله اذا کان الاکراه بوعید تلف۔

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۴۸ کتاب الاکراه۔ الباب الثانی)

اکراہ کی صورت میں کلمۂ کفر کہنا

سوال:۔ اگر کسی مسلمان کو قتل کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ اپنی جان جانے کے خوف سے کلمۂ کفر زبان سے نکال دے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تو کیا ایسا آدمی کافر شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ حالتِ اکراہ میں زبان سے کلمۂ کفر کہنے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا بشرطیکہ دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، البتہ اگر ایسا شخص کلمۂ کفر کہنے سے انکار کردے اور قتل کر دیا جائے تو شہادت کا درجہ پائے گا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وان اکرہ علی الکفر باللہ تعالیٰ أو سبّ النبیﷺ صلی اللہ علیہ وسلم بقطع او قتل اخص لہٗ ان یظھر ما امر بہٖ علی لسانہ وقلبہ مطمئن بالایمان ...... ویوجر لو صبر لترکہ الاجراء المحرم۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۴،۱۳۵ کتاب الاکراہ) [۱]

حالتِ جبر میں زنا کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل معاشرے کے حالات اخلاقی طور پر انتہائی ناگفتہ بہ ہیں، عیاشی، فحاشی اور بے حیائی عروج پر ہے۔ اگر کسی شخص کو زنا کرنے پر مجبور کیا جائے اور نہ کرنے کی صورت میں اس کی جان کو یقینی خطرہ ہو تو کیا اس کو بصورتِ مجبوری زنا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زنا کی حرمت شرعاً و عقلاً دونوں طرح ثابت ہے، کسی بھی صورت میں اس کی حرمت ساقط نہیں ہوتی اگرچہ کرنے والے کی جان کو خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے بناء بر صورتِ مسئولہ ایسے شخص کے لیے زنا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں اور اگر وہ اس کا ارتکاب کر جائے تو عنداللہ مجرم ہوگا۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: وکذلک الزنا فانہٗ لا یرخص ولا یباح للرجل

---

[۱] لما قال العلامۃ الشیخ وھبۃ الزحیلی: التصرف الحسی المرخص بالاکراہ ھو کاجراء کلمۃ الکفر علی اللسان مع اطمینان القلب بالایمان أو سبّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم او الصلاۃ الی الصلیب او اتلاف مال المسلم فھذہ الامور لاتباح ولکن یرخص فعلھا عند الاکراہ التام وان امتنع المستکرہ عن فعلھا حتی قتل کان مثابا ثواب الجھاد۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۵ ص۳۹۲ البحث الثالث اثر الاکراہ فی التصرفات)
ومثلہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۸ الباب الثانی فیما یحل للمکرہ۔

بالاکراہ مطلقاً ولو فعل اثم لان حرمۃ الزنا ثابتۃ عقلاً قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّسَآءَ سَبِیْلًا۔ وکذا المرأۃ لا یرخص لہا ایضاً عند الاکراہ ولو کان تاماً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص ۳۹۵ المبحث الثالث اثر الاکراہ) [۱]

کسی مسلمان کو حالتِ جبر میں قتل کرنا

سوال: اگر کسی مسلمان کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ فلاں آدمی کو قتل کردے نہیں تو تجھے قتل کردیا جائے گا، اب اگر یہ شخص اپنی جان بچانے کی غرض سے کسی کو قتل کردے تو گنہگار رہوگا یا نہیں؟

الجواب: اکراہ اور جبر کی صورت میں اگرچہ بعض افعال مباح یا مرخص ہوجاتے ہیں مگر کسی مسلمان کو ناحق قتل اس حکم کے تحت داخل نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ایسے مجبور شخص کیلئے ہرگز یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی موت کے خوف سے کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کردے، اور اگر وہ اس فعل کا ارتکاب کرجائے تو عند اللہ گنہگار ہوگا۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: التصرف الحسی الحرام الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ ھو قتل المسلم بغیر حق او قطع عضو من اعضائہ ولو نملۃ لان القتل حرام محض، قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص ۳۹۵ المبحث الثالث، اثر الاکراہ) [۲]

جبراً شراب پینے پر حد نہیں

سوال: اگر کسی شخص کو زبردستی یعنی مجبور کرکے شراب پلادی جائے اور حکومت اسے گرفتار کرلے تو کیا شرعاً اس شخص پر حد نافذ ہوگی؟ یعنی اسے سزا دی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: اکراہ کی صورت میں جب کسی شخص کو شراب پلادی جائے اور حکومت اُسے

---

[۱] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو اکرہ علی الزنا لا یرخص لہ لان فیہ قتل النفس بضیاعھا لکنہ لا یحد استحساناً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۱۳۷ کتاب الاکراہ)

[۲] قال العلامۃ الکاسانیؒ: النوع الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ اصلاً فھو قتل المسلم بغیر حق سواء کان الاکراہ ناقصاً او تاماً لان قتل المسلم بغیر حق لا یحتمل الاباحۃ بحال۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۷۷ کتاب الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۱۳۵ کتاب الاکراہ۔

گرفتار کرے تو شرعاً اس سے حد ساقط ہوگی۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: الحکم الذی یرجع الی الدنیا فی الانواع الثلاثۃ اما النوع الاول فالمکرہ علی الشرب لایجب علیہ الحد اذا کان الاکراہ تاماً لان الحد زاجراً عن المستقبل۔ (بدائع الصنائع جلد ۷ ص۱۸۷ کتاب الاکراہ) [1]

جبراً زنا کی صورت میں حد کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص سے جبراً زنا کا ارتکاب کرایا جائے اور حکومت اسے گرفتار کرلے تو کیا شرعاً اس پر حد نافذ ہوگی یا نہیں؟ اگر بالفرض یہ عورت ہو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ حالتِ اکراہ میں بھی زنا کرنا حرام ہے اور اس کی شرعاً اجازت نہیں، تاہم اگر اکراہ کی صورت تام ہو یعنی یقیناً اس میں جان جانے کا خطرہ ہو تو ارتکاب کی صورت میں بناء برقول مفتی بہ حد نافذ نہیں ہوگی، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، اگرچہ بعض ائمہ کرامؒ کے ہاں مرد پر حد جاری ہوگی۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: فاذا اکرھت المرأۃ علی الزنا فلا یقام علیھا الحد عند جمھور الفقھاء سواءً کان الاکراہ تاماً ام ناقصاً...... فاذا اکرہ الرجل علی الزنا..... قال الصاحبان: لایجب الحد حالۃ الاکراہ التام سواءً کان الاکراہ من السلطان ام من غیرہ ورأیھما ھو الراجح عند الحنفیۃ وھو رأی ابی حنیفۃ اخیراً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۴۰۶ المبحث الثالث، النوع الثالث) [2]

---

[1] لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: الاکراہ علی شرب الخمر اذا کان الاکراہ تاماً فلا یجب الحد علی المستکرہ علی شرب الخمر اتفاقاً لان الحد شرع زاجراً من الجنایۃ فی المستقبل والشرب المکرہ علیہ لیس جنایۃ بل ھو مباح۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۳۹۵ المبحث الثالث فی اثر الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۳ کتاب الاکراہ۔

[2] لما فی الھندیۃ: اذا اکرہ الرجل علی الزنا بامرأۃ فزنی بھا کان ابوحنیفۃ اولاً یقول یجب علیہ الحد ثم رجع وقال لاحد علیہ وھو قولھما..... واَما المرأۃ فلاحد علیھا ولکنھا تاثم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۴۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراہ۔

مجبورمزنیہ پرحدِزنا کا حکم

سوال :۔ اگر کسی عورت کو یہ دھمکی دی جائے کہ اگر وہ زنا نہ کرائے گی تو اُسے اور اس کے مال کو ہلاک کر دیا جائے گا اور وہ اپنی جان اور مال کی ہلاکت کے خوف سے زنا جیسے قبیح عمل کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے تو کیا اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں ؟

الجواب :۔ اکراہ اور جبر چاہے تام ہو یا ناقص دونوں عورت کے حق میں برابر ہیں ، اگر وہ جبر کی کسی بھی صورت میں زنا کا ارتکاب کر جائے تو شبہ کی وجہ سے حد زنا اس سے ساقط ہو جائے گی ۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واما فی حق المرأة فلا فرق بین الاکراہ التام والناقص ویدرأ بالحد عنہا فی نوعی الاکراہ لانہ لم یوجد منہا فعل الزنا بل الموجود هو التمکین وقد خرج من ان یکون دلیل الرضا بالاکراہ فیدرأ عنہا الحد ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۸۱ کتاب الاکراہ) لہ

جبراً ہلاک شدہ مال کے ضمان کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! اگر مجبوری کی حالت (اکراہ) میں کسی کا مال ہلاک کر دیا جائے تو اُس مال کے تاوان کا ضامن کون ہوگا ؟ کیا جبر و اکراہ کرنے والا اُس مال کا ضمان دے گا یا ہلاک کرنے والا ضامن ہوگا ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ اکراہ کی نوعیت بیان نہیں کی گئی ہے اسلئے دونوں صورتوں کا جواب دیا جاتا ہے :

(۱) اگر اکراہ تام ہو یعنی ہلاک کرنے والے کی جان یا اس کے کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ضمان مجبور کرنے والے کے ذمے ہوگا اس لیے کہ مال کو ہلاک کرنے والا آلہ کے مانند ہے ۔

(۲) اگر اکراہ ناقص ہو یعنی اس میں جان یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ و خوف نہ ہو تو

لہ لما قال العلامة وهبة الزحیلی : فاذا اکرهت المرأة علی الزنا فلا یقام علیہا الحد عند جمهور الفقهاء سواءً کان الاکراہ تاماً ام ناقصاً ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص۴۰۲ المبحث الثالث فی اثر الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی الهندیة ج ۵ ص۴۸ کتاب الاکراہ ۔الباب الثانی ۔

ضمان ہلاک کرنے والے کے ذمے ہوگا۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: المکرہ علی اتلاف مال الغیر اذا تلفہ یجب الضمان علی المکرہ دون المکرہ اذا کان الاکراہ تاماً لان المتلف ھو المکرہ من حیث المعنی وانما المکرہ بمنزلة الآلة علی معنی انہ مسلوب الاختیار...... وان کان الاکراہ ناقصا فالضمان علی المکرہ لان الاکراہ الناقص لا یجعل المکرہ آلة المکرہ لانہ لایسلب الاختیار اصلاً فکان الاتلاف من المکرہ فکان الضمان علیہ ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۷۹ کتاب الاکراہ) لہ

جبراً کھلائے گئے مال کے ضمان کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ فلاں شخص کا مال (مرغی، بکری وغیرہ) کھا جائے ورنہ اس کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے، لہٰذا اس مجبوری کے تحت اس نے دوسرے کا مال بغیر اس کی اجازت کے کھا لیا کیونکہ نہ کھانے کی صورت میں جانی نقصان کا قوی امکان تھا۔ اب جس آدمی کا مال جبراً کھایا گیا ہے وہ کھانے والے سے اپنے مال کے تاوان کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا شرعاً مالکِ مال اس شخص سے تاوان وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟ یا وہ جبر کرنے والے سے مطالبہ کرے؟

الجواب:۔ اگرچہ جبر کی صورت میں مجبور شخص آلہ کی حیثیت رکھتا ہے مگر کسی کا مال کھانے کی صورت میں اس شخص کا اپنا فعل بھی پایا جاتا ہے اس لیے اُس مال کا ضمان کھانے والے کے ذمے واجب الاداء ہے اور مالکِ مال اسی سے تاوان کا مطالبہ کرے گا۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: کذلك لو اکرہ علی ان یاکل مال غیرہ فالضمان علیہ لان ھذا النوع من الفعل وھو الاکل مما لا یعمل علیہ الاکراہ

لہ لما قال الشیخ وھبة الزحیلی: فان کان الاکراہ تاماً فالضمان علی المکرہ عند الحنفیة والحنابلة فی الارجح عندھم وبعض الشافعیة لان المستکرہ مسلوب الارادة وماھو الآلة للمکرہ ولاضمان علی الآلة اتفاقاً....... وان کان الاکراہ ناقصاً فالضمان علی المستکرہ عند الحنفیة والمالکیة الخ

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۳۹۸ کتاب الاکراہ۔ المبحث الثالث)

لانه لا یتصور تحصیله بآلة غیره فکان طائعاً علیه فکان الضمان علیه ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۷۹ کتاب الاکراه) ؎۱

مجبور مفعول پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مہتمم صاحب جامعہ حقانیہ! الحمد للہ آنجناب کی دعاؤں اور مساعی سے افغانستان میں امارت اسلامی قائم ہے اور شرعی قوانین کا اجراء بھی ہو چکا ہے، اب ایک مسئلہ درپیش ہے وہ یہ کہ اگر کسی کے ساتھ جبراً (یعنی اسلحہ کی نوک پر) لواطت کی جائے اور وہ دونوں اس قبیح فعل کے کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو کیا حد دونوں پر جاری ہوگی یا صرف فاعل کو سزا دی جائے گی؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ کے مطابق مفعول چونکہ مجبور محض ہے اور اس کے ساتھ یہ قبیح عمل جبراً (اسلحہ دکھا کر) کیا گیا ہے اس لیے سزا صرف فاعل کو دی جائے گی مفعول اس سے مستثنیٰ ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ظاهر تعلیلهم أن حکم اللواطة کحکم المرأة لعدم الولد فترخص بالملجی الا ان یفرق بکونها اشد حرمة من الزنا لانها لم تبح بطریق ما ولکون قبحها عقلیا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراه) ؎۲

؎۱ قال العلامة شیخ زاده المشهور بداماد افندی رحمه الله: وان اکره علی اتلاف مال مسلم لا حدهما ای بالقتل او القطع رخص الاتلاف ای للمکره لان الاتلاف مال الغیر یستباح للضرورة کما فی المخمصة وقد ثبت والضمان علی المکره بالکسر لان المکره فی حق الاتلاف آلة للمکره فلم یلزم علیه الضمان وفیه اشارة الی الاحتراز عن الاکل والتکلم والوطئ فان فیها لا یصلح آلة ۔

(مجمع الانهر ج۴ ص۴۴ کتاب الاکراه)

؎۲ قال العلامة محمد بن علی بن محمد الحصنی رحمه الله، وعلی هذا ظاهر تعلیلهم ان حکم اللواطة لحکم المرأة لعدم الولد فترخص بالملجئ الا ان یفرق بکونها اشد حرمة من الزناء لقبحها عقلاً ایضاً۔

(الدر المنتقی فی ذیل مجمع الانهر ج۴ ص۴۹ کتاب الاکراه)